ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

جولائی 2014

عنیزہ سید

رفعت سراج

کے دلچسپ ناول

نامور قلمکار غزالہ نگار اور کنزی سے پُرکیف ملاقات



اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

افسانے

پبلشر و پرو پرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ھاکی اسٹیڈیم کراچی

خصوصی مضامین

مستقل عنوانات

شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400 رانا ملک حمید 0323-2895528
ماڈل: نیناں .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا
جلد 42 • شمارہ 04 • جولائی 2014 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے......!

قارئین کرام! آپ سب کو بے حد مبارک باد...... چند دن بعد رمضان المبارک اپنی رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو رہا ہے۔ اجر و ثواب کا موسم شروع ہونے کو ہے...... نیکیوں کا موسم بہار پوری ملت اسلامیہ پر چھا جانے والا ہے، آئیں اس کا استقبال کریں......

نماز کی طرح روزہ بھی ابتدا سے ہی انبیا کی شریعتوں کا لازمی جز رہا ہے اور اسلامی تقویم کا نواں مہینہ کہلاتا ہے۔ قرآن پاک اور تمام اسلامی کتب اسی مبارک مہینے میں نازل ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس ماہ مبارک کے روزوں کو فرض قرار دیا اور اس کی راتوں کے قیام کو ثواب کا عمل بنا دیا۔ اس مبارک مہینے میں عبادات اور نیکیوں کا ثواب کئی گناہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ مومن کا رزق بھی اس مہینے میں بڑھا دیا جاتا ہے، یہ لوگوں کے ساتھ غم خواری اور صبر کا مہینہ ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ رمضان المبارک کا پہلا عشرہ رحمت، دوسرا عشرہ مغفرت اور آخری عشرہ دوزخ سے نجات کا ہے۔ اس ماہ مبارک کی ایک عظمت یہ بھی ہے کہ اس میں لیلۃ القدر ہوتی ہے۔ جس کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔ "بے شک ہم نے نازل کیا قرآن کو لیلۃ القدر میں اور تم کیا جانو کہ لیلۃ القدر کیا ہے؟ لیلۃ القدر ہوتی ہے جس کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔ "بے شک نازل کیا قرآن کو لیلۃ القدر میں اور تم کیا جانو کہ لیلۃ القدر کیا ہے لیلۃ القدر بہتر ہے ہزار مہینوں سے...... اس میں نازل ہوتے ہیں ملائک۔" روحانی اسکالرز کا کہنا ہے کہ مومن کامل کے ذہن کی رفتار اس رات میں ساٹھ ہزار گنا زیادہ ہو جاتی ہے اور ذہن کی یہی وہ قوت ہے جس سے ایک مومن ملائک اور روح کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کا تقاضا ہے کہ ہم رمضان المبارک کے مہینے کو پا کر پورے روزے رکھیں اور اس کے شکر گزار بندے بنیں کہ جانے اگلے سال ہمیں یہ موقع بھی مل سکے یا نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی ہے کہ اس ماہ کے فیض و برکات کی بدولت ہم سب کے گناہوں کو معاف فرما دے اور ہمیں بھی ان لوگوں میں شامل کر لے، جن کے روزے قبول کیے گئے ہیں۔ آمین، ثم آمین۔

مدیرہ
انجم انصار



علم.... معرفت الٰہی

دوسرا اہم منبع حدیث ہے۔

زندگی کے بہت سے سوالات اور آسمان وزمین کے بہت سے حقائق ایسے ہیں جنہیں صرف وحی ہی حل کر سکتی ہے..... انسانی حواس، عقل اور تجربے سے وہ مسائل حل نہیں کیے جا سکتے خاص طور سے وہ مسائل جن کا تعلق ہماری اجتماعی زندگی اور آنے والی زندگی سے ہے لہٰذا وحی ہمارے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں بھیجا تو ہمیں علم کے ذرائع بھی عطا کیے جن میں حواس خمسہ اور عقل نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

زندگی گزارنے کے وہ رہنما اصول جن کا تمام انسانوں کو پابند ہونا چاہیے وہ اصول ہمیں کون بتائے گا......؟ پھر اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ اپنی آخرت درست کرنے کا طریقہ عبادت کا صحیح طریقہ اور عبادت کیسے کی جائے؟

ان تمام سوالات کا جواب صرف وحی سے دیا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحی آتی رہی اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک "وحی متلو" جس کا دوسرا نام قرآن ہے دوسری قسم کو "وحی غیر متلو" کہا جاتا ہے اور اس کا نام حدیث یا سنت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نبی اکرم ﷺ پر بھیجی جانے والی وحی کی پہلی قسم کو وحی متلو کہا جاتا ہے یعنی وہ وحی جس کی نماز میں تلاوت کی جا سکتی ہے اس وحی کے الفاظ بھی منجانب اللہ نازل ہوتے ہیں اور معنی تو بہر حال اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں..... اس وحی متلو کو ہم قرآن کہتے ہیں..... اس کی تلاوت کرتے ہیں اور اسے نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کا پڑھنا زبردست ثواب کا باعث ہے اور اس کا سمجھنا نعمت عظمیٰ ہے۔

مگر قرآن کریم میں زیادہ تر اصول بتائے گئے ہیں۔ عقائد ہوں یا عبادات، معاملات ہوں یا معاشرت...... اخلاق کا شعبہ ہو یا زندگی کے دیگر شعبے۔ قرآن کریم نے ہر شعبے سے متعلق اصولی ہدایات آیات کی شکل میں ہمیں دی ہیں۔ ان اصولوں کو زندگی میں نافذ کرنے کا عملی طریق کار قرآن کریم نے اکثر جگہ بیان نہیں کیا...... بلکہ اس کی عملی تطبیق جناب رسول خدا ﷺ کے سپرد کی گئی کہ وہ اس پر عمل کر کے بتائیں اور لوگوں کو سکھائیں کہ قرآن پہ عمل کیسے کیا جائے گا...... یعنی قرآن کریم میں ہمیں حکم تو دے دیا کہ "نماز قائم کرو......" مگر نماز کتنے اوقات میں قائم کی جائے گی؟ اس میں رکعتوں کی تعداد کیا، کیا ہوگی؟ قیام، قرأت، رکوع، سجود، قعدہ کی ترتیب کیسے ہوگی؟ تو ان سب کا عملی طریقہ کار رسول اللہ ﷺ نے سکھایا اور کر کے دکھایا...... یہی حال زکوٰۃ، روزہ اور حج کے احکامات کا ہے۔ قرآن نے صرف اصولی ہدایات دی ہیں جبکہ عملی طریقہ کار کا بیان رسول اللہ ﷺ کے سپرد کر دیا گیا...... رسول اللہ کی تمام احادیث کو "وحی غیر متلو" کہا جاتا ہے۔

حدیث کا وحی ہونا محض قیاس یا اجماع یا حدیث سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ خود قرآن سے بھی ثابت ہے۔

قرآن پاک میں صاف فرمایا گیا......

"یعنی نبی (ﷺ) اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتے (وما ینطق عن الھویٰ) بلکہ ان کی بتائی ہوئی بات وحی ہوتی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔" (سورہ نجم آیت ۳۔۴) "آپ فرما دیجیے...... اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو...... خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ (سورۂ آل عمران آیت ۳۱)

تعریف حدیث:

1۔ قولی حدیث...... رسول اکرم ﷺ کا فرمان۔

2۔ فعلی حدیث...... آپ ﷺ کا عمل۔

3۔ تقریری حدیث...... آپ ﷺ کی اجازت۔

یعنی آپ کی موجودگی میں کوئی کام کیا گیا ہو یا کوئی بات کہی گئی ہو اور آپ ﷺ اس پر خاموش رہے ہوں...... منع نہ کیا ہو......

☆☆☆

حضرت علی کرم اللہ وجہہ علم و فضل کے اعتبار سے نہایت بلند مقام پر فائز ہیں۔ حدیث ہے کہ میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ قرآن حکیم کے حافظ تھے۔ اس کی ایک ایک آیت کے معنی اور شان نزول سے واقف تھے گویا تفسیر قرآن میں وہ مرتبہ کمال پر تھے۔ خود ان کا اپنا قول ہے کہ

"مگر وہ فہم جو خدا کسی کو قرآن میں دے وہ میرے پاس ہے۔" حدیث میں بس وہ ارشادات نبوی ﷺ کے بہت بڑے عالم تھے...... تقریر و خطابت میں اپنی مثال آپ تھے۔ فن نحو کی ایجاد کا سہرا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سر ہے۔

☆☆☆

ایک یہودی کی داڑھی بہت مختصر تھی۔ ٹھوڑی پر چند گنتی کے بال تھے جبکہ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی داڑھی مبارک بڑی گھنی اور بھری ہوئی تھی۔ ایک دن وہ یہودی حضرت علیؓ سے کہنے لگا...... "اے علی! تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن پاک میں جمیع علوم ہیں اور آپ کرم اللہ وجہہ باب مدینۃ العلم ہو تو بتاؤ کہ قرآن پاک میں کیا آپ کی گھنی داڑھی اور میری مختصر داڑھی کا بھی ذکر ہے؟"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا...... "ہاں ہے لو سنو......! قرآن پاک میں آتا ہے۔ یعنی جو اچھی زمین ہے اس کا سبزہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نکلتا ہے اور جو خراب ہے اس میں سے نہیں نکلتا مگر تھوڑا مشکل۔"

"تو اے یہودی......! وہ اچھی زمین میری ٹھوڑی ہے اور خراب زمین تیری ٹھوڑی ہے۔"

ایک دفعہ کسی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے درخواست کی کہ ہم دس آدمی ہیں اور سوال ایک ہی ہے مگر جواب جداگانہ چاہتے ہیں...... آپ نے فرمایا...... ہاں کہو...... اس نے سوال پیش کیا...... "علم بہتر ہے یا مال......"

آپؓ نے اس طرح جواب دینا شروع کیا۔ (جو کہ آپ کے علم کی قابل رشک مثال ہے)

1۔ علم...... اس لیے بہتر ہے کہ مال کی تجھے حفاظت کرنی پڑتی ہے اور علم تیری حفاظت کرتا ہے۔

2۔ علم...... اس لیے بہتر ہے کہ مال فرعون و ہامان کا ترکہ ہے اور علم انبیا کی میراث ہے۔

3۔ علم...... اس لیے بہتر ہے کہ مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے اور علم ترقی کرتا ہے۔

(جاری ہے)

امانت

رفعت سراج

قسط 19

لہو سے سینچنے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پر سایۂ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور...... چاند کی چاندنی امانت...... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے چہار سو اجالا کردیتی ہیں۔

امانت و خیانت کو واضح کرتی ایک پُر درد مگر خوب صورت تحریر



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نیورو سرجن تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور رومانہ کے لیے ایک سخت گیر بہن اور ماں تھیں۔ اصیل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور معتمدِ خاص تھا۔ کائناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے وہ اور روما بیسٹ فرینڈز ہیں۔ ایس پی شاہ زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریکِ کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے جو برہان کو ناقابلِ قبول ہوتا ہے۔ رابی شاہ عالم کے گھر چلی جاتی ہے۔ مہر جان کو ہوش آتا ہے تو گل جان کو پتا چلتا کہ وہ حال کو فراموش کر چکی ہیں۔ ستارہ، برہان کو فون کر کے بتاتی ہے کہ شبینہ کی جگہ اس کی شادی ہو گئی ہے۔ گل جان، مہر جان کو اکیلا نہیں چھوڑتی ان کے ہی کمرے میں لیٹ کر ماضی میں گم ہو جاتی ہے۔ صابرہ، ستارہ سے ملنے کے لیے بے چین ہوتی ہے۔ جابر علی، ایس پی سے ولیمے کی بابت دریافت کرتا ہے تو وہ اسے جھوٹی تسلیاں دے کر مطمئن کر دیتا ہے۔ رابی، برہان کو دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتی ہے کہ وہ کون ہے۔ روما شاہ عالم کے گھر آ جاتی ہے۔ جابر علی، ستارہ سے اپنے ساتھ چلنے کو کہتا ہے تو وہ منع کر دیتی ہے۔ ستارہ منع کرتی ہے تو جابر علی ستارہ کو گولی مار دیتا ہے۔ برہان کو خبر ملتی ہے تو وہ فوراً اپنے گھر پہنچتا ہے۔ شاہ عالم اخبار میں قتل کی خبر میں برہان کا نام پڑھ کر چونکتے ہیں۔ برہان، شاہ عالم کا فون آنے پر انہیں بتاتا ہے کہ اس کی بہن کا مرڈر ہو گیا ہے وہ اب روما کو نہیں پڑھا سکے گا۔ مہر جان اپنے مرحوم باپ کو صدائیں دیتی ہیں وہ گل جان سے کہتی ہیں کہ بابا ان سے ملے بغیر کبھی نہیں گئے تو اب کیسے چلے گئے۔ ایس پی، وارث علی کو خبردار کرتا ہے۔ رابی کو برہان کی بہن کے مرڈر کی خبر ہوتی ہے تو وہ سوچتی ہے کہ شاید اب وہ اسے نہیں دیکھ پائے۔ شاہ عالم، رابی کی ہمت بندھاتے ہیں۔ شاہ عالم، برہان کے گھر جاتے ہیں اسے تسلی دیتے ہیں۔ شائستہ بیگم، فائزہ کو کہتی ہیں کہ اب وہ شبینہ سے دوستی ختم کرے...... شبینہ، برہان سے جابر علی کے بارے میں پوچھتی ہے تو برہان کہتا ہے کہ وہ اب ان سے نہیں ملے گا۔ رابی، کائناز اور روما کو برہان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہیں۔ وارث علی، ایس پی شاہ زمان سے کہتا ہے کہ وہ جابر کے قبضے سے وہی فائل نکلوائے...... ستارہ کی تدفین ہو جاتی ہے۔ رابی شاہ عالم سے کہتی ہے کہ وہ کائناز بتا دیں کہ اب برہان انہیں پڑھانے نہیں آئے گا تو شاہ عالم کہتے ہیں کہ وہ برہان کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ روما، کائناز کے ساتھ اپنے گھر جاتی ہے تو مہر جان اسے نہیں پہچانتیں۔ ایس پی جابر علی سے بات کرتا ہے کہ وہ فائل اسے دے دے۔ وارث علی، برہان سے فائل کی بات کرتا ہے کہ اگر وہ فائل اسے نہ ملی تو ان کے لیے اچھا نہیں ہوگا...... برہان فائل کے بارے میں شبینہ سے پوچھتا ہے تو وہ بھی پریشان ہو جاتی ہے۔ احمر شائستہ بیگم کی اس بات سے بہت ڈپریسڈ ہوتا ہے کہ فائزہ، شبینہ سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ اصیل خان، گل جان سے کہتا ہے کہ اب روما اور رابی کو گھر واپس آ جانا چاہیے۔ میر داد، جابر علی سے کہتا ہے کہ وہ کیس کو الجھا دے لیکن جابر علی اس کی بات کی نفی کرتا ہے۔ گل جان، اصیل خان سے کہتی ہے کہ وہ بچیوں کو اصل حقیقت کا بتا دے گی۔ کائناز اپنے والدین کی تصویریں روما اور رابی کو دکھاتی ہے تو روما جذباتی ہو جاتی ہے۔ گل جان دیکھتی ہے کہ مہر جان ماضی کی یادوں میں گم ہیں۔ وارث علی گھر آتا ہے اور صابرہ سے کہتا ہے کہ وہ رشتے داری کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ صابرہ اسے کہتی ہے کہ وہ برہان کے آنے پر آ کے بات کرے۔ برہان غصہ کرتا ہے کہ صابرہ نے اسے گھر میں کیوں بلا لیا۔ وارث علی ایس پی سے کہتا ہے کہ وہ جابر علی کی بیٹی کو اٹھا لے گا۔ روما، اصیل خان سے کہتی ہے وہ اس کے باپ کے بارے میں بتائے، اصیل خان اسے صرف اتنا بتاتا ہے کہ اس نے روما کے باپ کو دیکھا ہے۔ شبینہ، صابرہ کو نیند کی دوا دیتی ہے، وہ وارث علی کا فون سنتی ہے تو وارث علی، برہان کو دھمکی دیتا ہے تو برہان، شبینہ کو شاہ عالم کے گھر لے جاتا ہے۔ وہ گارڈ سے کہہ کر کائناز کو بلاتا ہے اسے بتاتا ہے کہ شبینہ اس کی بہن ہے وہ اسے یہاں رکھے صبح وہ شاہ عالم سے بات کرے گا۔ فائزہ، احمر سے کہتی ہے کہ وہ شائستہ بیگم کو سمجھائے کہ وہ شبینہ سے دوستی ختم نہیں کر سکتی۔ کائناز اور روما، شبینہ کے آنے پر بہت حیران ہوتی ہیں۔ شاہ عالم کو صبح کائناز، برہان کی بہن کے آنے کا بتاتی ہے۔ برہان، صابرہ کو بھی شاہ عالم کے گھر لے آتا ہے۔ برہان، شاہ عالم سے کہتا ہے کہ وہ انیکسی کرائے پر لے کر تو نہیں رہ سکتا لیکن وہ اس مد میں کچھ پیسے ضرور دے گا...... میر داد حیران ہوتا ہے کہ جابر کے گھر سے اب تک کوئی اس سے ملنے نہیں آیا...... برہان، شاہ عالم کے پاس وارث علی کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے جاتا ہے۔ وارث علی آ کر شاہ زمان کو بتاتا ہے کہ وہ لوگ گھر چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ رابی اب فوراً سے پیشتر اپنا پہلے والا چہرہ حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن گل جان اسے اکیلے بھیجنے پر متامل ہوتی ہے۔ بیرسٹر جمیل، شاہ عالم کو کہتے ہیں کہ وہ کائناز کے لیے ان کی پسند کے مطابق رشتہ تلاش کر رہے ہیں۔

اب آگے پڑھیں

”آپ دونوں تو جڑواں بہنیں لگتی ہیں۔ یہ تو شبینہ نے مجھے بتایا کہ روما تو آپ کی دوست ہے...... بیٹا آپ کہاں رہتی ہیں! میرا مطلب ہے کہ آپ آج کل یہاں اپنی دوست کے گھر رہنے آئی ہوئی ہیں؟“ صابرہ نے بڑے شوق اور دلچسپی سے پوچھا تھا۔ روما ایک دم گھبرا کر کائناز کی طرف دیکھنے لگی۔

”ارے...... نہیں آنٹی یہ رہنے نہیں آئی ہوئی ہے بس...... ہم نے تو زبردستی اپنے گھر میں رکھ لیا ہے، یہ تو ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔“ کائناز اپنے مخصوص برجستہ اور لاابالی انداز میں گویا ہوئی تھی۔ صابرہ حیرت سے کائناز کی طرف دیکھنے لگی۔

”پڑوس میں رہتی ہے......؟ لیکن میں تو جب سے آئی ہوں اس بچی کو آپ کے ساتھ ہی دیکھ رہی ہوں۔“

”جی...... آنٹی یہ آج کل ہمارے ساتھ ہی رہتی ہے اس کی جو بڑی بہن ہیں ناں وہ بھی ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔“ کائناز نے اسی لاابالی انداز میں جواب دیا۔

شبینہ جو دُھلے ہوئے کپڑے لے کر اندر آ رہی تھی...... صابرہ کی سوالیہ نظریں اس پر ٹک گئیں جیسے وہ سوال نہ کر پا رہی ہو...... لیکن امید ہو کہ شبینہ کوئی ایسی بات بولے کہ اسے اپنے سوال کا جواب خود ہی مل جائے...... لیکن شبینہ اسی طرح اندر آ کر کپڑے ایک طرف رکھ کر ماں کے برابر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

”ماشاء اللہ بہت پیاری بچیاں ہیں بلکہ آج کل کے زمانے کے حساب سے تو بہت سیدھی بچیاں ہیں۔“ صابرہ، شبینہ سے مخاطب ہوئی۔ وہ زبردستی کے سے انداز میں مسکرائی، وہ ذہنی طور پر بالکل غیر حاضر تھی اور شاید اسے ابھی تک روما اور کائناز میں کسی قسم کی دلچسپی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی، اس کا ذہن حاضر بھی کیسے ہو سکتا تھا...... نئی، نئی افتاد تھی...... باپ جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا...... اسے روما اور کائناز کی معصومیت، سادگی اور خوب صورتی سے چنداں دلچسپی نہیں تھی بلکہ اسے اپنے آس پاس ہونے والے کسی غیر متوقع حادثے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی جو کچھ اس پر بیت رہی تھی وہ شاید کسی پر نہیں بیتی تھی...... لیکن کائناز اپنی سادگی اور برجستگی کی وجہ سے صابرہ کی توجہ اپنی طرف کھینچنے میں کافی کامیاب ہو چکی تھی۔ اس کے مقابلے میں روما، چپ، چپ اور گم سم دکھائی دے رہی تھی۔

”آنٹی پتا ہے کیا...... روما کی اماں جان ہیں ناں بےچاری بہت بیمار ہیں...... تو یہ دونوں بہنیں بہت پریشان تھیں تو ہمارے دادا جان انہیں اپنے گھر لے آئے۔“ کائناز نے اپنی دانست میں افلاطون بن کر کوئی بات بنانے کی کوشش کی تھی۔

”اچھا، اچھا...... شاہ صاحب آج کے زمانے میں تو عجوبہ ہی ہیں، اتنی انسانیت آج کل کہاں دکھائی دیتی ہے۔ مومن آدمی ہیں پڑوس کا حق ادا کر رہے ہیں اور وہ بھی آج کے زمانے میں...... اس زمانے میں تو وہ نفسا نفسی ہے بیٹا کہ پڑوس میں کوئی مر بھی جائے تو خبر نہیں ہوتی...... شاہ صاحب جیسا مالدار انسان لوگوں کا اتنا احساس کرتا ہے...... مجھے تو دیکھ کر تعجب ہو رہا ہے، ہمارے لیے تو وہ ویسے ہی فرشتہ ثابت ہوئے ہیں، ورنہ پتا نہیں ہمارے ساتھ کیا ہوتا......“

”جی...... آنٹی میرے دادا جان بہت اچھے ہیں، سب کا خیال رکھتے ہیں، ہمارے گھر میں بہت پرانے نوکر تھے ناں جو اس دنیا میں نہیں رہے...... میرے دادا ان سب کی فیملیز کا بھی خیال رکھتے ہیں اور ان کا پورا خرچ ان کے گھر پہنچاتے ہیں اور وہ کبھی بھولتے بھی نہیں...... اور ہاں...... آنٹی دادا جان کو مت بتا دیجیے گا کہ میں نے یہ سب آپ کو بتایا ہے، وہ پسند نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ کوئی اچھا کام کرو تو سب سے چھپاؤ...... اچھا

کام صرف اللہ کی خوشی کے لیے کرتے ہیں۔'' اب شبینہ بھی اس کی باتوں میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوگئی تھی۔

''ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ واقعی بہت بڑی بات ہے، شاہ صاحب واقعی بہت عظیم انسان ہیں، اللہ ان کی عمر میں، رزق میں، برکت دے، آمین۔'' کائناز کی باتیں سن کر صابرہ کے دل پر بہت گہرا اثر ہوا تھا...... شاہ صاحب کے لیے اپنے دل میں جو وہ عقیدت محسوس کر رہی تھی اس میں سوگنا اضافہ ہوگیا تھا۔

''آپ کی امی کو کیا بیماری ہے بیٹا......؟'' صابرہ نے اب چپ، چپ بیٹھی روما پر توجہ کی...... روما اس کا سوال سن کر ایک دم حواس باختہ سی نظر آنے لگی اور گھبرا کر کائناز کی طرف دیکھا۔

''وہ آنٹی، ان کے دماغ کو کچھ ہوگیا ہے کسی کو پہچانتی ہی نہیں اور وہ جو اس کی خالہ ہیں ناں وہ ان کا علاج بھی نہیں کروا رہیں، دادا جان تو بہت پریشر ڈال رہے ہیں، میرا خیال ہے کچھ دنوں میں دادا جان کی بات مان لیں گی وہ اور ان کا علاج کروائیں گی تو وہ بالکل ٹھیک ہوجائیں گی۔'' کائناز نے اپنے سابقہ انداز اور اسی ٹون میں جواب دیا۔

''دماغ کو کچھ ہوگیا ہے، کیا مطلب......؟ کوئی صدمہ پہنچا ہوگا انہیں کیونکہ بعض اوقات صدمے کی وجہ سے بھی دماغ پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔'' صابرہ کو سن کر جیسے دلی دکھ ہوا تھا...... چند لمحے کے لیے وہ اپنے ذاتی دکھ سے دور ہوگئی تھی وہ روما کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہمدردی کا تاثر بہت گہرا تھا جیسے اسے کم عمر معصوم سی روما پر جی بھر کر ترس آرہا ہو۔

''کوئی بات نہیں بیٹا دکھ، بیماری بھی انسان ہی کے ساتھ ہے اللہ نے چاہا تو آپ کی امی بالکل ٹھیک ہوجائیں گی۔'' صابرہ کو روما کے چہرے پر پھیلی ہوئی یاسیت کی وجہ سمجھ آگئی اور جیسے وہ اس کی کم گوئی کا راز بھی پاگئی تھی۔ روما کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے جنہیں اس نے بڑی مہارت سے چھپانے کی کوشش کی تھی اور گردن موڑ کر دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔

''اچھا آنٹی اب ہم چلتے ہیں۔ دادا جان بھی باہر گئے ہوئے ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر میں واپس آجائیں۔ آپ نے لنچ کرلیا ناں......''

''ہاں...... ہاں کائناز! امی نے اور میں نے کھانا کھالیا تھا اگر تم لوگوں نے کھانا نہیں کھایا تو جا کر کھالو۔'' شبینہ دو چار ملاقاتوں میں ان سے بے تکلف ہوگئی تھی۔ ویسے بھی وہ عمر میں ان دونوں سے بڑی تھی اور اب تک دونوں سے اپنے بڑے پن کے ساتھ ہی باتیں کر رہی تھی۔

''اچھا آنٹی آپ ریسٹ کیجیے ہم بعد میں باتیں کریں گے۔ ٹھیک ہے ناں...... اور ہاں...... سر نظر نہیں آرہے، کیا کہیں گئے ہوئے ہیں......؟'' کائناز جاتے، جاتے رک کر پوچھنے لگی۔

''ہاں بیٹی اپنے ہی کسی کام سے باہر گیا ہوا ہے وہ۔''

''لیکن وہ تو یونیورسٹی جاتے ہیں ناں......؟'' کائناز کو جیسے ایک دم یاد آگیا۔

''ہاں...... مگر آج وہ یونیورسٹی نہیں گیا کہہ رہا تھا کہ کسی ضروری کام سے جارہا ہوں۔'' برہان کا خیال آتے ہی صابرہ کے چہرے پر تفکرات کا جال بچھ گیا...... روما، کائناز سے پہلے کمرے سے نکل گئی تھی۔ کائناز نے نکلتے، نکلتے پھر بچوں کے سے انداز میں شبینہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا جیسے کہیں دور جارہی ہو اور خدا حافظ کہہ رہی ہو۔ دونوں کے جاتے ہی صابرہ نے شبینہ کی طرف دیکھا اور بولی۔

''کتنی معصوم بچیاں ہیں...... لگتا ہے انہیں تو زمانے کی ہوا ہی نہیں لگی۔''

ماں کی بات سن کر شبینہ خاموش رہی...... شاید اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا...... یا یہ کہ اس کی خاموشی کا مطلب تھا کہ اسے اپنی ماں کی بات سے اتفاق ہے۔

☆☆☆

''باہر جانے کا کہہ رہی ہے۔'' گل جان، اصیل خان کے کوارٹر کے باہر کھڑی ہوئی اصیل خان سے بات کر رہی تھی بلکہ اپنے حساب سے اسے مطلع کر رہی تھی۔ اصیل خان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ ارادے سے گل جان کی طرف دیکھے لیکن خبر ہی ایسی تھی کہ اس نے گل جان کے چہرے سے کچھ اور بھی اخذ کرنا چاہا تھا...... وہ کچھ جو اس کے اندازے کے مطابق شاید گل جان کے منہ سے نہ نکلا لیکن اس کا چہرہ چغلی کھا سکتا تھا...... کیونکہ چہرے چغلی کھانے میں دیر نہیں لگاتے۔

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا...... باہر؟...... باہر سے کیا مطلب......؟'' اصیل خان الجھنے لگا۔

''باہر کا مطلب، ملک سے باہر، پلاسٹک سرجری کے لیے جانا چاہتی ہے، کہہ رہی تھی کہ بیس سے پچیس لاکھ تک خرچہ آئے گا۔''

''نہیں، میرا خیال ہے اتنا خرچہ نہیں آئے گا۔'' اصیل خان کے منہ سے نکل گیا۔

''تو پھر ویسے ہی اپنے اندازے سے کہہ رہی ہوگی...... لیکن میں اسے اتنی دور کیسے جانے دوں......'' گل جان متفکر انداز میں خود کلامی کرنے لگی۔

''آپ اسے جانے نہیں دیں گی تو روک بھی نہیں سکتیں۔'' اصیل خان رانی کو شاید گل جان سے زیادہ سمجھنے لگا تھا۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن اتنا پیسہ اسے دے دوں تو وہ تو بالکل ہی ہاتھ سے نکل جائے گی۔''

''آپ بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں گل جان بی بی...... وہ اب بھی آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے...... اگر وہ اپنا چہرہ واپس لانے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے تو اچھی بات ہے۔ دے دیں اسے بیس، پچیس لاکھ روپے......'' اصیل خان نے سر جھکا کر کہا تھا۔

''ارے واہ...... اتنی بڑی رقم غیر شادی شدہ بچی کے حوالے کردوں......؟''

''اسی کا مال ہے، آپ تو اس کے مال کی رکھوالی کر رہی ہیں، دے دیں جس کی امانت ہے اس کے حوالے کردیں......'' اصیل خان نے سپاٹ و بے تاثر لہجے میں ایک ایسا جملہ پھینکا تھا جسے سن کر گل جان جیسے ایک دم حواسوں میں آگئی تھی۔

''ہاں...... تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ میرا مال ہے، اس کے باپ کا مال ہے تو ظاہر ہے اسی کا ہے، میں تو صرف اسے اکیلا بھیجنے کی وجہ سے ایسا کہہ رہی ہوں، ظاہر ہے میں تو اس کے ساتھ نہیں جاسکتی اور روما کو بھی اس کے ساتھ نہیں بھیج سکتے...... البتہ اگر تم اس کی چوکیداری کے لیے تیار ہو تو میں تمہارے جانے کا بھی بندوبست کرسکتی ہوں۔'' اپنی بات کہہ کر گل جان نے اس کے چہرے کی طرف بہت غور سے دیکھا تھا...... اصیل خان جس نے غیر ارادی طور پر اپنے چہرے کا رخ موڑ لیا تھا۔ دھیمی آواز میں بولا۔

''میں تو کسی قابل ہی نہیں ہوں گل جان بی بی، میرا نام مت لیا کریں بس آپ سے اتنی درخواست کرتا ہوں کہ رانی جہاں جانا چاہ رہی ہے آپ اسے مت روکیں اور پیسے دے دیں اسے...... وہ اسی کے ہیں۔'' یہ کہہ کر اصیل خان اپنے کوارٹر میں چلا گیا...... گل جان اپنی جگہ لب بستہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

''بیٹا اگر آپ کے گھر والے آپ کو باہر جانے کی اجازت دیتے ہیں تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہے۔'' شاہ صاحب، رابی سے تمام تفصیلات کے بعد بہت سکون سے گویا ہوئے تھے۔

''جی دادا جان...... میرے جانے پر کسی کو اعتراض نہیں ہے۔ لیکن مجھے بس آپ کی تھوڑی سی ہیلپ چاہیے......'' رابی کی بات سن کر شاہ عالم قدرے متفکر سے ہوگئے۔

''کس قسم کی ہیلپ بیٹا؟ میں جس لائق بھی ہوں حاضر ہوں، بولو۔''

''دادا جان وہ آپ میرا ارجنٹ پاسپورٹ بنوادیں اور ویزے کے لیے میری ہیلپ کردیں، میں جلد سے جلد جانا چاہتی ہوں، ہر وقت اپنی شکل چھپا کر رکھنی پڑتی ہے خود کو دیکھنے کو جی نہیں چاہتا لوگوں کو کیسے دکھاؤں۔'' رابی اب خاصے ڈپریسڈ انداز میں گویا ہوئی تھی۔ شاہ صاحب جیسا نرم دل انسان تڑپ کر رہ گیا جیسے رابی کے دکھ کو اپنے دکھ کی طرح محسوس کیا ہو۔

''بیٹا آپ جیسا کہیں گی میں آپ کی ہیلپ کرنے کو تیار ہوں۔ رہی پاسپورٹ کی بات تو چلیں کل ہی میرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے، باقی وہاں پر ایک جو میرے جاننے والے ہیں ان سے بات کرتا ہوں، پاسپورٹ آپ کا ایک ہفتے کے اندر بن جائے گا۔'' یہ سن کر رابی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

''اور دادا جان ویزا کتنے دن میں لگ جائے گا......؟'' ''بیٹا وہ ابھی سے...... کچھ نہیں بتایا جاسکتا...... لیکن بہرحال میں اپنے جاننے والوں سے بات کرتا ہوں اس کے بعد ہی آپ کو بتا سکوں گا۔'' انہوں نے کچھ دیر توقف کیا پھر گویا ہوئے۔ ''لیکن بیٹا میں ایک بات سوچ رہا ہوں آپ کے ٹریٹمنٹ میں کئی مہینے لگ سکتے ہیں آپ اتنے دن تک کیا ہوٹل میں stay کریں گی......؟ بہت بل بن جائے گا...... کیا آپ کا کوئی رشتے دار یا جاننے والا وہاں نہیں رہتا؟'' شاہ عالم کافی سوچ، سوچ کر بول رہے تھے اسی لیے ان کے اندازِ کلام میں روانی نہیں تھی...... رابی کے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''رشتے دار چھوڑیں دادا جان، مجھے تو اس لفظ سے ہی چڑ ہے البتہ سوشل میڈیا پر میں نے اچھی خاصی فرینڈز بنائی ہیں اور دو تین سے تو بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ بھی ہوگئی ہے۔ میں نے انہیں کسی اور انداز میں بتایا تو ہے شاید میں بہت جلد ان سے ملوں...... آپ کی تسلی کے لیے...... میں ان کی آپ سے بات بھی کرا سکتی ہوں...... بہت اچھی فیملی سے belong کرتی ہیں۔'' رابی جلدی سے بولی۔

''بیٹا مجھے آپ کی کسی بات پر شک نہیں، میں ضرور ان لوگوں سے بات کرلوں گا...... لیکن ایک مرتبہ پھر سوچ لیں اگر آپ کی خالہ جانی آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوجائیں تو زیادہ اچھا ہے۔''

''آپ میری فکر نہیں کریں دادا جان، مجھے کسی شخص سے اور کسی بات سے ڈر نہیں لگتا...... آپ دیکھیے گا میں اپنا پورا ٹریٹمنٹ کروا کر جلدی ہی واپس آجاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے بیٹا...... آپ کی بات سمجھ آتی ہے۔''

''دل تو یہاں ہی پڑا ہے جتنی جلدی جانے کی ہے اس سے زیادہ جلدی آنے کی ہوگی...... بس یہ داغ، داغ چہرہ ایک مرتبہ روشن ہوجائے۔ اس کے بعد تو پھر چاروں طرف اجالے ہی اجالے ہیں۔'' وہ سوچ کر دل ہی دل میں بولی۔

☆☆☆

''سر جی...... میں آپ سے ٹھیک کہہ رہا ہوں میرا خیال غلط نہیں ہوسکتا...... وہ لوگ روپوش ہوگئے ہیں۔ رات کو میں بہت دیر سے گیا تھا مگر گیٹ پر اسی طرح تالا پڑا ہوا تھا۔ کوئی نہیں ہے گھر میں۔'' وارث علی از حد...

فکرمندی سے اپنا سر کھجاتے ہوئے بول رہا تھا، سر کھجانے کی اضطراری کیفیت اس کا ذہنی خلفشار ظاہر کررہی تھی۔

''یار...... پریشانی نے تمہاری مت ماردی ہے...... اگر وہ لوگ روپوش ہوگئے ہوتے تو وہ لڑکا میرے پاس کیوں آتا؟'' ایس پی بے پروائی سے کہہ رہا تھا۔

''سر جی لڑکے کو پتا نہیں ہے کہ آپ کی اور میری یاری ہے، وہ تو آپ کو اپنا ہمدرد سمجھ کر آیا تھا۔ اسے کیا پتا میں اور آپ ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہیں۔''

شاید پہلی مرتبہ وارث علی ایس پی پر غالب آیا تھا...... ورنہ عموماً تو یہی ہوتا تھا۔ وہ کوئی بے تکا جملہ بول جاتا تھا اور ایس پی اس کی اصلاح کرتا تھا یا اسے ریلیکس کرتا تھا۔ وارث علی کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے تو ایس پی بھی سوچ میں پڑ گیا پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔

''جب ایک دفعہ میرے پاس آیا تھا تو دوبارہ بھی آئے گا۔ یار اس کا باپ سلاخوں کے پیچھے ہے، وہ روپوش ہوجائے گا تو اس کے باپ کو کون دیکھے گا۔ کچھ بھی سہی آفٹر آل باپ ہے۔''

''لیکن میری اطلاع کے مطابق ابھی تک جابر علی کے پاس گھر سے کوئی ملاقات نہیں آئی ہے۔''

''ڈرے ہوئے ہوں گے بے چارے......'' ایس پی نے وارث علی کی بات کاٹ کر کہا۔

''یار سوچو تو سہی ان پر تو ایسی ناگہانی پڑ گئی ہے ابھی تک ہوش ٹھکانے نہیں آئے ہوں گے...... ہوسکتا ہے لڑکا اپنے باپ سے مل چکا ہو، میں یہاں ہر وقت ڈیوٹی پر نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر کسی سے میری بات ہوتی ہے۔''

''سر میرے اپنے بھی ذرائع ہیں، میری مخبریاں مجھے بتاتی ہیں کہ ابھی تک جابر علی کی کوئی ملاقات نہیں آئی۔''

''واہ بھئی واہ، تم تو مجھ سے بھی بڑے افسر ہو۔''

''سر اس وقت مذاق چھوڑیں...... واقعی میں بہت پریشان ہوں، وہ تالا دیکھ کر تو میرے ذہن نے کام کرنا بند کردیا۔''

''حالانکہ تمہارا ذہن کبھی کبھی کام کرتا ہے، اب تو تم بہت ہی قابلِ رحم ہو۔'' ایس پی، وارث علی کی گھبراہٹ اور پریشانی سے حظ اٹھاتے ہوئے بولا اور پھر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''وارث علی میں اس لڑکے کے باپ کا افسر ہوں، اس کا آنا جانا لگا رہے گا۔ میں باتوں، باتوں میں اگلوا لوں گا...... مگر یار اسے بھروسا تو کرنے دو...... اتنا ٹائم تو لگے گا ناں......''

''سر آپ معاملے کو بہت لائٹ لے رہے ہیں...... سوچیں جابر علی اقبالی مجرم ہے، وہ مجھے پھنسائے بغیر پھانسی پر نہیں چڑھے گا...... جو شخص غصے میں اپنی اولاد کو نہ بخشے وہ بھلا میرے ساتھ کیا رعایت کرے گا......؟ کچھ تو سوچیں سر جی...... رات بھر جاگ کر ترکیبیں سوچتا ہوگا...... مجھے تو جلدی پڑی ہے۔ بھلے آپ کو برا لگتا ہے۔'' وارث علی نے اب تکلفاً بھی کسی مروت کا مظاہرہ نہیں کیا اور یہ سچ ہی تھا کہ اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔

''ہاں، ہاں دیکھو میں اس سے خود رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں، لاتا ہوں اسے باتوں، باتوں میں راہ پر...... دو، چار ملاقاتیں ہوں گی تو کچھ نہ کچھ بول بیٹھے گا۔ ہم بھی پولیس والے ہیں...... حلق میں انگلی ڈال کر کچھ نہ کچھ نکلوا ہی لیتے ہیں۔'' ایس پی نے وارث علی کو بھرپور تسلی دی۔

''سر جی زمین کے مالک کا مرڈر میرے ہاتھوں ہوا تھا۔ یعنی شاہدین زندہ ہیں لیکن روپوش ہیں اور مرنے والے کے وارث ہیں...... مرنے والے کی امانت، میرا مطلب ہے وہ زمین کی اوریجنل فائل جابر علی کے قبضے میں ہے۔''

''یار...... یہ تو میں نے ہی تمہیں بتایا تھا کہ فائل جابر علی کے پاس ہے۔ ایک دن بیٹھا ہوا تھا میرے پاس

میں نے گھیر گھار کر اس کے منہ سے نکلوالیا تھا...... بہت ہمدرد بن رہا تھا ان کا، کہہ رہا تھا وہ بہت مظلوم لوگ ہیں ان کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے، مرنے والے کی صرف بیٹیاں ہی ہیں......کوئی بیٹا نہیں ہے۔“

”چھوڑیں سر جی اس کا کوئی اپنا مطلب ہوگا بظاہر پارسا بنا ہوا ہے......اسے دوسرے کی بیٹیوں سے اتنی ہمدردی...... مگر اپنی بیٹی کو کھڑے، کھڑے قتل کر دیا......سر جی مجھے تو یہ بندہ بھی کسی کا مُہرہ لگ رہا ہے......آپ تھوڑا سا اندر اتریں بہت ساری حقیقتیں پتا چلیں گی۔“

”پولیس والوں کو بتا رہے ہو؟“ ایس پی نے بڑے مغرور انداز میں گردن اکڑا کر وارث علی کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”سر جی جابر علی کی سزائے موت، عمر قید میں بدل سکتی ہے اور پھندا میرے گلے میں آسکتا ہے...... مجھے تو فکر پڑی ہے ناں...... جب تک جابر علی کی دوسری لڑکی میرے قابو میں نہیں آجاتی ...... سمجھو میں تو پھنسا ہوا ہوں۔“ وارث علی اب نئے سرے سے گھبراہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔

”ہم مر گئے ہیں کیا؟“ ایس پی نے برجستہ کہا تھا۔ ”جابر علی کے بیٹے کو اپنے دام میں لائیں گے اور کامیابی حاصل کریں گے......ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی کسی لڑکی کی۔“

”نہیں سر جی وہ مرد ذات ہے، اتنی آسانی سے ہمارے قابو نہیں آئے گا۔ البتہ اس کی بہن ہمارے قابو میں آئے گی تو سب کچھ ہمارے قابو میں آئے گا...... باپ بھی اور بھائی بھی......“ وارث علی کی بات سن کر ایس پی کے چہرے سے لگا کہ وارث علی نے اسے غور و فکر میں مبتلا کر دیا ہے۔

☆☆☆

رابی اپنے رہائشی کمرے سے باہر آئی تو گھر میں چاروں طرف خاموشی اتری ہوئی تھی......اس کا دھیان فوراً برہان کی طرف گیا۔ کائناز نے اس کی کھوج کو سمجھے بغیر باتوں، باتوں میں بتا دیا تھا کہ برہان اپنی ماں اور بہن کے ساتھ انیکسی میں شام کو شفٹ ہو گیا ہے......اس لیے اسے یہ اطمینان تھا کہ فی الحال یہاں گھر میں برہان کی ماں، بہن نہیں ہیں۔ اس لیے وہ بے دھڑک انداز میں لان میں جانے کے لیے آگے بڑھی تھی...... بند کمرے میں دل گھبرانے لگتا تھا تو وہ کھلی ہوا میں آکر تھوڑی دیر ٹہلتی رہتی تھی......ساتھ ہی کچھ سوچتی بھی جاتی تھی اور آج کل تو خیالوں میں کھو کر اسے بہت لطف محسوس ہوتا تھا۔ اسے پورا یقین ہو چلا تھا کہ کچھ دنوں کی بات ہے وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین چہرے کے ساتھ دنیا کے سامنے ہوگی۔ وہ بے پروائی سے گلے میں دوپٹا اٹکا کر سبک خرامی سے لاؤنج پار کر کے کاریڈور سے ہو کر باہر نکل آئی تھی۔

رات کے دس بج چکے تھے......ردما اور کائناز رات کا کھانا کھانے کے بعد سے کمرے میں بند تھیں۔ اس نے خود ہی ان کے پاس جانے سے گریز کیا تھا......ان دونوں کی معصومانہ حیرت آمیز باتیں اسے بہت احمقانہ لگتی تھیں...... دونوں کی کمپنی میں وہ بہت uncomfortable محسوس کرتی تھی۔ اس لیے کہ وہ اپنی عمر سے بہت پیچھے چل رہی تھیں اور رابی اپنی عمر سے بیس سال آگے چل رہی تھی...... وہ اپنی دھن میں آگے بڑھ رہی تھی اسے احساس تک نہیں ہوا کہ کب کھلے گیٹ سے برہان گھر میں داخل ہوا تھا......اور بڑی تیز رفتاری سے چلتے ہوئے بالکل رابی کے مقابل آ گیا تھا۔

غیر متوقع طور پر برہان کو سامنے دیکھ کر رابی تو ایک دم حواس باختہ ہو گئی...... چند لمحے کے لیے تو ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا...... سمجھ ہی نہیں آئی کہ اب فوراً اسے کیا کرنا چاہیے......بس برہان کی طرف خالی، خالی نظروں

سے دیکھنے لگی......اور برہان کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو جسم میں لہو نہیں...... وہ حیران، پریشان رابی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا......ایسا داغ، داغ چہرہ......شاید اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

چہرے پر pimpels کے گہرے گڑھے، چیچک کے داغ، پھوڑے، پھنسیوں کے داغ...... یہ سب کچھ زندگی میں انسان دیکھتا ہی رہتا ہے لیکن ایسا داغ، داغ چہرہ...... اور داغ بھی بڑی عجیب قسم کے جیسے پوری شکل پر کسی نے خوب گاڑ گاڑ کر لمبی لمبی لکیریں کھینچی ہوئی ہوں۔

رابی کے مقابلے میں وہ اتنا حواس باختہ نہیں تھا اس لیے پہلے اس نے خود کو سنبھالا پھر بڑے فارمل اور عجیب سے حجاب آلود انداز میں سلام کیا اور سلام بھی ایسا کہ جیسے کوئی منہ ہی منہ میں منمنا کر رہ گیا ہو۔

”السلام علیکم......!“ بس اس کے ساتھ ہی اس نے ریس لگائی تھی اور پلٹ کر انہیں دیکھا تھا۔ جبکہ رابی چند لمحے اسی زاویے سے کھڑے رہنے کے بعد پیچھے پلٹ کر دیکھنے لگی تھی......لیکن...... برہان اتنی سرعت سے غائب ہوا تھا کہ اس کے قدموں کی آہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ رابی نے اپنے چہرے پر بے اختیار ہاتھ رکھ لیا......اب وہ گم صم نظر آرہی تھی۔

☆☆☆

حواس ٹھکانے آتے ہی رابی تو یوں بھاگی جیسے کسی نے اسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو اور اس کا پیچھا کیا جا رہا ہو......اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے سانس لی تھی......اور دھپ سے بیڈ پر تقریباً گر کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تھا۔

”یہ کیا ہو گیا...... یہ اس وقت کہاں سے آ گیا سامنے......اس نے میرا چہرہ کیوں دیکھ لیا......؟ میں تو یہ چہرہ، یہ شکل کسی کو دکھانے کے قابل ہی نہیں ہوں......کوئی اور دیکھ لیتا تو شاید کچھ بھی نہ ہوتا......اس نے کیوں میرا یہ داغ، داغ چہرہ دیکھ لیا......؟ جو بھی میرا یہ داغ، داغ چہرہ دیکھے گا......وہ میرے دل کے داغ دیکھنے سے پہلے ہی بھاگ جائے گا۔“

بے ترتیب منتشر خیالات اس وقت رابی کا حصار کیے ہوئے تھے، عجیب سا ملال اور ایک بوجھ اس کے دل پر آن گرا تھا۔ سوچ اِدھر اُدھر سے گھوم کر اسی نقطے پر آ ٹھہری تھی۔ ”اس نے میرا یہ چہرہ کیوں دیکھ لیا؟ اس چہرے کے ساتھ تو بہت سے سوال ہی ہیں......کل کو سامنے بیٹھ کر بے حساب سوال کر ڈالے تو میں کیا جواب دوں گی۔ کیا اسے وہ سب کچھ بتا سکوں گی جو میرے ساتھ ہو چکا۔ لیکن پہلے خود کو تو یقین دلاؤں کہ کیا میں اتنی خوش قسمت ہوں کہ زندگی میں کبھی برہان کے آمنے سامنے بیٹھوں گی۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھے گا اور...... میں اسے جواب بھی دوں گی......شاید میں بہت......خوب صورت خواب دیکھ رہی ہوں، میری زندگی میں سوائے خوابوں کے اور ہے ہی کیا......“ یہاں تک سوچ کر وہ نڈھال سی ہو گئی ایک عجیب سی بے قراری دل کو لاحق تھی...... برہان نے اسے کیوں دیکھ لیا؟

☆☆☆

شبینہ نے صابرہ کو نیند کی گولی کھلا کر سلا دیا تھا۔ انیکسی کے کمرے میں اس وقت دونوں ماں بیٹی رہائش پذیر تھیں۔ اس کمرے میں اس وقت بہت ہلکی سی روشنی تھی......گمان ہوتا تھا کہ وہ دونوں سو رہی ہیں جبکہ برہان نے احتیاطاً اس کمرے میں جھانکنے کی کوشش نہ کی کہ کہیں شبینہ نہ جاگتی ہو اور اسے دیکھ کر باہر چلی آئے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے......

اس وقت وہ کسی حیرت کدے میں تھا۔ بار، بار دکھائی دینے اور کچھ دیر قبل دکھائی دینے والی لڑکی اس کے ذہن پر ہلکی، ہلکی ضربیں لگا رہی تھی ”یہ لڑکی کون تھی......؟“ ایک سوال...... اس وقت سارے بکھرے، ہوئے خیالات کا محور و مرکز تھا۔ ”اس بے چاری کے چہرے پر عجیب و غریب داغ ہیں...... اور یہ شاہ صاحب کے گھر میں ہے...... ضرور شاہ صاحب سے اس کا کوئی نہ کوئی تو تعلق ہوگا۔“

کائناز نے اپنی بے تکان، بے موقع گفتگو کے دوران بھی کچھ ایسا ظاہر نہیں کیا کہ اس کے اور شاہ صاحب کے علاوہ یہاں کوئی رہتا ہے...... ”کون ہے یہ لڑکی؟ شاہ صاحب کی کیا لگتی ہے......؟ کائناز نے کبھی ذکر تو نہیں کیا...... نوکرانی تو نہیں لگتی...... لباس تو اس کا بہت قیمتی اور شاندار تھا......“ برہان کے لیے وہ صرف ایک عام لڑکی نہیں تھی! بلکہ وہ لڑکی تھی جو ایسا چہرہ لیے اس کے سامنے آئی تھی...... یہ چہرہ اس چہرے کے مقابلے میں زیادہ توجہ کھینچ رہا تھا جو...... حسن و جمال کا شاہکار بن کر اس دنیا میں display ہوتا ہے۔ ”بڑے عجیب و غریب قسم کے داغ ہیں اس لڑکی کے چہرے پر...... یوں جیسے کسی بچے نے سیاہی میں برش ڈبو کر کوئی خوب صورت سی تصویر بگاڑ کر رکھ دی ہو......“ برہان کو ابھی بہت کام تھے...... وہ ان حالات سے پیچھا بھی چھڑانا چاہتا تھا...... مگر ایسا نہ جانے کیا تھا کہ وہ چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔

”کون ہے یہ لڑکی......؟ جو رات کے اندھیرے میں دکھائی دی...... دن میں تو کبھی دکھائی نہیں دی۔“

☆☆☆

”جوانی ایسی ہی ہونی چاہیے...... پارسا، باہمت، بلند حوصلہ......“

شاہ صاحب برہان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف بہت محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے...... دونوں ایک ساتھ ہی فجر کی نماز پڑھنے گئے تھے اور ساتھ ہی واپس آئے تھے۔

شاہ صاحب مسجد سے واپس آکر اپنے گھر کے بڑے سے لان میں آدھے گھنٹے تک چہل قدمی کیا کرتے تھے...... آج برہان بھی ان کے ساتھ صبح کے خوب صورت نظاروں کا لطف لے رہا تھا...... بڑا سا لان جس میں دنیا جہان کے خوب صورت پھول مسکرا رہے تھے۔ کچھ پھول جنہوں نے کچھ عرصہ پہلے آنکھیں کھولی تھیں اور کچھ پھول جنہوں نے آج پہلی بار دنیا میں آنکھ کھولی تھی...... برہان کو اس وقت شاہ صاحب کے ساتھ لان میں چہل قدمی کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

شاہ صاحب ٹہلتے، ٹہلتے برہان کی طرف یوں دیکھتے جیسے کوئی اپنی قیمتی اثاثے سے لطف اندوز ہو رہا ہو...... یہ نوجوان جو پہلی ہی نظر میں اور پہلے ہی دن ان کے دل میں گھر چکا تھا...... وہ اسے ٹوٹ کر بکھرتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

”شاہ صاحب ذمّے داری کا احساس خود ایک طاقت ہے، بہت بڑی قوت ہے، میں تو آپ سے بس یہی درخواست کروں گا کہ آپ اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھیے اور دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ان مشکلوں میں میرے لیے آسانیاں پیدا کردے......“

”آمین۔“ شاہ عالم نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر برہان کی دعا پر مہر لگائی تھی۔

”تم جیسے نوجوانوں کی ملک کو ان کے گھر کو...... بلکہ سب کو ضرورت ہے ہم جیسے بوڑھے لوگوں کو تو...... تم جیسے نوجوانوں کو دیکھ کر توانائی ملتی ہے۔“ شاہ صاحب نے اب برہان کی پشت پر دھیرے سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

”بہت شکریہ شاہ صاحب......! آپ جیسے لوگوں سے شاید دنیا کا بھرم باقی ہے اور آپ کو دیکھ کر خیال آتا ہے...... بزرگی ایسی ہی ہونی چاہیے۔“ برہان نے بھی سر جھکا کر شاہ صاحب کے لیے تعریفی کلمات کہے۔

”بیٹا بات صرف اتنی ہے کہ بے شمار من مانیاں کرلینے کے بعد بہت سارے کھٹے میٹھے تجربوں سے گزرنے کے بعد سوچ ایک جگہ آکر رک جاتی ہے اور پھر یہی خیال آتا ہے کہ اب تک جو ہم کرتے رہے اصل میں ہم وہ کرنے دنیا میں نہیں آئے تھے۔ دنیا میں آنے کا مقصد تو کچھ اور ہے جو ہم جیسے جاہلوں کو بہت سا وقت گنوانے کے بعد پتا چلتا ہے۔“ شاہ صاحب کا انداز ایک خود کلامی کا سا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے ان کے سامنے کوئی اسکرین ہو اور وہ اس اسکرین پر نظر جما کر برہان سے ہم کلام ہوں۔ برہان الجھی، الجھی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا...... شاہ صاحب کی بات ادھوری تھی اور برہان کو دلچسپی تھی کہ جب ان کی بات مکمل ہوگی تو ان کے خزانے کا موتی اس طرح اس کی جھولی میں آگرے گا...... وہ کیا کہنا چاہتے ہیں یہ تجسس تو شاہ صاحب نے اس کے دل میں بیدار کردیا تھا...... وہ بغیر کچھ بولے ان کی بات مکمل ہونے کا مشتاق تھا۔

”زندگی کا مقصد یہ ہے بیٹا کہ ہمارے ہوتے ہوئے دور، دور تک جہاں، جہاں انسان نظر آتا ہے، ان میں سے کسی بھی انسان کو اپنے اکیلے ہونے کا احساس نہ ہو...... اللہ نے انسانوں کو ایک دوسرے کے لیے پیدا کیا ہے اور ہم ہوش سنبھالتے ہی اپنا بنیادی مقصد بھول جاتے ہیں...... کوئی ہمیں حقیر لگتا ہے، کوئی ہمیں اجنبی لگتا ہے، کوئی ہمیں ہمارے اسٹیٹس سے بہت کم دکھائی دیتا ہے تو کوئی اپنے اسٹیٹس سے بہت اونچا کوئی خود غرض دکھائی دیتا ہے تو کوئی بدصورت...... کسی کا لہجہ اچھا نہیں ہوتا، کسی کی باتیں احمقانہ ہیں...... یہ ہمارا کچھ نہیں لگتا...... وہ بہت خود غرض ہے، یہی کچھ کھچڑی پکاتے رہتے ہیں ہم لوگ اس دنیا میں۔“ شاہ صاحب نے توقف کیا اور برہان کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

”آپ نے بہت خوب صورت بات کی شاہ صاحب، بہت نیچرل بہت حقیقی...... میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ اس وقت آپ کے ساتھ ہوں اور آپ کی وہ باتیں سن رہا ہوں جو آپ کے زندگی بھر کے تجربے کا حاصل ہیں۔“ برہان نے اس طرح کہا جیسے شاہ صاحب نے اسے کھڑے، کھڑے خرید لیا ہو۔

”خطاب، عہدہ...... high social status یہ سب دل کے دھوکے ہیں، وقتی ہیں، کسی بھی وقت ہاتھ سے چلے جاتے ہیں...... اور جب یہ آکر چلے جاتے ہیں تو صرف انسان باقی رہ جاتا ہے، وہ انسان جو ان تمام چیزوں کے اس کی زندگی میں آنے سے پہلے تھا۔ یہ آنی جانی چیزیں آتی جاتی رہتی ہیں...... اور جتنی دیر یہ چیزیں انسان کے ساتھ رہتی ہیں، انسان سمجھتا ہے کہ وہ پاور میں ہے، جب یہ چیزیں اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتیں تو وہ خود کو بہت کمزور سمجھتا ہے...... اور مختلف قسم کے خوف میں مبتلا ہوجاتا ہے، ان آنے جانے والی چیزوں کا سہارا لے کر وہ کیا کچھ نہیں کرتا...... سب کچھ بھول جاتا ہے، یہ بھی کہ وہ انسان ہے اور بحیثیت انسان اسے بہت سی ذمے داریاں نبھانا ہے...... پہلی ذمّے داری تو یہ ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے کوئی تکلیف میں اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہ کرے......“

”بہت بڑی بات ہے شاہ صاحب...... بہت بڑی بات۔“ برہان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا...... اس نے شاہ صاحب کی بات مکمل ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا تھا...... وہ حیرت اور خوشی کی کیفیت میں شاہ صاحب کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا ہو۔

سنتے تو تھے دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں مگر وہ بھی زندگی میں کسی ایسے انسان سے ملے گا جو ساری نعمتوں

کے ہوتے ہوئے صرف اور صرف انسان دکھائی دے گا...... دونوں کے درمیان چند لمحے کی خاموشی حائل ہوئی تو...... برہان کی سوچ پھر رات کے واقعے کی طرف پلٹ گئی۔

''وہ شاہ صاحب...... وہ کائناز کا کوئی اور بہن، بھائی تو نہیں ہے ناں...... میرا مطلب ہے کہ میں نے کائناز کے بہن، بھائی کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔''

شاہ عالم، برہان کی طرف دیکھنے لگے۔

''بھئی کوئی بہن یا بھائی ہوتا تو آپ ضرور سنتے ناں......'' انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بڑی اداسی سے مسکرائے۔ ''بیٹا یہ معصوم بچی تو بس ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ماں، باپ کی نعمت سے محروم ہوگئی...... وہ ایک حادثہ میری زندگی میں آکر ٹھہر گیا پھر میں نے کچھ نہیں سوچا۔ بہت دنوں تک غم نہیں منایا...... اللہ کی رضا کے سامنے سر جھکا دیا۔ اللہ نے مجھے بیٹا دیا تھا بلکہ دو بیٹے دیے تھے اور دونوں میرے پاس اللہ کی امانت تھے...... اس نے واپس لے لیے...... کوئی گلہ شکوہ نہیں......'' شاہ صاحب بڑے پُروقار انداز میں اپنے درد کی ٹیسیں دبا کر پُرسکون لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''اچھا......! کائناز اکلوتی ہے کوئی اور بہن، بھائی نہیں ہے۔'' برہان نے اپنی تسلی کے لیے اپنی ہی کہی ہوئی بات دُہرائی۔

''ہاں، ہاں بیٹا، وہ تو بہت چھوٹی تھی...... میرا بڑا بیٹا پہلے فوت ہوگیا تھا...... بس اچانک بیٹھے، بیٹھے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ دیکھنے میں تو بالکل صحت مند تھا اور کائناز کے ماں، باپ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہمیں الوداع کہہ کر چلے گئے وہیں جہاں ایک روز میں نے بھی چلے جانا ہے۔'' یہ جملہ بولتے، بولتے شاہ صاحب کو بڑی شدت سے کائناز کی تنہائی کا احساس ہوا۔ محبت نے ایک موہوم سے اندیشے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی شاہ عالم کی نظر برہان کے چہرے پر چند لمحے کے لیے رک گئی۔

خیالات کا ایک سمندر بہتا رہتا ہے اور یہ خیالات کا سمندر اس کائنات کے سب انسانوں کے لیے ہے، اپنی، اپنی بساط کے مطابق ہر انسان اس سمندر سے کچھ نہ کچھ نکالتا رہتا ہے...... لاتعداد ہی بکھرے ہوئے خیال چند انسانوں کے لیے نہیں ہوتے...... اس کائنات میں سانس لینے والی ذی روح کا حصہ ان میں معلوم اور ثابت ہے اسی سمندر سے ایک خیال نے یوں سر اٹھایا جیسے چاند کی چودہ کو جوار بھاٹا چاند کو چھونے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی انتہائی اونچائی تک جاتا ہے۔

''آپ کچھ سوچ رہے ہیں شاہ صاحب؟'' برہان ان کی گہری خاموشی سے قدرے پریشان ہوکر بولا۔

''نہیں، نہیں بیٹا......! کچھ نہیں سوچ رہا...... اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو، ہم سب اسی کی ذمے داری ہیں، خواہ مخواہ کے اندیشے تو شیطان کا حربہ ہیں...... میرا آپ کا ہم سب کا ذمہ تو اللہ پر ہے، پتا نہیں ہم انسانوں کو ہر بات پر...... پریشان ہونے کی کیا بیماری ہے۔'' شاہ صاحب پھر اسی خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئے...... بڑی بے ربط سی بات تھی جس کا سرا نظر نہیں آرہا تھا...... برہان مارے ادب و لحاظ کے کچھ پوچھنے کے بجائے خاموش سا ہوکر رہ گیا۔

☆☆☆

شبینہ، صابرہ کو نماز پڑھتا دیکھ کر کچن میں چائے بنانے کے لیے چلی گئی۔ شاہ صاحب نے انیکسی میں وہ تمام ضروری سامان جو روزمرہ کی ضرورت ہوتا ہے...... رکھوا دیا تھا...... اور وہ بھی صابرہ ہی کے کہنے سے......

وہ تو صابرہ کو اپنا مہمان بنانے کے لیے پوری طرح تیار تھے...... لیکن صابرہ ہی نے ان سے کہا تھا۔

''پتا نہیں یہاں کتنے دن رکنا پڑے گا اچھا نہیں لگتا...... اور پھر جب آپ نے جگہ دے دی ہے تو اب ہم اپنا کھانا پینا خود ہی دیکھ لیں گے۔''

شبینہ چائے تیار کر کے باہر آئی اس نے ماں کی طرف دیکھا...... صابرہ نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے ہوئے تھے اس کی آنکھوں سے تواتر کے ساتھ آنسو بہہ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ اپنی ہچکیاں بہ مشکل روکے ہوئے ہے، شبینہ کے دل پر ایک چوٹ سی پڑی...... وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اس وقت اللہ کے سامنے سر جھکائے ماں کیوں رو رہی ہے...... وہ چپ چاپ قریب پڑی ایک فولڈنگ چیئر پر بیٹھ گئی اور ماں کی دعا مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

صابرہ اپنے دکھ میں اتنا ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ شبینہ کچن سے آچکی ہے اور کرسی پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھ رہی ہے، دعا بہت طویل ہوگئی تھی...... ہونٹ خاموش تھے مگر شاید ہونٹوں کا کام دل کر رہا تھا۔ بالآخر اس کی دعا تمام ہوئی...... دوپٹے سے اس نے اپنے بہتے ہوئے آنسو صاف کیے اور تسبیح چوم کر جانماز اٹھاتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ جانماز تہ کرنے کے دوران اس کی نظر شبینہ پر پڑی تھی۔ وہ ایک دم نظریں چرانے لگی...... اس خیال سے کہ بیٹی نے اسے آنسو بہاتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ اب وہ ضرور پوچھے گی...... ''امی! آپ اتنا کیوں رو رہی تھیں؟'' مگر شبینہ نے کوئی سوال نہیں کیا بس چپ چاپ چائے کا کپ ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''امی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' صابرہ نے جانماز ایک طرف رکھ کر اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا اور اس کے قریب ہی رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''برہان نماز پڑھ کر ابھی تک نہیں آیا؟''

''آگئے ہیں امی......''

''تو کیا اندر کمرے میں ہے؟''

''نہیں، وہ شاہ صاحب کے ساتھ باہر لان میں ہیں۔ ابھی میں نے کچن کی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو دونوں باتیں کر رہے تھے۔''

''ہوں......'' صابرہ نے ہلکے سے ہنکارا بھرا...... اور چائے کے چھوٹے، چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔

''آنکھ کھلتے ہی تمہارے باپ کا خیال آتا ہے...... اسی شہر میں ہیں اور زندہ بھی ہیں پھر بھی ہمارے درمیان صدیوں کے فاصلے آگئے ہیں...... برہان سے کوئی بات کرتی ہوں تو دل ڈرتا ہے، جانے کیا جواب دے...... کہیں گناہ گار نہ ہو جائے اس لیے اب اس سے کوئی بات نہیں کر پاتی۔''

''اچھا کرتی ہیں امی...... اگر بھائی سے بات بھی کریں تو کیا فائدہ...... بھائی نے تو پہلے ہی کہہ دیا ہے ناں کہ اب کوئی ابا جان سے ملنے نہیں جائے گا۔''

''ایک حساب سے وہ ٹھیک سوچ رہا ہے لیکن پھر میں یہ سوچتی ہوں کہ وہ تو اپنے انجام سے گزر رہے ہیں اگر انہوں نے کچھ کیا ہے تو بھگت بھی رہے ہیں...... ہمارا جو فرض ہے وہ تو پورا کرنا چاہیے...... برسوں کی رفاقت کانچ کے باریک ریزوں کی طرح کھال سے چپکی ہوئی تھی۔ قدرتی سی بات تھی دل ہر وقت اسی طرف لگا رہتا ہے۔''

بیٹی کا دکھ تو چٹان پر پڑے نشان جیسا تھا اور زندگی کی آخری سانس تک اس نشان کے مٹنے کا کوئی امکان

نہیں تھا مگر وہ جو زندہ تھا کبھی اس کا سب کچھ تھا...... یہ تو پھر اپنے بچوں کے ساتھ ہے جو اس کی...... ڈھارس بندھاتے ہیں، حوصلہ دیتے ہیں، تنہائی کا احساس مٹاتے ہیں لیکن جابر علی وہ تو پلک جھپکتے میں بالکل تنہا ہو کر رہ گیا...... یہاں تک سوچ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی اور چائے کا گھونٹ لینے لگی تھی۔

شبینہ ماں کو گہری سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر چپ چاپ اپنی جگہ سے اٹھی اور باہر گیلری کی طرف چلی گئی...... اندھیروں کا سفر لاحق تھا...... مقصد اور منزل کچھ بھی واضح نہیں تھا۔

☆☆☆

جابر علی دو تین قیدیوں کے ساتھ جو اس کے ساتھ لاک اپ میں تھے ناشتا کر رہا تھا۔ کئی دن سے وہ اس لاک اپ میں اکیلا تھا لیکن یہ تین قیدی کل شام ہی یہاں آئے تھے۔ تینوں مختلف الزامات کی وجہ سے اندر ہوئے تھے۔ دو تو بالکل نوجوان لڑکے تھے جبکہ ایک ادھیڑ عمر مرد تھا جس نے اپنا تعارف ایک دکاندار کی حیثیت سے کرایا تھا۔ اس پر الزام تھا کہ ادھار سودا لینے آنے والی عورت پر دست درازی کی تھی اور اس عورت نے اس کے خلاف پرچہ کٹوا دیا تھا...... اس کا نام صدیق تھا۔

جابر علی نے اپنی طرف سے ان تینوں سے ابھی تک بات نہیں کی تھی لیکن صدیق جو خاصا حواس باختہ تھا اس پر الزام بھی جھوٹا تھا۔ بہت زیادہ خوفزدہ اور پریشان دکھائی دیتا تھا۔ بقول اس کے عزت دار آدمی ہے الزام بھی عورت نے لگایا ہے، ساری زندگی جو محنت کی تھی ایک منٹ میں ضائع ہو گئی تھی۔ ضمانت پر باہر چلا بھی گیا تو لوگ شکل پر تھوکیں گے۔ کس کس کو یقین دلاؤں گا۔

جابر علی نے اس کی بات سن کر ایسا تاثر دیا تھا جیسے اس نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دی ہو...... وہ پولیس افسر رہا تھا اس طرح کی باتیں تو معمول کا حصہ تھیں...... یہ کوئی خاص خبر نہیں تھی اس کے لیے۔

''آپ کے بال بچے تو ہوں گے جابر علی صاحب؟'' جابر علی نے اسے پہلی فرصت میں بتا دیا تھا کہ وہ پولیس افسر ہے پر یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیوں اندر ہے...... صدیق نے پوچھا تھا لیکن...... جابر علی نے یہ کہہ کر خاموش کرا دیا تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے۔ صرف یہ سن کر کہ جابر علی پولیس افسر ہے وہ تو ویسے ہی رعب میں آ گیا تھا۔ اس لیے آپ جناب سے ہی بات کرتا تھا۔

''سب مر گئے۔'' جابر علی نے ٹھیکرا سا جواب دیا۔

''سب مر گئے......؟'' صدیق بہت افسردہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''اچھا معاف کیجیے گا بس میں نے ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔'' صدیق یہ کہہ کر جوشاندے کے ذائقے والی چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔

''آپ اتنے نیک آدمی ہو...... میں کل سے یہاں آیا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ آپ ایک نماز بھی قضا نہیں کرتے، اتنا نیک اور پرہیزگار بندہ یقیناً اس پر کوئی جھوٹا الزام لگا ہے میری طرح۔ مجھے بہت ہمدردی ہو رہی ہے آپ سے۔'' صدیق نے کوئی بات تو کرنا تھی۔ سو یوں ہی بولنے لگا۔

جابر علی جو اپنا ناشتا ختم کر چکا تھا اس نے بڑے کڑے تیور کے ساتھ صدیق کی طرف دیکھا اور اپنے وہی پولیس افسر والے انداز میں گویا ہوا۔

''میں نے کسی سے اپنے نماز، روزے کا ایوارڈ نہیں لینا، یہ میرا فرض ہے اور تم نماز نہیں پڑھتے؟ جبکہ تمہاری تو اچھی خاصی عمر ہو گئی ہے...... اب بھی تمہیں اللہ کا خیال نہیں آیا...... نماز پڑھا کرو...... ورنہ بخشش نہیں

ہوگی۔'' وہ لتاڑنے والے انداز میں صدیق پر چڑھ دوڑا۔ وہ دونوں لڑکے جو خاصے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ناشتا کر رہے تھے، یک دم گھبرا سے گئے کیونکہ انہیں اندازہ ہو گیا کہ اس بندے کے ساتھ اگر لاک اپ میں رہنا ہے تو انہیں بھی نماز پڑھنا ہوگی...... ورنہ یہ کسی بھی وقت ان کے ساتھ تبلیغ کا عمل شروع کر دے گا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کیے اور انجان سے بن کر ناشتا کرنے لگے۔

''جی، جی میں نماز پڑھتا ہوں...... بس یہاں پر شک ہی ہے، پتا نہیں جگہ پاک صاف ہے کہ نہیں ہے۔''

''دماغ تو صحیح ہے تمہارا...... اللہ نے ساری زمین کو جا نماز بنا دیا ہے، جہاں پر ہو وہیں پر بیٹھ کر اللہ کو سجدہ کر سکتے ہو، وضو کے لیے پانی نہیں ہے تو تیمم کر لو...... لوگوں نے بس نماز نہ پڑھنے کے بہانے بنا لیے ہیں۔''

تینوں کے تینوں ایک دم جابر علی کے رعب میں آ گئے اتنا نمازی، اتنا پکا مسلمان انہیں کیا پتا تھا کہ گھر میں ماں، باپ کی ڈانٹ پھٹکار سنتے، سنتے ایک دن لاک اپ میں پہنچیں گے تو وہاں پر بھی یہی باتیں سننے کو ملیں گی۔ وہ دونوں لڑکے تو بری طرح ڈر گئے تھے جبکہ صدیق سر جھکائے شرمندہ، شرمندہ سا بیٹھا تھا۔

جابر علی نے ایک حقارت بھری نظر ان کے اوپر ڈالی اور سوچنے لگا۔ توبہ، توبہ یہ نام کے مسلمان...... اب لاک اپ میں مجھے بھی ان ظالموں کے ساتھ وقت گزارنا پڑے گا۔''

☆☆☆

''سر جی میں آپ کو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں، صبح سے لے کر رات تک میں تین دفعہ گیا اور تینوں دفعہ تالا دیکھا لگا ہوا...... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں وہ لوگ فرار ہو گئے ہیں۔'' وارث علی سر کھجاتے ہوئے فون پر یہ بات کر رہا تھا۔

''یار تم نے بھی تو حد کر دی ناں...... ایسی کیا آفت آئی تھی...... دو چار دن تو صبر سے بیٹھ جاتے...... ظاہر سی بات ہے جب تم اتنی بڑی، بڑی باتیں کرنے لگے تو انہوں نے بھی تو کچھ کرنا تھا، ابھی سے بڑی، بڑی دھمکیاں دینے کی ضرورت کیا تھی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا ہماری چھوٹی سی بات سے کام بن جاتا۔'' ایس پی بھی یہ جاننے کے بعد کہ گھر میں مستقل تالا لگ گیا ہے پریشان ہو گیا تھا اور چڑ کر وارث علی سے بات کر رہا تھا۔

''سر جی، آپ پولیس والے ہیں، وہ کل کا لڑکا زیادہ دن آپ سے چھپ کر کہیں نہیں بیٹھ سکتا۔ ڈھونڈیں اسے...... اس کے ذریعے ہی تو ہم نے سارا پریشر ڈالنا ہے...... آپ سمجھ رہے ہیں ناں...... چلیں ایک منٹ کے لیے یہ بھول جائیں کہ میرا فائدہ ہے، یہی سوچ لیں کہ صرف آپ کا فائدہ ہے۔'' وارث علی انتہائی پریشانی کی کیفیت سے دوچار تھا۔ اس وقت وہ اپنے اور ایس پی کے تعلقات کو بھی خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ جو دل چاہ رہا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

''تمہارا کیا مطلب ہے تم مجھے لالچ دے رہے ہو، یہ صرف کہنے کی بات ہے، تمہارا اپنا لالچ بھی میرے ہی برابر ہے، اس لیے ہم دونوں کی پریشانی مشترک ہے۔''

''سر جی...... آپ میری بات کا برا مان گئے میں تو آپ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اس وقت بہت برا وقت ہے، ہمیں اس برے وقت سے جلد از جلد جان چھڑانی ہے مجھے تو تب تک نیند نہیں آئے گی جب تک فائل اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر نہیں سوؤں گا۔'' وارث علی نے پھر اس جارحانہ انداز میں ایس پی سے بات کی تھی، ایک طرح سے وہ الٹ پڑا تھا۔

''میں سوچتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے! یہ تو مجھے بھی پتا ہے فائل جابر علی کے بیٹے کے through ہی ملے گی، وہ خود تو ہمیں دینے سے رہا...... جس نے فائل کی خاطر اپنی بیٹی کی جان لے لی...... وہ...... ہماری دھمکیوں سے

مرعوب ہوگا بھلا......؟ ہم جتنا اسے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کریں گے، وہ کیس کو اتنا ہی بگاڑ دے گا......ذرا دماغ کو ٹھنڈا رکھو، کہیں ایسا نہ ہو برے پھنس جائیں......'' ایس پی، وارث علی کو حفظِ ماتقدم کے مشوروں سے نوازنے لگا۔

''ٹھیک ہے سر جی...... میں گھر پر ہی ہوں اور کوشش کر رہا ہوں کہ دماغ کو ٹھنڈا رکھوں......لیکن آپ آج کی تاریخ میں اسے ڈھونڈیں......اپنی ماں بہن کو لے کر کس کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا ہے......خدا حافظ......''

☆☆☆

''دادا جان، آپا پولیس جا رہی ہیں، میں بھی گھر چلی جاتی ہوں، جب دل چاہے گا کائناز کے پاس آجایا کروں گی۔'' روما، شاہ عالم کو لاؤنج میں دیکھ کر ان کے پاس چلی آئی تھی اور ایک طرح سے اپنا اسٹریس شفٹ کر رہی تھی......شاہ عالم نے چونک کر روما کی شکل دیکھی۔

''بیٹا خدانخواستہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟ کوئی شکایت تو نہیں ہے؟''

''نہیں، نہیں دادا جان، مجھے تو یہاں بہت آرام ہے، ہر وقت کائناز کے ساتھ ہوں، مجھے بھلا کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ مجھے اب اپنے گھر چلے جانا چاہیے۔ اچھا نہیں لگتا ناں...... کہ برابر میں گھر ہے اور ہم یہاں پڑے رہیں۔'' روما ہچکچاتے ہوئے کہہ رہی تھی......شاہ عالم بے اختیار مسکرا دیے اور روما کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''بیٹا یہ گھر بھی آپ کا ہے وہ گھر بھی آپ کا ہے......آپ کیوں اس طرح سوچتی ہیں...... کائناز آپ کی وجہ سے خوش نظر آتی ہے میرے لیے یہی بہت بڑی بات ہے......لیکن آپ کا خود دل چاہ رہا ہے اپنے گھر جانے کے لیے تو میں زبردستی نہیں کروں گا میں تو گل جان بی بی کی وجہ سے آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ فی الحال آپ کو گھر بلانا نہیں چاہتیں۔''

''پتا نہیں خالہ جانی کیا، سوچ رہی ہیں...... عجیب سوچ ہے ان کی، کہتی ہیں اماں جان اب بہت سکون سے ہیں...... سب کچھ بھول گئی ہیں، یہ ان کے لیے بہت اچھا ہے، وغیرہ...... وغیرہ......'' روما قدرے جھنجلائے ہوئے انداز میں بولی تھی......شاہ عالم، روما کی بات سن کر ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے...... پھر اس کی طرف دیکھ کر گویا ہوئے۔

''ڈاکٹر صاحبہ......اولاد کو بھول کر پُرسکون ہیں...... مگر اولاد تو اپنی ماں کو نہیں بھول سکتی بیٹا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں دادا جان...... میں......اپنی ماں کی خدمت کرنا چاہتی ہوں...... دیکھیں ناں ماں کیسی بھی ہو ماں ہوتی ہے۔ رات کو جب کائناز سو جاتی ہے ناں دادا جان تو میں اماں جان کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں، مجھے اب ان پر بہت ترس آتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ ٹھیک ہو جائیں...... چاہے پہلے کی طرح غصہ کریں......'' شاہ عالم نے روما کی بات سن کر بہت سراہنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔

''شاباش بیٹا اولاد کو ایسا ہی ہونا چاہیے، چاہے سختی کریں، چاہے نرمی، ماں، باپ سے زیادہ اولاد کو کوئی نہیں چاہ سکتا۔ میں آپ سے کتنی ہی محبت کرلوں لیکن محبت میں آپ کی ماں کا مقابلہ نہیں کرسکتا...... آپ پریشان نہ ہوں بیٹا اگر آپ سمجھتی ہیں کہ آپ اپنے گھر رہ کر خود بھی پُرسکون رہ کر اپنی اسٹڈیز کرسکتی ہیں تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہے اور گھر کون سا دور ہے۔''

''جی دادا جان وہی تو میں کہہ رہی ہوں...... بس اب خالہ جانی کچھ بھی کہیں، میں گھر چلی جاؤں گی اور جب دل چاہے گا آجاؤں گی...... اماں جان کو تو اپنا ہوش نہیں ہے اب تو وہ مجھے روکیں گی بھی نہیں۔'' روما، ماں

کی کیفیت کو بڑی ہمدردی اور دلسوزی سے محسوس کرتے ہوئے بڑی اداسی سے کہہ رہی تھی۔

''بیٹا آپ پر کوئی زور زبردستی نہیں ہے میں تو بس آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔'' شاہ صاحب نے پُرشفقت انداز میں روما کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں بیٹا میں گل جان بی بی سے کہوں گا کہ وہ ڈاکٹر صاحبہ کے علاج میں دیر نہیں کریں۔''

''جی دادا جان آپ خالہ جانی کو سمجھائیں ورنہ پھر میں خود آپ کے ساتھ اماں جان کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے ان کی ایک نہیں سنوں گی......دادا جان مجھے اپنی ماں کو ایب نارمل دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے روما کی آنکھوں سے ٹپ، ٹپ آنسو گرنے لگے......شاہ صاحب نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

''ارے بیٹا...... روتے نہیں، رونے کا مطلب ہوتا ہے کہ انسان مایوس ہے...... اور مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ جسے اللہ پر یقین ہے اسے ہمیشہ امید کا سہارا لے کر آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔''

روما، شاہ صاحب کی یہ بات سن کر جلدی، جلدی اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

☆☆☆

''آنٹی آپ سر سے کہیں کہ وہ ہمیں پڑھانا شروع کریں۔'' کائناز بڑی عجیب سی کیفیت میں صابرہ سے بات کر رہی تھی۔ صابرہ نماز پڑھنے کے بعد مسلسل تسبیح پڑھ رہی تھی کہ کائناز بڑی عجلت کے انداز میں چلی آئی......صابرہ نے اسے دیکھ کر تسبیح چوم کر رکھ دی تھی۔ وہ سلام کر کے صابرہ کے پہلو میں یوں بیٹھ گئی جیسے برسوں پرانی شناسائی ہو اور درمیان میں تکلف کا ہلکا سا پردہ بھی نہ ہو۔ اس کا موڈ خراب تھا، شاید اس وجہ سے کہ روما نے اپنے گھر جانے کی بات کی تھی اور ساتھ ہی کائناز کو کہا تھا...... کہ وہ اب آگے نہیں پڑھنا چاہتی...... اس کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا...... اور یہ سننے کے بعد کائناز کے تو گویا اوسان جاتے رہے تھے...... پریشان ہوگئی تھی اور اسی وجہ سے ہر مصلحت بالائے طاق رکھ کر صابرہ کے پاس آتے ہی شروع ہوگئی تھی۔

''بیٹا لگتا ہے آپ بہت پریشان ہیں۔'' صابرہ نے چہرہ موڑ کر پہلو میں بیٹھی ہوئی کائناز کو دیکھا اور بہت محبت آمیز لہجے میں گویا ہوئی۔

''جی آنٹی پریشان تو میں ہوں...... دیکھیں اب ایک ہی میری دوست ہے اور وہ بھی اپنا ستیاناس مارنے پر تُل گئی ہے اب دیکھیں ناں پڑھائی تو بہت اچھی چیز ہے، آج کل تو غریب سے غریب گھر کی اور کم پڑھے لکھے گھرانوں کی لڑکیاں بھی گریجویٹ ہوتی ہیں...... پتا نہیں اس کو کیا ہو گیا ہے، میں نے اتنا سمجھایا مگر اس کی سمجھ نہیں آرہا...... میں نے ابھی دادا جان کو نہیں بتایا کہ یہ پڑھائی چھوڑنے جا رہی ہے، بس آپ اپنے سادگی بھرے انداز میں سر کو سمجھائیں، ہو سکتا ہے سر کے کہنے سے سمجھ آجائے۔'' کائناز ایک تواتر سے بولتی چلی جا رہی تھی۔ صابرہ بڑی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شبینہ اس وقت کپڑے دھو کر چھت پر ڈالنے گئی ہوئی تھی۔ کائناز اتنی ٹینسڈ تھی کہ اسے دھیان میں نہیں آیا کہ اس وقت شبینہ انیکسی میں دکھائی نہیں دے رہی...... اس کا موڈ بہت آف تھا۔

''وہ تو آپ کی بات ٹھیک ہے بیٹا...... مگر پڑھائی طبیعت سے ہوتی ہے...... آپ کہہ رہی ہیں کہ اس کا دل نہیں چاہتا پڑھنے کو......تو زبردستی پڑھائی کیسے ہوگی...... آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں اور بس اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔'' صابرہ کو جو کچھ سمجھ میں آیا اسی حساب سے اس نے کائناز کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''آنٹی، آپ نہیں سمجھ رہیں...... اگر وہ نہیں پڑھے گی تو میں بھی نہیں پڑھوں گی...... میرا بھی دل نہیں لگے گا پڑھنے میں پلیز آپ سمجھنے کی کوشش کریں......'' کائناز بڑے بزرگانہ انداز میں اسے سمجھا رہی تھی۔ صابرہ حیران ہوکر کائناز کی شکل دیکھنے لگی۔

''بیٹا...... آپ نے اپنے دماغ سے پڑھنا ہے اور اس نے اپنے دماغ سے...... وہ پڑھائی چھوڑ دے گی تو آپ کیوں نہیں پڑھو گی، سمجھ نہیں آئی۔''

''آنٹی بات یہ ہے کہ بس...... میں...... اس کی کمپنی میں خود کو بہت comfortable سمجھتی ہوں اس کا ساتھ مجھے اچھا لگتا ہے۔'' کائناز کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اسے اس وقت مناسب الفاظ اپنے اختیار سے باہر محسوس ہوئے اور بے ربط سے انداز میں اس نے اپنی بات مکمل کی...... ظاہر ہے جو بات کائناز کے ذہن میں واضح نہیں تھی وہ صابرہ تک منتقل کیسے ہوتی...... صابرہ الجھی الجھی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''آنٹی پتا ہے کیا...... اس کی mother سائیکو ہیں، میرا مطلب ہے وہ ہمیشہ سے سائیکو نہیں ہیں سائیکو ہوگئی ہیں۔'' کائناز جلدی سے بولی...... صابرہ الجھن میں پڑ گئی اور بڑی معصومانہ حیرت سے بولی۔

''کیا ہیں بیٹا؟'' کائناز کو بڑی کوفت ہوئی کہ اس نے اتنی آسان سی بات کی تھی ان آنٹی کو سمجھ نہیں آئی، ایک دم جھنجلا کر بولی۔

''آنٹی وہ جن لوگوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے ناں...... انہیں انگلش میں سائیکو بولتے ہیں۔'' صابرہ ہکا بکا ہوکر کائناز کی شکل دیکھنے لگی۔

''کیا کہہ رہی ہو بیٹا...... روما کی ماں کا دماغ خراب ہے؟''

''جی آنٹی...... مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں انہیں پاگل کہوں۔'' صابرہ نے ایک دم اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا اور آنکھیں پھاڑ کر کائناز کی طرف دیکھنے لگی۔

''اوہ...... میرے خدایا اس بچی کی ماں پاگل ہے، ہائے...... بے چاری...... تو بیٹا ان کا گھر بار کون دیکھتا ہے، آپ کے دادا بتا رہے تھے کہ یہ تو پڑوس میں ہی رہتی ہیں...... کیا ان کی ماں اسپتال میں داخل ہیں؟''

''یہی تو مسئلہ ہے آنٹی انہیں کوئی اسپتال بھی داخل نہیں کر رہا ان کی سگی بہن ان کا علاج نہیں کرا رہیں بڑی عجیب، عجیب سی باتیں کرتی ہیں وہ، میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔'' کائناز کے اوپر جھنجلاہٹ طاری ہوگئی تھی۔ وہ بڑے بیزار کن لہجے میں بول رہی تھی۔ صابرہ تو پریشان ہوکر رہ گئی...... اس کی اپنی پریشانی اتنی بڑی تھی کہ سوچ ادھر سے ہٹتی ہی نہیں تھی...... لیکن اس لڑکی نے تو آناً فاناً اس کے ذہن کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔

''ہائے...... ہائے اس معصوم بچی کی ماں پاگل ہے بہت دکھ ہوا سن کر......'' صابرہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

''اور...... آنٹی آپ کو حیرت کی بات بتاؤں؟'' کائناز نے بتانے سے پہلے بڑا سسپنس create کیا۔ صابرہ نے کائناز کی طرف بڑی معصومیت اور سادگی سے دیکھا تھا۔

''اس سے بڑی کوئی بات ہے کیا؟'' اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

''روما کی اماں جان خود دماغ کی ڈاکٹر ہیں، نیورولوجسٹ ہوتا ہے ناں آنٹی! جو انسان کے دماغ کا علاج کرتا ہے...وہ اسپیشلسٹ ہیں، شہر کے بڑے، بڑے اسپتال میں انہیں بلایا جاتا تھا...... بہت نام ہے ان کا...... جتنے بھی بڑے، بڑے ڈاکٹرز ہیں ناں سب جانتے ہیں ان کو......'' کائناز نے واقعی صابرہ کو حیرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا وہ آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

''اچھا...... اتنی بڑی ڈاکٹر ہیں اور خود پاگل ہوگئی ہیں؟ اللہ کی شان ہے، واہ میرے مولا بڑے نرالے کھیل ہیں تیرے......'' صابرہ جو انتہائی ضرورت کے بغیر کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالتی تھی اس کے لیے تو یہ باتیں بڑی حیران کر دینے والی تھیں۔ پلکیں جھپکائے بغیر کائناز کی طرف دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی......

''یا اللہ اس دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے، ہم جیسے گھر کی چار دیواری میں بیٹھے ہوئے لوگ اندازہ بھی نہیں کر سکتے...... میں تو سمجھتی تھی کہ بس کچھ لوگ ہم جیسے پریشان ہوں گے اور کچھ لوگ آرام سے ہوں گے...... اس دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے...... کیا کچھ ہوسکتا ہے، ہم جیسے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے لوگ تو سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس بچی نے تو اس وقت مجھے گمراہ ہی بنا دیا......'' صابرہ کے پاس اب بولنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

''آنٹی پلیز آپ سر کو سمجھائیں اور انہیں کہیں وہ پہلے کی طرح ہمیں پڑھانا شروع کر دیں، ہوسکتا ہے روما کو سر کنونس کر لیں...... دیکھیں ناں یہ بہت بڑی نیکی ہوگی اس کی زندگی بن جائے گی، سر کو بھی ثواب ملے گا۔'' کائناز اپنی جانب سے صابرہ کو لالچ دینے اور اکسانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ہاں...... ہاں بیٹا......'' صابرہ ایک دم اپنی گہری سوچ سے چونک گئی...... ''میں ضرور بربان سے بات کروں گی، اللہ کسی کی نیکی ضائع نہیں کرتا...... اگر میرے بچے کی وجہ سے اس معصوم بچی کا بھلا ہو جاتا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔ میں اس سے ضرور بات کروں گی۔ بس وہ آج کل ذرا پریشان ہے ناں...... تو موقع محل دیکھ کر بات کر پاؤں گی مگر تم پریشان مت ہو، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا...... مجھے تو اس بچی سے بہت ہمدردی ہو رہی ہے، وہ تو بہت دکھی بچی ہے اس کا تو بہت خیال رکھنا چاہیے...... اب مجھے ساری بات سمجھ آگئی......'' صابرہ نے قدرے توقف کے بعد گہری سانس لی اور کہا۔

''ساری بات......؟'' کائناز اٹھتے، اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔

''ہاں بیٹا! ساری بات کا مطلب ہے کہ آپ کے دادا جو اس بچی کا اتنا خیال کر رہے ہیں تو سمجھ آگئی کہ وہ اس بچی کے ساتھ کیوں ہمدردی کر رہے ہیں...... آپ کے دادا بہت نیک آدمی ہیں، اللہ ان کو لمبی عمر دے۔ اچھی صحت کے ساتھ...... میں تو صبح، دوپہر، شام جب خیال آتا ہے ان کے لیے دعا کرتی ہوں۔''

''آپ بھی بہت اچھی ہیں آنٹی...... جو لوگ دوسروں کے لیے دعائیں کرتے ہیں ناں وہ لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں......'' کائناز بڑی معصومیت سے بولی تھی...... صابرہ کو بہت ٹوٹ کر اس پر پیار آیا...... اس نے بے اختیار کائناز کو اپنے کندھے سے لگا لیا تھا۔ اس بچی نے تو اسے وقتی طور پر اپنے دکھوں سے بہت دور کر دیا تھا۔

☆☆☆

شائستہ بیگم دو دن کے لیے اسلام آباد جا چکی تھیں ان کی کسی عزیز دوست کی بیٹی کی شادی تھی اور ان کی دوست نے بہت اصرار کر کے انہیں بلایا تھا...... فائزہ اور احمر نے اس موقع سے فوراً سے پیشتر فائدہ اٹھایا...... شائستہ بیگم ابھی اسلام آباد بھی نہیں پہنچی ہوں گی...... لیکن فائزہ اور احمر، شبینہ کے گھر پہنچ گئے تھے...... لیکن...... یہ کیا گیٹ پر پڑا ہوا بڑا سا تالا ان کا منہ چڑا رہا تھا۔

فائزہ نے انتہائی مایوسی کی کیفیت میں بھائی کو دیکھا...... اس کی حالت شاید اس سے بھی زیادہ بری تھی...... کیونکہ جو حادثہ ہوگزرا تھا اس حادثے کے بعد یہ تالا معمول کی بات نہیں تھی۔ اس کے پیچھے کوئی بڑا گہرا راز چھپا ہوا تھا۔

شبینہ کا باپ گرفتار ہو چکا تھا اور گھر کے باقی لوگ تالا لگا کر چلے گئے تھے۔ کسی کے گھر میں تالا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی تالا بھی زندگی کا ایک حصہ ہے...... لیکن جس گھر پر تالا پڑا ہوا تھا، اس گھر میں ایک

ایک پیچیدہ مقدمہ اور اس کا فیصلہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دور میں دو مسافر کافی چلنے کے بعد تھک گئے تو انہیں شدت کی بھوک محسوس ہوئی۔ دونوں سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور اپنے، اپنے کھانے کے برتن کھولے ایک کے پاس پانچ روٹیاں دوسرے کے پاس تین روٹیاں تھیں۔ ابھی کھانا شروع نہیں کیا تھا کہ تیسرا مسافر پاس سے گزرا۔ سلام کرنے پر دونوں نے جواب دے کر کھانے کی دعوت دی، اس نے قبول کرلی تینوں نے کھانا ختم کیا..... کھانا کھانے کے بعد وہ صاحب کھڑے ہوگئے..... دونوں صاحبان کے ہاتھ میں برابر کے آٹھ درہم رکھتے ہوئے کہا کہ آپ دونوں صاحبان کا جو کھانا تناول کیا ہے، اس کے عوض یہ درہم رکھ لیجیے۔ اس کے جانے کے بعد رقم کی تقسیم پر دونوں کے درمیان تنازعہ کھڑا ہوگیا۔ جس شخص کی پانچ روٹیاں تھیں وہ پانچ درہم خود رکھنے اور تین درہم اسے دینے پر بضد تھا جبکہ دوسرا شخص جس کی تین روٹیاں تھیں وہ رقم کو برابر حصوں میں تقسیم کرنے کا خواہاں تھا..... آخر فیصلے کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس حاضر ہوکر پورا واقعہ سنا کر مدد کی درخواست کی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے تین روٹیوں والے سے کہا جب تمہاری روٹیاں تین تھیں تو تمہیں تین درہم لینے پر بخوشی راضی ہوجانا چاہیے مگر وہ زیادہ درہم لینے پر اڑ گیا..... آپ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تمہارا ساتھی تین درہم دے کر تم پر احسان کر رہا ہے ورنہ تم صرف ایک درہم کے حقدار ہو..... اس شخص نے ادب سے کہا..... سبحان اللہ..... اگر انصاف کا تقاضا یہی ہے تو مجھے وجہ بتائیں، میں ایک درہم پر بھی راضی ہوجاؤں گا..... آپ کرم اللہ وجہہ نے سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ روٹیاں آٹھ تھیں اور کھانے والے تین ..... ظاہر ہے تین پر آٹھ تقسیم نہیں ہوتے اس لیے مانا جائے گا کہ سب نے برابر روٹیاں کھائی ہیں تو سب کو مساوی کرنے کے لیے روٹیوں کے ٹکڑے یا حصے مانے جائیں، ہر روٹی کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کیا جائے۔ اس طرح آٹھ روٹیوں کے چوبیس ٹکڑے ہوئے، اس حساب سے ہر شخص نے روٹی کے آٹھ ٹکڑے کھائے۔ اب چونکہ تمہاری روٹیاں تین تھیں..... اس کے نو ٹکڑے ہوئے، جس میں سے آٹھ ٹکڑے تم نے خود کھالیے..... باقی بچا ایک ٹکڑا وہ تیسرے شخص نے کھایا..... تمہارے ساتھی کی پانچ روٹیوں کے پندرہ ٹکڑے ہوئے جن میں سے آٹھ اس نے خود اور باقی سات تیسرے شخص نے کھائے..... اس شخص نے تمہاری روٹی کا ایک ٹکڑا کھایا اس لیے تمہارا حق صرف ایک درہم ہے۔ وہ شخص ایک درہم کے فیصلے پر بخوشی راضی ہوگیا۔

مرسلہ: اُمِ ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ

بہت غیر معمولی واقعہ پیش آچکا تھا اس لیے یہ خالی گھر بڑے معنی خیز اشارے دے رہا تھا۔

''تم ایسا کرو شبینہ کو فون ملا کر پتا کرو.....'' احمر بالکل ڈھلے ہوئے کپڑے کی طرح نچڑ کر رہ گیا تھا..... لہجے میں بلاوجہ تھکن سی اتر آئی تھی۔ دونوں بڑے جوش و جذبے کے ساتھ گھر سے روانہ ہوئے تھے مگر یہاں پہنچ کر جیسے غبارے سے ساری ہوا ہی نکل گئی تھی۔

''آپ کو پتا ہے، بتایا تو تھا میں نے آپ کو..... شبینہ کے پاس..... سیل فون نہیں ہے اس کے فادر نے کبھی allow ہی نہیں کیا۔''

''ایک منٹ!'' احمر نے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے فائزہ سے کہا۔ ''وہ میں ساتھ والے گھر سے پتا کرتا ہوں کہ آیا وہ... کہیں گئے ہوئے ہیں یا پھر.....'' احمر کی بات سن کر جیسے فائزہ کے اندر بھی بجلیاں سی دوڑ گئیں۔

''ہاں، ہوسکتا ہے..... ہم لوگ ویسے ہی کچھ الٹا سیدھا سوچ رہے ہیں وہ لوگ کسی کام سے باہر نکلے ہوئے ہوں.....'' فائزہ نے سوچا تھا..... اس اثنا میں احمر کار سے اتر کر جابر علی کے برابر والے گھر کی طرف بڑھ چکا تھا..... فائزہ بھی بڑی بے تابی سے اس گھر کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں احمر رک کر کال بیل کا بٹن پش کر رہا تھا..... چند لمحے بعد فائزہ نے دیکھا گیٹ کھلا اور ایک بڑی عمر کی عورت گیٹ سے باہر جھانکنے لگی۔

احمر اس کے لیے قطعاً اجنبی تھا اس لیے اس عورت کی آنکھوں میں حیرت اور تجسس کے تاثرات تھے۔

کار میں اے سی چل رہا تھا۔ چاروں طرف کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے فائزہ کو دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو تو سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن احمر کے چہرے کے تاثرات سے وہ اندازہ لگانے کی اپنی سی کوشش ضرور کر رہی تھی..... اس نے احمر کے چہرے پر صاف پڑھ لیا تھا کہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے، مایوسی کی کیفیت نے روح میں ڈیرے ڈال دیے تو اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔

احمر گاڑی کا دروازہ کھول کر اپنی سیٹ پر بیٹھ رہا تھا۔

''یہ آنٹی کیا کہہ رہی ہیں بھائی.....'' فائزہ نے آنکھیں کھول کر احمر کو دیکھا..... جو بہت بجھا بجھا سا نظر آرہا تھا..... گہری سانس لے کر اس نے ایک نظر فائزہ کی طرف دیکھا تھا۔

''کچھ نہیں وہ کہہ رہی تھیں یہ لوگ تو کئی دن پہلے یہاں سے جاچکے ہیں۔''

''کئی دن پہلے.....؟'' فائزہ چونک کر اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ''اور کیا کہہ رہی تھیں؟'' فائزہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں..... بس انہیں تو پتا ہی نہیں چلا یہ لوگ کب چلے گئے۔''

''اوہ..... مائی گاڈ..... اس کا مطلب یہ ہے کہ اب شبینہ سے کبھی ملاقات نہیں ہوسکتی۔'' فائزہ کی بات سن کر احمر نے اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے سوچا تھا۔

''فائزہ جو تم سوچ رہی ہو وہ میں بھی سوچ رہا ہوں.....'' کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز ماحول میں ابھری..... اور احمر نے..... بڑے شکستہ اور نڈھال انداز میں آہستہ، آہستہ کلچ چھوڑنا شروع کیا..... کار حرکت کرنے لگی..... لیکن فائزہ اپنی جگہ یوں بیٹھی تھی جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو..... وہ بڑے گہرے صدمے کے زیر اثر تھی۔

☆☆☆

''ابھی تک مرے ہوئے ہو..... چلو شاباش زندہ ہوجاؤ۔'' موبائل وارث علی کے کان سے لگا ہوا تھا اور ائرپیس میں ایس پی کی زندگی سے بھرپور آواز گونجی تھی..... وارث علی جو سچ مچ آج صبح سے اپنے بیڈ پر تھا.....

اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایس پی کی آواز کے اتار چڑھاؤ نے اس کے رگ و ریشے میں زندگی کی حرارت دوڑا دی..... صاف لگ رہا تھا کہ ایس پی کے پاس کوئی اچھی خبر ہے۔

''حکم کیجیے سرکار......'' وارث علی نے بڑے فدویانہ انداز میں ایس پی کو بھرپور رسپانس دیا تھا۔

''یار جابر علی کا لڑکا تو NED میں پڑھتا ہے؟''

''وہ NED میں پڑھتا ہے تو میں کیا کروں، میں نے تو کالج کی شکل نہیں دیکھی۔ NED کا نام سن کر تو مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔'' وارث علی نے بھرپور شوخی کے ساتھ جواب دیا تھا کیونکہ وہ ایس پی کا یارِ غار تھا..... ایس پی کے پہلے جملے ہی سے اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ ایس پی کے پاس اس کے لیے کوئی بہت ہی خاص خبر ہے۔

''تو یار تم اپنی برسوں پرانی حسرت پوری کر لو۔''

''کیا مطلب......؟'' وارث علی کو ایس پی کی بات ذرہ برابر سمجھ نہیں آئی۔

''بھئی میرا مطلب یہ ہے کہ تم نے کالج کی شکل نہیں دیکھی اب ڈائریکٹ یونیورسٹی کا دیدار کرو......''

''لیکن میں وہاں کیوں جاؤں......؟'' وارث علی نے فوراً سے پیشتر سوال کیا۔

''او بابا اس لڑکے سے جا کر ملاقات کرو اس کا ٹھکانا پتا کرو......''

''تو وہ اپنا ٹھکانا بتائے گا مجھے......؟'' وارث علی کو ایس پی کی بات بہت بچکانہ سی لگی مگر اس نے اپنے لب و لہجے کو بڑا کنٹرول میں رکھ کر سوال کیا تھا۔

''یار اس کا تو باپ بھی بتائے گا...... بچہ ہے کل کا...... ٹیلی فون پر پریشر ڈال رہے تھے غلط بات ہے پریشر سامنے بیٹھ کر ڈالنا چاہیے...... تو کچھ ہاتھ آ جاتا ہے...... یہ ٹیلی فونوں پر دھمکیاں دھمکیاں وقتی thrill دوڑاتی ہیں، بات جو ہوتی ہے سامنے بیٹھ کر ہوتی ہے۔ اس لڑکے کو دھمکیاں مت دو۔ ذرا پیار سے محبت سے اسے قابو میں کرو اس کو بتاؤ کہ تم اس کے دشمن نہیں ہو تم اس فیملی کے ساتھ ساری زندگی گزارنے کے خواہش مند ہو...... وہ کیوں تم سے ڈر رہے ہیں، سمجھ رہے ہو ناں میری بات کو...... پہلے تو ان کا خوف ختم کرو...... پھر بات بنے گی جتنا زیادہ ان کو ڈراؤ گے تو سمجھو کہ ہمارا کیس بہت کمزور ہو جائے گا۔ جوان لڑکا ہے ترٹیوں میں نہیں آئے گا یار...... گھوڑے تو ناچنا سیکھ لیتے ہیں وہ انسان کا بچہ ہے ذرا پیار سے قابو میں کرو......'' ایس پی تواتر سے بول رہا تھا جبکہ وارث علی ایک، ایک لفظ بہت غور سے سن رہا تھا۔

''سر بات تو آپ کی ٹھیک ہے کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''بات یہی ٹھیک ہے وارث علی، اب اپنی افلاطونیت نہیں دکھانا۔ جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کرو...... اور جو کچھ تم مجھ سے شیئر کیے بغیر کر چکے ہو ناں...... دیکھ لو اس کا کیا نتیجہ نکلا ہے اب اس بگڑی بات کو بھی تم ہی سنبھالو گے۔'' چند ثانیے ایس پی رکا۔ ''تو پھر تم صبح یونیورسٹی جا رہے ہو ناں......؟'' ایس پی نے اپنی تسلی کی خاطر پھر سوال کیا۔

''جی بالکل سر جی...... یہ تو آپ نے مجھے اس کا پتا ٹھکانا بتا دیا...... اب تو روز ملاقات ہوگی فکر ہی نہیں کریں......''

''خدا حافظ......'' ایس پی نے اپنی طرف سے خدا حافظ کہہ دیا تھا۔

''خدا حافظ سر جی...... اللہ آپ کا بھلا کرے...... اللہ اگلے سال آپ کو چار پھول پہنائے...... اور ہم اسی طرح آپ کی جوتیاں سیدھی کرتے رہیں۔'' وارث علی معنی خیز لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے مسکرا بھی رہا تھا۔

☆☆☆

رابی نے وارڈروب میں لٹکے ہوئے سارے کپڑے نکال کر بیڈ پر ڈھیر کر دیے تھے اور اب دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کپڑوں کے ڈھیر کو گھورے جا رہی تھی۔

اسی لمحے گل جان اندر داخل ہوئی پہلے تو اس نے رابی کو قدرے حیرت سے دیکھا جو کپڑوں کے ڈھیر کو گھور رہی تھی...... پھر دوسری نظر وارڈروب کے کھلے ہوئے پٹوں پر ڈالی... چاروں پٹ پورے کھلے ہوئے تھے اور وارڈروب بالکل خالی تھی۔

''بیٹا یہ تم نے سارے کپڑے نکال کر باہر کیوں پھینک دیے؟''

''یہ ہیں ہی اس قابل...... انہیں بہت دور پھینک دینا چاہیے۔'' رابی نے ایک گہری سانس لے کر بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟'' گل جان ذرا بھی نہیں سمجھی۔

''مطلب یہ کہ ان ڈھیروں کپڑوں میں صرف دو تین سوٹ اس قابل ہیں جو میں یو ایس لے جا سکتی ہوں۔ خالہ جانی مجھے تو کپڑوں کی شاپنگ بھی کرنی پڑے گی...... وہاں تو ابھی سردی ہوگی۔''

''تو بیٹا سردیوں کے کپڑے بھی بہت ہیں آپ کے پاس۔''

''چھوڑیں خالہ جانی وہ کپڑے اِن ڈور پہننے والے ہیں۔ اس قابل نہیں کہ ان کو پہن کر کسی کے سامنے جایا جائے......''

''ناشکری نہیں کرتے، کپڑے تو آپ دونوں بہنیں اپنی، اپنی پسند سے ہی خریدتی ہو...... بی بی جان آپ دونوں کو ساتھ لے کر جاتی تھیں اور آپ کی پسند کے ہی کپڑے دلواتی تھیں۔ انہوں نے کبھی زبردستی نہیں کی آپ کے ساتھ اس معاملے میں۔''

''ہاں...... لیکن ہم ڈر کے مارے جلدی، جلدی ہی پسند کر لیتے تھے...... یوں لگتا تھا کہ اگر جلدی، جلدی پسند نہیں کیا تو اماں جان ہمیں وہیں کھڑے، کھڑے گولی مار دیں گی۔ اتنی ٹینشن اور ڈر میں کیا سلیکشن ہوتا ہے، آپ خود ہی بتائیں۔''

''لیکن تم تو کبھی بی بی جان سے نہیں ڈریں......''

''اب ایسا بھی نہ بولیں خالہ جانی...... ڈر ڈر کر بری حالت ہوئی تھی تبھی تو ڈر سے پیچھا چھڑانے کے لیے گھر سے باہر بھاگی......'' بولتے بولتے رابی کی آواز میں ایک چبھنے والا کھردرا پن محسوس ہونے لگا تھا...... گل جان نے ایک گہری سانس لی پھر زبردستی کے انداز میں مسکرا کر بولی۔

''اچھا کپڑے بھی لے لینا بیٹا کون منع کر رہا ہے، کل چلی چلوں گی تمہارے ساتھ...... جو پسند آئے لے لینا۔''

''ہاں...... پھر بس یہ سوچتی ہوں، چار پانچ سوٹ کافی رہیں گے باقی شاپنگ میں یو ایس میں ہی کر لوں گی۔ واؤ...... وہاں شاپنگ کرنے میں کتنا مزہ آئے گا پھر جو سیزن وہاں چل رہا ہوگا اس حساب سے شاپنگ بھی ہو جائے گی...... ٹھیک ہے ناں......''

''ٹھیک ہے...... بیٹا جیسے تمہاری مرضی......''

''اتنا برا سا منہ بنا کر بولتی ہیں آپ تو یہی چاہتی ہیں کہ بس ہم آپ کی بہن کی مرضی سے ہی سانس لیں۔'' رابی، گل جان کے اداس اور زبردستی کے لہجے پر بری طرح چڑ گئی...... گل جان ایک دم گھبرا گئی۔

''نہیں...... نہیں بیٹا میرا مطلب یہ نہیں...... اللہ تم کو خوش رکھے، میں تو دن رات دعائیں مانگتی ہوں اللہ

تعالیٰ تم دونوں بہنوں کو سلامت اور خوش و خرم رکھے۔ میں بھلا کیوں زبردستی کروں گی، تم لوگوں کے ساتھ...... میں تو بہت کمزور ہوں، بی بی جان کی طرح زور آور نہیں اور مجھے زور آور بننے کا شوق بھی نہیں...... اب تو بس دن رات اپنے رب سے دعاؤں میں یہی مانگتی ہوں کہ اللہ تم دونوں بہنوں کو اتنی خوشیاں دے، اتنی خوشیاں دے کہ تم ہر گزری تلخ بات کو بھول جاؤ۔''

''ٹھیک ہے خالہ جانی...... یہ جو دعائیں آپ ہمارے لیے کرتی ہیں لگتا ہے انہی سے کوئی دعا قبول ہوئی ہے...... اُف آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ ایک پنجرے میں قید مینا یوں ایسی فضاؤں میں اڑتی پھرے گی...... تو پتا چلے گا کہ اصل زندگی کیا ہے...... ؟ کیوں ہوتی ہے؟ اور کس کے لیے ہوتی ہے...... بندہ جیے تو کھل کر جیے ورنہ کڑھے، کڑھ کے مر جائے۔''

''تم اتنی بے دھڑک باتیں نہ کیا کرو رابی...... بولتی ہو تو بولتی چلی جاتی ہو...... بری بات ہے بیٹا اب بات، بات پر مرنے کی باتیں نہ کیا کرو، بس اب جینے کی بات کرو۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں خالہ جانی، بس بہت دن ہم مر چکے اب تو سمجھیں ہم دوبارہ سے زندہ ہوئے ہیں...... ہیں ناں...... ؟'' رابی شریر انداز میں کھلکھلا کر ہنس دی۔

پھر کپڑوں کے ڈھیر کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے گل جان کی طرف دیکھ کر بولی۔

''خالہ جانی ڈاکٹر صاحبہ جادو کے زور سے ٹھیک نہیں ہوں گی۔ انہیں تو ہوش ہی نہیں ہے کہ زمین پر ہیں یا آسمان پر...... میرے جانے کے بعد اگر آپ چاہیں تو ان کا علاج کرا لیں۔''

''علاج تو میں تمہارے ہوتے ہوئے بھی کرا لوں رابی...... تم مجھے ان کا علاج کرانے سے تو نہیں روک سکتیں اور نہ روک سکتی ہو' مجھے تو بی بی جان ہنستی مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں، میں انہیں دوبارہ دوزخ میں کیوں دھکیلوں...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......'' گل جان یہ کہہ کر پلٹی ہی تھی کہ مہر جان بڑے جوش و جذبے کے ساتھ تیز تیز چلتے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے بہت خوب صورت شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا لیکن دوپٹا لڑکیوں کے انداز میں گلے میں پڑا تھا۔ جتنی تیزی سے وہ اندر داخل ہوئی تھیں اس سے کہیں زیادہ زوردار جھٹکے سے اپنی جگہ رکی تھیں ان کے لیے اندر کا منظر بڑا عجیب و غریب تھا...... بیڈ پر کپڑوں کا ڈھیر داغ، داغ چہرے والی رابی اور ان کی طرف پریشان نظروں سے دیکھتی ہوئی گل جان۔

''گل جان تم اتنے سارے کپڑوں کا کیا کر رہی ہو...... ؟ کیا کسی کو دے رہی ہو...... دل بھر گیا ہے؟''

''نہیں بی بی جان، یہ رابی اپنی وارڈ روب ٹھیک کر رہی ہے آپ آئیں میرے ساتھ۔''

''ایک منٹ میری بات تو سنو......'' گل جان نے مہر جان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن مہر جان نے پوری قوت سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا لیا تھا اور بڑی تیزی سے چلتے ہوئے رابی کے بالکل قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھیں، اتنے قریب...... کہ بس یوں لگتا تھا کہ ابھی دونوں گلے مل جائیں گی۔

''گل جان یہ اس لڑکی کی شکل پر نشان کیسے ہیں چڑیلوں جیسے؟'' وہ حیرت سے دیکھتے ہوئے گل جان سے مخاطب تھیں۔ رابی کے چہرے سے ایک سرد آہ خارج ہوئی...... اس نے مہر جان کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور زہر خند کے ساتھ گویا ہوئی۔

''میں چڑیل ہی ہوں ڈاکٹر صاحبہ......''

''اچھا تم چڑیل ہو......؟''

''بری بات ہے ایسے نہیں کہتے بیٹا......'' گل جان نے فوراً ٹوک دیا تھا۔

''آئیں بی بی جان...... آپ میرے ساتھ چلیں، میں نے آپ کے لیے بہت اچھا سا وجیٹیبل پلاؤ بنایا ہے، گرم گرم ہے کھالیں پھر اس کے بعد آپ کو میڈیسن بھی دینی ہے، تاکہ آپ سکون سے سو جائیں۔''

''بس تمہیں تو میرے سونے کی فکر پڑی رہتی ہے...... بس میں تھک گئی ہوں سو، سوکر...... مجھے یہ بتاؤ کہ یہ لڑکی کون ہے؟ تمہاری دوست ہے کیا؟''

''آپ آئیں میرے ساتھ۔'' گل جان روہانسی ہوکر مہر جان کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی باہر لے گئی۔ رابی دھپ سے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

''اگر یہ میری ماں ہیں تو میرے دل کو کچھ کیوں نہیں ہوتا...... میرا دل کیوں نہیں چاہتا کہ کسی دن میں ماں کے گلے سے لپٹ کر بہت روؤں، ڈاکٹر صاحبہ کو دیکھ کر مجھے رونا نہیں آتا...... غصہ کیوں آتا ہے۔'' رابی خود سے سوال کررہی تھی...... حیرت کدے کا سفر ختم ہی ہوکر نہیں دے رہا تھا...... ایک حیرت کدے سے نکلتی تو دوسرے حیرت کدے میں جا پھنستی۔ ذہن میں ابھرنے والا ہر خیال نئے راستے کی طرف لے جاتا تھا۔

☆☆☆

''آپ دونوں میری بات کا برا مت مانیے گا...... ظاہر ہے آپ لوگ اب اس گھر میں میرے ساتھ رہتے ہیں، آپ کا ہر ذاتی مسئلہ یوں سمجھیں کہ اب میرا مسئلہ ہے، مجھے بتائیں کہ میں آپ لوگوں کی کیا مدد کرسکتا ہوں۔'' شاہ عالم عشا کی نماز پڑھ کر آئے تو انہوں نے صابرہ اور برہان کو لاؤنج میں بلوالیا تھا۔ وہ بہت بے چین تھے کئی باتیں انہیں پریشان کررہی تھیں کیونکہ جب سے برہان، صابرہ اور شبینہ کو ان کے گھر لے کر آیا تھا اس وقت سے لے کر اب تک اس نے شاہ صاحب سے اپنے باپ کے بارے میں کسی قسم کی کوئی بات نہیں کی تھی نہ ہی آنے والے دنوں میں وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس کا کچھ پتا... چل رہا تھا۔

''شاہ صاحب آپ نے اپنے گھر میں ہمیں سر چھپانے کی جگہ دی ہے، یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ ہم ساری زندگی نہیں اتار پائیں گے......'' صابرہ نے بڑی شرمساری اور شکر گزاری کے انداز میں جواب دیا۔

''آپ مجھے شرمندہ کررہی ہیں...... اتنا بڑا گھر ہے چند پریشان حال لوگ اس چھت کے نیچے آکر سکون سے بیٹھ گئے...... سمجھیں اس کی قیمت وصول ہوگئی۔''

''شاہ صاحب میں بہت ڈرتے، ڈرتے آپ کے پاس آیا تھا لیکن اب میرے اندر کسی قسم کا کوئی خوف نہیں ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں بہت جلد کسی اچھی جگہ رہائش کا بندوبست کرلوں گا اور جس طرح امی کہہ رہی ہیں کہ آپ نے جو احسان ہم پر کیا ہے وہ اتارنے کی کوشش تو ضرور کروں گا مگر مجھے پتا ہے اتار نہیں سکتا۔''

''اب آپ بھی مجھے شرمندہ کرنے لگے اپنی والدہ کی طرح...... بیٹا اب بس بھی کریں...... مجھے یہ بتائیں کہ اپنے والد صاحب کے سلسلے میں آپ کو کسی قسم کی میری اخلاقی مدد درکار ہے تو میں حاضر ہوں...... انشاء اللہ تعالیٰ جو کچھ کرسکتا ہوں ضرور کروں گا۔''

''نہیں، نہیں شاہ صاحب میں آپ پر مزید بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔'' برہان نے جلدی سے کہا تھا۔

صابرہ نے ایک نظر شاہ صاحب کو دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر بولی۔

''ہمیں جابر علی کے لیے کچھ نہیں کرنا، ہم کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ وہ شخص جسے اپنے بچوں کا باپ سمجھ کر میں بڑے صبر کے ساتھ اس کے ساتھ وقت گزارتی رہی، اب میرا کچھ نہیں لگتا...... اس نے میری ہنستی کھیلتی بیٹی مجھ

سے چھین لی، آپ خود ہی سوچیں ایک ماں کو اپنی اولاد کا دشمن کیسا لگے گا...... کیا اس سے کبھی ہمدردی ہو سکتی ہے؟'' صابرہ کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ وہ گویا پھٹ پڑی تھی۔

''انہوں نے جو کیا ہے شاہ صاحب انہیں خود ہی بھگتنے دیں۔ آپ بس میری اتنی مدد کیجیے کہ میں اپنے ان دونوں بچوں کو لے کر کسی سکون کی جگہ بیٹھ جاؤں۔'' صابرہ کی بات سن کر شاہ صاحب کو ایک دھچکا سا لگا تھا...... وہ تو سمجھ رہے تھے کہ شاید برہان کی ماں اپنے شوہر کی ضمانت اور رہائی کے لیے ان سے کوئی بات کرے گی۔ ان سے کسی بھی قسم کی اخلاقی قانونی مدد کے لیے کہے گی۔

''برہان آپ کے والد کی آپ سے ملاقات کب ہوئی تھی؟'' شاہ صاحب نے برہان سے سوال کیا۔

''نہیں شاہ صاحب......'' برہان نے بیزار کے بے ساختگی سے کہا تھا۔ ''اور ہو گی بھی نہیں...... میں ان سے نہیں ملنا چاہتا......'' برہان کا صاف جواب سن کر شاہ صاحب کو ایک لمحے کے لیے تو سمجھ ہی نہیں آئی کہ اب وہ اس سے کیا بات کریں...... چند لمحے سر جھکا کر سوچتے رہے پھر ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے گویا ہوئے۔

''مجھے آپ لوگوں کے دکھ کا اچھی طرح اندازہ ہے لیکن زندگی ایک جگہ رک جانے کا نام نہیں ہے بیٹا...... یہ چلتی رہتی ہے اور چلتی رہنی چاہیے...... کیونکہ موت کا تو ایک وقت معین ہے اپنی موت سے پہلے تو کوئی نہیں مرتا لیکن عقل و ہوش کے ہوتے ہوئے جان بوجھ کر مشکلات کو بڑھانا نہیں چاہیے۔''

''شاہ صاحب بس دو چار دن کی بات ہے پھر میں اپنی بیٹی کو لے کر گاؤں چلی جاؤں گی......'' اپنے مخصوص عاجزانہ لہجے میں ایک بات کہہ کر شاہ عالم کو ایک بار چونکا دیا تھا۔

''گاؤں......!'' شاہ صاحب حیرت سے برہان کی طرف دیکھنے لگے۔

''جی شاہ صاحب...... گاؤں میں میرے مرحوم والد کا ایک چھوٹا سا مکان ہے جہاں میری ایک بوڑھی بیوہ پھپی رہتی ہیں۔ برہان پڑھ رہا ہے یہ شہر میں ہی رہے گا لیکن میں شبینہ کو لے کر گاؤں چلی جاؤں گی۔ کل سے میں یہی سوچ رہی ہوں آپ نے تو اپنے گھر کا اتنا بڑا حصہ ہمارے حوالے کر دیا مگر مجھے شرم آتی ہے...... یہ دو چار دن کی بات نہیں نہ جانے برہان کب اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر نوکری کرے گا کب گھر کا بندوبست کرے گا...... ہماری وجہ سے مشکل میں ہی رہے گا اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں شبینہ کو لے کر گاؤں چلی جاؤں اور برہان یہاں شہر میں رہ کر اپنی پڑھائی پوری کر کے کوئی نوکری ڈھونڈ لے......'' صابرہ بول رہی تھی اور برہان حیرت سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک صابرہ نے برہان سے گاؤں جانے والی بات نہیں کی تھی۔

''دیکھیں اس مشکل میں آپ کی مدد کرنا...... بحیثیت انسان میرا فرض ہے، اسی خیال سے آپ سے پوچھ لیا تھا۔ آپ ہرگز یہ نہیں سمجھیں کہ آپ اس گھر میں رہ رہی ہیں تو مجھ پر کوئی بوجھ ہے، آپ اطمینان سے یہاں رہیے اور آئندہ کا جو بھی پروگرام بنائیں بس مجھے ضرور مطلع کر دیجیے گا۔''

''بے فکر رہیے شاہ صاحب جو بھی اسٹیپ لوں گا آپ کو بتا کر لوں گا۔'' برہان نے سر جھکا کر بہت مؤدبانہ انداز میں شاہ صاحب کو تسلی دی تھی۔

شاہ صاحب مختلف خیالات کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے انہوں نے جو کہنا چاہا تھا کہہ دیا تھا...... لیکن صابرہ کے گاؤں جانے والی بات نہ جانے کیوں ان کے دماغ میں کانٹے کی طرح اٹک گئی تھی۔ انہیں خود نہیں معلوم تھا کہ وہ یہ بات سن کر اتنے بے چین کیوں ہو گئے۔ لاشعوری طور پر ان کی نظریں برہان کے چہرے پر ٹک...... گئی تھیں۔ شاید برہان ان کے دل میں اترتا جا رہا تھا یا وہ جن حالات سے گزر رہے تھے ان حالات

میں برہان بہت اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا......

''شاہ صاحب آج کل اچھے لڑکوں کا کال ہے آج کل اچھے لڑکے ملتے کہاں ہیں۔'' ان کے کانوں میں بیرسٹر جمیل خان کے الفاظ بازگشت کی طرح گونجنے لگے...... ''لیکن یہ بچہ تو ایک قاتل کا بیٹا ہے...... اس کی شناخت بھی یہی باقی رہ گئی ہے کہ اب اسے لوگ انسپکٹر جابر علی کا بیٹا نہیں...... قاتل کا بیٹا کہہ کر شناخت کریں گے...... آخرت میں باپ کا بدلہ بیٹے سے نہیں لیا جائے گا مگر یہ ظالم دنیا باپ کے بدلے بیٹے سے اور بیٹے کے بدلے باپ سے خوب گن گن کر لیتی ہے۔'' اس خیال کے ساتھ ہی ان کے رگ و پے میں لہو کی جگہ درد دوڑنے لگا......

☆☆☆

برہان کی سوتے سوتے آنکھ کھل گئی تھی اب اکثر رات کو اسی طرح ہوتا تھا کہ نیند کے غلبے سے اس کی آنکھیں بند ہوتی تھیں وہ سو جاتا تھا لیکن سوتے سوتے ایک دم اس کی نیند ٹوٹتی تھی اور آنکھ کھلتے ہی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سویا ہی نہیں...... جانے کب سے جاگ رہا تھا...... نیند ٹوٹتے ہی وہ چند لمحے خالی، خالی نظروں سے چھت کی طرف دیکھتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نیند کے ٹوٹتے ہی بستر بھی کاٹنے کو دوڑتا تھا...... پھر ایک پل نہیں لیٹا جاتا تھا۔

وہ بستر سے اٹھ کر بڑے سے دریچے میں آ کھڑا ہوا، اس کمرے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کی بالکونی میں کھڑے ہو کر گھر کے تین حصے بہت صاف نظر آتے تھے۔

یہ وسیع و عریض رقبے پر تعمیر شدہ ایک کوٹھی تھی جس کا صرف لان ہی ایک ہزار گز سے زیادہ کا تھا اور L shape میں تھا۔ بالکونی میں کھڑے ہوتے ہی لان کا بڑا حصہ مین گیٹ اور کار پورچ بالکل صاف دکھائی دیتے تھے...... وہ تو بالکل خالی الذہن بالکونی میں آ کھڑا ہوا تھا لیکن سامنے نظر پڑتے ہی ایک زور کا جھٹکا لگا تھا۔ کیونکہ ہلکے اجالے میں اس کی نظر ٹھیک سے کام کر رہی تھی مگر یہ تو صاف پتا چل رہا تھا کہ سنگی بینچ پر کوئی لڑکی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ہے...... ''کائناز......'' ایک خیال بڑی سرعت سے اس کے ذہن سے ٹکرایا......

''لیکن کائناز اس وقت رات ڈیڑھ بجے اکیلی لان میں کیوں بیٹھے گی......'' وہ ٹکٹکی باندھ کر پلکیں جھپکائے بغیر بالکل سیدھ میں دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ لڑکی جو گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ہے اس نے ابھی تک زاویہ تبدیل نہیں کیا تھا۔

''وہ......'' پھر اچانک برہان کو یاد آیا...... ''کہیں یہ وہ تو نہیں جو اس روز دکھائی دی تھی جس کے چہرے پر عجیب و غریب نشانات تھے۔'' تجسس آخری حدوں کو چھونے لگا تو وہ کشاں کشاں لان کی طرف کھنچا چلا آیا...... ابھی وہ...... لان میں پہنچا ہی تھا کہ اس کی سماعت سے نسوانی سسکیاں ٹکرانے لگیں۔

''کون ہے یہ؟ یہ تو رو رہی ہے۔'' برہان نے فکرمندی سے سامنے کی طرف دیکھا...... لان کی روشنیاں اتنی مدھم تھیں کہ وہ دور سے پہچان ہی نہیں سکتا تھا کہ بینچ پر کون بیٹھا تھا...... وہ حیرت اور تجسس کی فراوانی میں بہتا ہوا لڑکی سے قدرے قریب ہوا۔

''اوہ...... یہ تو روما ہے......'' صرف بالوں کے اسٹائل، نظر آنے والے ہاتھوں سے اس نے فوراً اندازہ لگا لیا تھا...... ''لیکن یہ یہاں اکیلی بیٹھی کیوں رو رہی ہے......'' وہ انتہائی پریشان ہو گیا، اِدھر اُدھر دیکھا دور، دور تک کسی انسانی وجود کا کوئی شائبہ نہیں تھا...... لے دے کے وہ گارڈ جو گیٹ پر کسی وقت ٹہلتا یا کھڑا نظر آ جاتا تھا غالباً کیبن میں جا کر گہری نیند سو چکا تھا۔

''روما......!'' برہان نے بڑی بے اختیاری سی کیفیت میں آواز دی۔ روما نے یوں چونک کر سر اٹھایا جیسے

440 وولٹ کے کرنٹ کا جھٹکا لگا ہو..... اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اس وقت لان میں آسکتا ہے..... اس کا خیال تھا کہ سب اس وقت بہت گہری نیند سو رہے ہوں گے۔

وہ برہان کو سامنے پا کر جلدی، جلدی بدحواسی کے عالم میں پاؤں میں چپل پھنسا کر بھاگنے کی تیاری کرنے لگی..... لیکن برہان عین اس کے بالمقابل آکھڑا ہوا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"روما! آپ رو رہی ہیں..... یہاں..... خیریت ہے، کیا ہوا.....؟"

"کچھ نہیں سر! ہماری تو قسمت ہی خراب ہے..... ہم تو ایسے ہی شاید روتے رہیں گے، آپ ہماری فکر نہیں کریں۔" یہ کہہ کر روما نے آنسو پونچھے اور ساتھ ہی جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

"ایک منٹ روما..... ! میری بات سنیں....."

"سر..... آئی ایم سوری سر، میں آپ سے اس وقت کوئی بات نہیں کر سکتی میں بہت پریشان ہوں۔ نیند نہیں آرہی تھی بس رونا آرہا تھا۔ میں نے سوچا اگر رونے لگی تو کائناز اٹھ کر بیٹھ جائے گی تو پھر میں لان میں آگئی۔"

"رونے کے لیے.....؟" برہان نے برجستہ سوال کیا..... روما نے بھی اثبات میں گردن ہلا دی اور خود ہی اپنی اس حرکت پر شرمندہ سی نظر آنے لگی۔

"سر..... وہ ناں بس..... وہ پلیز آپ پریشان نہیں ہوں، میری تو عادت ہے رونے کی اور میں تو ویسے ہی روتی رہتی ہوں۔ آپ کائناز سے پوچھ لیجیے گا۔"

"لیکن..... آپ کیوں روتی رہتی ہیں..... کیا مسئلہ ہے آپ کو.....؟"

"کوئی ایک مسئلہ ہو تو بتاؤں سر! ہمیں تو آج تک اپنے فادر کا نہیں پتا..... ہماری اماں جان اب ہمیں پہچانتی بھی نہیں ہیں۔ برابر میں ہمارا گھر ہے اور ہم کائناز کے گھر میں بیٹھے رو رہے ہیں..... اسی سے آپ کو اندازہ نہیں ہوتا کہ ہماری قسمت کتنی خراب ہے..... کوئی بھی نہیں ہے ہمارا....." یہ کہہ کر روما بڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھنے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا کہ برہان کو اس عالم تحیر میں چھوڑ کر وہ بڑے آرام سے چلتی چلی جا رہی ہے جو پتھر کا بت بنا اس کے لفظوں کی بازگشت میں چکرا رہا تھا..... اور پوری آنکھیں کھول کر روما کی طرف دیکھ رہا تھا..... اور آس پاس سے اتنا بے خبر ہو چکا تھا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ پہلی منزل کی بالکونی سے جھانکتی ہوئی رابی کتنی حیرت زدہ نظر آرہی ہے..... اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ روما، برہان سے بات کر رہی تھی..... اور پھر بڑے عجیب سے انداز میں اندر کی طرف گئی تھی..... رابی یہ بھی دیکھ چکی تھی کہ برہان ابھی تک اپنی جگہ ساکت اور صامت کھڑا جاتی ہوئی روما کو دیکھے چلا جا رہا تھا۔

"یہ دونوں اس وقت لان میں کیا کر رہے تھے.....؟" وہ تو کتاب پڑھتے پڑھتے بیزار ہو گئی تھی۔ نیند تھی کہ آکر ہی نہیں دے رہی تھی۔ اس لیے کمرے کا دروازہ کھول کر کمرے سے ملحق بالکونی میں یونہی آکھڑی ہوئی تھی۔ بعض اوقات وسیع فضا پر نظریں جمانے سے بھی بڑا سکون ملتا ہے لیکن جو کچھ اس نے دیکھا وہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ جلدی سے روما کے پاس جائے اور پوچھے..... کہ وہ اتنی رات کو برہان سے کیا باتیں کر رہی تھی.....؟ کیا چکر ہے لیکن فوراً ایک خیال نے اسے روک لیا تھا..... روما کمرے میں اکیلی نہیں ہوتی، وہ کائناز کے ساتھ ہوتی ہے..... اگر وہ روما سے بات کرے گی تو لامحالہ کائناز بھی جاگ اٹھے گی..... "لیکن اب ساری رات مجھے نیند نہیں آئے گی..... یہ روما اور برہان کیا باتیں کر رہے تھے..... اتنی

تیز، روما پر بالکل بھی نہیں لگتی....." رابی تو جیسے وسوسوں اور اندیشوں کے جھکڑ میں لڑکھڑانے لگی تھی..... اب اسے نیند آجائے گی؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... وہ سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

"برہان علی..... این ای ڈی یونیورسٹی سے بی ای الیکٹریکل کر رہا ہے....." ایس پی، وارث علی کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے اپنی دانست میں گویا اسے مطلع کر رہا تھا۔

"یہ میں جانتا ہوں سر جی لڑکا پڑھتا ہے....." وارث علی نے قدرے بیزار کن کیفیت میں کہا..... وہ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ ایس پی اسے کوئی دھماکا خیز خبر سنانے والا ہے..... ایسی خبر جس کے بعد اس کی ساری پرابلم حل ہو جائیں گی۔

"لیکن تمہیں شاید یہ نہیں پتا تھا کہ وہ این ای ڈی کا بڑا ہونہار اسٹوڈنٹ ہے....." ایس پی نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر پھر سابقہ انداز میں کہا۔

"سر جی یہ کوئی خاص خبر نہیں ہے۔ اس عمر میں سب لڑکے پڑھتے ہیں، کوئی کالج میں پڑھتا ہے کوئی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اس میں کیا خاص بات ہے..... اگر میں اس سے ملنے یونیورسٹی چلا بھی جاتا ہوں تو مجھے فائدہ نہیں ہوگا۔"

"نادان دوست آگے بھی سنو....." ایس پی بہت معنی خیز اور پرسکون انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اور بہت غور سے وارث علی کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھتا جا رہا تھا۔

"لڑکا بہت ہونہار ہے، میرٹ پر گیا ہوگا..... اس کے باپ میں تو اتنا تیر نہیں کہ لاکھوں لگا کے اس کو این ای ڈی میں بٹھا دے۔"

"آگے بولیں اب سر جی....." وارث علی کی بے تابی اب انتہا کو پہنچ چکی تھی کیونکہ اسے اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ کسی خبر کے سلسلے میں ہی اتنی لمبی تمہید باندھ کر وہ بات کر رہا ہے۔

"اور آج کل وہ اپنی ماں، بہن کے ساتھ اپنے نانا کی دو ہزار گز کی کوٹھی میں رہتا ہے....." ایس پی نے بالآخر دھماکا کر دیا..... وارث علی نے آنکھیں پھاڑ کر ایس پی کی طرف دیکھا..... اسے واقعی یوں لگا تھا جیسے اس کے سر پر کسی نے بم پھوڑا ہے..... چند لمحے تو وہ بات کرنے کے قابل نہیں رہا تھا..... ٹکٹکی باندھ کر ایس پی کی شکل تکنے لگا۔

"نانا..... میری معلومات کے مطابق تو اس کا یہاں پر کوئی نانا، دادا نہیں تھا..... اگر ایسی بات ہوتی تو میری پیاری مرحومہ بیوی مجھے اپنے نانا سے ملانے ضرور لے کر جاتی..... جس لڑکی کا نانا دو ہزار گز کی کوٹھی میں رہتا ہو وہ لڑکی اپنے نانا کا رعب جمانے میں دیر نہیں لگاتی..... اور پھر سر جی جابر علی کا سسر کروڑ پتی، ارب پتی کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ تو شکل سے ہی مڈل کلاسیا لگتا ہے....." وارث علی نے تواتر سے بولنا شروع کر دیا تھا۔

"بولے چلے جا رہے ہو اندازے لگائے چلے جا رہے ہو....." ایس پی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ "یار ہم پولیس ڈیپارٹمنٹ والے اندازے لگاتے ہیں اس وقت جب ہمارے پاس چند سولڈ ٹھوس ثبوت آجاتے ہیں ورنہ ہم بستر پر لیٹ کر اندازے لگانے کی کوشش نہیں کرتے..... کیا ایک خاندان میں امیر، غریب رشتے دار نہیں ہوتے، ہوسکتا ہے مجبوری سے جابر علی سے شادی کرنی پڑی ہو، لڑکی صورت شکل کی اچھی نہ ہو، خدا نخواستہ اس میں کوئی جسمانی عیب ہو، اس کے رشتے نہ ملتے ہوں..... تو پھر بندہ جابر علی جیسے تنخواہ دار کو بیٹی کا ہاتھ تھما دیتا ہے..... سمجھا کرو یار..... ہر رئیس لڑکی کی شادی رئیسوں میں نہیں ہوتی۔"

"لیکن سر جی میں آپ کو یقین دلا رہا ہوں....." وارث علی کو ایس پی کی بات سے مطلق دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے تو ایس پی کے بولنے سے پہلے ہی اس حقیقت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا..... کہ جابر علی کا سسر

کروڑ پتی یا ارب پتی ہوسکتا ہے۔"

"اتنا امیر نانا ہوتے ہوئے وہ لڑکی میرے گھر آجاتی.....؟ جابر علی نے محلے کے دس بندے جمع کیے تھے اور سب کو چائے پانی پر ٹرخا دیا تھا اگر اتنے امیر نانا کی نواسی تھی تو بارات کو فائیو اسٹار ہوٹل میں ریسپشن دیتا..... بھائی عزت دار لوگوں کو اپنی عزت بہت پیاری ہوتی ہے، سر جی وہ نانا نہیں ہوگا..... ہوسکتا ہے کوئی دور پرے کا رشتے دار ہو۔"

"میری اطلاع کے مطابق اس کوٹھی کا مالک شہر کا ایک معروف بزنس مین ہے جس نے مختلف جگہوں پر کروڑوں روپے لگائے ہوئے ہیں..... sleeping partner ہے پیسہ لگاتا ہے اور منافع اٹھاتا ہے۔ یار ستر پچھتر برس کا بندہ ہے..... اب بس اپنے پیسے سے ہی کھیل، کھیل سکتا ہے۔"

"نہیں سر جی نہیں، آپ کے مخبر کی اطلاع غلط ہے، وہ نہ جانے کس کو برہان سمجھ کر کھوج لگانے گیا تھا..... آپ دوبارہ سے کھوج لگائیں..... مجھے پورا یقین ہے کہ مخبر کو مغالطہ ہوا ہے، جابر علی کا رشتے دار اتنا با اثر اتنا دولت مند ہو ہی نہیں سکتا..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا....."

"کیسے سوال پیدا نہیں ہوتا یار ہمارے اپنے خاندانوں میں تم نہیں دیکھتے، امیر، غریب، مڈل کلاس ہر طرح کے رشتے دار ہوتے ہیں۔" ایس پی جھنجلا گیا۔

"نہیں، نہیں سر جی نہیں..... وہ لڑکی بہت تیز تھی، اپنے باپ سے زیادہ پولیس والی لگتی تھی..... اگر وہ اتنے رئیس نانا کی نواسی ہوتی ناں تو میری ناک میں تنکا چلا دیتی۔ رعب جما جما کر..... میں پھر کہہ رہا ہوں آپ دوبارہ سے چھان بین کرائیں، مخبر کی اطلاع غلط ہے، اس نے کسی اور لڑکے کو برہان سمجھ لیا ہے۔"

"نہیں وارث علی، یہ میرا وہ مخبر ہے جس کی کوئی اطلاع آج تک غلط نہیں نکلی۔ بڑا اصاف ستھرا ریکارڈ ہے اس کا۔ میں آنکھیں بند کرکے اس کی خبر پر بھروسا کرتا ہوں۔ میں تمہیں شاہ عالم کی کوٹھی کا نمبر دے رہا ہوں..... میرا مطلب ہے کہ ایڈریس دے رہا ہوں تم جا کر خود پتا کرو....." یہ کہہ کر ایس پی نے دراز کھولی اور ایک فولڈ کیا ہوا کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور وارث علی کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ رہا اس کا پتا..... خود جا کر تسلی کرلو پتا چل جائے گا کہ برہان اپنی ماں، بہن کے ساتھ وہاں رہتا ہے یا نہیں....." وارث علی پر اب جیسے سکوتِ مرگ طاری ہوچکا تھا۔ اس کی بے شمار نہیں، نہیں کے جواب میں ایس پی کا چہرہ بہت پُراعتماد اور پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ وارث علی نے وہ کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا کھولا اور شاہ عالم کے گھر کا ایڈریس دیکھنے لگا..... شاہ عالم اس نے زیرِلب شاہ عالم کا نام لیا۔

ایس پی اپنے مخصوص افسرانہ اسٹائل میں وارث علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پولیس والوں کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے پہلا خیال یہی آتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ہر وقت شک اور بے یقینی میں مبتلا رہتے ہیں اور مسلسل شک کی وجہ سے ان کی آنکھوں کا ایک خاص زاویہ بن جاتا ہے اور وہ ہر کسی کو اسی زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ تو جب اپنے معصوم جگری دوست کو بھی دیکھتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے کہہ رہے ہوں کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

☆☆☆

رانی رات سے لے کر اب تک ایک اذیت ناک اندرونی جنگ میں مبتلا تھی۔ روما سے اکیلے ملنے کا موقع ہی مل کر نہیں دے رہا تھا۔ وہ ہر طرح سے اسے بہلانے اور سمجھانے کی کوشش کرسکی تھی۔ انسان اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے جو کچھ سوچ سکتا ہے، جہاں تک اس کے خیال کی اڑان جاتی ہے وہی سب کچھ وہ کر گزری

تھی لیکن کسی خیال میں اور کسی دھوکے نے اس کا دل مطمئن نہیں کیا..... وہ جو اتنے ذوق شوق سے باہر جانے کی تیاریاں کر رہی تھی دن رات صرف ایک سوچ میں تھی کہ بس اسے اس کا چہرہ واپس مل جائے.....

اگر وہ پیدائشی طور پر سیاہ فام یا بدشکل ہوتی تو شاید اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ چہرے کی خوب صورتی کی کیا اہمیت ہوتی ہے اور جو چہرہ بھی اسے ملتا..... وہ اسی چہرے سے محبت کرتی اور اسی چہرے کو آئینے میں دیکھتے ہوئے خواب دیکھتی..... کیونکہ آئینہ دیکھتے ہوئے خوابوں کی اڑان اور پرواز کا تعین کیا جاسکتا ہے..... بہت سے پری چہرہ جب خود کو آئینے میں دیکھتے ہیں تو ساتھ ہی اسی آئینے میں ان کو اپنی پشت پر ہیرے موتیوں سے آراستہ شاہی تخت بھی نظر آنے لگتا ہے اور وہ اپنے اس چہرے کو پیار سے دیکھتے ہوئے سوچتے ہیں کہ وہ تو کسی تخت پر بیٹھنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں..... اسی طرح سے وہ چہرہ جو دوسروں کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا لیکن جس کا چہرہ ہوتا ہے وہ اپنے اسی چہرے کے ساتھ کچھ خوب صورت خواب اپنی آنکھوں میں سجا ہی لیتا ہے، اپنی بساط کے مطابق..... اپنی نظر آنے والی حدود کے مطابق..... لیکن اسے تو برہان کے ملنے کے بعد کسی پل کسی کل چین نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ اپنا وہی چہرہ پھر سے آئینے میں دیکھنا چاہتی تھی تاکہ وہ آئینہ بہت جلد کوئی منصب عطا ہونے کی خوشخبری سنائے..... اور کسی کے دل میں اتر جانے سے زیادہ عظیم منصب اور کیا ہوسکتا تھا..... اس سے بڑا منصب تو کوئی نہیں ہوتا۔

سر فتح کیے جاتے ہیں تو وہ فتح عارضی ہوتی ہے، دل فتح ہوجاتے ہیں تو گویا کائنات تسخیر ہوجاتی ہے..... اسے تو ایک دل فتح کرنے کی دُھن لاحق ہوگئی تھی..... صبح، دوپہر، شام اس کے نشانے کی زد پر وہی دل تھا جس میں اترنے اور فتحیاب ہونے کی خواہش اتنی شدت اختیار کرچکی تھی..... جیسے کسی مرض الموت میں مبتلا مریض کی زندہ رہنے کی خواہش میں شدت ہوتی ہے۔

لیکن یہ کیا..... ایک فلک بوس عمارت آنِ واحد میں زمیں بوس ہوچکی تھی..... "نہیں، نہیں..... ایسا نہیں ہوسکتا روما.....! روما کے لیے ہزار دروازے کھل جائیں گے مگر میرے پیچھے تو بلائیں لگی ہیں مجھے ان بلاؤں سے بچنے کے لیے کسی منتر کا حصار چاہیے۔ جانے کب خالہ جانی جذبات میں آکر اٹھ کھڑی ہوں اور اماں جان کو علاج کے لیے داخل کرادیں..... اماں جان پھر ٹھیک ٹھاک ہوکر آئیں اور میرے لیے کسی سہراب خان کی تلاش شروع کردیں..... نہیں، نہیں برہان سے پہلے کچھ نہیں دیکھا تھا اور برہان کے بعد تو..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... روما تم میرے راستے میں نہیں آؤ گی....." رانی کی کیفیت گویا پاگلوں جیسی ہورہی تھی..... کیسے رات کٹی کیسے صبح ہوئی اس نے ناشتے میں کیا کھایا..... صبح سے دوپہر ہوگئی..... اور پھر دوپہر بھی ڈھلنے لگی..... اس کا ذہن رات کے اس پہر جس جگہ اٹکا تھا ہنوز اسی جگہ اٹکا ہوا تھا..... لیکن روما سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ہی مل کر نہیں دے رہا تھا۔ یا تو روما، کائنات کے ساتھ دکھائی دی یا پھر bed room میں سوتی ہوئی اب کسی سوتے ہوئے بندے کو اٹھا کر اتنی مشکل اور حساس نوعیت کی باتیں تو نہیں کی جاسکتیں، جانے بندہ کس سوال کا کیا جواب دے دے "لیکن میری آنکھوں نے جھوٹ نہیں دیکھا....." رانی نے پھر خود کو یقین دلایا..... اور دھوکا دینے والی بہن کو جیسے دونوں ہاتھوں سے پرے کردیا..... گڑبڑ تو ضرور ہے لیکن میں آج رات سونے سے پہلے، پہلے سب کچھ جان کر رہوں گی۔

خیالات کے بوجھ سے اس کے اعصاب شل ہوگئے..... وہ بیڈ کے کونے پر سر جھکائے بیٹھی تھی..... غیر ارادی طور پر مٹی کے ڈھیر کی طرح بیڈ پر ڈھے گئی..... معاً اسے اپنے بے سروپا اندیشوں پر ہنسی آگئی۔

"اماں جان اگر ٹھیک بھی ہو جائیں اور میرے لیے کسی نئے سہراب خان کو تلاش بھی کرنے لگیں تو اس مرتبہ وہ نہیں ہو سکے گا جو پہلے ہوا تھا۔ یہ داغ، داغ چہرے کو دیکھ کر کوئی خاک روب بھی مجھ سے شادی کرنا پسند نہیں کرے گا..... اس چہرے نے تو مجھے بہت بڑے عذاب میں گرنے سے بچایا ہے اور شاید...... اسی لیے بچایا ہے کہ کسی نے ملنا تھا اور مجھے بھی پتا لگنا تھا کہ خواب صرف ڈراؤنے نہیں ہوتے حسین بھی ہوتے ہیں...... لیکن میرے حسین خواب اور یہ رونا...... نہیں نہیں میں اسے اپنے کمرے میں بلا کر لاتی ہوں...... میرا خیال ہے سو گئی ہوگی......" رابی ایک دم تڑپ کر جیسے پھر سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور پاؤں سلیپر میں پھنسانے لگی۔

☆☆☆

برہان کے اٹھارہ انیس سال داؤ پر لگ گئے تھے۔ صابرہ نے اسے بتایا تھا کہ اس کا جب اسکول میں ایڈمیشن ہوا تو اس کی عمر پانچ سال تھی اور اب جبکہ وہ اپنے تعلیمی مراحل کے آخری دور سے گزر رہا تھا...... قیامت برپا ہوگئی، جہاں تک نظر اٹھاتا اسے ہر چیز گردش کرتی ہوئی دکھائی دیتی۔ جیسے ہر شے نے اپنی جگہ چھوڑی ہو اور دوسری شے سے ٹکراتی پھر رہی ہو۔

شاہ صاحب جیسے انسان دوست بندے نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو یوں لگا جیسے ان کی ہتھیلی سے کوئی جادو بھری لہر نکل کر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی ہو...... اس کے ٹوٹے ہوئے حوصلے پھر جڑنے لگے اور آج وہ اپنی ساری ہمت مجتمع کر کے یونیورسٹی چلا آیا۔ اگر اب بھی نہ آتا تو کیا کرتا، صابرہ اور شبینہ کے اداس چہرے دیکھتا جو کسی نہ کسی بہانے سے اس کے باپ کا ذکر چھیڑ سکتی تھیں اور وہ اتنا دلبرداشتہ اور باپ سے برگشتہ تھا کہ ذکر بھی یوں لگتا تھا جیسے کوئی اس کے نرخرے پر الٹی چھری چلا رہا ہو...... اور کہہ رہا ہوں کہ خاموشی سے ذبح ہو جاؤ منہ سے ایک لفظ نہ نکالنا۔

کئی دن بعد یونیورسٹی میں قدم رکھا تو یوں لگا جیسے وہ کسی ایسی جگہ آیا ہے جہاں برسوں پہلے اس کا گزر ہوا تھا...... ہر چیز اجنبی، اجنبی اور دھندلی، دھندلی محسوس ہو رہی تھی...... حال کے بجائے ماضی کا عکس دکھائی دے رہی تھی۔ کلاس فیلوز......... اساتذہ...... سب کی آنکھیں اسے اپنے جسم سے چپکی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ جیسے ہر کوئی کھوج کر رہا ہو۔

"یار تم اتنے ذلیل کیسے ہوگئے......؟ شکل سے تو بڑی اچھی ماں کے بیٹے لگتے ہو...... پھر ذلتوں کا سودا کیسے ہوگیا......" اس سے قبل کہ شدید روحانی اذیت اسے نڈھال کر دیتی...... اس کے قدموں سے سکت چھین لیتی......

شاہ صاحب کا خیال آتے ہی نئے سرے سے اس کے وجود میں توانائیاں بھر گئیں اور جو کچھ بھی انہوں نے سمجھانے بجھانے کے معنوں میں اس سے کہا تھا وہ بازگشت بن کر اس کے حافظے میں گردش کرنے لگا...... بالکل ایسے ہی جیسے جسمانی توانائی حاصل کرنے کے لیے کوئی جادو اثر ٹانک استعمال کیا جاتا ہے اور لوگوں میں زندگی پوری قوت سے دوڑنے لگتی ہے۔

شاہ صاحب کے شفقت بھرے لہجے میں بالکل کچھ ایسا ہی اثر تھا کہ وہ ذرا کی ذرا شاہ صاحب کو سوچتا تھا اور حوصلہ آنکھیں ملتا ہوا اس کے روم، روم میں انگڑائیاں لینے لگتا تھا۔

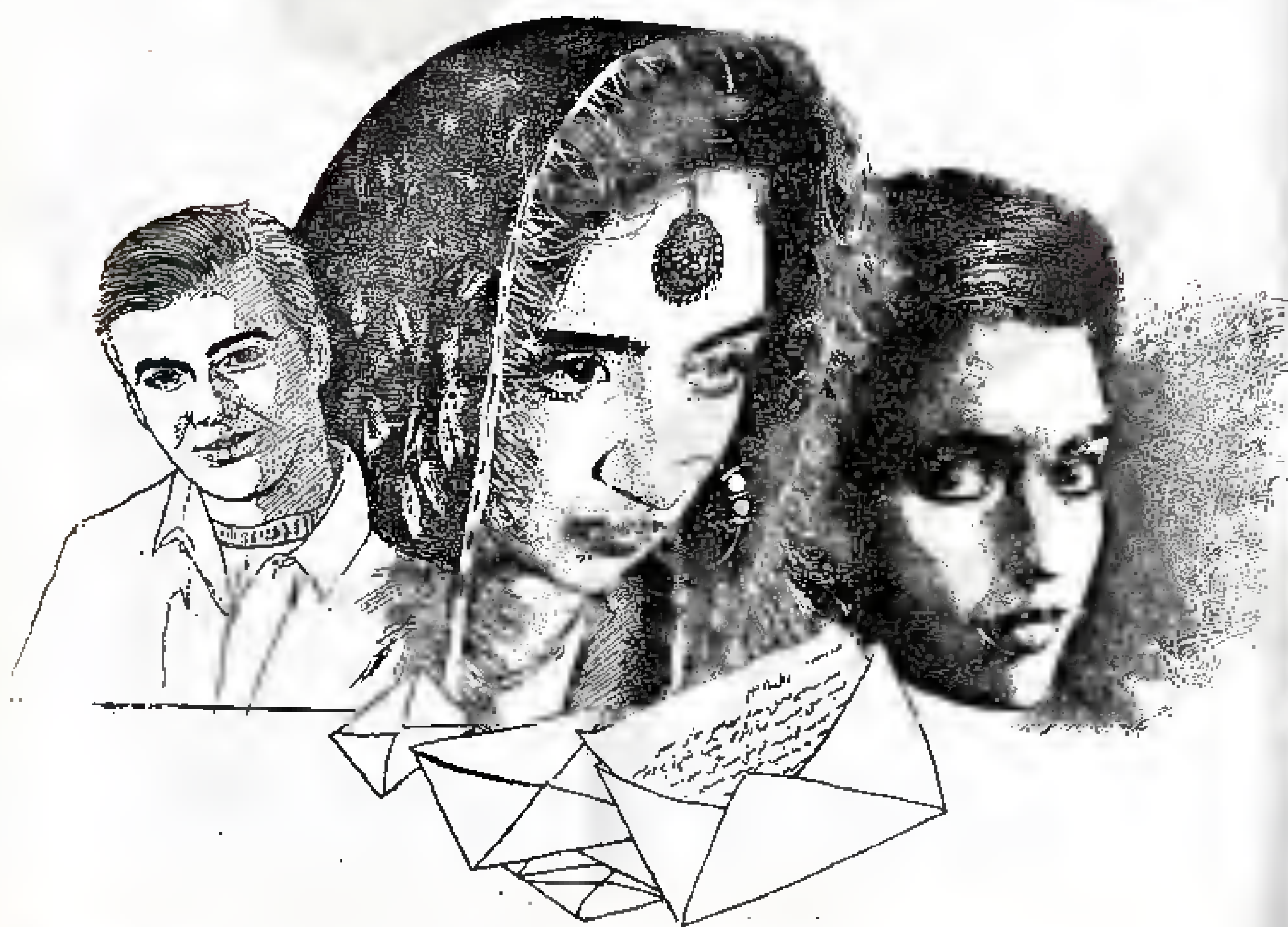
"بیٹا گرنے والے کو یہ دنیا روند کر چلی جاتی ہے۔ اٹھانے والے تو نصیب سے ملتے ہیں، خود کو گرنے مت دینا......" شاہ صاحب کی آواز بازگشت کی صورت اس کے حافظے کی دیواروں سے ٹکرانے لگی۔

جاری ہے

"آپا...... میری پیاری آپا دیکھیں آج سبحان کی شادی ہے۔ میں نے آپ سے کیے ہوئے وعدے کو پورا کیا۔ ہر وہ خوشی سبحان کو دی جس کی تمنا آپ کرتی تھیں۔ پیاری آپا میں نے سبحان کی شادی اُسی کی مرضی سے طے کی۔ ارم بہت پیاری لڑکی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے گھر کو جنت بنا دے گی۔" تبسم نے کوثر کی تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یوں بات کی جیسے وہ تصویر سے نہیں بلکہ اپنی بڑی بہن

اک کنواری جسم کی پیاس

عنیقہ محمد بیگ



کوثر کے پاس بیٹھی ہوا اور اپنی بہن کے جواب کی منتظر بھی۔ کچھ دیر کے بعد اس کی آنکھیں فریم کو دیکھتے، دیکھتے بھر آئیں۔ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''پیاری آپا آپ نے اپنے سسرال والوں کے ظلم سہہ، سہہ کر جان دے دی۔ مجھے پندرہ سال اور سبحان کو سات سال کی عمر میں چھوڑ کر چلی گئیں۔ آپ نے میرا سوچا نہ ہی سبحان کا اور سبحان کی صورت میں اتنی بڑی ذمے داری مجھے سونپ دی۔ میری نظروں میں آج بھی وہ منظر ٹھہرا ہوا ہے جب آپ کی سانسیں آپ کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں اور آپ مجھ سے وعدہ لے رہی تھیں ''سبحان کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دینا۔ اسے کوئی دکھ بھی... چھو نہ سکے'' آپا وہ وعدہ میں نے نبھایا۔ آج سبحان ایک کامیاب بزنس مین ہے۔ اپنے قدموں پر کھڑا ہے۔'' بولتے، بولتے اس کے آنسو فریم پر گرنے لگے۔ فریم دھندلا گیا۔ سبحان نے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولا اور اپنی خالہ کو کمرے میں پا کر دبے قدموں وہ ان کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ سفید پر سنہری کڑھائی کی شیروانی میں ملبوس وہ بہت حسین لگ رہا تھا۔ اس کا کھلا کھلا چہرہ یک دم بجھ گیا جب اس نے اپنی خالہ تبسم کو ماں کی تصویر کے ساتھ روتا پایا۔

''خالہ..... میری پیاری خالہ، آپ نے اماں کی وفات کے بعد مجھے ایک ماں، ایک بڑی بہن اور ایک اچھا دوست بن کر میرا دکھ بانٹا اور حد درجہ پیار دیا۔ آپ کیوں اس طرح رو رہی ہیں؟'' اس نے ان کے ہاتھوں کو تھام لیا اور انہیں چومتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اپنا فرض بخوبی نبھایا ہے پھر یہ اداسی بھلا کیوں؟''

''کاش میری آپا زندہ ہوتیں اور تمہاری خوشیوں میں شامل ہوتیں۔'' اس نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا اور فریم کو سینے سے لگا کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

''اوہو خالہ..... میری خالہ، دل برا مت کریں۔ آپ یوں روئیں گی تو میرا سوچیں، میں تو ٹوٹ کر بکھر جاؤں گا۔'' اس کے چہرے کا رنگ مزید پھیکا پڑ گیا۔ سبحان کے بجھے چہرے کو دیکھ کر تبسم نے ہمت باندھی اور اپنے آنسوؤں پر قابو پانے لگی۔ سبحان نے جھٹ سے بات کو پلٹا۔

''خالہ آج میری شادی ہے۔ مجھے کچھ تو بتائیں میں اس شیروانی میں کیسا لگ رہا ہوں؟'' اس نے خالہ سے فریم تھام لیا اور معصوم سا چہرہ بنا کر پوچھنے لگا۔ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے تنقیدی نظروں سے مسکرا کر عزیز از جان بھانجے کو دیکھا اور پھر ہنس کر بولی۔

''بس ٹھیک ہی لگ رہے ہو۔'' وہ اب مزید اسے افسردہ دیکھنا نہیں چاہ رہی تھی اس لیے اس نے بات خوشگوار انداز میں کی۔ وہ ہنسنے لگا۔

''بس ٹھیک.....؟ بس ٹھیک.....؟ آپ کا بھانجا بس ٹھیک لگ رہا ہے؟'' اس نے تین دفعہ پوز بنا کر اسے دکھائے۔

''اللہ نظر بد سے بچائے..... بہت اسمارٹ اور پرکشش لگ رہے ہو۔'' مسکرا کر اس نے سبحان کے سر پر پیار دیا۔

''آپ بھی یلو سوٹ میں بلا کی حسین لگ رہی ہیں۔'' وہ شریر سا ہوا تو تبسم نے پیار سے اس کے کان کھینچے۔

''ارم کے گھر جانا بھی ہے یا پھر یہاں ہی رہنے کا موڈ ہے جناب کا۔'' وہ وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائیں۔

''ہاں..... ہاں آپ چلیں میں بس ابھی پیچھے، پیچھے آتا ہوں۔'' اس نے شائستگی سے جواب دیا۔ جبھی تبسم نے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا اور اسے دعائیں دینے لگی۔

☆☆☆

وہ دلہن کے روپ میں سجی بنی اس کے کمرے میں بیٹھی تھی اور وہ اس کا ہاتھ تھامے محبت سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟'' آخر ارم نے ہی خاموشی کو توڑا اور اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر جھیل سی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں اتنا خوش قسمت بھی ہو سکتا ہوں۔'' اس نے محبت سے اسے دیکھا۔ وہ مسکرائی اور شریر لہجے سے بولی۔

''میں خواب ہوں اور آپ نیند میں ہیں جونہی آپ نیند سے بیدار ہوں گے میں غائب ہو جاؤں گی۔'' وہ شریری ہوگئی۔

''نہیں، نہیں پلیز ایسا نہیں......'' اس نے فوراً اس کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا اور ہنسنے لگا۔

''اچھا ایسی بات ہے تو پھر جلدی سے آپ میری اچھی سی تعریف کر دیں۔'' وہ مسکرانے لگی۔

''بہت پیاری...... رنگیلی بہت پیاری۔'' وہ پیار سے اسے دیکھ کر بولا۔

''بس اتنی چھوٹی سی تعریف..... حد ہے بھئی۔'' وہ اسے گھورنے لگی۔ وہ اس کی چوڑیوں کو چھونے لگا اور پھر کچھ سوچتے، سوچتے مسکرا کر بولا۔

''اتنی پیاری ہو کہ ستاروں نے آسمان کے چاند کو فکر میں ڈال دیا کہ اس سے کہیں زیادہ حسین چاند سبحان کی زندگی میں شامل ہوا ہے۔''

''اچھا..... سچ، اس کا مطلب یہ ہے ستاروں نے آسمان کے چاند کا دل توڑ دیا ہے۔ میں ابھی ستاروں کے کان مروڑ کر آتی ہوں۔'' اس نے بیڈ سے اٹھنے کے لیے حرکت کی۔

''اوہو، آپ کہاں جا رہی ہیں؟ میں ستاروں کے خود کان مروڑ دوں گا۔'' اس نے ہنستے، ہنستے جواب دیا۔

''نہیں، نہیں بے چارہ چاند رو رہا ہوگا مجھے جانا چاہیے۔'' وہ مزید شریر ہو کر اپنی ہنسی دبانے لگی۔ جبھی وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''اگر تم اِک پل بھی میری آنکھوں سے اب کبھی دور ہوئیں تو میں رونے لگوں گا۔'' اس نے معصوم سا چہرہ بنا لیا اور وہ ہنسنے لگی۔

''اچھا تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ ہم اپنا ہنی مون چاند پر بنا لیتے ہیں۔ اس طرح چاند بھی خوش ہو جائے گا اور ستاروں کے کان بھی اچھی طرح کھینچ لیں گے۔ کیوں، یہ ٹھیک ہے ناں؟'' وہ مطمئن لہجے سے پوچھنے لگی۔

''جب میرے پاس اتنا پیارا اپنا چاند ہے تو مجھے کہیں جا کر ہنی مون کی کیا ضرورت۔'' اس نے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا..... تو اس کا مطلب ہم ہنی مون پر کہیں نہیں جائیں گے؟'' وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''اوہو جائیں گے یار مگر......'' اس نے بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا مگر؟'' وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی جس کے دل میں پہلے ہی اس کی سہیلیوں نے ہزار باتیں ڈال دی تھیں۔

''سبحان اکلوتا ہے اور اس کی ساس بھی کنواری، مطلب کیا وہ اپنی خالہ کو اکیلا چھوڑ کر جائے گا؟''

''میری جان یہ وقت اگر مگر کی کھال ادھیڑنے کا نہیں۔'' اس نے جھٹ سے ایک خوب صورت مخمل کی سرخ ڈبیا جیب سے نکالی اور اسے کھول کر اس کے آگے کی۔ ڈبیا کے اندر گولڈ در یاقوت کی ایک بہت پیاری انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

''اوہ یہ میرے لیے ہے ناں۔'' وہ بچوں کی سی معصومیت سے بولی۔ سبحان نے ارم کے نازک ہاتھ

کو تھاما اور پیار سے اس کی نازک انگلی میں وہ انگوٹھی پہنائی اور ہنستے ہوئے بولا۔

''جی جناب، یہ انگوٹھی بھی آپ کی ہے اور یہ غلام بھی...... پڑوسن کے لیے تھوڑی لایا تھا۔'' وہ شریر سا ہوا۔ سبحان کی بات پر اس نے زور سے قہقہہ لگایا اور پھر دونوں کے خوشگوار محبت بھرے قہقہوں سے حجلۂ عروسی گونج اٹھا۔

☆☆☆

''کیوں بھئی تم لوگ میری وجہ سے ہنی مون پر نہیں جا رہے۔ میں چھوٹی بچی تھوڑی ہوں کہ اب اکیلے نہیں رہ سکوں گی۔ مجھے تمہارے اس فیصلے پر بہت دکھ ہوا ہے۔'' شروع کے دن تو دعوتوں میں گزر گئے۔ پندرہ دن بعد اس روز وہ اور سبحان ناشتے کی ٹیبل پر اکھٹے تھے تو اس نے مصنوعی خفگی بھرے انداز میں کہا۔

''بھلا آپ سے اس سلسلے میں کس نے بات کی؟'' اس کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آنے لگے۔

''جو بھی ہے بس تم لوگ ہنی مون پر جا رہے ہو۔ یہ میرا فیصلہ ہے اور ہاں مجھ سے کسی نے کوئی بات نہیں کی بس میں خود چاہتی ہوں کہ تم ارم کو ہر وہ خوشی دو جس کا وہ حق رکھتی ہے۔ وہ خوش رہے گی تو گھر کا ماحول بھی ہمیشہ خوشگوار رہے گا۔''

''اچھا تو اس کا مطلب ہے کہ ارم نے آپ سے بات کی ہے؟'' وہ تھوڑا غصے سے بولا اور ناشتے سے اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

''نہیں، نہیں ارم نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی...... اب خواہ مخواہ اس سے جھگڑا مت کرلینا۔ ابھی شادی کو دو ہفتے ہی ہوئے ہیں اپنا موڈ خراب مت کرو۔''

''مگر یہ بات میرے اور ارم کے درمیان تھی، لازم ہے کہ ارم نے ہی آپ کے ساتھ بات کی ہے بھی تو آپ پریشان ہیں۔ میں ابھی آپ کے سامنے ارم سے بات کرتا ہوں۔'' اس نے کرسی چھوڑ دی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''سبحان! یہاں بیٹھو۔'' وہ اس کے ردعمل پر گھبرا سی گئی اور وہ غصے سے ارم کو پکارنے لگا۔

''ارم...... ارم...... ارم!'' باورچی خانے میں کھڑی ارم جو ملک شیک بنانے کی غرض سے آئی تھی سبحان کے یوں پکارنے پر گھبرا سی گئی اور تیزی سے اس کی آواز پر لپکی۔

''جی...... جی، کیا ہوا؟'' اس کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔

''ارم، تم نے میری خالہ سے شکایت کی کہ ہم لوگ ہنی مون پر ان کی وجہ سے نہیں جا رہے؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔

''نہیں...... نہیں تو، میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔'' وہ گھبرا کر خالہ کی طرف دیکھنے لگی۔

''جھوٹ مت بولو ارم، مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم میری ماں جیسی خالہ کو اتنی اذیت دو گی۔'' اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

''سبحان! اپنے غصے کو قابو رکھو۔ ارم نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔'' تبسم نے اسے سمجھایا۔ وہ سبحان اور ارم کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس موضوع پر سبحان سے بات کر کے اس نے بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔

''ارم، آئندہ تمہاری وجہ سے خالہ کو کوئی پریشانی ہوئی تو...... تو......'' اس نے غصے سے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ غصے سے بس اسے گھورتا رہ گیا۔

''پلیز سبحان! میرا یقین کرو۔'' وہ التجائیہ انداز میں بولی پھر خالہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ ''خالہ آپ ہی بتا دیں کہ میں نے ایسی کوئی بات آپ سے نہیں کی۔'' اس نے مدد مانگی اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''سبحان، بات یہیں ختم کر دو۔ ارم نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ درحقیقت میں نے خود اس بات کو محسوس کیا ہے۔'' اس نے فکرمندی سے اس کا ہاتھ تھام لیا جو بہت غصے سے ارم کو گھور رہا تھا۔

''جو بھی ہوا آپ کا دل تو میری وجہ سے ٹوٹا ناں۔'' وہ پریشان نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''نہیں، میرا دل کیوں ٹوٹے گا میرے پیارے بھانجے۔'' وہ شائستگی سے بولی۔ ارم نے اپنا سر جھکا لیا اور وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے لگی۔ اسے نشا پر غصہ آ رہا تھا جس نے اس مسئلے پر تبسم کو احساس دلایا تھا۔

''خالہ، میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا ہوں۔ آپ اور ارم دونوں اس موضوع پر مجھ سے نہ ہی بات کریں تو اچھا ہے۔'' اس نے غصے سے فیصلہ سنایا اور پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ دونوں پریشان کھڑی ایک دوسرے کو دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

ارم نے اپنی سہیلی نشا سے فون پر روتے ہوئے کہا۔

''نشا تمہیں میری ساس سے اس مسئلے پر بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ تم جانتی نہیں، سبحان نے میری کتنی انسلٹ کی ہے۔ شادی کی پہلی رات ہی اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں کبھی اس کی خالہ کو پریشان نہیں کروں گی اور صرف دو ہفتے میں ہی میں نے اس کے وعدے کا خیال نہیں رکھا۔'' وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

''اوہو ارم! سارے مرد ایسے ہی وعدے لیتے ہیں۔ یار خود کو سنبھالو کوئی بڑی بات نہیں ہوئی جس کے لیے یوں ہلکان ہو رہی ہو۔''

''نہیں نشا، تمہیں ہنی مون کے سلسلے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں نے سبحان کا دل دکھایا ہے، وہ بہت اپ سیٹ تھا۔''

''اچھا...... اگر بات نہ کرتی تو یوں ہی وہ تمہاری ہر خوشی چھین لیتیں۔ اچھا ہے شروع میں ان پر بھی سب کچھ واضح ہو جائے تاکہ آئندہ وہ تم دونوں کے کسی پروگرام میں رکاوٹ نہ بنیں۔''

''سبحان بھلا میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا کہ اس نے ایک وعدہ مجھ سے لیا اور میں اس پر قائم بھی نہیں رہ سکی؟''

''ابھی تمہاری پوری زندگی پڑی ہے یار۔ یہ وعدہ نہیں نبھا سکی تو کوئی اور وعدہ نبھا دینا اور ایسے وعدوں پر ایک سال ہی چلا جا سکتا ہے۔ تم میری ساس کو دیکھ لو میں ان کی کتنی خدمت گزار تھی مگر اس کے باوجود وہ مجھ سے خوش نہیں تھیں پر جونہی میں نے زبان کھول دی وہ چپ کر کے بیٹھ گئیں۔ نیکی کا زمانہ نہیں ہے ارم تمہیں بھی پہلے سے ہی اپنے حق کی بات ضرور کرنی چاہیے۔ مجھے یقین ہے تبسم آنٹی گھر کے سکون کے لیے تمہاری ہر بات مانیں گی۔'' نشا نے لفظ چباتے، چباتے اسے مشورہ دیا۔

''اچھا چلو ایسا کر کے دیکھتی ہوں مگر خدانخواستہ کچھ الٹا ہو گیا تو؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''اوہو کچھ نہیں ہوگا۔ تم اپنے تیور بدلو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری قسمت بدل جائے گی۔'' نشا نے قہقہہ لگایا اور پھر یک دم دروازے پر کسی کی آمد کا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ وہ دیر تک اس کی باتوں کو سوچتی رہی۔

☆☆☆

چند ماہ بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ واقعی تبسم خالہ کی وجہ سے اس کی ہر خوشی ادھوری رہ جائے گی۔ وہ باورچی خانے میں ہنڈیا بنا رہی تھی جب خالہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔ وہ ارم کی مدد کے لیے آئی تھیں۔

''آج کیا پکا رہی ہو ارم؟'' انہوں نے پیار

سے اس سے پوچھا۔

''آپ کو نظر نہیں آرہا چکن قورمہ بنارہی ہوں۔'' ارم نے بے نیازی سے کہا۔ تبسم اس کے لہجے پر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ''مجھے کیا روز، روز آپ سے پوچھ کر ہنڈیا پکانی پڑے گی۔ یہ گھر جتنا آپ کا ہے اتنا میرا بھی ہے۔'' ارم نے ان کا کوئی لحاظ نہیں کیا اور ہنڈیا بھوننے لگی۔

''ارم تم سبحان کی وجہ سے اپ سیٹ ہو۔ میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے ہر بات پر فوقیت دیتا ہے۔ میں اسے سمجھاؤں گی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت تمہیں دے۔ کل رات وہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ وقت کا اسے اور نہ مجھے اندازہ رہا پھر اس کے جانے کے بعد تم لوگوں کے کمرے سے جھگڑنے کی آواز بھی سنائی دی۔ میں کافی پریشان ہوگئی تھی۔ سبحان تمہاری انسلٹ کرتا ہے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے، میں اسے کل رات یہی باتیں سمجھا رہی تھی کہ تم اس کی بیوی ہو اور تمہاری بات سننا اس کا فرض ہے۔''

''اچھا...... ایسی بات تھی تو پھر آپ نے آکر اپنے بھانجے کو میری انسلٹ کرنے سے روکا کیوں نہیں؟ میں اچھی طرح سے سمجھ گئی ہوں، آپ بھی دل سے مجھے خوش دیکھنا نہیں چاہتیں۔ آپ کی شادی ہوئی ہوتی تو آپ کو احساس ہوتا ناں کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔'' ارم نے غصے سے چولہا بند کیا اور انہیں گھورتی ہوئی باورچی خانے سے باہر چلی گئی۔

تبسم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا بدلتا رویہ دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

''پلیز ارم...... مجھے معاف کردو تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ میں غصے میں نہ جانے کیا فضول، فضول بول جاتا ہوں پلیز اب ناراضی ختم کرو۔'' سبحان نے محبت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے منایا۔

''سبحان میں بھی آپ سے کب خفا رہنا چاہتی ہوں۔ آپ ہی دو دن سے مجھے اگنور کررہے ہیں۔'' وہ رونے لگی۔

''پلیز ارم، مجھے معاف کردو۔ میں نے سچ میں تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے مگر تبسم خالہ کے میری زندگی پر اتنے احسانات ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ انہوں نے میری وجہ سے اپنی زندگی میں آنے والی کسی خوشی کو قبول نہیں کیا پھر اب میں کیسے انہیں تنہا چھوڑ دوں۔ تم سمجھ رہی ہو ناں؟'' اس نے محبت بھرے لہجے میں اسے سمجھایا۔

''ہاں...... ہاں، میں سب سمجھ رہی ہوں۔ آئندہ میں تمہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔'' اس نے دل پر پتھر رکھ کر اسے تسلی دی مگر درحقیقت اس نے اپنا مشن شروع کردیا تھا۔

''چلو تو پھر آج کا کھانا کسی اچھے سے ہوٹل میں چل کر کھاتے ہیں۔'' اس نے خوشی سے بتایا۔

''ریئلی؟'' وہ یک دم خوش ہوگئی۔

''تم جلدی سے تیار ہوجاؤ۔'' اور وہ الماری کی طرف بڑھنے لگی پھر نرمی سے بولی۔ ''سبحان آپ خالہ سے بھی کہہ دیں ہم اکٹھے چلتے ہیں۔'' اس نے بہ مشکل ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر انہیں بھی ساتھ لے جانے کو کہا۔

''ریئلی...... تم...... خالہ کو بھی؟'' سبحان کا چہرہ چمکنے لگا۔

''ہاں بابا، تم کیا سمجھتے ہو کہ صرف خالہ کو تم ہی پیار کرتے ہو۔'' وہ مسکرائی۔ وہ اس کے پاس آکھڑا ہوا اور اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

''ارم، تم نے سچ میں میری پریشانی کو دور کردیا۔ میرے ذہن میں خالہ کی فکر تھی۔'' اس نے اپنی سوچ ظاہر کی اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ غصے سے منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''ہاں بس، بہت جلد ہم دونوں کے درمیان آنے والی ہر پریشانی کو...... دور کردوں گی۔'' اور پھر الماری سے کپڑے لے کر وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ اس کا موڈ شدید آف تھا۔

☆☆☆

''اُف خدایا...... جتنا موڈ آف کروں ان کی محبت بڑھتی جاتی ہے۔ میں آخر کروں تو کیا کروں؟'' اس نے فون پر چیخ کر نشا کو اطلاع دی۔

''اس کا مطلب ہے وہ تم سے زیادہ چالاک ہیں۔'' وہ سوچتے...... ہوئے بولی۔

''تو اور کیا! مجھے تو نہیں لگتا کہ میں کبھی دو پل کہیں اکیلے سبحان کے ساتھ جا کر انجوائے کرسکوں گی۔ اگر کبھی مجھے کوئی موقع بھی ملتا ہے تو سبحان کے ذہن میں ان کی فکر چھائی ہوتی ہے۔'' اس نے بے بسی سے بتایا۔

''اُف نند ہوتی تو تم اس کی جلد شادی کرسکتی تھیں مگر یہاں تو ساس ہے اور وہ بھی کنواری۔'' نشا نے فکرمندی سے بیزار ہوکر جواب دیا۔

''مجھے یہ مصیبت ساری زندگی جھیلنی پڑے گی۔ اس کا کچھ نہیں ہوسکتا۔'' اس نے ہار مان لی۔

''اوہو...... ارم، ایسا مت سوچو بلکہ ایسا سوچو کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔'' اس نے ہنستے، ہنستے مشورہ دیا۔

''تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟'' وہ اس کے قہقہے پر تجسس سے پوچھنے لگی۔

''بس جناب، تم دیکھتی جاؤ جو مشورہ میں تمہیں دینے والی ہوں ناں۔'' نشا نے اسے تسلی دی۔

''کیسا مشورہ؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''ایسا مشورہ ہے کہ پل میں تمہاری جان ہمیشہ کے لیے تمہاری کنواری ساس سے چھوٹ جائے گی۔'' نشا نے کھنکتے لہجے میں جواب دیا۔

''سچ...... ایسے کیسے ہوسکتا ہے، تم یقین سے

اہمیتِ سلام

☆ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت انسؓ سے فرمایا۔ ''اے بیٹے جب تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ تو سلام کیا کرو، یہ سلام تمہارے لیے اور تمہارے گھر والوں کے لیے برکت کا سبب ہوگا۔'' (ترمذی 99/2)

☆ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا۔ کون سا عمل سب سے بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ''اللہ کے بندوں کو کھانا کھلانا اور جانے پہچانے اور انجان ہر ایک کو سلام کرنا، سب سے افضل عمل ہے۔'' (بخاری)

☆ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''سب سے بڑا بخیل وہ ہے جو سلام کرنے میں بخل کرتا ہے۔'' (مشکوٰۃ)

سلام کا اجر و ثواب

سلام کرنا سنت اور جواب دینا واجب ہے، واجب کا ثواب سنت سے زیادہ ہوتا ہے لیکن سلام کرنے کی سنت کا ثواب جواب دینے کے واجب سے زیادہ ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح)

جب کسی مسلمان کو سلام کیا جائے تو اس کے ذمے جواب دینا تو واجب ہے، اگر بغیر کسی عذرِ شرعی کے جواب نہ دے تو گناہ گار ہوگا، البتہ جواب دینے میں دو باتوں کا اختیار ہے، ایک یہ کہ جن الفاظ میں سلام کیا گیا ہے ان سے بہتر الفاظ میں جواب دیا جائے، دوسرے یہ کہ بعینہٖ انہی الفاظ سے جواب دے دیا جائے۔ (معارف القرآن)

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

کہہ رہی ہو؟'' ارم کے چہرے پر خوشی سی چھا گئی۔
''بالکل سچ اور اب ذرا توجہ سے میری بات سنو......'' تبسم آہستہ آواز میں اسے سمجھانے لگی اور اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھرنے لگی۔

☆☆☆

تبسم کمرے میں اپنی مرحومہ بہن کی تصویر نکال کر بیٹھی تھیں۔ جب سبحان نے دروازے پر دستک دی۔
''کون ہے؟'' تبسم نے تصویر کو جھٹ سے دراز میں رکھ کر پوچھا۔
''میں ہوں خالہ، سبحان۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ وہ دروازے کی طرف لپکی اور دروازہ کھول کر واپس بیڈ پر آ بیٹھی۔ وہ جانتی تھی سبحان آج پھر وہی سوال پوچھنے آیا ہے۔ وہ نظریں چرا کر اس کے پاس آ کر بولا۔
''آج عثمان صاحب کی بہن منگنی کی رسم کے لیے آ رہی ہیں!'' اس نے دبے، دبے لہجے سے اطلاع دی۔
''ٹھیک ہے، میں تیار رہوں گی۔'' تبسم نے فوراً جواب دیا مگر اپنا جھکا ہوا سر نہ اٹھایا۔
''خالہ آپ شادی کے لیے تیار تو ہیں ناں؟'' اس نے پھر سے پوچھا۔ اسے اس رات کے واقعے پر یقین نہیں آ رہا تھا جب اس نے خالہ کو دیکھا جورات کے آخری پہر محلے کے کسی اوباش آدمی کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر جا رہی تھیں۔ اس کا دل دو ٹکڑے ہو گیا۔ اس کا وجود زمین میں دھنسنے لگا۔ جب ارم نے اسے بتایا اس نے کئی بار تبسم خالہ کو اس کے ساتھ جاتے دیکھا ہے مگر وہ تبسم خالہ پر کیسے الزام لگا سکتی تھی۔ وہ اسے دکھ دینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جو اپنی تبسم خالہ کی شرافت کی قسمیں کھاتا تھا اس منظر کو دیکھ کر... اندر سے چکنا چور ہو گیا۔
اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عثمان صاحب سے اپنی خالہ کا بیاہ کر دے گا مگر تبسم نے انکار کر دیا اور بات آگے نہ بڑھ سکی مگر اب تبسم خالہ کی زندگی کا فیصلہ اس نے خود لیا تھا جس پر انہوں نے بھی چپ سادھ لی۔
''میں اس شادی کے لیے تیار ہوں۔'' تبسم نے نظریں ملا کر اسے جواب دیا۔
''خالہ آپ نے اپنا گھر بسانا تھا تو......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کی آنکھوں میں نمی بھر آئی ـ کمرے میں ارم بھی آ کھڑی ہوئی تھی۔
''کیا ہوا ہے؟ سبحان تم پریشان دکھائی دے رہے ہو؟'' ارم نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔
''ارم تم کچھ دیر کے لیے مجھے اور خالہ کو اکیلا چھوڑ دو۔'' سبحان نے اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
''نہیں سبحان، مجھے تھوڑا آرام کرنا ہے۔ تم اب جاؤ۔'' خالہ نے فوراً ہی بات کو پلٹ دیا۔ ارم نے غصے سے سبحان کو دیکھا اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس سے پہلے وہ کچھ بولتا تبسم نے فکرمندی سے کہا۔
''دیکھو سبحان، ارم امید سے ہے اور میں نہیں چاہتی کہ تمہاری ذرا سی بے پروائی ہمارے خاندان کے لیے بری ثابت ہو۔ بس تم ابھی اسی وقت اس کے پاس جاؤ۔ اس کا خیال رکھو۔ میں بس یہی چاہتی ہوں۔'' تبسم نے ساری باتوں کو بھلا کر اسے اپنے گھر کا خیال رکھنے کا مشورہ دیا۔
وہ کتنا چیخا چلایا کہ اپنے حق میں کچھ تو بولیں کہ آخر وہ کیوں چھپ چھپ کر حیدر سے ملنے جاتی رہیں مگر تبسم نے زبان نہیں کھولی اور وہ اس کی اور ارم کی نظروں میں گناہ گار بنی رہی۔
دل پر پتھر رکھ کر اس نے سادگی سے تبسم خالہ کا نکاح کر دیا اور وہ رخصت ہو گئیں۔ ارم بہت خوش تھی مگر وہ خوش نہیں تھا۔ اسے اب بھی اس رات والے حادثے پر یقین نہیں آ رہا تھا۔
رخصتی کے بعد اس نے خود کو خالہ کے کمرے میں بند کر لیا۔ دیر تک رونے کے بعد اس نے غصے سے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی اُن کی ہر چیز کو گرا دیا تب اس کے قدموں کے پاس کچھ کاغذ آ گرے۔
اس نے حیرانی سے کاغذوں کو ایک کے بعد ایک کھول کر پڑھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

☆☆☆

''توبہ...... توبہ نہ جانے وہ کب سے چھپ کر اس اوباش انسان سے مل رہی تھیں، شکر ہے کہ اللہ نے اس گھر کی عزت کو بچا لیا ورنہ شاید ہم لوگ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔'' ارم نے تبسم کی بات کر کے پھر سے اس کا دل توڑا وہ بستر پر بت بنا بیٹھا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور چیخنے لگا۔
''ہاں سچ میں، میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔'' وہ گھبرا سی گئی۔ سبحان کے اس ردِعمل پر اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
''آپ کو منہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے، اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔'' وہ غصے سے اسے گھورنے لگا۔
''غلطی میری ہے جو...... جو میں نے آنکھوں دیکھے کو سچ سمجھا اور خالہ کی خاموشی کو سمجھ نہ سکا۔''
''کیا مطلب؟'' وہ گھبرا گئی۔
''مطلب تم اچھی طرح جانتی ہو۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر جانے لگا۔
''کچھ تو بتائیں آخر...... آپ...... آپ اس قدر کیوں پریشان ہیں اور میں کیا...... کیا جانتی ہوں؟ مجھے کچھ نہیں پتا؟'' وہ انجان سی بن گئی جبکہ اس نے ہی تبسم خالہ کو ایک انجان لڑکی بن کر خط لکھے تھے کہ...
''ان کے بھانجے سبحان نے اس کی زندگی کو

تباہ کر دیا اس نے ارم سے شادی سے پہلے اس کے ساتھ تعلقات رکھے۔ اس سے شادی کا وعدہ کیا اور اب وہ امید سے ہے اگر وہ یہ سچ جاننا چاہتی ہے تو حیدر کے ساتھ وہ اس سے ملنے کے لیے آ سکتی ہے ورنہ دوسری صورت میں وہ ارم کو ساری اصلیت بتا دے گی اور ایسا نہ ہو کہ سبحان کا گھر تباہ ہو جائے۔''
''ارم...... میرے گھر صرف میرے بچے کو بچانے کے لیے تمہیں دکھوں سے دور رکھنے کے لیے تبسم خالہ نے صرف خطوط کا راز جاننے کے لیے گھر سے باہر قدم رکھا تھا۔'' اس نے وہ سارے خطوط نکال کر ارم کی طرف بڑھائے۔
''یہ...... یہ کیسے؟'' اس نے انجان بن کر وہ خطوط پکڑے اور اپنے ہی لکھے الفاظ پڑھنے لگی اور پھر گھبرا کر بولی۔ ''یہ ہم سے کیا ہو گیا...... اُف وہ بے قصور تھیں۔'' سبحان نے وہ سارے خطوط اس کے ہاتھ سے پکڑ لیے اور پھر انہیں پھاڑتے ہوئے بولا۔
''ہم سے نہیں بلکہ یہ سب کچھ تم سے ہوا صرف تم سے...... تم خط لکھتے، لکھتے بھول گئیں کہ جس کلاس میں تم پڑھتی تھیں میں بھی اسی کلاس میں تمہارے ساتھ تھا اور تمہارے لکھے ہر لفظ سے بخوبی واقف ہوں۔ یہاں تک کہ تمہارا پسندیدہ لیٹر ہیڈ جو آج ان خطوط کی شکل میں میرے سامنے ہے۔'' وہ ڈر کر اسے دیکھنے لگی۔
''مجھے معاف کر دو سبحان۔'' اس نے روتے روتے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔
''ارم میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا مگر...... مگر میں تمہیں طلاق بھی نہیں دوں گا کیونکہ میرے گھر کو بچانے کے لیے تمہاری کنواری ساس نے جو قربانی دی ہے وہ میں ہرگز ضائع ہونے نہیں دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ رو دیا۔

ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی



چھٹا حصہ



آج کل ان کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی اور شاید وہ پہلے کی طرح جلدی صحت یاب ہوجاتے اگر مون کی طرف سے انہیں دھڑکے نہ لگے ہوتے......ان کی سب سے بڑی خواہش تو یہ تھی کہ مون ان کے ساتھ اس گھر میں رہے اور دوسری خواہش یہ تھی کہ مون شادی کرلے......اور ان کی بہت لاڈلی، تھوڑی ،ضدی، کچھ سرکش اور انتہائی غیر معمولی ذہین بیٹی ان دو باتوں کو ماننے سے قطعاً

دور تھی...... وہ جب بھی مون کے سامنے اپنی یہ دو خواہشات رکھتے تھے، مون انہیں ایسے، ایسے دلائل دے کر بے بس کر دیتی تھی کہ وہ دوبارہ کچھ کہہ ہی نہیں پاتے تھے۔

علی عیسیٰ کی خوشحال اور پُرسکون زندگی سے وہ جتنے مطمئن تھے، مون کی وجہ سے اتنے ہی اپ سیٹ، پریشان حال اور پُراذیت رہنے لگے تھے۔ وہ کیوں ایسی تھی؟ وہ کیوں ایسی ہوگئی تھی؟ یا پھر وہ شروع سے ہی ایسی تھی وہ باپ ہو کر بھی سمجھ نہیں پائے۔ ابھی کچھ دیر پہلے مون کی فون کال آئی تھی۔ اکلوتی بیٹی کی آواز سن کر ان کے دل میں دور تک ٹھنڈک اتر آئی تھی مگر اس کی باتوں نے اتنا ہی ان کے وجود کو برزخ بنا دیا تھا۔ وہ ابھی تک بہت ژولیدہ حال اور بکھری ہوئی سوچوں کے بھنور میں غرق ہو رہے تھے اور مون جیسے بڑے ہی عام لہجے میں ٹھوکروں سے کانچ اڑا رہی تھی۔ ان کے یہ کہنے پر کہ ”تم میرا حال پوچھنے بھی نہیں آئی بیٹا۔“ اور اسی قسم کے دوسرے شکوے سن کر مون نے سرسری لہجے میں کہا تھا۔

”آپ تو اکثر بیمار رہتے ہیں، اب ہر روز اپنا کام چھوڑ کر تو نہیں آسکتی۔“ اس کا لہجہ اتنا برا نہیں تھا جس قدر الفاظ زہریلے تھے۔ ان کے اندر کانچ ٹوٹ کر بکھرنے لگے تھے۔ ایسا زور کا دھچکا لگا تھا کہ بہت دیر تک وہ کچھ بولنے کے قابل بھی نہیں ہو سکے تھے۔ یہ ان کی اکلوتی، لاڈلی بیٹی تھی جس کے پاس باپ کی طبیعت پوچھنے کا بھی وقت نہیں تھا حالانکہ وہ جانتے تھے مون ان سے بے انتہا محبت کرتی تھی...... پھر اچانک بیچ میں کیا ہوگیا؟ وہ سوچتے تو مون کے اس رونے کے پیچھے تھوڑا بہت اپنا بھی قصور انہیں نظر آنے لگتا تھا مگر مون بھی آہستہ، آہستہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے گی یا احساسِ توہین کی زنجیروں سے نکل جائے گی، اپنی خام خیالی پر وہ بس سوچتے ہی رہ گئے تھے نہ وہ احساسِ توہین کے شکنجے سے نکل سکی تھی اور نہ ہی وہ کچھ بھول پائی تھی۔ اسے اوّل روز سے مالا کے وجود اور اس کی ذات سے نفرت تھی، یہ نفرت بڑھ تو سکتی تھی کم نہیں ہو سکتی تھی۔

ان کے سینے پر ایک بوجھ نما راز دفن تھا اور جب اس بوجھ کا وزن دُگنا ہو جاتا ان کی برداشت سے بڑھ جاتا تب وہ اسپتال کے بستر پر پہنچ جاتے تھے۔ اب بھی سینے سے اٹھتی ٹیسوں کو دبائے وہ مسلسل مون کے بارے ہی میں سوچ رہے تھے۔

”تمہارے پاس اپنے بیمار باپ سے ملنے کا بھی وقت نہیں رہا بیٹا۔“ انہوں نے کیسے اپنے بکھرے حواسوں پر قابو پا کر بہ مشکل شکوہ کرنے کی کوشش میں آنسوؤں پر بند باندھا تھا۔

”نہیں......“ مون نے کٹھور پن کی انتہا کر دی تھی۔ ان کے دل کو پھر سے دھچکا لگا۔

”تم ایسی تو نہیں تھیں مون......“ وہ رو دیے تھے مگر مون ان احساسات کو سمجھنے سے بہت دور جا چکی تھی۔ اس پر باپ کے بھرائے لہجے نے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ وہ بہت سنگ دل ہو چکی تھی۔

”آپ میرے لیے متفکر نہ ہوا کریں......“ اس نے غصیلی آواز میں کہا۔

”تو پھر کون متفکر ہوا کرے......؟“ انہیں گہرا رنج ہوا۔ مون کی باتیں اکثر ان کے دل میں پیوست ہو جاتی تھیں۔

”پلیز پاپا! کوئی بات اور نہیں تو میں فون بند کرتی ہوں، کام ہے مجھے۔“ وہ سخت بیزار لہجے میں بولی تھی۔

”میری بات سنو......“ انہوں نے بے ساختہ مون کو روکا تھا۔ وہ جو فون بند کرنے لگی تھی ایک دم رک گئی۔

”گھر کب آؤ گی؟“ اس کی خاموشی محسوس کر کے حبیب احمد نے پھیکے لہجے میں پوچھا۔

”یہ سوال مت کیا کریں......“ وہ رکھائی سے بولی۔

”کیوں......؟“ انہیں پھر سے دھچکا لگا۔

”میں جواب نہیں دے سکوں گی۔“ مون بولتے، بولتے ذرا دیر کے لیے چپ کر گئی تھی تبھی انہوں نے دوبارہ بے چینی سے پوچھا۔

”کیوں......؟“

”آپ کو برا لگے گا۔“ وہ ایک مرتبہ پھر ذرا سا رک گئی۔

”اچھا...... تو تمہیں اس بات کا خیال ہے؟“ ان کی نم آنکھیں مسکرا دی تھیں تب مون کچھ جھنجلا گئی۔

”ہے تو مگر......“ وہ شاید فون بند کر دینے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کال طویل ہوتی دیکھ کر جھلاہٹ کا شکار تھی۔

”اگر خیال ہے تو اپنے پاپا کی خاطر گھر لوٹ آؤ بیٹا!“ ان کے لہجے میں آس بھیگ رہی تھی۔ وہ آزردگی کی انتہا پر تھے اور مون کٹھور پن کی انتہا پر......

”یہ ممکن ہے، اگر آپ ”اسے“ یا مجھے، ہم دونوں میں سے ایک کو قریب رکھیں، آپ میری بات مان جائیں، میں آپ کی بات مان جاؤں گی۔“ اس نے وہی بات کی جس کا انہیں دھڑکا تھا تو اس کا مطلب ہے مون نے اپنے دل میں لگی گانٹھ کو ابھی تک نہیں کھولا تھا۔ وہ کتنے بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔

”تم کیوں نہیں سمجھتیں بیٹا! یہ ممکن نہیں۔“ وہ رو دینے کو تھے مگر دوسری طرف پروا کسے تھی۔

”جب ممکن ہوا تب اپنی ڈیمانڈ میرے سامنے رکھیے گا۔“ مون زہرخند ہوئی...... تب وہ گویا اندر سے ایک مرتبہ پھر ٹوٹ گئے تھے۔

”تمہارا اعتقاد کیوں اتنا کمزور ہوتا جا رہا ہے؟ کیوں نہیں، تمہیں سمجھ آتی، جو محبتیں ہمارے نصیب کی ہوں، دنیا کی کوئی طاقت انہیں ہم سے نہیں چھین سکتی۔ وہ ہمیں مل کے ہی رہتی ہیں اور جو ہمارے حصے کی نہ ہوں انہیں ساری دنیا مل کے بھی ہمارا نہیں کر سکتی۔“ وہ قطرہ، قطرہ پگھل گئے تھے، مون کی سرکشی، ضد اور جذباتیت انہیں اتنی ہی تکلیف دیتی تھی۔ اس کی ایک ضد نے انہیں برسوں کا بیمار بنا دیا تھا۔

”میرے سامنے عیسیٰ کی طرح اقوالِ زریں بولنا مت شروع ہو جایا کریں......“ مون چیخ کر رہ گئی...... اکثر باپ اور بھائی کی باتیں اسے لاجواب کر دیتی تھیں پھر جب اس کے پاس دلائل ختم ہو جاتے تھے تب وہ دوسرا حربہ استعمال کرتی تھی پھر کیا مجال تھی، اس کے باپ یا بھائی کی جو وہ اس کے سامنے کوئی اور دلیل اٹھا لاتے۔ مون اس وقت بھی چاہتی تو اپنے باپ کو لاجواب کر سکتی تھی مگر فی الحال دوسرا حربہ استعمال کرنے کا اس کے ذہن میں خیال نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ وہ اپنے ذہن کو کبھی کبھی بہت ریلیکس کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتی تھی، اب باپ کی نیندیں حرام کر کے وہ خود کو پُرسکون کر رہی تھی، کیسی خود غرض بیٹی تھی وہ۔

”تمہارا باپ ہوں، تمہیں بھٹکتا نہیں دیکھ سکتا۔“ وہ بھرائی آواز میں بولے۔

”آپ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے، نہ کل کچھ کیا تھا اور نہ آج کچھ کریں گے۔ میں خود بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ آپ شاید جانتے نہیں، میں تو محض آپ کی محبت کو آزما رہی تھی اور آپ کی محبت کتنی کمزور نکلی...... بس علی عیسیٰ اور مالا تک محدود ہے آپ کی محبت...... اور دیکھیے گا، میں وہ سب کر کے دکھاؤں گی جو آپ وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے۔“

اس کے لہجے میں کیسی فرعونیت بھری تھی۔ حبیب احمد گویا دہل، دہل گئے۔

"تجھے خوف نہیں آتا مون......" ان کو اگلے الفاظ ہی بھول گئے...... مون کے لب و لہجے میں پوشیدہ دھمکی نے ان کے حواس معطل کر دیے تھے۔ وہ گویا سر سے لے کر پیروں تک منجمد ہو گئے تھے۔ وہ کیا چاہتی تھی؟ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی؟ وہ انہیں ڈھکے چھپے لفظوں میں کیا بتا رہی تھی؟

"نہیں......" اس نے ایک مرتبہ پھر ان کے حواس معطل کر دیے تھے۔

"تو تمہیں کسی بات کا خوف نہیں رہا...... پھر بھی تم سمجھ نہیں رہیں بیٹا! کہ تم راستہ بھول رہی ہو۔" حبیب احمد کی آواز کسی عمر رسیدہ بزرگ کی طرح کپکپا رہی تھی۔ مون اللہ کی طرف سے ان کے لیے آزمائش اور امتحان بن رہی تھی۔ ان کا جھٹکے کھاتا وجود بے بس ہو رہا تھا۔ یہ ان کی بیٹی کا ذہن اور سوچ اسے کس سمت لے جا رہے تھے؟ وہ کیوں نہ خوف زدہ ہوتے؟ مون نے ایک ننھے سے خواب کو بچانے کی خاطر جان کی بازی لگا رکھی تھی۔

"میں رستہ نہیں بھول رہی...... بس ایک خواب بچا رہی ہوں، پہلا اولین خواب...... جسے آپ نے اپنے ہی قدموں تلے کچل دیا......" اس کی سانسیں پھنکار رہی تھیں حالانکہ لہجہ تو اب بھی اس کا بہت دھیما تھا۔ سرگوشیانہ سا، مدھم سا...... مگر اس کے لفظ تلوار کی دھار تھے۔

"وہ خواب تمہارے نصیب کا نہیں تھا، تمہارے حصے کا نہیں تھا پھر تم نے اسے کیوں دیکھا......؟ اس میں رنگ کیوں بھرے......؟ تم نہیں جانتی تھیں کیا......؟ خوابوں میں حقیقت کے رنگ صرف اللہ بھرتا ہے اگر خواب دیکھ لیا تھا تو پھر اس کی تعبیر کے لیے اللہ سے مدد مانگتی، دعا کرتی...... یقیناً وہ دلوں کو پلٹنے والا ہے، یقیناً وہ اس کے دل کو بھی پلٹ دیتا......" وہ ٹوٹے بکھرے لہجے میں بے آواز روتے ہوئے بولتے جا رہے تھے مگر دوسری طرف سماعتوں پر خمار کا پردہ چڑھا تھا۔ اپنی بے پناہ صلاحیتوں پر مان اور خمار کا پردہ...... وہ کیوں نہ پھر مون کی سرکشی سے خوف زدہ ہوتے......

"میں گمراہ یا سرکش نہیں، نہ رستہ بھولنے والی ہوں...... آپ کیوں نہیں سمجھتے...... اللہ خود مدد کے لیے زمین پر نہیں اترتا...... وسیلے بنا دیتا ہے اور میری صلاحیتیں، میرے لیے وسیلہ ہیں۔" مون نے جھنجلا کر وضاحت کی تھی۔ عموماً وہ وضاحتیں کرتی نہیں تھی مگر پاپا کے "سرکشی" والے طعنے اسے صفائی دینے پر مجبور کر دیتے تھے۔

"اپنی صلاحیتوں کا ناجائز استعمال نہ کرو، یہ بھی گناہِ کبیرہ ہے، اپنے علم کو بھی ناجائز نہ بانٹو، یہ بھی گناہِ کبیرہ ہے۔" وہ بے ساختہ اسے ٹوک گئے تھے۔

"اور ثواب کیا ہے؟ احساسِ توہین میں جکڑ کر عمر گزار دینا، ٹھکرائے جانے کی تکلیف سہنا......؟ انتقام لینا، نہ بدلہ لینا......؟" مون غضبناک ہو گئی۔

"تمہیں کسی نے نہیں ٹھکرایا...... غلط بات مت کرو۔" حبیب احمد نے گویا منت کی تھی۔

"آپ دوسروں کے عیبوں پر پردہ مت ڈالیں، میں جانتی ہوں، جس نے جو بھی میرے ساتھ کیا تھا۔" وہ انتہا کی بدگمان تھی۔

"کسی نے تمہارے ساتھ کچھ نہیں کیا، تم نصیب کے لکھے پر شاکر کیوں نہیں ہوتیں......؟" حبیب احمد زیرِ لب بڑبڑا رہے تھے تب کسی نے چپکے سے دروازہ کھول کر قدم اندر رکھے تھے۔ پھر کوئی دبے قدموں چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا...... وہ چونکے تو تب تھے جب کسی نے ریسیوران کے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے کان سے لگا لیا تھا۔ ائرپیس سے وہی پُراثر، دھیمی مگر سلگتی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"ابھی تک صبر اور شکر کیے تو بیٹھی ہوں...... ورنہ جانے کیا کچھ کر ڈالتی، آپ کا خیال ہی تو ارادوں کو توڑ ڈالتا ہے......" جانے کس رو میں اس نے پہلی مرتبہ کمزور لہجے میں کچھ کہا تھا۔ شاید باپ کی محبت اسے کبھی کبھی کمزور کر ہی دیتی تھی۔ عیسیٰ نے اک گہری سانس لی تھی اور دوسری طرف مون کی اتنی تیز حسیات تھیں کہ اس نے محض عیسیٰ کے سانس لینے والے اسٹائل سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ ریسیور پاپا کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

"تم بھی پہنچ گئے؟" مون نے زیرِ لب بڑبڑا کر کہا تھا، وہ جانتی تھی عیسیٰ نے جتنی بات سن لی تھی، اس پر تبصرہ کیے بغیر رہنے والا نہیں تھا۔

"پاپا کا خیال تمہارے یعنی مون حبیب کے ارادوں کو توڑ دیتا ہے۔ اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہوگی؟ تم اپنے آپ سے نکل کر دوسروں کے لیے سوچنے لگی ہو، اتنی بڑی تبدیلی...... یقیناً میں حیران ہوں۔"

عموماً مون اپنے بھائی سے کم، کم ہم کلام ہوتی تھی، اسے عیسیٰ کی مقناطیسی باتوں سے خوف آتا تھا۔ جیسے اب آ رہا تھا، وہ عیسیٰ سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی یہ تو اچانک عیسیٰ اس کے فون کی خوشبو کا پیچھا کرتا آ گیا تھا حالانکہ مون جانتی بھی تھی، وہ آفس سے آنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزارتا ہے، یہ عیسیٰ کا معمول تھا اور مون کی توقع کے برعکس عیسیٰ شادی کے بعد بھی اپنی روٹین بدل نہیں سکا تھا۔ وہ تو یہی سمجھتی تھی، عیسیٰ شادی کے بعد بہت بدل گیا ہے، حالانکہ دور سے دیکھنے والی چیز کے بارے میں غلط اندازے لگانا اس کے فن میں شامل نہیں تھا۔ وہ جانے کب تک خاموش رہتی مگر عیسیٰ کی دھیمی نرم آواز طلسم توڑ ڈالتی تھی۔

"کیا تم لائن پر موجود ہو مون......؟" عیسیٰ نے گلا کھنکھار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور مون گویا خیالات کی دنیا سے حیران، حیران باہر نکلی تھی۔

"تم جانتے تو ہو، مجھے اپنی ذات بہت عزیز ہے۔" وہ فی الفور سنبھل کر گویا ہوئی تھی۔ اپنی کسی کمزوری کو واضح کرنا اسے گوارا نہیں تھا۔ عیسیٰ کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"وہ کہتے ہیں ناں......" اس نے مسکراہٹ روک کر کچھ یاد کرنے کی کوشش میں خاموشی اختیار کی تھی پھر نرمی سے گویا جتانے لگا۔

"گزرے لمحوں کو بھلانے میں کچھ وقت لگے گا
اپنی ذات سے باہر نکلنے میں کچھ وقت لگے گا"

"آں...... ہاں......" عیسیٰ کے کلام کو سن کر مون نے برجستہ اسے ٹوکا تھا...... "میں اپنی ذات کے بُت کدے سے باہر نکلنے والی نہیں......" در پردہ وہ اسے لاجواب کرنا چاہ رہی تھی۔ مون ایسا کر بھی سکتی تھی اگر اپنے اوپر والے پورشن (دماغ) کا کمال حاصل کرتی تو...... مگر آج وہ کسی اور ہی موڈ میں تھی۔ ذہنی طور پر خود کو تھکانا نہیں چاہتی تھی۔

"یاد رکھنا پیاری مون......! بت ٹوٹ بھی جاتے ہیں...... اللہ تمہیں ایسی اذیت سے بچائے......" عیسیٰ نے بے ساختہ اسے ٹوکا تھا۔

"تم مجھے اتنا کمزور نہ سمجھو......" وہی ضدی سا کچھ کچھ کر و فر انداز...... بھلا مون کا باپ اور بھائی پوری جان سے کانپتے کیوں نہ......

"اتنی اونچائی پر مت جانا مون......! کہ ہم تم تک اور تم ہم تک پہنچ ہی نہ پاؤ...... یاد رکھنا، جب اللہ کسی کو اونچی جگہ پر کھڑا کرتا ہے تو اسی پر بھروسا رکھنا چاہیے یا تو جب گرنے کے قریب وہ سہارا دے گا، ورنہ اڑنا تو سکھا ہی دے گا...... بات صرف اللہ پر بھروسے کی ہے، اپنے ایمان کو کمزور مت کرو...... اور اونچائی پر کھڑے ہو کر غرور بھی مت کرو، تمہیں اونچائی پر کھڑا کرنے والا بھی اللہ

ہے اور اونچائی سے زمین بوس کرنے والا بھی وہی خدا ہے۔ اس کے بھروسے کی رسی کو چھوڑو گی تو نہ دنیا رہے گی نہ آخرت.....'' عیسٰی نے تحمل سے اپنی بات کی وضاحت دلیل کے ساتھ کی تھی۔ موں کو یہی لہجے لاجواب کرتے تھے اور وہ لاجواب ہو کر اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''میرا ایمان کمزور نہیں۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا تھا، اب کہ لہجہ مضبوط تھا پر الفاظ ذرا کمزور تھے۔ وہ جو باتوں کو پکڑنے کے فن سے آشنا تھا اس وقت سابقہ کسی لمحے کو پکڑ کر سامنے لے آیا تھا۔

''بواریا کے (کرخ) گرجا گھر میں کھڑے ہو کر بھی یہی کہو، تو بات بنے..... جہاں تمہارا جانا ضروری نہیں ہوتا، وہاں کیوں جاتی ہو؟'' عیسٰی نے کتنی پرانی بات کا حوالہ دیا تھا..... جب وہ مالا کو ہمراہ لے کر گروبی کی طرف گیا تھا اور وہ مالا کو بواریا کا تاریخی گرجا گھر دکھا رہا تھا، تب اس نے موں کو وہاں دیکھا تھا مگر جتایا بعد میں بھی نہیں تھا۔ آج اتنے دنوں بعد اسے جتانے کا موقع بالآخر مل ہی گیا تھا۔ وہ موقع کی مناسبت سے بات کرنے والوں میں سے تھا۔ بعد میں کئی ملاقاتوں کے دوران بھی اس نے موں کو گرجے جانے پر کبھی کچھ کہا نہیں تھا۔ آج موقع ملا تو اس نے گنوایا بھی نہیں تھا۔ موں کچھ پل کے لیے چپ سی کر گئی تھی۔

''میں تم سے ملنے وہاں گئی تھی، سوزن کے لیے یا گرجے کی کشش میں نہیں۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ یقیناً وہ سچ بول رہی تھی۔ تب عیسٰی نے اِک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''تم مجھ سے ملنے گئی تھیں پر ملی نہیں..... مجھے دیکھ کر تم غائب ہو گئیں.....'' عیسٰی کا انداز اب بھی صاف جتانے والا تھا، موں کو بے حد برا لگا۔ وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولی۔

''تمہارے ساتھ وہ لڑکی تھی، سو میں وہاں سے چلی گئی، مجھے تمہاری بیوی نہیں پسند.....'' عیسٰی کی بات کے جواب میں ایسا روکھا، سچ باہر آنے والا تھا یہ عیسٰی کو بھی خبر نہیں تھی۔ اب کہ عیسٰی کچھ پل کے لیے گم صم رہ گیا..... حالانکہ وہ جانتا تھا کہ موں کو اس کی بیوی سے عجیب سی پُرخاش ہے۔ موں اسے پسند نہیں کرتی..... مگر یوں منہ پھاڑ کر موں کا سچ بولنا بھی عیسٰی کو اچھا نہیں لگا تھا۔

''اب تمہاری پسند، ناپسند کی حدود سے بات باہر نکل چکی ہے، مالا میری بیوی ہے، اس لحاظ سے تمہارے لیے بھی قابلِ احترام ہے۔'' عیسٰی نے تحمل کے ساتھ اسے سمجھانا چاہا تھا۔ پاپا اس دوران خاموشی کے ساتھ عیسٰی کی گفتگو سن رہے تھے۔ انہوں نے عیسٰی کو ٹوکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''وہ میرے لیے قابلِ احترام نہیں.....'' موں بے ساختہ چیخی۔

''تو پھر.....؟'' عیسٰی نے اچنبھے سے پوچھا۔

''اس کا نام میرے سامنے مت لیا کرو۔'' وہ زہرخند ہو رہی تھی۔

''نام نہ لینے سے کیا ہوگا.....؟ اس کی حیثیت میں تبدیلی نہیں آئے گی..... وہ میری بیوی ہی رہے گی۔'' عیسٰی اب ذرا سخت لہجے میں بولا تھا۔ موں کی ناگواری اور غصہ اسے بھی غصہ دلا رہا تھا۔

''وقت بہت کچھ ختم کر دیتا ہے۔'' کچھ دیر بعد وہ اپنے ازلی اعتماد سے گویا ہوئی..... وہی پُرتپش، پُراسرار قسم کا دھیما لہجہ..... عیسٰی کا ذہن الجھ گیا تھا۔

''وقت کم از کم رشتے ختم نہیں کر سکتا.....'' عیسٰی نے اندرونی بے چینی چھپا کر کہا تھا تب وہ ہولے سے دوسری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔

''بہت کچھ بدل جاتا ہے عیسٰی! تم جانے کتابوں سے کب نکلو گے۔'' موں نے استہزائیہ لب و لہجے میں کہا تھا، عیسٰی کچھ چونک گیا۔

''تم جو کتابوں کو چھوڑ چکی ہو۔'' عیسٰی کو قلق سا ہوا تھا، موں نے جب تعلیم ادھوری چھوڑی تھی تب عیسٰی کو سب سے زیادہ تکلیف ہوئی تھی مگر ہمیشہ کی طرح موں نے نہ پاپا کی بات مانی تھی اور نہ عیسٰی کے دلائل کو کوئی اہمیت دی تھی۔

''مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں.....'' وہ بے نیازی سے بولی۔

''سب سے بڑی غلطی ہی یہی ہے کہ اپنی غلطیوں سے بے خبر رہا جائے۔'' عیسٰی متاسف سا رہ گیا۔

''تو تم اپنی غلطی سے آگاہ ہو؟'' وہ بھی تو عیسٰی کی بہن تھی پھر بھلا کیسے چوک جاتی، چبھتا ہوا لہجہ عیسٰی کو خوب چونکا بھی رہا تھا اور موں کی بات کے ہر پہلو کی طرف اشارہ بھی کر رہا تھا۔

''پاکیزہ رشتوں کو غلطیوں سے عبارت کر رہی ہو.....؟ اگر شادی کرنا ایک غلطی ہے تو پھر میں واقعی گناہ گار ہوں۔'' عیسٰی بھی بے نیازی سے جتلا رہا تھا۔ تب موں نے بے ساختہ اسے ٹوک دیا۔

''شادی کرنا غلطی نہیں..... اگر سوچ سمجھ کر چھان پھٹک کے کی جائے.....'' اس نے اندر کی جلن باہر نکال ہی دی تھی۔ آج بہت عرصے بعد ان دونوں کے درمیان طویل گفتگو ہو رہی تھی۔ موں کو جتے ہوئے کتنے ہی ماہ و سال یاد آ گئے تھے جب وہ دونوں بہن بھائی اتنے قریب نہ تھی پر اتنے دور بھی نہیں تھے۔

''یعنی تم سمجھتی ہو، پاپا کا اور میرا انتخاب غلط ہے؟'' عیسٰی نے بہ مشکل ناگواری دبا کر پوچھا تھا۔

''ہاں..... اور وقت ثابت بھی کر دے گا۔'' وہ مطمئن تھی۔ گویا وقت کے اچانک پلٹا کھانے کا اسے یقین تھا۔ عیسٰی کو بے پناہ دکھ ہوا تھا مگر وہ کچھ دیر کے لیے چپ سا کر گیا..... بہت دیر کی خاموشی کے بعد عیسٰی نے سابقہ لہجے کو برقرار رکھ کر کہا تھا۔

''ایسا نہیں ہوگا.....'' عیسٰی بھی مطمئن تھا، اس کا لہجہ بھی ٹھوس اور مستحکم تھا۔

''سانپ کو آستین میں رکھ کر سمجھتے ہو کہ وہ ڈسے گا بھی نہیں.....'' موں کے اگلے الفاظ نے عیسٰی کے مستحکم یقین کو متزلزل کر دیا تھا۔ وہ گویا لمحے بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا..... اسے موں سے ایسی دلیری اور زہریلی بات کی امید نہیں تھی۔

''سانپ سے تمہاری مراد کیا ہے؟'' بہت دیر بعد عیسٰی نے بڑے ہی ضبط کے ساتھ پوچھا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا موں کبھی اچھی بات نہیں کرے گی مگر پھر بھی جانے کس امید کے تحت پوچھ لیا تھا۔

''مالا اور آفاق.....'' بالآخر موں نے اپنے اندر کا زہر باہر اگل ہی دیا تھا۔ دوسری طرف اتنے زور سے عیسٰی چلایا کہ موں کو اپنے کان پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔ وہ ایک دم دہل کر چپ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وہ اس کی چیخ پر دہل گیا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کا موبائل پکڑنے والا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا تھا۔ اس نے کچھ تپ کر موبائل کو دیکھا تھا جو بج، بج کر خاموش ہو چکا تھا۔ اس نے اسکرین کو روشن کر کے دیکھا، سامنے والی سفید جنگلی بلی کی کال تھی۔ اسے قلق سا ہوا، مالا کی ڈرامائی چیخ کی وجہ سے موبائل زمین بوس ہو چکا تھا اسے اٹھانے کے لیے وہ نیچے جھکا تو مالا کے ہونق سے چہرے پر نظر پڑی تھی۔ آفاق کا منہ کچھ کھل سا گیا تھا۔ اس نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھل کر کہا۔

''تم کبھی ہونق ہو جاتی ہو اور کبھی چیخ پڑتی ہو، آخر میری باتوں میں ایسا کیا راز ہے؟'' وہ..... بے چارگی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ موبائل کی اسکرین خاموش تھی، اس کا آدھا دھیان کال کرنے والی

میں اٹکا ہوا تھا اور آدھا دھیان مالا کی طرف چکر لگا رہا تھا۔

''یہ جو تم قسطوں میں بات کرتے ہو ناں...... ادھوری گفتگو چھوڑ کر اِدھر اُدھر توجہ دینا، آدھی بات کسی سے کرنا، آدھی بات درمیان میں چھوڑ دینا...... کسی دن اپنے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبو گے۔'' مالا نے سنبھل کر اس کے چودہ طبق بھی روشن کردیے تھے۔

''آں...... آں...... سمجھ گیا۔'' وہ چونک کر سیدھا ہوا تھا پھر اسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ خوب لمبا سا قہقہہ لگا کر وہ مالا کے غصیلے تاثرات کا جائزہ لینے لگا تھا پھر اس کا کام سے فارغ ہوکر ذرا سنجیدہ ہوگیا کیونکہ مالا بھی غصہ انتہائی سنجیدگی سے کررہی تھی۔

''وہ اصل میں یہ اچانک موبائل بج کے ماحول ڈسٹرب کرگیا تھا ناں......'' اس نے موبائل کو غصے سے اٹھا کر صوفے پر پٹخا تھا پھر مالا کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم وہ بات بتاؤ جسے ادھورا چھوڑ کے موبائل کے گیت سننے لگے تھے۔'' وہ بیزاری سے بولی تھی۔ ابھی اسے ٹیبل پر کھانا لگانا تھا۔ عیسٰی کے کپڑے نکالنے تھے جبکہ آفاق کی لن ترانیاں ختم نہیں ہورہی تھیں۔

''تم سے...... ایک التماس کرنا تھی۔'' وہ ایک مرتبہ پھر تمہید باندھنے لگا تھا جب مالا نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے تھے۔

''جو کہنا ہے، کہہ بھی دو، تمہیں اللہ کا واسطہ۔'' مالا گویا عاجز ہوچکی تھی تب آفاق نے ذرا پُرسوچ لہجے میں پچھلی بات کا حوالہ دے کر کہا۔

''پہلے مجھے تم یہ بتاؤ کہ محبت صرف ایک بندے تک محدود ہوتی ہے؟'' اس کا لہجہ اور انداز بہت پُرسوچ قسم کے تھے، مالا الجھ سی گئی۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' اس نے جز بز سا ہوکر پوچھا۔

''اوکے، اس بات کو رہنے دو، سوال مشکل ہے، مجھے صرف یہ بتاؤ کہ محبت کی صرف ایک ہی قسم اور ایک ہی نظر ہوتی ہے۔ کیا محبت ماں، بہن، بیٹی یا کسی دوست کے خلوص سے نہیں ہوسکتی؟'' آفاق نے آسان لفظوں میں اپنی بات کو واضح کردیا تھا، مالا گویا سمجھ کر ڈھیرے سے مسکرادی تھی، وہ جو یہ سوچ رہی تھی کہ آفاق جانے اب کون سی الجھنوں میں الجھاتا رہے گا، اب اس کی بات کے معنی سمجھ کر ہلکی پھلکی ہوگئی۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے بھی وہ ایک مرتبہ پھر اس کے حواسوں پر بجلی گراتا رک گیا تھا۔ آفاق کے ''تم سے'' جیسے دو لفظوں سے تو مالا کو اب خوف آنے لگا تھا۔ حالانکہ یہ خوف کچھ دیر پہلے بھی اس کے دل کو پنکھ لگا گیا تھا مگر اس کی وضاحت نے اسے پھول کی طرح ہلکا پھلکا کردیا تھا۔ اس کی خاموشی پر آفاق نے جھنجلا کر آواز لگائی تھی تبھی مالا چونک اٹھی۔

''ہاں، کیوں نہیں...... !'' اس نے مسکرا کر آفاق کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ تبھی وہ مزید بڑے اعتماد سے بولا۔

''تو پھر جان لو کہ مجھے تم سے اور عیسٰی سے بہت پیار ہے...... میری محبت تم لوگوں کے خلوص کے سامنے بالکل ہیچ ہے...... اور یہ محبت کسی بھی غرض سے پاک ہے جبکہ انی پڑوسن سے محبت اگرچہ بے غرض ہے مگر پھر بھی اس میں کچھ نہ کچھ غرض پوشیدہ ہے......'' وہ اپنی جھونک میں بولتا جارہا تھا جب مالا ایک مرتبہ پھر بے ساختہ چیخ پڑی۔

''انی سے؟ تو کیا تم انی سے محبت کرتے ہو؟'' پچھلی ساری باتیں نظرانداز کرکے وہ انی کے نام پر انتہائی شاکڈ رہ گئی تھی۔

''ہاں تو اور کیا......'' وہ آنکھیں مسل کر اثبات میں زور شور سے سر ہلاتا گیا...... ''مگر جو

محبت تم دونوں سے ہے، اس کی برابری انی بھی نہیں کرسکتی۔'' آفاق شاید بتانا چاہتا تھا کہ انی کی چار روزہ محبت ان دونوں کی محبت پر سبقت نہیں لے گی مگر مالا نے جھنجلا کر اسے ٹوک دیا تھا۔

''ارے...... ہمیں بھاڑ میں جھونکو...... مجھے انی کے بارے میں بتاؤ...... یہ معرکہ کب سرانجام دیا؟ ہماری ناک کے نیچے پوری لو اسٹوری چلتی رہی اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہوسکی۔'' مالا سخت متجسس اور بے چین ہوچکی تھی۔ آفاق کی محبت سے لے کر مجنوں بننے تک پوری کہانی سننا چاہتی تھی۔

''انی کے بارے میں کیا بتاؤں؟ اسے تو خود اپنے بارے میں خبر نہیں......'' اب وہ فلسفہ جھاڑنے کے موڈ میں نظر آرہا تھا تب مالا پھر سے جھنجلا گئی تھی۔

''اُف...... اب لمبی، لمبی مت چھوڑنے بیٹھ جاؤ...... جلدی بولو محبت کی ابتدا کے بعد کہانی فلاپ کیسے ہوگئی؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا تھا...... دراصل میز پر کھانا لگانے کی بھی جلدی تھی اور اتنی دیر تک تجسس پر قابو پانا بھی محال تھا۔ وہ اس کی پوری اسٹوری میں جہاں، جہاں عیسٰی کی محبت اور مالا کا خلوص سامنے آتا گیا، وہ اسے فارورڈ کرواتی ہوئی محض انی اور آفاق کے سین تک پہنچ گئی تھی۔

''پہلے میری بات سن تو لو، آگے بھی بتاتا ہوں۔'' وہ معاً انتہا کا سنجیدہ ہوگیا تھا۔ مالا نے ایک گہری سانس کھینچی۔ وہ جانتی تھی پوری حکایت سنے بغیر جان نہیں چھوٹے گی...... اور آفاق مختصر بات کرنے کا تو تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

''اب جلدی بولو، بیچ میں رکنا نہیں۔'' مالا جھلا گئی تھی۔

''دیکھو مالا! مجھے کچھ وضاحت کرنی ہے، یہ جو تم میری باتوں پر پریشان ہوجاتی ہو، تو اس کے لیے چھوٹی سی وضاحت دوں گا، مجھے عیسٰی اور تمہارے خلوص سے بہت محبت ہے۔ میں یہاں اجنبیوں کے دیس میں مارا، مارا پھر رہا تھا جب عیسٰی میرے لیے وسیلہ بن گیا...... میں اس گھر کا نمک کھاتا ہوں اور میں نمک حرام نہیں ہوں...... عیسٰی نے اگر مجھے یہاں رکھا ہوا ہے تو وہ مجھ پر اپنی ذات سے بڑھ کر اعتبار کرتا ہے۔ اسے مجھ سے کوئی خدشہ لاحق نہیں، وہ مجھ پر اعتماد کرتا ہے اور میں عیسٰی کا اعتبار توڑ دوں؟ یہ مجھے مر کے بھی گوارا نہیں ہوگا۔ باقی کہانی کچھ یوں ہے کہ انی مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور انی کی ممی کو بھی میں بطور داماد پسند آگیا ہوں مگر......'' وہ نان اسٹاپ بولتے ہوئے عادتاً رک گیا تھا تب مالا نے بے چینی سے کہا۔

''مگر کیا......؟'' اس نے عجلت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''یہی کہ میری دادی اور بہنوں نے محاذ کھڑا کردیا ہے۔ انہیں غم ہے کہ میں کسی میم کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں حالانکہ وہ جانتی بھی ہیں کہ یہاں شادی کرنا میری مجبوری ہے۔ محبت ایک طرف، اگر میں یہاں شادی نہ کرسکا تو کبھی سیٹلڈ نہیں ہوسکوں گا پھر ان لوگوں کے بڑے، بڑے خواب کیسے پورے ہوں گے؟ میرا فیوچر بھی نہیں بن سکے گا۔'' وہ اپنی پریشانی کی اصل وجہ مالا کو بتا کر اسے بھی متفکر کرچکا تھا۔

''تو پھر اب کیا ہوگا؟'' مالا سخت پریشان ہوگئی تھی۔ آفاق بھی فکرمند سا پیشانی ملتا بہت اپ سیٹ لگ رہا تھا۔

''ہونا کیا ہے؟ امی اور دادی کو منانا ہوگا مگر یہ کام عیسٰی ہی کرسکتا ہے۔ امی اور باجیوں کو عیسٰی پر بڑا اعتماد ہے۔'' آفاق نے سنجیدگی سے اگلے معاملات سے بھی آگاہ کیا...... تب مالا تھوڑا سا الجھ سی گئی تھی۔

"تم نے عیسیٰ سے بات نہیں کی۔" وہ کچھ سوچ کر حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"اگر عیسیٰ سے بات کر لیتا تو تمہارے سامنے بین بجانے کی کیا ضرورت تھی۔" آفاق جھلا کر بولا۔ مالا سخت برا مان کر خفگی سے تڑپتی تھی۔

"تو پھر اب میں کیا کروں.....؟" اس نے الجھ کر کہا تھا۔

"تم عیسیٰ سے بات کرو، وہ تمہاری بات بھی رد نہیں کر سکتا۔" آفاق ملتجی سا بول رہا تھا۔ مالا ذرا سا حیران ہوئی۔

"اور تمہاری بات رد کر دے گا؟" اس نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا تھا۔ آفاق کی دماغی حالت پہ اسے سو فیصد شک تھا۔ اب یقین بھی ہو چکا تھا۔ محبت نے اس کے حواس اچھے خاصے متاثر کر رکھے تھے۔

"ہاں کیونکہ وہ رشتوں کو ایک طریقے سے ساتھ لے کر چلنے والا بندہ ہے، جب میں اسے بتاؤں گا امی اور دادی نہیں مان رہیں تو وہ کہے گا' میں ان کی بات مان لوں..... جو میرے دل کو گوارا نہیں ہو گی......" وہ منہ بسورے پھر سے نان اسٹاپ شروع ہو چکا تھا۔ مالا ہونق سی ہو گئی۔

"عیسیٰ تمہاری محبت کو انجام تک لے جانے میں اگر تمہارا ساتھ نہیں دیں گے تو پھر میری طرف سے بھی جواب ہے۔" مالا نے گویا آنکھیں ہی ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ اس کا صاف کھرا جواب سن کر آفاق کو دھچکا لگا تھا۔

"ایں..... تم کیسی بہن ہو؟" اب وہ بہت خونخوار تیور لیے پوچھ رہا تھا۔ مالا کو فوراً اپنے لفظوں کا احساس ہو گیا۔ دراصل یہ لفظ ہی تو ہوتے ہیں جو ذرا سے ہیر پھیر کی وجہ سے پورا مفہوم ہی الٹ دیتے ہیں۔ کسی کو سمجھ آ جاتے اور کوئی ان کی گہرائی میں اترے بغیر اپنی مرضی کا مفہوم نکال لیتا ہے۔ اب مالا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو فوراً وضاحتی لہجے میں بولی۔

"میرا مطلب ہے اگر عیسیٰ ساتھ نہ دیں تو میں کیسے؟" وہ گڑبڑا کر چپ سی کر گئی..... تب اتنے کشیدہ ماحول میں بھی آفاق کو ہنسی آ گئی تھی۔ وہ دیر تک اس کی گڑبڑاہٹ سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔

"اُف اے مشرقی خاتون! نہیں آپ کی اطاعت گزاری اور وفا شعاری پر حرف آئے گا۔" وہ مسکرا مسکرا کر ہلکان ہو رہا تھا۔ اپنے جوگیوں والے حلیے میں ہنستا ہوا وہ قطعاً جوکر لگ رہا تھا۔ مالا کو سخت برا لگا۔

"میں مشرقی خاتون ہوں، مجھے اس پر فخر ہے۔" وہ ذرا اِترا کر اور تھوڑا جتا کر بولی تھی۔ تب آفاق نے فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔

"جانتا ہوں میں..... اب کیا اعلان کروا دوں....." آفاق نے مسکرا کر اسے چھیڑا تھا تب وہ چڑ کر رہ گئی تھی۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے؟" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"وہ ہی..... یعنی عیسیٰ سے بات کرو، وہ دادی کو منا لے، باقی انی کی ممی تو سمجھو تیار بیٹھی ہیں۔ انہیں میرے جیسا داماد تو کہیں مل ہی نہیں سکتا۔" اب..... اترانے کی باری آفاق کی تھی۔

"ایک بات بتاؤ آفاق کیا تم انی سے محبت کرتے ہو یا پھر محض نیشنلٹی کے لیے شادی کرنا چاہتے ہو؟" مالا نے کچھ جھجکتے ہوئے بالآخر اصل بات پوچھ ہی لی تھی جبکہ آفاق کا چہرہ کچھ تاریک سا ہو گیا تھا۔ گویا اپنی محبت پر غرض کی یہ ہلکی گرد بھی اسے پسند نہیں تھی۔ تاہم وہ مالا کو کچھ بھی پوچھنے سے روک نہیں سکتا تھا۔

"ایسی بات نہیں مالا! مجھے انی سے محبت نیشنلٹی کے لالچ میں نہیں ہوئی... بلکہ میں نے تو یہ سوچا بھی نہیں تھا..... ان تمام آپشنز کو انی نے میرے سامنے رکھا تھا بلکہ اسی نے مجھے پرپوز کیا..... تم تو کچھ جانتی ہی نہیں مالا.....! یہاں پاکستانی فیملیز کو بیٹیوں کے مناسب رشتوں کے لیے کس قدر ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انی کا بھائی پاکستان اسی سلسلے کی غرض سے گیا ہے۔ اپنے باپ کے خاندان والوں میں بہنوں کے لیے مناسب بر تلاش کرنے..... جو پاکستانی گھرانے حسیب انکل اور انی کی فیملی جیسے مہذب، شریف اور پرانی قدروں پہ جان دینے والے ہیں، ان کو اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی کے لیے یہاں اپنے جیسے ملتے ہی نہیں اور جو ملتے ہیں وہ اس قدر عیاش ہوتے ہیں کہ ان سے رشتہ جوڑنے سے بہتر خودکشی کر لینا ہے۔" آفاق نے بہت سنجیدگی کے ساتھ وضاحت کی تھی تب مالا گویا سمجھ کر سر ہلا گئی۔ وہ بغیر سوچے سمجھے سوچ کی انتہا پر پہنچ کے فتویٰ جاری کر دیتی تھی جو بالکل غیر مناسب تھا۔ کسی بھی پہلو پہ غور کیے بغیر اگلے بندے پہ اٹیک کرنا قطعاً فضول حرکت ہے، عیسیٰ نے کئی مرتبہ مالا کو اس جلد بازی پہ ٹوکا بھی تھا مگر مالا سے پھر بھی بھول چوک ہو جاتی تھی..... وہ نہ جانے کتنی دیر تک اپنی جلد بازی پہ پشیمان رہتی مگر آفاق نے اسے زیادہ دیر تک پشیمان نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ مالا کو مزید بتا رہا تھا کہ جرمنی میں مستقل رہائش کے باوجود بھی شہریت بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ کتنی کے تارکینِ وطن جو یقیناً بڑے خوش نصیب تھے انہیں جرمنی کی شہریت ملی تھی جن میں ایک حسیب احمد بھی شامل تھے۔ ویسے بھی تمام مغربی ممالک اپنے مفاد کو لے کر آگے چلتے ہیں۔ اگر جرمنی، سیاسی پناہ کے لیے آنے والے مہاجرین کو اپنے ملک میں جگہ دیتا ہے تو اس میں بھی سراسر اپنا فائدہ اور نفع دیکھتا ہے جیسا کہ صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے مہاجرین بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اسی طرح جرمنی اگر انگریزی منٹ کے تھرڈ کسی دوسرے ملک سے افرادی قوت حاصل کرے تو یہ کام خاصا مہنگا ہو گا..... یہ ملک اقوامِ متحدہ کے قانون کے مطابق سیاسی پناہ گزینوں اور مہاجرین کو مکمل تحفظ فراہم کرتا ہے..... اسے اپنی قانونی یا اخلاقی ذمے داری نہیں سمجھتا بلکہ اس میں بھی جرمنی کا اپنا فائدہ اور نفع نظر آتا ہے۔ کیونکہ سیاسی پناہ لے کر آئے افراد جرمنی کی تمام صنعتوں اور کاروباری اداروں میں کم لاگت پر انتھک اور دیر تک کام کرتے ہیں بلکہ ان پناہ گزینوں کے خون تک نچوڑ لیتے ہیں۔ یہ انگریز قوم بغیر نفع و نقصان کا حساب لگائے تو سانس بھی نہیں لیتی۔ آفاق نے مزید یہ بھی بتایا تھا کہ یہاں پیپر میرج کرنا بھی آسان نہیں، یہ قوم بڑی عقلمند ثابت ہوئی ہے۔ ویسے بھی اگر دوسری عالمی جنگ کے بعد مردوں کی تعداد جرمنی میں کم نہ ہو جاتی تو حکومت نے جرمن عورتوں کو غیر ملکیوں کے ساتھ شادی کی ہرگز بھی اجازت نہیں دینا تھی۔ اس قانون میں نرمی کے بعد جرمن خواتین کو غیر ملکیوں سے شادی کی اجازت مل گئی تھی مگر انہیں ہر لحاظ سے مردوں پہ فوقیت دی گئی۔ وہ کئی مغربی ممالک میں عورتوں کی آزادی کے تحت جب دل چاہے شوہر سے طلاق لے سکتی تھیں۔ شوہر کی مکمل نگرانی کا حق انہیں حاصل تھا۔ تمام اخراجات ان کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ جتنی چاہے رقم شوہر کو دیں..... وہ بے چارہ کما، کما کر بے حال ہو جاتا اور یہ اپنی مرضی سے عیاشیاں کرتی پھرتیں، حتیٰ کہ شوہروں کو باہر اپنی مرضی سے دوستوں اور تعلق داروں سے ملنے کے لیے ایک مقرر وقت کی حد تک بیوی سے اجازت درکار ہوتی تھی۔

آفاق مالا کے چودہ طبق روشن کرتے ہوئے

مزید بتا رہا تھا کہ ویسے جرمن عورتیں بلا کی وفادار اور وفاشعار ثابت ہوتی ہیں جن کی ایک بڑی مثال عیسٰی کی مما اور...... انی کی می نے قائم کی۔ عیسٰی کی مما جب تک زندہ رہیں، اپنے شوہر کی وفاداری اور انی کی می اپنے شوہر کے مرجانے کے بعد بھی اس کی وفادار تھیں...... انہوں نے اپنی باقی زندگی بچوں کی تعلیم و تربیت میں وقف کردی تھی۔ یقیناً یہ دونوں عورتیں عظیم تھیں اور ان دو عورتوں کے شوہر بھی عظیم ثابت ہوئے تھے۔ جنہوں نے پاکستانی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ان عورتوں سے شادی کرکے شہریت لینے کے بعد انہیں چھوڑا نہیں تھا۔ اب یہ تو طے تھا کہ شادی کر لینے کی صورت میں مستقل رہائش کی ٹینشن دور ہو جاتی مگر دیکھنا یہ تھا کہ بیوی کیسے ملتی؟ اس کا مزاج اور عادتیں کیسی ہوتیں......؟ محض شادی کرنا ہی تو آفاق کے لیے مسئلہ نہیں تھا...... وہ کسی سے بھی شادی کرکے اچھے تعلقات بیوی سے رکھتا تو بینک سے کار خریدنے یا گھر بنوانے کے لیے قرض بھی مل سکتا تھا...... مگر بیوی کی بھلا کیا گارنٹی ہوتی؟ وہ آفاق کے ساتھ ساتھ جانے کس کس کی بیوی بن چکی ہوتی۔ حالانکہ وہ جانتا بھی تھا جرمن عورت سے شادی کے ایک سال بعد رہائشی ویزا جاری ہو جائے گا پھر اس میں دو یا چار سال کی توسیع بھی کردی جائے گی...... اگر وہ بیوی کا فرمانبردار، پیدا ہونے والے بچوں پر بھی بھرپور توجہ دے، گھر کا ماحول لڑائی جھگڑے سے پاک رکھے، کسی جرم میں بھی ملوث نہ رہے تو مدت گزرنے کے بعد پانچ سال کے لیے پاسپورٹ بھی جاری ہو جائے گا۔ جس کی وجہ سے وہ جرمن میں مزید رک سکتا ہے اگر مزید پانچ سال گزر جائے تو جرمنی کا پاسپورٹ بھی مل جاتا، جس کی وجہ سے وہ کسی بھی ملک میں آزادانہ گھوم سکتا تھا مگر بات تو بیوی پر آ کر رک جاتی تھی۔ ضروری تو نہیں تھا، اس کی بیوی عیسٰی کی مما اور انی کی می جیسی نیک، خدا ترس اور شریف ثابت ہوتی...... پھر اگر بچے ہو جاتے تو وہ عمر بھر کے لیے خوار ہو جاتا...... اس نے ہر پہلو پر غور کیا تھا۔ یہاں پیپر میرج کا مسئلہ نہیں تھا...... مگر وہ خود کو عمر بھر کے لیے اسیر کرنے اور پیدا ہونے والے بچوں کو ذلیل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اسے شادی کرنا تھی تو حبیب احمد کی طرح...... ایک معزز، مہذب اور شریف لڑکی سے، وہ شادی کے نام پر کاروبار کرکے پھر بیوی، بچوں کو خوار کرکے اپنے ملک کے نام پر دھبا نہیں لگوانا چاہتا تھا پھر اگر قسمت اس پر مہربان ہو رہی تھی، محبت اس پر مہربان ہو رہی تھی تو وہ ناشکرا کیوں بنتا......؟ اس نے پیچھے کسی سے عہد و پیمان تو کر نہیں رکھے تھے مگر اس کی امی اور بہنوں نے اتنا رونا دھونا مچا رکھا تھا۔ وہ چاہتی تھیں۔ آفاق ویزے کی مدت پوری کرکے واپس آ جائے۔ اس کی شادی پاکستان میں وہ خود کریں...... جبکہ آفاق جانتا تھا کہ ذمے داریوں کے اتنے پہاڑ وہ پاکستان میں جا کر کیسے سر کر پائے گا؟ وہ اپنی ماں، دادی اور بہنوں کو قائل نہیں کر سکا تھا۔ وہ کہتی تھیں، ہمیں پہلے روز سے یہی امید تھی کہ تم جرمن جا کر ”چن“ ضرور چڑھاؤ گے...... وہ پچھلے کئی دنوں سے ذہنی اذیت کا شکار تھا...... اگر انی کی می سے وعدہ نہ کر چکا ہوتا تو وہ اپنے دل کو سمجھا ہی لیتا مگر یہ دل کے سلسلے اپنے بس میں تھے کہاں؟ اتنے دنوں سے عیسٰی چپ چاپ تماشا دیکھ رہا تھا مگر اتنی توفیق نہیں ہوئی، اس کا حال دل جان جاتا...... یقیناً وہ چاہتا تھا کہ آفاق خود اپنا مسئلہ شیئر کرے...... آفاق یہ کام بھی کر لیتا مگر وہ جانتا تھا عیسٰی نے امی اور بہنوں کے حق میں ووٹ دینا تھا...... عیسٰی کا خیال تھا بزرگوں کو ناراض کرکے دائمی خوشیاں نہیں سمیٹی جا سکتیں...... اس کا خیال درست تھا...... مگر بزرگوں کو منایا بھی تو جا سکتا تھا ناں...... اب وہ مالا سے ہر بات ڈسکس کرنے کے بعد پُرسکون ہو چکا تھا...... اسے امید تھی کہ مالا کی بات عیسٰی رد نہیں کرے گا...... یوں اس کی نیا بھی پار لگ جائے گی...... اِدھر مالا سوچ رہی تھی۔ انی کے لیے آفاق سے بہتر کوئی نہیں...... اور اگر آفاق، سوزن میں انٹرسٹڈ ہوتا تو پھر بھی اسے بہت خوشی ہوتی...... مگر سوزن کے آفاق سے ستارے ملنے والے نہیں تھے۔ دونوں کے درمیان مذہب، نظریات اور رسم و رواج خلیج کے مانند کھڑے تھے۔ اب ہر مغربی لڑکی عیسٰی کی مما جیسی نہیں ہوتی، جو کامیابی کے آخری زینے پر کھڑی تھیں۔ جنہوں نے حبیب احمد کو چن کر زمانہ پا لیا تھا...... مذہب، رشتے، محبت سب کچھ......

☆☆☆

”جسٹ شٹ اپ مون......!“ وہ پوری قوت سے چلا اٹھا تھا...... مون کو لگا، اس کی سماعتوں پہ یکے بعد دیگرے کئی پتھر آ گرے تھے۔ ایسے نوکیلے اور سخت پتھر کہ وہ بے ساختہ کراہ اٹھی تھی مگر عیسٰی کی دہاڑ نے اس کی سانسیں تک روک دی تھیں۔ وہ کسی پتھر میں ڈھلے مجسمے کی طرح ساکت ہو چکی تھی جبکہ عیسٰی کی لہو رنگ آنکھوں کو دیکھ کر حبیب احمد کے ہاتھ سے کتاب گر پڑی تھی۔ وہ بے ساختہ راکنگ چیئر سے اٹھ کر عیسٰی کی طرف آئے تھے۔ انہوں نے گھبراہٹ میں عیسٰی کا کندھا ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا مگر عیسٰی اپنے حواسوں میں کہاں تھا؟ وہ باپ کی بات سن کہاں رہا تھا؟ اس کے ذہن میں، کانوں میں اور آس پاس بڑا تمسخر اڑاتا شور اٹھ رہا تھا۔

”آفاق اور مالا......“ کوئی اس کے کان میں بہت زور سے چلایا تھا۔ عیسٰی کو لگا، اس کے دماغ کی کوئی شریان پھٹ جائے گی۔ یہ اس کی سگی

بہن تھی جو اس کے وجود کی دھجیاں اُڑا رہی تھی۔ اس کے پرخچے اڑا رہی تھی۔ وہ زہرخند سا چلا اٹھا تھا۔

”تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو مون! تم پاگل ہو چکی ہو۔“ عیسٰی نے دھیمے انداز میں پھنکارتے لہجے میں کہا تھا۔ حبیب احمد نے پھر سے اس کا کندھا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ سمجھ گئے تھے، بہن، بھائی کے درمیان کسی بات پر تلخ کلامی ہو رہی ہے۔ یقیناً مون نے عادتاً کوئی ایسی بات ضرور کردی تھی جو عیسٰی کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ بیٹے کو کول ڈاؤن رہنے کا اشارہ کر رہے تھے مگر عیسٰی ان کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔

”میں اپنے حواسوں میں ہوں، مجنون یا دیوانی نہیں ہوں، بس یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنی آنکھیں کھول کر رکھو، آستین سے سانپ نکال کر پھینک دو، یہ لوگ تمہیں ڈس لیں گے۔“ مون کی سوئی ایک جگہ پھنس چکی تھی جبکہ اس کے آگ اگلتے الفاظ عیسٰی کو غضبناک کر رہے تھے۔

”بکواس بند کرو مون......!“ وہ پھر سے چیخا تھا...... ”تم میری بہن نہ ہوتیں تو میں تمہارے ساتھ کس طرح پیش آتا...... تم گمان بھی نہیں کر سکتیں۔“ وہ اپنے ماتھے کو مسلتا کسی قدر شکستہ نظر آنے لگا تھا۔ ایک دم نڈھال اور غمزدہ، مون اس کی اذیت کو سمجھ نہیں سکتی تھی اگر سمجھ جاتی تو ایسی بات ہی کیوں کرتی؟ مگر اسے دلوں کو ٹھوکروں سے اڑاتا آتا تھا...... سو وہ اپنا کام دلجمعی سے کر رہی تھی۔

”ایک غیر عورت کے لیے اپنی بہن سے اس لہجے میں بات کر رہے ہو۔“ مجھے بہت تکلیف ہوئی مگر یاد رکھنا، جس کے لیے مجھ سے تلخ کلامی کر رہے ہو، وہ بھی تمہیں فیض نہیں دے گی۔ سخت دھوکا کھاؤ گے بڑے خسارے اٹھانے والے ہو تم۔“

نکل کر اچھے موڈ میں گیا تھا پھر اب مالا نے اسے چاچو کے روم سے نکلتے دیکھا تھا۔ جانے اندر کیا بات ہوئی جو وہ ابھی تک اتنا اپ سیٹ تھا مگر مالا سے اپنی پریشانی کو چھپا رہا تھا۔ اس کو طرح، طرح کے اندیشے لاحق ہونے لگے۔

مون، عیسٰی کے زہریلے لہجے کے دھچکے سے سنبھل کر سابقہ زہر خند آواز میں کہہ رہی تھی۔ اس کے لیے اپنے الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں تھی جو کچھ وہ عیسٰی کو کہہ چکی تھی گویا وہ سب اس کے لیے معمولی تھا۔

وہ مون کا فون بند کر کے باہر نکلا تو مالا کچن سے نکلتی دکھائی دی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر نگاہ ڈال کر ٹھٹک سی گئی پھر میز پر کوئی باؤل رکھ کر اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔ عیسٰی جو فی الحال اتنے برے موڈ کے ساتھ مالا کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر فوراً واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا جبکہ مالا وہیں کمرے میں کھڑی ہو کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر اتنا ٹائم لگا کر فریش ہونے کے بعد واش روم سے باہر نکلا تو مالا کو ابھی تک کمرے میں موجود دیکھ کر گہری سانس کھینچ کر رہ گیا جبکہ مالا بہت متفکر سی گھبرائے، گھبرائے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ غمگینی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں......؟" وہ کتنی بے چین اور مضطرب تھی۔ تبھی بغیر کوئی دوسری بات کیے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ کچھ دیر پہلے والے غصے، اضطراب اور پریشانی کا عیسٰی کے چہرے پر شائبہ تک نہیں تھا...... مگر مالا پھر بھی مطمئن نہیں ہو سکی تھی۔

"ہاں، میں ٹھیک ہوں۔" عیسٰی نے ٹاول اسٹینڈ پہ پھیلا کر اپنے کپڑے ہینگ کرنے شروع کر دیے تھے۔ وہ عموماً اپنا کام کرتے ہوئے پھیلاوا نہیں ڈالتا تھا۔ یہ اس کی بہت پرانی عادت تھی مگر... فی الحال تو وہ مالا کے مزید سوالوں سے بچنا چاہتا تھا مگر مالا پھر بھی......

"مگر تب تو کچھ مضطرب لگ رہے تھے۔" وہ فکرمندی سے گویا ہوئی...... رہ رہ کر عیسٰی کی لہو رنگ آنکھیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ آفاق کے کمرے سے

"کچھ نہیں یار! بس مون کی فون کال سن کر آ رہا ہوں......" عیسٰی زیادہ دیر اسے پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"اور مون کی کال سن کر خیریت نہیں ہو سکتی۔" اس کے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا تھا۔ حالانکہ بات کر کے وہ سخت پچھتائی بھی تھی مگر عیسٰی نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

"یہی سمجھ لو......" وہ مبہم سا بولا تھا پھر اچانک کچھ یاد آنے پر چونک گیا۔ "آفاق کا مسئلہ حل ہوا؟" اس نے ہیئر برش اٹھا کر بال بنانے شروع کر دیے تھے۔ مالا گہری سانس کھینچ کر رہ گئی تھی۔ تو گویا وہ مون پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اندر سے کتنا گہرا تھا، مالا کو اب احساس ہو رہا تھا۔ وہ جس ٹاپک پہ نہیں بولنا چاہتا تھا، اس پہ بات بھی نہیں کرتا تھا بلکہ بہت صفائی کے ساتھ موضوع تبدیل کر دیتا۔

"میں اس کا مسئلہ تو حل نہیں کر رہی تھی، یہ کام تو آپ نے کرنا ہے۔" مالا برا مان کر بولی تھی تب عیسٰی پھر سے کچھ چونک گیا۔

"تو کام بتا دیا اس نے؟" وہ بال بنا چکا تو ہاتھ دھونے پھر سے واش روم چلا گیا۔ جب واپس آیا تو مالا سنبھل کر کچھ الفاظ ترتیب دے کر بیٹھی تھی تاکہ عیسٰی سے ابھی آفاق کے متعلق بات کر لے۔

"جی...... ہاں......" اس نے اگلے دس منٹ تک تمام تفصیل عیسٰی کے گوش گزار کر دی تھی جسے سن کر وہ سر ہلا کے بولا۔

"یہ تو میں جانتا ہوں۔" اس کا انداز پُرسوچ

قسم کا تھا۔ تب مالا گویا چیخ پڑی۔
”آپ جانتے بھی تھے پھر بھی کچھ نہیں کیا...... وہ بے چارہ اتنے دنوں سے مجنوں بنا پھرتا رہا...... اتنے دن سے ٹینشن لے رہا تھا۔ اور آپ جان بوجھ کر دیکھتے رہے......“ مالا خفگی سے بولتی جا رہی تھی۔ تب عیسٰی نے اسے رسان سے سمجھایا تھا۔

”مجھے کسی کے بھی ذاتی معاملات میں گھسنا پسند نہیں۔ چاہے وہ آفاق ہی کیوں نہ ہو...... تاہم اس کے بارے میں پل، پل کی خبرگیری کرنا میرا فرض ہے...... اس سے میں کنارہ نہیں کرسکتا...... ہاں میں پاکستان کال کرکے اس کی امی کو سمجھانے کی کوشش ضرور کروں گا۔“ عیسٰی نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے حامی بھرلی تھی...... تب مالا کچھ پُرجوش سی ہوگئی۔

”آفاق اور انی کی شادی ہوجائے تو میری بھی تنہائی کا خاتمہ ہوجائے گا۔“ وہ دبے دبے جوش اور ڈھیروں سرخوشی کا اظہار کررہی تھی تب ہی عیسٰی نے اس کی خوشی محسوس کرکے بے ساختہ کہا تھا۔

”تم اپنی تنہائی بانٹنے کا کوئی اور حل سوچ لو۔“ اس کے لہجے میں واضح شرارت تھی۔ کچھ دیر پہلے والی سون کی بکواس اس کے ذہن سے محو ہوچکی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک تکلیف دہ یادوں اور باتوں کو نہیں سوچتا تھا۔ تبھی مطمئن اور پُرسکون رہتا تھا۔

”مثلاً......؟“ مالا منہ بنا کر بولی۔ ”یہی کہیں گے ناں آپ......! نمی سے ڈچ میں گپ شپ لگایا کرو......“ اس کا انداز جلا کٹا سا تھا۔ عیسٰی بے ساختہ ہنس پڑا۔

”نہیں، اس کے علاوہ کچھ......؟“ اس کی آنکھوں میں کوٹ، کوٹ کر شرارت بھری تھی۔ مالا کچھ دیر کے لیے ہونق سی ہوگئی تھی۔ اسے عیسٰی کی بات کے اندر اترنا کبھی نہیں آتا تھا۔

”اس کے علاوہ کیا......؟“ وہ سوچتے ہوئے عیسٰی کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہاں انوکھی سی جگمگاہٹ تھی اور اس کی آنکھیں مالا کے خریدے گئے ڈھیروں کھلونوں پر جمی تھیں جنہیں مالا نے ترتیب سے کمرے میں جگہ، جگہ سجا رکھا تھا تب عیسٰی کی بات اور نظر کا مفہوم جان کر وہ ڈھیروں شرم سے بے حال ہوگئی تھی۔ انتہائی سرخ چہرہ لیے وہ پلکوں کو جھکائے میٹھی، میٹھی مسکان کے ساتھ سیدھی دل میں اتر رہی تھی۔ عیسٰی کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ پھر اس نے آہ بھر کر کہا تھا۔

”جانتی ہو، حسن سے بڑھ کر حیا میں کشش ہوتی ہے۔“ اس کا لہجہ بوجھل اور آواز مخمور سی تھی۔ مالا کے دل کی گھنٹیاں ٹن ٹن بجنے لگی تھیں اس کا سر کچھ اور جھک گیا تھا۔ یوں لگا، باہر تالاب میں سنہری پریاں اتر آئی ہیں یا بیلے کے جنگل میں مور پھر سے ناچنے لگے یا ستاروں کی بارات اس کے آنگن میں اتر آئی۔ اس کا دل کہکشاں کا گھر بن گیا تھا۔

علی عیسٰی کے دل نے اس پل سجدۂ شکر ادا کیا...... اللہ نے اسے ایک نیک اور باحیا عورت زمین پر بخش دی تھی۔ یہ اس کی خوش نصیبی کا بڑا اعلیٰ مقام تھا۔

”تم کو ایک بتاتا ہوں مالا......“ اسے علی عیسٰی کی رواں، مدھم آواز سنائی دی تھی۔ وہ ایک کرسٹل کی گڑیا کو ہاتھ میں لے کر اس کی چابی گھما رہا تھا۔ یہ گڑیا مالا خرید کر لائی تھی۔ ان تمام کھلونوں میں سب سے منفرد بھی یہی گڑیا تھی اور عیسٰی کو بھی کرسٹل کی یہ گڑیا بہت پسند آئی تھی۔ اسے مالا نے سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا کیونکہ اس گڑیا کی آنکھوں میں بہت تیز لائٹس روشن ہوتی تھیں جو اندھیرے میں زیرو پاور جتنے بلب کا کام بخوبی دے رہی تھیں۔ عیسٰی نے اسی گڑیا کو ہاتھ میں لے رکھا تھا۔

"تم نے سنا تو ہوگا، وہ شخص مر گیا، جو کسی کے دل میں نہیں رہا۔ آدمی کب مرتا ہے؟ جب دل سے اترتا ہے اور زندہ کب ہوتا ہے۔ جب دل میں اترتا ہے۔" عیسیٰ کی مدھم آواز کے ساتھ ہی کرسٹل کی گڑیا میز کی سخت سطح سے ٹکرائی تھی۔ مالا کے دل کو کچھ ہو گیا۔ کیونکہ گڑیا کو پوری شدت کے ساتھ میز کی سطح سے ٹکرایا گیا تھا۔ اس کی نیلگوں انتہائی موٹی آنکھوں میں سے ایک کا نیلا موٹا سا ڈیلا باہر نکل آیا تھا۔ گڑیا لمحوں میں بدنما ہو گئی تھی۔ مالا کو ایک دم دھچکا سا لگا۔ ابھی وہ کچھ بولنا چاہتی ہی تھی جب عیسیٰ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا تھا۔

"خوب صورتی دیکھنے والی آنکھ میں ہوتی ہے..... چیز اچھی ہو یا بری..... جسے خود اپنی پسند اور چاؤ سے خریدا ہو اس کے عیب پہ دل برا نہیں کرتے....." عیسیٰ نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے گڑیا کا موٹا سا نیلا ڈیلا پھر سے آنکھ کے گڑھے میں فٹ کر دیا تھا۔

"اس عیب کی اصلاح کرتے ہیں..... دل برا کر کے اسے یوں کوڑے (ڈسٹ بن) میں نہیں پھینکتے۔" عیسیٰ نے کوڑے والی ٹوکری کا پیڈ سے بٹن دبایا تو اس کا منہ کھل گیا۔ یہ ڈسٹ بن صرف عیسیٰ کے غیر ضروری کاغذات کے لیے کمرے میں رکھی گئی تھی۔ اکثر وہ غیر ضروری کاغذات مروڑ کر کورپ میں پھینک دیتا تھا مگر پھر کچھ دن بعد کبھی نہ کبھی ان کی ضرورت محسوس ہو ہی جاتی پھر انہیں ڈھونڈنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔ ننھی اس کورپ کو کم ہی ہاتھ لگاتی تھی۔ عیسیٰ نے اسے منع کر دیا تھا۔ فی الوقت بھی وہ ڈسٹ بن کھولے کچھ بول رہا تھا جب ایک دم کچھ چونک گیا۔

"اکثر غیر ضروری چیزیں جن کو ناکارہ سمجھ کر کوڑے دان میں پھینک دیا جاتا ہے، وہ ہمارے کام بھی آ جاتی ہیں۔" عیسیٰ نے بات کرتے ہوئے کاغذات سے بھری کورپ میں ہاتھ مارا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد ایک سخت سی چیز عیسیٰ کے ہاتھ میں آ گئی۔ یہ نقلی نگینوں والا بریسلیٹ تھا جسے مالا نے توڑ مروڑ کر غصے میں پھینک دیا تھا۔ تب وہ جانتی نہیں تھی کہ سوزن نے یہ گفٹ اسے بھیجا تھا۔ مالا کو ایک دم ڈھیروں ندامت ہوئی..... وہ جو بریسلیٹ کورپ میں سے نکالنا بھول گئی تھی اب انتہائی شرمسار کھڑی تھی۔ بھلا علی عیسیٰ کیا سوچتا ہوگا؟ مالا نے اس کی اتنی سویٹ کزن کا خلوص سے دیا تحفہ اتنی بے رحمی سے ڈسٹ بن کے حوالے کر دیا تھا۔ اس وقت بھی عیسیٰ کے تاثرات کم و بیش ایسے ہی تھے وہ مالا کو حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تحفے کی ایسی ناقدری پہلے کبھی نہ دیکھی نہ سنی..... اگرچہ بریسلیٹ اتنا مہنگا نہیں تھا مگر اتنا حقیر بھی نہیں تھا جو اس کی جگہ یہ کورپ ہوتی۔" عیسیٰ کی آواز میں تاسف تھا۔ مالا گویا شرمندگی کے گڑھے میں گوڈے، گوڈے ڈوب گئی تھی۔

"سوزن اتنی امیر نہیں یار.....! تم نے جانے کیا سمجھا تھا۔ بہر حال، میں یہ بریسلیٹ اسے واپس لوٹا دوں گا۔" اس نے گویا آخری فیصلہ کر کے بریسلیٹ اپنے لاکر میں محفوظ کر لیا تھا۔ مالا جو اپنی صفائی میں کچھ بولنا چاہتی تھی باہر سے آتی آفاق کی آواز سن کر دل مسوس کر رہ گئی۔ پھر اس نے سوچا۔ وہ عیسیٰ کو تسلی سے جواب دے گی اور وجہ بھی بتا دے گی مگر پھر آفاق کی لن ترانیوں اور بھوک کے شور کو سن کر ہمیشہ کی طرح بھول گئی اور یہ بھولنا کیا قیامت لائے گا..... اس بات سے مالا ہرگز واقف نہیں تھی۔

☆☆☆

آسمان پر سفید بادل دھجی دھجی بکھرے تھے۔ سورج اپنی جگہ پر جما چمک رہا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔

پورا آسمان سفید مرغابیوں سے چھپا تھا۔ فضا میں خاموشی کا راج تھا، کاریڈور سے کچھ آگے ہیرا کھلکھلاتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے گلے میں کیمرا لٹکا رکھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کھٹا کھٹ سفید مرغابیوں کی تصویریں اتار رہی تھی۔ اس کے قریب ہی میکس وان کسی گہری سوچ میں گم بیٹھا تھا۔ وہ عیسائی باپ کا بیٹا تھا اور ہندو عورت کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ وہ خود کو کتابی کہلوانا پسند کرتا تھا اور عیسائیت سے سچے عشق میں مبتلا تھا۔ مالا نے اب تک میکس کی کوئی ایک بھی گرل فرینڈ پورے شولے میں نہیں دیکھی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور چرچ باقاعدگی سے جاتا تھا۔

مالا کو ہیرا کے بعد میکس بہت اچھا لگتا تھا۔ شرمیلا سا، انتہائی کم گو اور مہذب.....

مالا گراؤنڈ میں سے گزرتے ہوئے پارک پلاس تک آئی تو میکس بھی اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ مالا کا ارادہ آج گھر جانے کا نہیں تھا بلکہ وہ کاؤف ہاؤس جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ سو اسی لیے ذرا جلدی کلاس سے نکل آئی تھی۔ وہ کوئی بس پکڑ کر مرکز تک جانا چاہتی تھی اور اس کا ارادہ بھانپ کر میکس نے فوراً آفر کر دی تھی۔

"میں بھی مرکز تک جا رہا ہوں، تم مجھے جوائن کر سکتی ہو۔" میکس کی پُر خلوص آفر کو مالا ٹھکرانے کا بھرپور ارادہ رکھتی تھی مگر انکار کے لیے کوئی موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ میکس اس کا تذبذب محسوس کر کے نرمی سے بولا تھا۔

"تم میرے ساتھ بے جھجک جا سکتی ہو، میں انتہائی شریف آدمی ہوں۔" اس نے اتنے بھولپن سے وضاحت کی تھی کہ مالا جو اتنی سنجیدہ صورت بنائے کھڑی تھی ایک دم ہنس پڑی۔

"ایسی بات نہیں....." مالا ذرا جھجک کر بولی تھی۔ دراصل اس نے عیسیٰ کو میسج کر رکھا تھا کہ آفاق

ماہِ صیام

مبارک ہو مسلمانو کہ پھر ماہِ صیام آیا
خدا کی رحمتوں اور برکتوں کا اژدہام آیا
خدا کا شکر ہے فصلِ بہار جانفزا آئی
خوشا قسمت کہ پھر سے موسم صوم و قیام آیا
زمانہ آ گیا کہ لطفِ باری عام اب ہوگا
نصیب اپنے کہ پھر سے زندگی میں یہ مقام آیا
قیامت میں یہ روزہ ڈھال ہوگا روزہ داروں کی
یہ سرمایہ بھی اپنا کیسے آڑے وقت کام آیا
ہدایت کے صحیفے سب کے سب اس ماہ میں اترے
اسی ماہِ مبارک میں کلاموں کا امام آیا

پسند: فضہ بتول، بہارہ کہو

فضیلتِ قرآن مجید

رمضان المبارک بہت ہی فضیلت و بزرگی والا مہینہ ہے اور اسی مناسبت سے اس مہینے میں ایک بہت ہی عظیم الشان امر کا ظہور ہوا ہے وہ یہ ہے۔

شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن

رمضان المبارک کا مہینہ ایسا ہے کہ اس مبارک مہینے میں قرآن شریف نازل ہوا اور جتنی کتابوں اور صحیفوں کے نزول ہوئے سب کے سب اسی مہینے میں اترے اسی نسبت سے حضور ﷺ کا رمضان شریف میں تلاوتِ پاک پر زور دینا نسبتاً اور مہینوں کے زیادہ ثابت ہے۔ صحابہ کرامؓ و خلفائے راشدینؓ... صحابہ کرامؓ و خلفائے راشدینؓ، تابعین اور بزرگانِ دین کا رمضان المبارک میں تلاوت کا خاص اہتمام..... یہ سب امور اس بات کے متقاضی ہیں کہ اس ماہِ مبارک میں قرآن پاک کی تلاوت کا معمول نسبتاً دوسرے معمولات ذکر و شغل کے اور زیادہ کرنا چاہیے اور جو بے چارے قرآن پاک کی تلاوت سے معذور ہیں وہ تراویح میں شریک ہو جائیں تو ان کو بھی یہ فضیلت میسر ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

مرسلہ: جبیں نیاز، ملتان

کو بھیج دے۔ اسے کچھ شاپنگ کے لیے مرکز جانا ہے مگر عیسیٰ کار چلانی نہیں آیا تھا جس کا مطلب تھا وہ بہت مصروف ہے۔ ویسے بھی ''این کاوَف سین ٹروم'' اتنا دور نہیں تھا۔ وہ بہ آسانی بس سے جا سکتی تھی مگر وہی اندرونی بزدلی، اکیلے جانے سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اگر وہ ہیرا سے کہتی تو اس نے فوراً تیار ہو جانا تھا۔ سو وہ اب میکس کی آفر ذہن میں رکھتے ہوئے ہیرا کو آواز دے رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر ہیرا گلے میں کیمرا لٹکائے بھاگتی دوڑتی آ گئی۔

''اگر شاپنگ کا موڈ ہے تو میرے ساتھ چلو۔'' مالا نے دبی آواز میں ہیرا سے ریکویسٹ کی تھی۔ اب اندھے کو بھلا کیا چاہیے تھا۔ وہ فوراً تیار ہو گئی تھی۔ میکس ان دونوں کو خوشی، خوشی اپنی ننھی سی کار میں بٹھا کر شاپنگ کے لیے لے آیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں ڈھیروں باتیں کر رہی تھیں جبکہ میکس خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا مسکراتا جا رہا تھا۔ پھر شاپنگ کے دوران وہ ان دونوں کو اکیلا چھوڑ کر اپنا کام کرتا رہا تھا۔ ہیرا نے اپنے لیے ڈھیروں کاسمیٹکس خریدا تھا۔ مالا کو بھی ضروری چند ایک چیزیں خریدنا تھیں...... سو ڈیڑھ گھنٹے کی شاپنگ کے بعد جب وہ دونوں لدی پھندی باہر آئیں تو پارکنگ میں میکس کو کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''تم ابھی تک یہیں ہو؟'' مالا نے حیرت کا برملا اظہار کیا تھا۔

''تو کیا مجھے چلے جانا چاہیے تھا؟'' میکس نے الٹا حیران ہو کر ان سے پوچھا تھا۔

''کیوں چلے جانا تھا......؟ ہمارے پاس ٹیکسی کا کرایہ تک نہیں بچا۔ اچھا ہوا تم گئے نہیں۔'' ہیرا نے خوش اخلاقی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کر کے شاپنگ بیگ دھڑا دھڑ کار میں ٹھونس دیے تھے جبکہ مالا میکس کو اتنا انتظار کروانے پر کچھ خفت زدہ تھی۔

''جب تم لوگ میرے ساتھ آئی تھیں تو پھر میں اکیلا تم لوگوں کو چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا؟'' میکس نے مسکرا کر جواب دیا۔ مالا اور ہیرا اس کے ایثار کی قائل ہو گئی تھیں۔ بلاوجہ بے چارہ انتظار کی زحمت اٹھاتا رہا تھا۔ تاہم اس سفر کے دوران ان دونوں پر منکشف ہوا تھا کہ میکس بہت اچھا اور مہذب انسان ہے۔

وہ پہلے ہیرا کو اس کے فلیٹ پر اور مالا کو اس کے گھر تک ڈراپ کر کے گیا تھا پھر مالا کو اسے گیٹ پر ٹرخانا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے میکس کو اندر آنے کی دعوت دی تھی۔ جسے اس نے شائستگی سے رد کرتے ہوئے ایک ریکویسٹ کی تھی اور مالا اس کی ریکویسٹ سن کر تذبذب کا شکار ہو گئی تھی۔

''آپ لوگ میری برتھ ڈے پارٹی پر ضرور آیئے گا۔'' میکس نے بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ دعوت دی تھی۔ آپ لوگوں سے مراد جانے کون، کون تھا؟ مالا نے ہونق پن کی انتہا کرتے ہوئے میکس سے پوچھ ہی لیا۔

''میں اور کون......؟'' وہ ہونق بنی پوچھ رہی تھی۔ تبھی میکس نے وضاحت کی۔

''تم اور تمہاری فیملی......'' اس نے مسکرا کر حبیب چاچو کو باہر نکلتے دیکھ کر اشارہ کیا تھا پھر ان سے ہیلو ہائے کرنے لگا۔ چاچو، مالا کے مہمان کو سوکھے منہ نہیں جانے دینا چاہتے تھے مگر میکس پھر کسی دن آنے کا وعدہ کر کے جانے لگا تھا جب چاچو نے اچانک اسے روک کر پوچھ لیا۔ وہ کچھ الجھی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

''مجھے لگ رہا ہے، ہم پہلے بھی مل چکے ہیں نا؟'' چاچو کے لہجے میں یقین بول رہا تھا۔ تب میکس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''جی ہاں...... میں تو آپ کو دیکھتے ساتھ ہی پہچان گیا...... ایک دفعہ شام کو آپ کے گھر مون اور سوزن کے ساتھ آ بھی چکا ہوں، شاید آپ کو یاد نہیں رہا۔ میں سوزن کی سنڈیکیٹ کا باقاعدہ رکن ہوں۔'' اس کی شائستگی سے تفصیلاً وضاحت کو سن کر چاچو سر ہلانے لگے تھے۔ گویا انہیں میکس کا گزشتہ حوالہ دینا بہت کچھ یاد دلا گیا تھا۔

''تب مالا کی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔'' میکس اب مسکرا کر مالا کی طرف اشارہ کر رہا تھا تب چاچو نے بڑے فخر کے ساتھ میکس کو بتایا تھا۔

''یہ میری بھتیجی اور بہو ہے، میرے اکلوتے بیٹے کی بیوی......'' چاچو کے تعارف نے مالا کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی جبکہ میکس ایک دم حیران رہ گیا تھا۔

''عیسیٰ کی بیوی......؟'' میکس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ وہ کمال کی حیرت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ گویا اسے عیسیٰ کی شادی کا گمان ہی نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات بھی بہت عجیب تھے۔ چاچو اور مالا دونوں الجھ کر رہ گئے۔

''حیرت کی بات ہے۔'' میکس کی بڑبڑاہٹ بہ آسانی ان دونوں کی سماعتوں تک اتر گئی تھی۔ ان دونوں نے بیک زبان کچھ کہنے کی کوشش کی تھی جبکہ میکس ان کی سنے بغیر اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔

''مجھے سوزن نے بھی نہیں بتایا، چلیں سوزن سے تو کافی عرصے سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ جبکہ مون تو اکثر بیدی نونگ میں ملتی رہتی ہے۔ نہ اس نے مجھے شادی پہ انوائٹ کیا...... اور نہ ہی بتانا گوارا کیا۔'' میکس انتہائی افسردہ اور دل برداشتہ نظر آ رہا تھا۔ گویا سوزن اور مون کے عمل نے اس کے دل کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اسے سوزن اور مون دونوں سے ایسی بے مروتی کی امید نہیں تھی۔ وہ تینوں ماضی میں اچھے دوست رہ چکے تھے اور ماضی قریب میں ہی سوزن کے جھگڑے کی وجہ سے وہ جماعت کی رکنیت سے بھی الگ ہو گیا تھا مگر پھر بھی اسے سوزن سے ایسے کٹھور پن کی قطعاً امید نہیں تھی۔ اسے بے دل سا مڑتا دیکھ کر چاچو زبردستی اندر لے آئے تھے پھر مالا کو چائے بنانے کے لیے بھیج کر وہ دونوں سٹنگ روم میں چلے گئے۔ مالا جب چائے کے ساتھ ڈھیروں لوازمات لے کر اندر آنے لگی تھی تب اسے چاچو اور میکس کی بہت سنجیدہ گفتگو نے پل بھر کے لیے روک دیا تھا۔ وہ دونوں بہت سنجیدگی سے کچھ ڈسکس کر رہے تھے۔ مالا نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ گفتگو مون کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ چاچو کی آواز میں عجیب سی تھکن تھی۔ وہ بہت بکھرے، بکھرے لہجے میں کچھ کہہ رہے تھے۔ مالا نے دروازے کی جھری میں سے جھانکا تو اس کے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ چاچو کا زرد آنسوؤں سے بھیگا چہرہ سامنے تھا جبکہ میکس انہیں نہ جانے کون، کون سی تسلیاں دے رہا تھا۔ وہ مقامی زبان میں بات کر رہے تھے...... اور مالا کی ڈوئچ اتنی امپرووو تو ہو چکی تھی جو وہ پورا فقرہ نہ سہی کچھ، کچھ الفاظ تو سمجھ جاتی...... اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش میں ہلکا سا دروازہ کھول دیا تھا۔ اسے میکس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ چاچو کو کچھ بتا رہا تھا۔

''اسے غیر ملکی اور ملکی کئی ایجنسیوں نے ہائیر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔'' میکس کی بات نے چاچو کے چہرے پر سرسوں کے عرق کا برش پھیر دیا تھا۔ ان کے گال انڈے کی زردی جیسے پیلے پڑ گئے۔ بہت دیر تک وہ کچھ بول ہی نہیں پائے تھے۔

''پھر...... اس نے حامی بھر لی؟'' ان کے لہجے میں وسوسے ڈول رہے تھے۔ آنکھوں میں فکر اور اذیت دور سے بھی نظر آ سکتی تھی۔

"نہیں....." میکس کے جواب نے گویا ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

"تو پھر.....؟" وہ کچھ بے چینی سے پوچھنے لگے۔

"فی الحال تو اس نے انکار کردیا ہے۔ اب آگے کا نہیں پتا.....!" میکس نے سنجیدگی سے بتایا۔

"بیدی نوتنگ ابھی تک جارہی ہے؟" چاچو نے گہری طویل سانس کھینچ کر پوچھا۔ ان کے اعصاب تھکن سے چور ہوگئے تھے۔ عجیب شکستگی کا غبار اُن کے آس پاس چھارہا تھا۔

"وہاں جانے کی اسے ضرورت تو نہیں...... بیدی نوتنگ والے تو خود اس کی صلاحیتوں کے تابع ہیں۔" میکس بھی شاید مون کے متاثرین میں سے تھا مگر یہاں مون کی بات کہاں ہورہی تھی؟ مالا نے حیرت سے سوچا تھا، یہ لوگ تو نہ جانے کسے ڈسکس کررہے تھے اور مالا سمجھ رہی تھی وہ لوگ مون کے متعلق بات کررہے ہیں، وہ سر جھٹک کر اندر جانا چاہتی تھی جب میکس کی پھر سے آواز سنائی دی تھی۔ مالا کے بڑھتے قدم پھر سے رک گئے تھے۔

"پروفیسر بشر کیا اب بھی آتے ہیں؟" وہ قدرے جھجک کر پوچھ رہا تھا۔ تب چاچو نے پھیکے سے لہجے میں بتایا تھا۔

"نہیں.....!" ان کا سر بھی بے اختیار نفی میں ہلتا چلا گیا تھا۔ میکس کچھ دیر کے لیے سوچوں میں گم ہوگیا۔ گویا کسی سابقہ منظر کو یاد کررہا تھا۔ پھر سر جھٹک کر بولا۔

"جب سے عیسٰی نے پروفیسر بشر کی بے عزتی کی تھی، وہ مون سے بھی کم کم ملنے لگے تھے۔ یوں سمجھ لیں، انہوں نے مون کے سر پر سے اپنا دستِ شفقت ہٹالیا تھا۔" میکس سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"سارے فساد کی جڑ یہ بشر ہی تو تھا۔ بس میں ہی سمجھ نہیں پایا۔" چاچو افسردگی سے کہہ رہے تھے۔

ان کے لہجے میں عجیب سا پچھتاوا تھا۔ وہ رنجیدگی کی انتہا پر کھڑے تھے۔ جانے انہیں کیا کچھ نہیں یاد آرہا تھا۔

"بس کچھ لوگوں کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے، عموماً لوگوں کی کھوج میں رہتے ہیں۔" وہ مبہم سا بولا تھا پھر چاچو نے ماحول کی کثافت کم کرنے کے لیے یہ موضوع بدل دیا تھا۔

"سوزن کا اور تمہارا معاملہ کہاں تک پہنچا؟" ان کے لہجے میں تجسس نہیں، سادگی تھی گویا وہ میکس کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔

"وہ بات تو وہیں ختم ہوگئی تھی۔" میکس کے الفاظ بھی گویا بھیگ سے گئے تھے۔ اس کے چہرے پر چھائی شکستگی بہت واضح پڑھی جاسکتی تھی۔ وہ اتنا دلبرداشتہ اور رنجیدہ کیوں ہوگیا تھا؟ مالا سمجھ نہیں پارہی تھی۔ مگر اب باہر کھڑے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میکس الوداعی کلمات بول کر اٹھنے ہی لگا تھا جب مالا ٹرالی دھکیلتی اندر آگئی۔ وہ اتنے لوازمات چائے کے ساتھ دیکھ کر بوکھلا سا گیا تھا۔

"نوئین مالا......! اس کی ضرورت کیا تھی؟ میں اس گھر میں مہمان تھوڑی ہوں۔" میکس خواہ مخواہ شرمندہ ہوئے جارہا تھا مگر چاچو اور مالا کے اصرار پر اسے چائے پینا ہی پڑی تھی۔ پھر وہ کچھ دیر مزید وہاں بیٹھ کر واپس چلا گیا تھا اور میکس کے چلے جانے کے بعد مالا سہولت سے برتن سمیٹ کر ان کے قریب آبیٹھی تھی۔ تاہم بیٹھنے سے پہلے اس نے چاچو کو دوا ضرور دے دی تھی۔ کم از کم چاچو کو وقت پر دوا دینے والا کام وہ کبھی نہیں بھولتی تھی۔ باقی بہت سے معاملات میں اپنے بھلکڑ پن کی وجہ سے اسے کتنا نقصان اٹھانا پڑسکتا تھا، اس بات سے مالا واقف نہیں تھی۔ تاہم وہ اپنی کمزوری پہ فی الحال قابو نہیں پاسکی تھی۔ اکثر اسے صبح کے وقت عیسٰی کو یہ یاد دلانا بھول جاتا تھا کہ وہ لنچ کے

لیے اب بھی گھر آجایا کرے۔ وہ لینگویج اسکول سے جلدی آجاتی تھی۔ تاہم عیسٰی مصروفیت کے باعث لنچ ٹائم میں اس کا فون نہیں اٹھاتا تھا اور صبح کے وقت مالا تاکید کرنا بھول جاتی تھی۔

فی الوقت بھی وہ میکس کی باتوں پر غور کرتی چاچو کو سوزن کے گفٹ کا نہیں بتاسکتی تھی جسے لاعلمی میں مالا نے کوڑے میں پھینک دیا تھا اور جو اس کی بدقسمتی کے پھیر کی وجہ سے عیسٰی کے ہاتھ لگ گیا تھا اور نہ صرف عیسٰی نے اسے بھگو بھگو کر باتیں سنائی تھیں بلکہ گفٹ اٹھا کر اپنے پاس سوزن کو لوٹانے کے لیے سنبھال لیا تھا...... اب بھلا مالا وہاں کیا کرتی......؟ وہ اس کی کوئی بات سننے والا نہیں تھا اور بعد میں مالا عادتاً وضاحت کرنا بھول گئی تھی۔ حالانکہ اگر وہ وضاحت کردیتی تو عیسٰی سو فیصد مطمئن ہوسکتا تھا۔ ظاہری بات تھی اسے سوزن کے تحفے کی اتنی بے حرمتی پسند نہیں آئی تھی۔ مالا ان نزاکتوں کی طرف دھیان کرلیتی تو شاید اتنے خسارے میں کبھی نہیں رہتی۔

فی الحال بھی وہ میکس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب اچانک چاچو نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔

"میکس تمہارا کلاس فیلو ہے؟" وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے، نہ جانے کیا سوچ رہے تھے اور کسے سوچ رہے تھے۔ ان کا سوال سن کر مالا نے فوراً سر ہلا کر جواب دیا تھا۔

"اس کی لینگویج بہت امپروو ہوچکی ہے چاچو! وہ اوپر کے کسی درجے میں پڑھتا ہے۔" اس نے اپنی معلومات کے مطابق بتایا تھا جبکہ چاچو قدرے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھر کے رہ گئے تھے پھر انہوں نے نفی میں ہولے سے سر ہلایا تھا۔ گویا مالا کی بات انہیں قائل نہیں کرسکی تھی اور وہ ذرا بھی مطمئن نہیں ہوسکے تھے۔ چاچو کے تاثرات ملاحظہ کرکے مالا نے مزید...... انہیں بتایا تھا۔

"پڑھتا تو وہ اوپر والے کسی درجے میں ہے جبکہ زیادہ وقت ہماری کلاس میں پایا جاتا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کی تھی۔ اسے چاچو کے سنجیدہ تاثرات کچھ کچھ گھبراہٹ میں مبتلا کررہے تھے۔ جانے کیا مسئلہ تھا؟ وہ اتنے سنجیدہ تو کبھی نہیں رہے تھے۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے چاچو۔" وہ متفکر ہوگئی تھی اور بھاگ کر بی پی آپریٹس اٹھا کر لانا چاہتی تھی۔ شاید چاچو کا بلڈ پریشر بڑھ رہا تھا، چاچو اس کا ارادہ بھانپ کر سرعت سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولے۔

"میں ٹھیک ہوں بیٹا! تم میرے پاس رہو۔" ان کے چہرے پر اب بھی زردی چھارہی تھی۔ بس مالا کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

"مگر مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے، کیا عیسٰی کو بلاؤں؟" مالا نے ان کا ٹھنڈا ہاتھ نرمی سے مسلتے ہوئے کہا تھا۔ تب وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیے تھے۔

"اسے پریشان نہ کرو...... مجھے کچھ نہیں ہوا۔" اب وہ مالا کی خاطر خود پہ قابو پاکر مسلسل مسکرا رہے تھے۔ وہ جانتی تھی، چاچو خود پر جبر کررہے ہیں مگر ان کی بات مانے بغیر گزارہ بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ان کا دھیان بٹانے کی غرض سے بولی۔

"آپ میکس کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟" اس نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑ دیا تھا جہاں سے اس کی سوچوں کے باعث ٹوٹ گیا تھا...... تب چاچو پھر سے کسی سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ مالا نے ان کا گھٹنا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" وہ پھر سے متفکر ہوگئی تھی۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ میکس کو ڈوچ سیکھنے کی

کیا ضرورت ہے۔ وہ تو آٹھ دس ماہ بواریا میں مون کے انسٹی ٹیوٹ میں پڑھاتا بھی رہا ہے...... تو پھر اس اسکول میں پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟'' چاچو کے حیران سوال نے مالا کو بھی لمحہ بھر کے لیے منجمد کردیا تھا۔

''تو کیا میکس جان بوجھ کر اپنا ٹائم ویسٹ کررہا ہے یا پھر شوقیہ......؟'' وہ بولتے، بولتے اٹک، اٹک کر رک گئی تھی۔

''شوقیہ تو نہیں، کیا پتا...... تمہارے اسکول میں جاب کا ارادہ رکھتا ہو۔'' چاچو نے گویا خود کو بودی سی دلیل دے کر قائل کرنا چاہا تھا مگر کر نہیں پائے تھے۔

''میکس بتا رہا تھا، اس کی مون کے ساتھ کسی بات پر تلخ کلامی ہوگئی تھی، وہ بواریا کا انسٹی ٹیوٹ چھوڑ چکا ہے اور بیدی تو تک بھی نہیں جاتا...... جانے اس بات میں کتنی سچائی ہے۔'' چاچو گویا خود کلامی کررہے تھے جبکہ مالا کی تو سانس تک رک گئی تھی۔ وہ پھٹی، پھٹی نگاہوں کے ساتھ چاچو کو ایک ٹک دیکھے جارہی تھی۔ اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی ضربیں لگ رہی تھیں۔

''مون اور میکس...... انسٹی ٹیوٹ، لڑائی، ڈوچ بولنا، اردو سمجھنا۔'' اسے لگ رہا تھا، مون اور میکس ایک ہی کہانی کے دو مختلف رخ ہیں، اس کے تصور کی اونچائی پر گروہی کے گھر کی وہ بھیانک رات ناچنے لگی تھی۔ دو حسین تر اور عجیب تر آنکھیں...... اس کی عجیب گفتگو، روح کھینچ لینے والی باتیں...... آنکھوں سے لپکتی نفرت کی آگ...... چہرے پر سنگِ مرمر جیسی سختی...... کروفرانہ، مغرورانہ وہ غرورِ حسن تھا یا کچھ اور......؟ وہاں نفرت کے شعلے تھے یا زخمی انا کا زہر پھونکا جارہا تھا؟

''تم عنقریب علی عیسیٰ کی زندگی سے جانے والی ہو۔'' تکبر سے بھرا لہجہ، آگ اگلتے لفظ...... اور پتھر جیسی رنگ بدلتی آنکھیں جو کبھی ہری نظر آتیں، کبھی سرمئی، کبھی نیلی اور کبھی سیاہ......

مالا کو کڑی سے کڑی ملانا نہیں آتا تھا...... اسے لفظ کی گہرائی میں اترنا نہیں آتا تھا۔ اسے لہجے سمجھنا اور چہرے پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ اسے تو کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ وہ چھوٹے سے ملک کی شہری تھی، اِک چھوٹے سے گھر میں محدود زندگی گزارتی آئی تھی۔ اس نے بھانت، بھانت کے اور رنگ، رنگ کے لوگ کہاں دیکھے تھے؟

مگر ایک بات اسے سمجھ ضرور...... آرہی تھی۔ کوئی جال سا تھا جو اس کے آس پاس پھینکا جارہا تھا۔ کوئی گھیرا سا تھا جو اس کے حلقوم اور گردن کے گرد تنگ کیا جارہا تھا۔ اسے چاروں طرف سازشوں کے شکنجے جکڑنے والے تھے مگر بے خبری کا یہاں عالم ہی کوئی اور تھا۔

☆☆☆

اسے رات بھر ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔ بار بار جانے کس خدشے کے تحت آنکھ کھل جاتی۔ اس شب علی عیسیٰ بھی گھر نہیں آیا تھا۔ آفاق اور عیسیٰ دونوں آؤٹ آف اسٹیشن گئے تھے۔ بس مالا اور چاچو ہی گھر میں موجود تھے۔ ہاں، عیسیٰ نے نمی کو رک جانے کے لیے کہا تھا۔ نمی دوسرے کمرے میں سو رہی تھی جبکہ مالا کو نیند نہیں آرہی تھی۔ پانچ دس منٹ کے لیے آنکھ لگتی اور پھر جانے کیسے اور کیونکر پلکیں خود بخود کھل جاتی تھیں۔ وہ اس آنکھ مچولی سے عاجز آکر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے کرسٹل کی گڑیا کے دونوں ڈیلے آن کردیے تھے۔ کمرے میں خاصی روشنی پھیل گئی تھی۔ یہ گڑیا، ٹیبل لیمپ کا کام بھی بخوبی دیتی تھی۔ اللہ نے انسان کو کیسے، کیسے دماغ دیے ہیں؟ کبھی آسمان پر اڑتے جہاز اسے حیران کرڈالتے تھے اور کبھی پانی

کی سطح پر تیرتے محل برابر جہاز، یاٹ، کشتیاں، کبھی ننھی منی مشینریاں اسے...... حیران کردیتی تھیں۔ یہ انسانی ذہن ہی تو تھا جس نے آنکھوں کو دنگ کردینے والی چیزیں ایجاد کی تھیں۔ کروڑوں میل دور بیٹھ کر اپنوں کی آوازیں سن لینا...... ایک بٹن دبا کر کمرا ٹھنڈا اور گرم کرلینا...... انسان کی زندگی مشین کے کتنے تابع ہے اور انسان خود بھی تو ایک مشین (دماغ) کے تابع ہے...... مالا نے عقل کو حیران کردینے والے ایسے ایسے نظارے اور چیزیں دیکھی تھیں کہ وہ دنوں ان کے سحر سے نکل نہیں پاتی تھی۔ کبھی کسی اتنی اونچی عمارت کو دیکھ کر وہ حیرت سے سوچتی تھی۔ ''اللہ یہ بھی تو انسان نے بنائی ہیں...... تیری بنائی مشین (دماغ) کے زور پر...... پھر بھی تیری ذات کو تسلیم نہیں کرتے؟ کیسے اندھے لوگ ہیں یہ......'' یہاں جگہ جگہ حیرت کدے کھڑے تھے۔ خود مالا کے اپنے گھر میں بہت ساری ایسی چیزیں موجود تھیں جس کے استعمال کی اسے سمجھ نہیں آتی تھی۔ خصوصاً اسے تو کمرا لاک ہو تو کھولنا بھی نہیں آتا تھا تبھی عیسیٰ نے جگہ جگہ کچھ پیغامات لکھ دیے تھے۔ جیسا کہ اس کے بیڈ روم کا دروازہ اندر کی طرف بہت کھینچنے سے کھلتا تھا سو عیسیٰ نے وہاں ایک سفید سلپ پر طریقہ لکھ دیا تھا۔ اسی طرح مالا کی رہنمائی کے لیے عیسیٰ نے بہت سی آسانیاں فراہم کردی تھیں۔ وہ عیسیٰ کو سوچتی ہوئی بہت اداس ہونے لگی تھی۔ وہ کبھی رات بھر کے لیے کہیں نہیں گیا تھا، کم از کم کاروباری کام کے لیے تو کبھی نہیں گیا تھا مگر اب اسے اپنے کام کے لیے شہر سے باہر تو جانا ہی تھا۔ مالا کو عارضی جدائی کے لیے عادی ہونا ہی تھا۔

اور شاید اس کی یاد اور محبت کی کشش تھی جو عیسیٰ کی فون کال نے ماحول کے سناٹے کو توڑ ڈالا تھا۔ ''آختونگ، آختونگ۔'' (توجہ کیجیے) عیسیٰ کا موبائل بج اٹھا تھا۔ وہ اپنا موبائل مالا کے پاس چھوڑ گیا تھا جبکہ دوسرا سیل ہمراہ لے گیا تھا۔ اس سیل فون کی ٹیون خود بخود بدلتی رہتی تھیں۔ مالا نے لپک کر سیل فون اٹھالیا تھا تبھی دوسری طرف گہری سانس کھینچی گئی۔

''مجھے پوری توقع تھی کہ تم جاگ رہی ہوگی۔'' عیسیٰ نے چھوٹتے ہی چوٹ کرنے کی کوشش میں مالا کو خفا کردیا تھا۔ وہ اس کی بات سن کر بگڑ گئی۔

''ایک تو اکیلا چھوڑ گئے ہیں، اوپر سے زبردستی سلانے کی کوشش میں بھی ہیں، نہیں آرہی مجھے نیند۔'' مالا چڑچڑے پن سے بولی۔ وہی بغیر سوچے سمجھے بولنے کی پرانی عادت...... اب وہ عیسیٰ کی طرح تول، تول کر تو بول نہیں سکتی تھی۔ عیسیٰ کو بے ساختہ ہنستے سن کر وہ قدرے حیران ہوئی تھی پھر اپنی بات پر غور کیا تو جھینپ سی گئی۔

''میں کہاں سُلا رہا ہوں، اتنی دور بیٹھے بس تصور ہی کیا جاسکتا ہے، عمل ہرگز نہیں۔'' عیسیٰ کا لہجہ شوخ سا تھا، ذرا بھی آواز میں نیند کا خمار یا بھاری پن نہیں تھا۔ مالا قدرے چونکی تھی پھر اس کی شوخ بات کا اثر زائل کرنے کی غرض سے بولی۔

''آپ کیوں نہیں سوئے......؟'' وہ خفگی سے پوچھ رہی تھی۔ حالانکہ عیسیٰ کی غیر متوقع کال نے اس کے اندر سکون اتار دیا تھا۔ کچھ دیر پہلے کا خوف جاتا رہا تھا۔ ورنہ، اسے تو نیلے ڈیلوں والی نازک اندام گڑیا سے بھی خوف آرہا تھا۔

''بس آپ کی یاد نے دل کو بے قرار کر رکھا ہے۔'' عیسیٰ نے خمار آلود آواز میں کہا تھا تب مالا اسے چھیڑنے کی غرض سے بولی۔

''کہیں پی تو نہیں رکھی؟'' اس کا لہجہ شوخ سا تھا۔ مسکراتا، کھلکھلاتا ہوا، عیسیٰ نے بڑی عزیدار سی آہ بھری تھی۔

"ہزار جام لطف، ہزار مہ خانے
نگاہِ یار کی لذت، شراب کیا جانے"

وہ بڑے برجستہ لب و لہجے میں بولا تھا۔ یوں کہ مالا بے ساختہ ہنس پڑی تھی پھر عیسیٰ نے پورا ایک گھنٹا اس سے بات کی تھی۔ مالا کا تو اب بھی دل نہیں بھر رہا تھا تاہم عیسیٰ نے اسے پچکارتے ہوئے رات گہری ہونے کا احساس دلایا تھا اور یہ کہ اسے وقت پر سونا چاہیے تھا تاکہ صبح فریش اٹھ سکے، عیسیٰ نے فون بند کیا تو مالا نے خود میں ایک نئی تازگی بھرتی محسوس کی تھی۔ یہ صرف عیسیٰ کی فون کال کا کمال تھا۔ وہ چپل پہن کر باہر نکل آئی۔ ارادہ تھا پانی پی کر آرام سے سونے کے لیے لیٹے گی۔ سو پانی پی کر وہ اپنی ترنگ میں باہر نکل رہی تھی جب کاریڈور کے آخری سرے پر اسے کسی کا سایہ نظر آیا تھا۔ یہ سایہ انسانی وجود کا تھا...... مالا کا کچھ دیر دالا شگفتہ سا مطمئن دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ خوف کے مارے اس کا وجود دھیرے، دھیرے کانپنے لگا تھا۔ لاؤنج اور کاریڈور میں اندھیرا تھا، نیم ملگجا سا...... اور مالا کو یہ سایہ چلتا پھرتا نظر آ رہا تھا۔ وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ چیخ بھی نہیں پا رہی تھی اور نہ اس میں ہمت تھی کہ جو آگے بڑھ کر کچن کی لائٹ آن کر لیتی۔ اس نے آنکھیں مسل، مسل کر سامنے دیکھنے کی کوشش میں تھوڑا آگے بڑھنا چاہا تھا مگر اس کے پیر گویا زمین نے جکڑ لیے تھے۔ اس کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید باہر ہوا تیز چل رہی ہو اور کاریڈور کے دائیں طرف سٹنگ روم کا کوئی پردہ ہل رہا ہو مگر یہ خیال پختہ نہیں تھا۔ سایہ کسی انسانی وجود کا تھا۔ مالا نے مڑنا چاہا تو محسوس ہوا کہ ٹانگوں میں ذرا بھی ہمت نہیں...... وہ نہ آگے بڑھ سکتی تھی اور نہ پیچھے ہٹ پا رہی تھی۔ خوف نے اسے زرو کر رکھا تھا اور وہ انسانی سایہ کہیں غائب ہونے والا بھی نہیں تھا۔

ایک ہی جگہ چلتا نظر آ رہا تھا۔ پھر معاً اسے خیال آیا...... کہیں نمی تو نہیں...... اور شاید وہ نمی ہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر داخلی دروازے کو دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہو گئیں۔ داخلی دروازہ کھلا تھا جبکہ چاچو نے سونے سے پہلے خود تمام لاک لگائے تھے۔ مالا کا سر چکر کھانے لگا تھا۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی اور وجود کسی مجسمے کے مانند ساکت اور سرد ہو رہا تھا پھر جانے کیسے اس نے دل کو ڈھارس پہنچانے کے لیے خود سے فرض کر لیا۔ "شاید نمی یا چاچو اندر سے بھلا کس نے دروازہ کھولنا تھا۔" بس یہی سوچ کر وہ ہمت مجتمع کرتی ہوئی کاریڈور کی طرف بڑھنے لگی تھی جب ایک عجیب سی کرخت اور بھیانک آواز سن کر سہم گئی۔

"زیحنت...... (خبردار) فور سیخت (خبردار)"

آواز میں اتنا واضح تحکم تھا کہ مالا کی گویا جان ہی نکل گئی تھی۔ اس نے چیخنا چاہا تھا مگر چیخ نہیں پائی، بولنا چاہا تو بول نہیں پائی۔ گویا اس کرخت آواز نے اسے اپنی طرف بڑھنے سے روکا تھا۔ مالا کو گویا زماں و مکاں بھول گئے تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے سرپٹ دوڑ لگاتے اس...... پہلے ہی بیڈ روم میں گھس گئی تھی جو نمی کا تھا یا چاچو کا...... جس طرح دروازہ دھاڑ سے کھول کر وہ چیختے ہوئے اندر آئی تھی۔ بیڈ پر پڑا نمی کا وجود سہم کر ہڑبڑایا تھا پھر نمی گویا خود بھی چیختی ہوئی بیڈ سے اچھل پڑی تھی۔ مالا کو اپنے کمرے میں حواس باختہ کھڑا دیکھ کر وہ بھی انتہائی خوفزدہ ہو گئی۔

"تم یہاں......؟" نمی نے نیند سے بھاری آواز میں کہا تھا تب مالا نے ہکلاتے ہوئے باہر کی طرف اشارہ کر کے نمی کو بتایا۔

"باہر...... کوئی ہے......" وہ بھاگتے ہوئے نمی سے چمٹ گئی تھی جبکہ نمی کا رنگ بھی خوف سے

اڑ گیا۔ اوپر سے مالا کی انتہائی بری حالت اور خوف سے نیلا پڑتا چہرہ دیکھ کر ڈرپوک سی نمی خود بھی تھر تھر کانپنے لگی تھی۔

"کک...... کون ہے......؟" نمی نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"کوئی...... سایہ...... بولتا ہوا......" مالا نے رک رک کر بتایا تھا۔ وہ نمی کا بازو دبوچے کھڑی تھی۔ اگر باہر نمی بھی نہیں تھی تو پھر وہ کرخت آواز کس کی تھی۔ انتہائی کھردرا اور بھاری زنانہ لہجہ تھا۔ نمی نے پوچھا تھا کہ وہ آواز کیسی تھی؟ مالا نے لڑکھڑاتے لہجے میں پوری بات بتا دی پھر لاؤنج کے کھلے دروازے کا سن کر تو نمی کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

"دروازہ کس نے کھولا......؟ سر نے خود لاک چیک کیے تھے؟" نمی ہکلاتے ہوئے حواس باختہ ہو گئی پھر مالا کو ساتھ لیے چاچو کے کمرے تک آئی۔ کاریڈور میں اب پوری روشنی پھیلی ہوئی تھی بلکہ سارا گھر جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ نمی اور مالا ایک مرتبہ پھر سے بے ساختہ چیخ پڑیں۔

"لائٹس کس نے آن کی......؟" چاچو کو اپنے بیڈ پر گہری نیند میں سوتا دیکھ کر مالا چیخ پڑی تھی۔ یہ اس کی چلاہٹ بھری خوفزدہ آواز تھی جسے سن کر چاچو بھی اٹھ گئے تھے اور چاچو کو اٹھتا دیکھ کر مالا ایک ہی جست میں ان تک پہنچ کر اونچی آواز میں رونا شروع ہو گئی تھی۔ چاچو اس افتاد پر گھبرا اٹھے تھے مگر مالا نے رونا اور چیخنا کم نہیں کیا تھا۔

"مالا...... ! میری بیٹی ہوا کیا ہے؟" چاچو کے بار بار پوچھنے پر سہمی کھڑی نمی نے پوری بات انہیں بتا دی تھی تب چاچو بے انتہا پریشانی کے عالم میں فوراً باہر نکل گئے تھے۔ مالا اور نمی بھی ان کے پیچھے بھاگتے ہوئے آئی تھیں اور مالا کی ایک مرتبہ پھر گویا آنکھیں پھٹ پڑی تھیں۔ پورے لاؤنج میں ہُو کا

مجھ سے ملیے

میرا نام صدف نورین ہے، میں



گوجرانوالہ کے ایک گاؤں میں سات اپریل 1988ء میں پیدا ہوئی۔ جب پانچ سال کی تھی تو میں اپنے والدین کے ساتھ لاہور شفٹ ہو گئی۔ میرے دو بھائی ہیں، میں ایک ہی بہن ہوں۔ پنجاب یونیورسٹی سے میں نے بی اے کیا ہے۔ میری پسندیدہ کتاب قرآن مجید ہے۔ میں تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں۔ قرآن و حدیث کے بے شمار کورسز بھی کیے ہیں، میں اپنے اس علم کو اپنے اسٹوڈنٹس تک منتقل کرنا چاہتی ہوں تاکہ وہ دینی تعلیم سے روشناس ہو سکیں جس سے بچوں کی اخلاقی تربیت بہتر ہو سکے گی۔ پاکیزہ سے میرا رشتہ بہت پرانا ہے...... جب تک پاکیزہ نہ پڑھ لوں چین نہیں ملتا۔ ہر ماہ بے قراری سے نئے پرچے کا انتظار رہتا ہے۔ مجھے آپ سے مل کر اچھا لگا، آپ کو کیسا لگا؟

عالم تھا۔ مکمل اندھیرے میں ڈوبا ہوا...... کاریڈور میں اب کوئی بھی بولتا ہوا سایہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ لاؤنج کے لاک جب چاچو نے چیک کیے تو مالا گویا دنگ رہ گئی تھی۔ دونوں آٹو میٹک لاک بند تھے۔ چاچو کچھ متحیر سے پلٹے۔

''مالا...... ! میری جان، یہاں تو کچھ بھی نہیں۔'' انہوں نے پھر سے اسے ساتھ لگا کر چوما تھا۔ تسلی ولاسا دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ اسے سمجھا رہے تھے کہ شاید اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے مگر مالا قطعاً ماننے کو تیار نہیں تھی۔

''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے چاچو...... ! یہاں ابھی کچھ دیر پہلے کوئی تھا۔'' وہ بری طرح سسک رہی تھی اور نمی بھی سر ہلا کر گویا تائید کر رہی تھی۔

''لا نبٹس آن تھیں۔'' نمی نے یقین دلانے والے انداز میں کہا تھا...... مگر چاچو نے اسے ڈانٹ دیا۔

''تم نے بے پروائی سے آن کر دی ہوں گی...... اب اسے مزید خوف زدہ مت کرو۔'' چاچو کے غصے کو محسوس کر کے نمی چپ کر گئی تھی جبکہ مالا قطعاً اسے کوئی بھیانک خواب نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کچھ دیر پہلے گھر میں کوئی آیا تھا؟ کون آیا تھا؟ اور پلک جھپکنے کی دیری میں کیسے چلا گیا؟ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔

''تمہارا وہم ہے بیٹا......'' چاچو نے پیار سے اسے سمجھایا۔ ''صدیوں سے یہاں اس گھر میں رہ رہا ہوں...... ایسا کبھی نہیں ہوا۔'' وہ اسے برابر تسلی دے رہے تھے پھر مالا کو دوبارہ اپنے کمرے میں لے آئے۔ نمی بھی ان کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

''کیا پتا، بھوت پریت میں سے کوئی ہو، اپنی دنیا سے بھٹک کر ہماری دنیا میں آ گیا ہو......'' نمی نے اپنی عقل کے مطابق رائے دی تھی۔ چاچو کو بے انتہا غصہ آ گیا۔ انہوں نے جھڑک کر نمی کو باہر جانے کے لیے کہا تھا۔

''یہ قوم......'' چاچو نے بہ مشکل خود کو غصہ کرنے سے باز رکھا تھا۔ ''اس چیز کو نہیں مانتے جس کو ماننا چاہیے...... وجودِ لاریب سے غافل ہیں اور بھوت پریت پر اندھے اعتقاد......'' نمی کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد بھی چاچو غصہ کرتے رہے تھے۔ پھر ہوا یوں کہ نمی ایک مرتبہ پھر ڈرتے، ڈرتے واپس آ گئی۔

''سر...... ! مجھے باہر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔'' اس نے اتنی بے چارگی سے کہا کہ چاچو اور مالا دونوں کو ترس آ گیا۔ یوں نمی اور مالا نے رات چاچو کے کمرے میں جیسے تیسے گزاری تھی اور صبح ہوتے ہی نمی نے گویا دوڑ لگا دی۔ یہ بوار یا میں گزرنے والی راتوں سے بھی خوفناک اور بھیانک رات تھی۔ مالا کو پوری رات نیند نہیں آئی تھی اور صبح بھاری سر کے ساتھ نماز ادا کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ چاچو تو مالا سے بھی پہلے اٹھ کر نماز ادا کر چکے تھے...... اور اب اپنی تسبیحات پڑھنے کے بعد معمول کے مطابق دوبارہ سو چکے تھے۔ تاہم مالا اٹھ کر باہر چلی آئی تھی۔ رات کا منظر ایک پل کے لیے بھی مالا کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ کاریڈور کے آخری کونے کو دیکھتے ہوئے اس نے بے ساختہ جھرجھری لی تھی۔ رات کی بھیانک ساعتیں ایک مرتبہ پھر نگاہوں کی پتلیوں میں جم گئی تھیں۔ وہ بہ مشکل خوف سے پیچھا چھڑا کر باہر آئی تو نمی کو تالاب کے کنگرے پر بیٹھا دیکھ کر کچھ متحیر رہ گئی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر وہ دبے قدموں سے چلتی ہوئی تالاب کی طرف آئی۔ اسے لگا نمی سر جھکائے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ہے مگر یہ مالا کی خام خیالی تھی۔ قریب آنے پر پتا چلا تھا نمی گھٹنوں میں منہ

چھپائے کسی سے فون پر بات کرنے میں مصروف تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ اس نے دور سے ہی کسی کے آنے کی آہٹوں کو محسوس کر لیا تھا تبھی فون کو آف کر کے گردن موڑ ے مالا کو دیکھنے لگی تھی۔ مالا کو اس کے تاثرات کچھ عجیب لگے تھے۔ گویا اسے مالا کی مداخلت سخت گراں گزری تھی۔ اور اس کا موڈ بھی کچھ بگڑ گیا تھا۔ تاہم وہ منہ سے ناگ (ہیلو) تک بھی نہیں بولی تھی جو اس کے معمول کا ایک حصہ تھا۔ مالا کو وہ کچھ کھوئی، کھوئی اور کسی الجھن میں ڈوبی نظر آئی تھی پھر کچھ ہی لمحوں میں اس نے گویا حواسوں میں آ کر مالا کو ہیلو کہا تھا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

''تم بھی سویرے اٹھنے کی عادی ہو۔'' نمی نے بہ مشکل مسکرانے کی کوشش میں باچھیں یہاں سے وہاں تک پھیلائی تھیں۔ مالا کو اس کا زبردستی مسکرانا بھی برا لگا تھا۔ بالکل عجیب سا۔

''ہاں...... اور شاید تم بھی۔'' مالا کو جواب میں کچھ تو بولنا ہی تھا سو مالا کا سوال سن کر نمی نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلایا۔

''کسی سے بات کر رہی تھیں؟'' اسے خاموش دیکھ کر مالا نے گفتگو مزید آگے بڑھائی تھی۔ تب وہ کچھ گھبرا کر ہاں کہنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تھی۔ مالا نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ یقیناً نمی اپنے کسی بوائے فرینڈ سے گپ شپ کر رہی تھی سو مالا کی انٹری نے اسے کچھ بدمزہ سا کر دیا تھا۔ اب مالا، کے سوال پر وہ بجائے جواب دینے کے پیروں سے گھاس مسلنے لگ گئی تھی۔ سو مالا نے اس تمہید پر لعنت بھیج کر سیدھے سیدھے رات کا قصہ چھیڑ دیا تھا جسے سن کر وہ خوف سے پیلی پڑ گئی۔ رات کو بھی نمی کا ردِعمل یہی رہا تھا۔ وہ مالا سے بھی زیادہ خوفزدہ تھی اور یقیناً ڈرپوک بھی بہت تھی۔

''نمی! کیا پہلے بھی رات کو اس قسم کے واقعات پیش آ چکے ہیں؟'' مالا اپنے وسوسے کو ختم کرنا چاہتی تھی، تبھی براہِ راست نمی سے پوچھ رہی تھی ورنہ چاچو تو رات کو جو کچھ بھی ہوا تھا اسے مالا کا وہم سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ وہ سب مالا کا وہم ہرگز نہیں تھا۔ نمی اس کا سوال سن کر پھر گھبرا گئی تھی۔ تبھی اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا تھا۔

''پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا......'' نمی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے، مالا کو ذرا بھی یقین نہیں آیا تھا بلکہ نمی کے جھوٹ نے اس کا ایقان بڑھا دیا تھا۔ وہ پورے وثوق سے کہہ سکتی تھی اس گھر میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

''جھوٹ مت بولو، نمی! مجھے سچ بتاؤ، یقین کرو، میں چاچو کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' مالا نے نرمی سے کہا تھا۔ وہ اس کا تذبذب جان چکی تھی۔ یقیناً اسے چاچو کی ڈانٹ نے خوف زدہ کر رکھا تھا اگر چاچو جان جاتے کہ نمی نے مالا کو کچھ اور بھی بتایا ہے تو پھر اس کی چھٹی کروا دی جاتی۔ نمی بہت غریب گھرانے سے تھی۔ اس کا باپ سیاسی پناہ لے کر جرمنی آیا تھا۔ نمی کا کنبہ بھی بہت زیادہ تھا...... یہ ساری بہنیں کلینرز تھیں اور گھر کا خرچہ بھی کھینچ گھسیٹ کر چلاتی تھیں۔ مالا کی یقین دہانی نے نمی کو کچھ ڈھارس پہنچائی تھی۔ اب وہ مالا کو کچھ بھی بتا دینے کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔ اس نے جھکے سر کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ حالانکہ وہ اب بھی خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا لہجہ اور آواز بھی کانپ رہی تھی۔

''اس گھر میں عجیب، عجیب واقعات ہوتے ہیں۔ یہ گھر شادی شدہ جوڑوں کے لیے بڑا ہی منحوس ہے۔ یہ صرف میں نہیں کہتی بلکہ یہاں کی ہاؤس فراؤ (عیسیٰ کی مما) بھی کہتی تھیں۔'' نمی نے خوف زدہ لہجے میں دھیرے، دھیرے بتانا شروع کیا تھا جبکہ مالا جو خود کو بڑا بہادر بنا کر نمی سے

سوال کر رہی تھی پہلی بات پر ہی اندر سے ڈھے گئی۔ ایک عجیب سا خوف تھا جس نے مالا کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا مگر وہ نمی کو خاموش نہیں کروا سکتی تھی۔ وہ نمی کو سننا چاہتی تھی۔

''میں نے اپنا لڑکپن یہیں گزارا ہے۔ ہاؤس فراؤ (مالکن) بہت اچھی تھی مگر آئے دن ان کے ساتھ کچھ نہ کچھ عجیب ہوتا تھا۔ کبھی ان کے کپڑے جل جاتے، کبھی نئے نکور برتن خود بخود شیلف سے نیچے گر کر ٹوٹنے لگتے اور پھر صحت مند تو وہ کبھی رہی ہی نہیں تھیں۔ ہر وقت بیمار رہتیں، کبھی سر میں درد، کبھی شدید قسم کا بخار، کبھی کھڑے، کھڑے چکر آنے لگتے تھے اکثر وہ راتوں کو خواب میں ڈر جاتی تھیں اور کبھی کبھار مالکن کو گھر میں چلتے پھرتے لوگوں کی آہٹیں سنائی دیتی تھیں۔'' نمی انگلیاں مروڑتے ہوئے اِدھر اُدھر چور نظروں سے دیکھتی کسی نادیدہ مخلوق کو دیکھ رہی تھی۔ ایسی مخلوق جو نمی کے منہ سے اپنا ذکر سن کر اسے نقصان بھی پہنچا سکتی تھی۔ وہ انتہائی خوف زدہ نظر آ رہی تھی اور مالا اس کی آخری بات سن کر لمحے بھر کے لیے دہل سی گئی۔

''لوگوں کی آہٹیں......؟'' مالا کے ہونٹ کپکپا گئے تھے۔ چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی۔ اس کے کان کسی نادیدہ مخلوق کی آہٹوں کو سننے لگے تھے جیسے عجیب سی شائیں شائیں جیسے کوئی گھاس پر چل رہا ہو، مالا نے بے ساختہ نمی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''کیا تمہیں بھی کسی کی آہٹ سنائی دی ہے؟'' اس کا وجود سوکھے پتے کے مانند کانپ رہا تھا۔ نمی اس کا سوال سن کر چپ سی کر گئی تھی پھر مالا کے دوبارہ دہرانے پر بھنچی بھنچی آواز میں بولی۔

''ہاں......'' اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ شدید گھبراہٹ کا شکار تھی۔ ''مجھے اکثر لاؤنج میں اور نیچے بیسمنٹ میں کوئی سرگوشیاں کرتا اور بولتا ہوا سنائی دیتا ہے۔'' نمی ہونٹ کاٹتے ہوئے کپکپاتی آواز میں بتا رہی تھی۔ مالا ایک دم پھر سے دہل گئی۔

''رات سے پہلے مجھے کبھی ایسا فیل نہیں ہوا۔'' مالا زیرِ لب بڑبڑا رہی تھی تب نمی نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا تھا۔

''پہلے تم کو اس لیے تنگ نہیں کیا گیا کہ یہاں رہنے والے لوگ مہمانوں کو کچھ نہیں کہتے...... اب ان کو سمجھ آ گئی ہے کہ تم مستقل یہاں رہو گی سو وہ اپنا آپ دکھانے لگے ہیں۔'' نمی بہت سنجیدگی کے ساتھ مالا کے حواسوں کو معطل کر رہی تھی۔ وہ خود بھی بہت پریشان تھی، رات کے واقعے نے اسے بھی سخت خوف زدہ کر رکھا تھا۔ اس کی مجبوری نہ ہوتی تو شاید وہ اس نوکری کو لات مار کے چلی جاتی مگر مسئلہ یہ تھا کہ کسی اسٹور یا پمپ پر جاب کرنا بہت تکلیف دہ، بڑا اذیت کام تھا۔ اڑتالیس گھنٹے کی سخت ڈیوٹی تھی اور نمی اتنا مشکل کام نہیں کر سکتی تھی جبکہ اس پاکستانی فیملی کے ساتھ کام کرتے ہوئے اسے کئی سال گزر چکے تھے۔ مناسب تنخواہ، کھانا فری اور کام بھی مشکل نہیں تھا۔ خصوصاً یہ لوگ ہر تہوار پر اضافی تنخواہ، بونس وغیرہ بھی دیتے تھے، عید، شب برات پہ نئے کپڑے بھی لے دیتے، اکثر بچا ہوا سارا کھانا وہ گھر لے جاتی تھی پھر اتنے اچھے لوگ تھے کہ ڈانٹ ڈپٹ، روک، ٹوک بھی نہیں کرتے تھے پھر ذرا سے خوف اور غیر معمولی واقعات سے ڈر کر وہ کیسے اتنی اچھی نوکری چھوڑ سکتی تھی۔ اس وقت بھی وہ مالا کو اپنی مجبوری کے متعلق بتا رہی تھی۔

''کبھی کبھی تو دن کو بھی برآمدے میں کسی کے چلنے کی آواز آتی ہے، مجھے اتنا ڈر لگتا ہے کہ حد نہیں...... مگر سر کو بھی نہیں بتا سکتی۔ وہ میری بات کا یقین نہیں کرتے۔'' نمی نے خوفزدہ لہجے میں بتایا۔ گویا یہ صورتِ حال اس کے لیے بہت پریشان کن تھی۔ مالا کی خوف کے مارے گھگی بندھ گئی تھی۔

ذہن پر ایک دم بوجھ آ پڑا تھا۔ چاروں طرف سائیں، سائیں کی آوازیں ابھر رہی تھیں اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ گویا کوئی نادیدہ چہرے اور آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ اس نے بے ساختہ نمی کا ہاتھ تھام لیا تھا، اسے رات کو کاریڈور سے آنے والی آواز پھر سے سنائی دے رہی تھی۔ ''زیخت'' (خبردار) مالا کے کانوں میں نوکیلے کانچ چبھ رہے تھے۔ جیسے اس وقت بھی وہ نادیدہ مخلوق انہیں خبردار کر رہی تھی کہ ہم یہیں آس پاس ہیں۔ اسی گھر میں رہتے ہیں۔ یہ ہمارا ٹھکانا ہے۔ یہاں کوئی عورت مستقل نہیں رہ سکتی۔ ہم اسے یہاں رہنے نہیں دیں گے۔ کم از کم مالا کو اپنے آس پاس یہی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

رات کا واقعہ اتنا معمولی نہیں تھا جسے اتنی آسانی کے ساتھ نظر انداز کر دیا جاتا مگر چاچو نے ایسے ہی کیا تھا۔ گویا ان کے نزدیک رات کا واقعہ مالا کے وہم یا خواب کے سوا کچھ نہیں تھا۔ حالانکہ نمی کے چلے جانے کے بعد بھی وہ چاچو سے کرید کرید کر سوال کرتی رہی تھی اور ہر دفعہ بات کو گھما پھرا کر اس گھر میں رہنے والی کسی نادیدہ مخلوق تک لے آئی تھی مگر چاچو کمالِ ذہانت سے اس کی بات کو بدل دیتے تھے یا تو وہ مالا کے خوف و ہراس کی وجہ سے کچھ چھپا رہے تھے یا پھر چاچو اس قسم کے واقعات اور انہونیوں کے عادی ہو چکے تھے جو بھی تھا، مالا کو وہ ہرگز بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکے تھے...... بلکہ ابھی تک اس کے رات والے وہم کو انجوائے کر رہے تھے جبکہ مالا اندر ہی اندر سخت جھنجلاہٹ کا شکار تھی۔

ایک طرح سے یہ بات مذاق میں ٹال دی گئی تھی۔ اتنا سنجیدہ موضوع مذاق کا نشانہ بن گیا تھا پھر عیسیٰ کو گویا اسے چھیڑنے کے لیے ایک اور موقع مل گیا۔ وہ آتے جاتے مالا کو تنگ کرتا۔

''پھر دوبارہ سے سہیلیوں نے ملاقات نہیں کی؟'' اس کی شرارت مالا کو غصہ دلا دیتی تھی۔ غالباً سہیلیوں سے مراد وہی نسوانی آوازیں تھیں جس نے مالا کو کاریڈور کی طرف آنے سے روکا تھا۔ مگر سچ تو یہ تھا جسے سب مالا کا وہم کہہ رہے تھے وہ کوئی وہم نہیں تھا بلکہ جاگتی آنکھوں دیکھنے والا بھیانک خواب تھا۔ مالا نے اس روز کے بعد کئی مرتبہ کمرے کے باہر آہٹیں سنی تھیں۔

اس رات کے بعد لائٹس آن ہونے والا واقعہ تو نظر کے سامنے نہیں آیا تھا مگر ایک ایسی انہونی ہوئی جسے کسی کا ذہن قبول کرنے والا نہیں تھا۔ صحیح معنوں میں چاچو اور عیسیٰ کو بھی اس واقعہ نے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ جو مالا کی باتوں کو سرے سے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے ایک دم انتہائی متفکر ہو گئے تھے بلکہ ان کی راتوں کا سکون اور نیند اُڑنے لگی تھی۔

ہوا کچھ یوں کہ مالا کو اس رات بھی اتفاقاً اکیلے رہنا پڑا تھا، اس شب نمی، مالا کے کمرے میں ہی سو رہی تھی کچھ دیر پہلے عیسیٰ نے کال کر کے ''سب خیریت ہے؟ کوئی مسئلہ تو نہیں۔'' اس قسم کی بہت سی باتیں پوچھی تھیں۔ تب تک کوئی مسئلہ نہیں پیش آیا تھا۔ مسئلہ تو فون بند کرنے کے بعد پیش آیا۔ کچھ دیر وہ ریسیور پکڑے بیٹھی رہی پھر جیسے کسی... غیر مرئی قوت نے اسے بستر سے اٹھا دیا۔ وہ غیر ارادی طور پر کمرے میں ٹہلنے لگی تھی۔ جب عیسیٰ گھر میں ہوتا تب اسے کسی بھی قسم کا خوف لاحق نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی ایسے عجیب و غریب واقعات پیش آتے تھے۔ اسے لگتا تھا، عیسیٰ کے منظر سے ہٹتے ہی اس کی زندگی بے ترتیبی کا شکار ہونے لگی تھی۔ جیسا کہ اس وقت اتنا عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔ مالا کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ جب اس نے اپنے روم کی واحد

گلاس ونڈو پر پڑے آدھے سفید نائیلون کے جالی دار اور آدھے پھولدار سلک کے پردے پر کسی عکس کو سرسراتے دیکھا تھا۔ جیسے کوئی کھڑکی کے باہر کھڑا تھا...... رات کے انتہائی پہر یہ خیال کیا کم ڈراؤنا تھا کہ کمرے کی کھڑکی سے باہر کوئی وجود سانس لیتا ہو اور آپ کو دکھائی نہ دیتا ہو؟ مالا کا معمول کے مطابق دھڑکتا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ ایک غیر ارادی حرکت کے طور پر وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں کھڑکی کے دوسری طرف گویا اوٹ میں ہو گئی تھی۔ یہ سمجھے بغیر کہ جو گھر کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے، جو بند لاک کو کھول سکتا ہے، وہ کمرے میں بھی تو آ سکتا ہے، وہ کمرے میں بھی تو بلا جھجک داخل ہو سکتا تھا اور وہ جہاں بھی چھپتی، اس نادیدہ مخلوق نے اسے دیکھ ہی لینا تھا مگر عین فطرتِ انسانی اس نے گویا خود کو کھڑکی میں سے تاڑتے وجود کی آنکھوں سے محفوظ کر لیا تھا۔ حالانکہ وہ سانس روکے دیوار سے چپکی کھڑی تھی۔ نیچے میٹرس پہ نینی بے خبر سو رہی تھی مگر اس کے ہونٹ ایک دوسرے کے ساتھ چپکنے سے بھی گریزاں تھے سو وہ نینی کو جگانے سے بھی قاصر تھی۔

مالا کو لگ رہا تھا گویا یہیں کھڑے، کھڑے صدیاں بیت گئی تھیں۔ اس سے مزید سانس روکنی بھی محال ہو گئی۔ وہ دیوار سے سر چپکائے لمبی، لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ جب اسے باہر باتوں کی بھنبھناہٹ سنائی دی تھی۔ کسی مرد اور عورت کی آوازیں تھیں، مالا کو لگا جیسے زمین اس کے پیروں تلے سے کھسک جائے گی...... جیسے ساتوں آسمان اس کے سر پر آن گریں گے جیسے وہ کبھی اپنے وجود کی عمارت کے ساتھ کھڑی نہ ہو پائے گی۔ اس کے کانوں نے آوازیں ہی کچھ اس قسم کی سنی تھیں۔ آسمان جیسے گر پڑا تھا اور زمین جیسے ریت کے مانند سرکنے لگی تھی۔ وہ ان آوازوں کو لاکھوں، ہزاروں، کروڑوں لوگوں کی آوازوں میں سے بھی پلک جھپکنے کی دیر سے پہلے پہچان سکتی تھی۔ مالا نے کان دیوار کے ساتھ چپکا دیے تھے۔

''ٹارگٹ تو اچیو کرنا ہی ہے......'' یہ مرد کی آواز تھی، سنجیدہ...... بردبار اور مستحکم سی، لہجے میں یقین بول رہا تھا۔ ارادے کی پختگی نظر آ رہی تھی...... کچھ دیر بعد نسوانی آواز بھی سنائی دی۔

''ٹارگٹ مشکل ضرور ہے، پر ناممکن نہیں...... میں چاہتی تو لمحوں میں کھیل کو ایک ہی چال کے ساتھ ختم کر سکتی تھی مگر ایسی گیم کا مزہ ہی کیا جس میں مقابل کو بے خبری میں مار ڈالا جائے...... بے خبری میں ہرا دیا جائے۔ مزہ تو تب ہے کہ مات کرنے سے پہلے تڑپا تڑپا کر پیار کا مزہ لوٹا جائے۔'' نسوانی آواز میں حقارت تھی، نفرت تھی، غرور تھا، زہر تھا، جانے اس کی آواز میں نفرت کے کیسے، کیسے غلیظ رنگ تھے۔ مالا کا پورا وجود سن ہو گیا تھا۔ جیسے برف کے تودوں نے اسے سن کر دیا ہو جیسے اس کا وجود برف کے گڑھے میں گر کر جم گیا ہو...... جیسے وہ برف کی کوئی دیوار بن گئی ہو، ان آوازوں کی پہچان نے مالا کو برف کا سردخانہ بنا ڈالا تھا۔

وہ مر جاتی پھر زندہ ہوتی تب بھی ان دو لوگوں کی آوازوں کو پہچان سکتی تھی۔ وہ عالمِ جنون میں بھی ان دو لوگوں کی آواز کو پہچان سکتی تھی۔ وہ دو لوگ کوئی اور نہیں بلکہ آفاق اور سوزن تھے۔

مرد اور عورت کی بھنبھناہٹ اب ختم ہو چکی تھی۔ جیسے کہانی ایک دفعہ تو ختم ہو چکی ہو مگر اصل کہانی ختم کہاں ہوئی تھی؟

مالا کی خوشگوار زندگی کس کی سازشوں کا شکار ہوئی......؟ کیا وہ ان آوازوں کو درست پہچانی تھی یا پھر......؟ یہ سب ضرور جانیے مگر اگلے ماہ

میرا مسیحا

تسنیم منیر علوی

آج کل میری نائٹ ڈیوٹی چل رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اسٹڈیز پر بھی پورا دھیان رکھا ہوا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں اپنے ملک میں خالی خولی ایم بی بی ایس...... سے کام نہیں چلتا جب تک ایک آدھ باہر کی ڈگری کا دُم چھلا نہ لگا ہو۔ تو جناب ہم اور ہمارے دو تین ساتھی آج کل ایف آر سی ایس کی بھی تیاری میں دن رات مصروف تھے۔ ہم مڈل کلاس لوگ اپنی اسپتال کی نوکری سے اتنا کما نہیں سکتے کہ امتحان کی



فیس، ائیرلائن کے ٹکٹ کا بوجھ اٹھا سکیں اس لیے کئی کئی ٹیوشنز بھی کر رہے تھے۔ امی، ابا کو میری شادی کی بھی جلدی تھی مگر میں اپنی تعلیم مکمل کیے بغیر ایسا سوچ بھی نہیں سکتا اور یوں بھی ضوافشاں کے بارے میں ابھی امی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ بھی میری طرح امتحان دینے میں سیریس تھی، میری خاطر اپنے کزن سے منگنی بھی توڑ دی۔ اس کے گھر والے کچھ عرصے تو اس سے ناراض رہے مگر اب گزرتے وقت کے ساتھ حالات نارمل ہونا شروع ہو گئے۔ یہ الگ بات تھی کہ کزن کے گھر والوں سے تعلقات منقطع ہو گئے۔ یہ ساری معلومات ضوفی کے ذریعے مجھ تک پہنچیں۔ اظہر کا تو کہنا تھا امتحان کی تیاری تو صرف ایک بہانہ ہے وہ اتنے ویل آف لوگ ہیں جب چاہیں اور جہاں چاہیں ضوفی کو امتحان دلا سکتے ہیں۔ اظہر کا گھر ضوفی کے گھر سے قریب تھا دونوں گھرانوں میں آنا جانا بھی تھا۔ بہرحال اب یہ خوب صورت سا بہانہ میرے ساتھ تھا۔

☆☆☆

ملک کے حالات جیسے بھی ہوں ہم نا امید نہیں تھے پر ضوفی تو بہت ہی خوف زدہ تھی۔

"اگر تمہارا ایگزام کلیئر نہ ہوا تو میں کیا کروں گی۔ حالات میرے ہاتھ سے نکل جائیں گے ممی پاپا کی ایک ہی ضد ہے ایگزام دیتے ہی ہم تمہاری مرضی وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑیں گے تمہارا رشتہ کر دیں گے۔" وہ اس روز تقریباً روتے ہوئے مجھے بتا رہی تھی اور اب میں یہ سوچ کر کانپ جاتا...... کہ اگر امتحان کلیئر نہ ہو سکا تو......؟

"نا امید نہ ہو ہم سے اے رہبر فرزانہ
کم ہوش ہیں لیکن بے ہوش نہیں راہی۔" میں شعر کو توڑ موڑ کر اسے ہنسانے کی کوشش کرتا اور وہ دلکشی سے مسکرا دیتی۔

انکوائری سے معلومات حاصل ہونے پر معلوم ہوا کہ ایگزام میں اب صرف دو مہینے ہیں ابھی تو بہت سی فارمیلٹیز بھی پوری کرنی تھیں۔

"شکر ہے ہم نے پاسپورٹ اور ڈاکومنٹس سب تیار کروا کے رکھے ہوئے تھے۔ اب صرف ہمارا ایڈمٹ کارڈ اور ویزا آنا ہے۔" ضوفی کی خوشی قابلِ دید تھی۔

"لگتا ہے تمہاری تیاری اتنی مکمل ہے کہ تمہارا بس چلے تو آج ہی اُڑ جاؤ۔ یہاں تو دل کی حالت دگرگوں ہے۔" میں نے پریشانی سے ضوفی سے کہا۔

"شافع، تم اپنے دل کو سنبھالو۔ کسی کو اس کی بڑی ضرورت ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے بال پوائنٹ سے اپنی جھولتی لٹوں کو برابر کرتے ہوئے شوخی سے مجھے چھیڑا تو میں جھینپ سا گیا۔ یہ لڑکی ہو کر کتنی بولڈ و دلیر ہے ایک ہم بیچارے...... مگر چلیں طوفان کی اس ادا میں بھی کتنا خلوص تھا۔ یہ سوچ کر اطمینان سا ہوا۔

☆☆☆

جاتی گرمیوں کی شامیں اکثر خوشگوار ہوتی ہیں۔ ہمارا گروپ اپنی اسٹڈیز میں اتنا گم تھا کہ اردگرد کا ہوش نہیں ہوتا، وہ تو کوثر نے باہر کھڑکی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یار باہر دیکھو کتنا پیارا موسم ہے اور ایک ہم ہیں کھانے کا ہوش نہ سونے کا۔ بس "لگے رہو منا بھائی" والی کیفیت ہے اور کیوں نہ ہو ایک ہفتے کے بعد روانگی ہے۔" ابھی لندن کے موسم کے مطابق لباس کا بھی انتظام کرنا تھا...... دوستوں کے بقول "خوش لباسی تم پر ختم ہے۔"

جس دن ہماری روانگی تھی ضوفی خلافِ توقع بڑی اپ سیٹ لگ رہی تھی۔ پھول سا چہرہ کملایا ہوا تھا، وہ تو مجھے اظہر نے بتایا کہ ضوفی کی والدہ ماجدہ صاحبہ نے اعلان کر دیا ہے۔ "یہ آخری موقع ہے اگر شافع ایگزام کلیئر نہ کر سکا تو ہم تمہاری پسند نا پسند کچھ خیال نہ کریں گے اور اپنی مرضی سے تمہاری

شادی کر دیں گے" کیونکہ ان کے خیال میں صرف ایم بی بی ایس کرنے والے لڑکوں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا اور انہونی یہ ہے کہ اس کے والد اور بھائی صاحب، والدہ کے ہمنوا تھے۔ اس انکشاف پر میرے تو پاؤں تلے سے زمین ہی کھسک گئی ہم نے تو کتنے ڈاکٹر دیکھے ہیں جو ہر 2-3 سال کے بعد کسی کو بتائے بغیر امتحان دینے جاتے ہیں جب کہیں جا کر کلیئر کر پاتے ہیں اور کسی کو علم تک نہیں ہوتا کہ انہوں نے کتنی بار آگ کا دریا پار کیا کیونکہ یہ بہت سخت اور آزمائش سے بھرپور امتحان ہوتا ہے بقول اظہر اس پریشانی میں بھی تمہاری نانی بڑے لشکارے مار رہی ہے۔

پاکستان واپسی کے بعد ہم سب خوشی، خوشی چھٹیاں انجوائے کر رہے تھے۔ سب خوش تھے کہ پیپرز اچھے ہوئے۔ ہر ایک کو یہ خوش گمانی مستقبل کے سہانے خوابوں کی طرف دھکیل رہی تھی۔

آج ایک مہینے کے بعد ہم سب آن ڈیوٹی تھے یعنی پرندے آشیانے کو لوٹ آئے تھے کیونکہ صیاد سے مانوس جو ہو چکے۔ مجھے تو انجانے اندیشوں نے لا گھیرا۔ ان گنت سوالات ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ پہلا سوالیہ نشان تو یہ ہی تھا کہ کیا پاس ہو جاؤں گا پھر ایسا نہ ہو سکا تو کیا ضوفی کے بغیر رہ سکوں گا؟ آگے مجھ میں سوچنے کی ہمت نہ تھی۔ گو کہ وہ مجھے فون پر بھی اور اسپتال میں بھی جب ملتی تسلی دیتی، آنے والے وقت کو بہت سہانا اور خوشگوار بتاتی مگر ہائے میرا دیوانہ دل...... جو صرف اس کے لیے دھڑکتا تھا۔ جلوہ گاہ ناز میں اسی پری وش کا قبضہ ہے۔ یوں بھی دو دن سے ضوفی ڈیوٹی پہ نہیں آ رہی تھی۔ موبائل پر فون کیا تو کافی اپ سیٹ تھی۔

"کوئی کرنل انکل اپنی فیملی کے ساتھ ایبٹ آباد سے چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے ہیں۔"

"تو اس سے تمہاری ڈیوٹی پر کیا فرق پڑتا ہے تم کیوں چھٹی کر رہی ہو؟" میں الجھ پڑا۔

"یار سمجھا کرو ناں، میں کیسے الگ تھلگ رہوں چھوٹی بہن صاحبہ بھی ساتھ ہیں، وہ ہر وقت گھسیٹے پھرتی ہے پھر امی کہتی ہیں کہ کمپنی دے دیا کرو۔ ایک عدد فرمانبردار قسم کے صاحبزادے بھی ہمراہ ہیں بس مت پوچھو...... کتنا چھچھورا انسان ہے...... مگر تم فکر مت کرو پرسوں تک سب رخصت ہو جائیں گے پھر وہی فرصت کے رات دن اور رزلٹ کی کیا خبر ہے...؟ Faculty سے خبر لیتے رہو۔ بے خبری میں کہیں مارے نہ جاؤ۔ اچھا چلو پھر ملتے ہیں بریک کے بعد شاید افزا ادھر ہی آ رہی ہے۔" اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔

اچانک بہتے جھرنوں کی پھوار برسنا جیسے بند ہو گئی اور میں دل برداشتہ سا بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ عمر ہی گزرے گی امتحان میں کیا......؟ وہ ہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا جب وہ اسپتال آئی اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

"وہ کرنل چھوڑ لے بنے البیلے، بانکے، سجیلے نوجوان کا پروپوزل دے گیا ہے اور پوری فیملی کو دل سے قبول ہے۔" میرے لیے یہ خبر برق بن کر گری اور خاکستر کر گئی۔ وہ بولے

"لگتا ہے گردشِ دوراں ہم سے کوئی بڑی چال چلنے والی ہے مما کی وہی جذباتی تقریر ساری زندگی ...... mediocre بن کر لائف گزارنا آسمان چھو لینے کی تمہاری خواہش دم توڑ دے گی اور تم گھر بیٹھ کر بچے پالو گی۔ ساس، سسر اور نندوں کے جنجال میں پھنس کر کھو جاؤ گی اور پھر میڈیکل کی سیٹ بھی ضائع کر دو گی۔" وہ جذباتی ہو چلی تھی اور اپنی مما کی تقریر کی بڑی زبردست نقل کر رہی تھی اور میرے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن پھر بھی میں نے اپنی تمام ہمتوں کو جمع کر کے کہا۔

"تم میرا کیس ذرا اسٹرونگ طریقے سے لڑتیں۔ تمہیں کہنا چاہیے تھا کہ وہ مڈل کلاس ایریا میں رہتا ضرور ہے مگر کیچڑ میں بھی تو کنول کھلتے ہیں، ان کا

حسب نسب بہت اعلیٰ اور سارا خاندان تعلیم یافتہ ہے ابھی حال میں ہی چھوٹی بہن کا بھی میڈیکل میں داخلہ ہوگیا ہے مگر مجھے لگتا ہے تم والدین کو کنونس نہیں کرسکیں۔'' میں نے نہایت مایوس ہوکراس کی جھلملاتی آنکھوں کی طرف دیکھا اور واپس راہداری میں مڑ گیا۔

☆☆☆

ضوفی کا تعلق ایک ماڈرن اور ویل آف فیملی سے تھا۔ والدین اور دو بھائی بہن پر مشتمل یہ خاندان شہر کے ایک پوش علاقے میں رہائش پزیر تھا۔ ڈی ایم سی میں چونکہ میرا ایڈمیشن ہوا تو وہاں ہر طبقے سے اسٹوڈنٹ پہنچتے ہیں۔ میں اپنے میڈیکل کالج کا پہلا دن کیسے بھول سکتا ہوں جب ہم والدین کے ارمانوں کا بوجھ سر پر لیے یہاں تک پہنچے۔ ذہانت کسی کی میراث نہیں ہوتی ہم دو بہن بھائیوں میں ایک بات مشترک تھی۔ ذہانت اور محنت...... اسی اعلیٰ کارکردگی کی بدولت ہم اپنے، اپنے شعبوں میں نمایاں رہے۔ میڈیکل کالج میں پہلے دن کچھ لوگوں نے فرسٹ ایئر فول کا کہہ کر بہت ڈرا دیا تھا۔ نئے لوگ، اجنبی ماحول میں نوٹس بورڈ پر اپنا نام رول نمبر اور کلاس نمبر تلاش کررہا تھا جہاں ایک جم غفیر لگا ہوا تھا اچانک ایک وحشی ہرنی جیسی شوخ حسینہ ہاتھ میں اپنی چپل اٹھائے مجمع کو چیرتی ہوئی اندر گھستی چلی گئی اور جتنی تیزی سے آئی اس سے کہیں برق رفتاری سے واپس پلٹی۔

''ہُرے...... افزا، روحانہ روم نمبر 14...... اوہ مائی کی نمبر چلو چلو موو۔'' میں اس جاتی حسینہ کو دیکھتا ہی رہ گیا اور مبہوت سا دیوار سے جا لگا۔ اتنے میں اظہر، وجاہت وغیرہ بھیڑ کو چیرتے ہوئے باہر نکلے۔

''یار شافع، آجاؤ روم نمبر 14 ہے ہم سب ساتھ ہی ہیں۔'' میں جیسے واپس ہوش میں آگیا اور جب کھچا کھچ بھری کلاس میں داخل ہوا تو غیر ارادی طور پر میں اسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ رش کی وجہ سے آخر میں جگہ ملی پھر پروفیسر کلاس میں داخل ہوئے تعارف شروع ہوا۔

''ڈاکٹر ارسلان آپ کے اناٹومی کے پروفیسر۔'' پھر سارے اسٹوڈنٹ آہستہ آہستہ اپنا نام بتاتے گئے۔ پھر جانے کیسے کانوں میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔

''ضوافشاں۔'' اور جب میری باری آئی تو میں طلسم کدہ میں گم تھا۔ اظہر نے ٹہوکا دیا۔

''اوہ لیس سر شافع محمد۔'' میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔

''او مائی ینگ مین کیا آپ اندھیرے سے اچانک اجالے میں آگئے ہیں جو آپ کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ ینگ مین اجالوں کے عادی بنیں۔'' ان کے طنز نے مجھے گھائل کردیا اور پوری کلاس ایک دم ہنسنے لگی۔

''لو میاں شافع محمد پہلے ہی دن رُسوا ہوگئے۔ بڑے چلے تھے میڈیکل کی دنیا میں تیر مارنے۔ ایک لڑکی کے ہاتھوں عزت بھی گئی۔'' تو یوں ہم سب لڑکے لڑکیوں کا ایک گروپ خود آپ ہی آپ تشکیل پا گیا اور ہم نے عہد کیا دوستی بعد میں پڑھائی پہلے اور یوں والدین سے کیا عہد کہ ہمیں آسمان کا سب سے روشن ستارہ بن کر رہنا ہے سو ہر سال اچھے نمبر آتے رہے۔ پیتھالوجی میں تو مجھے گولڈ میڈل ملا۔ اب تو ضوفی بھی میری زندگی میں شامل ہوگئی تھی۔ ہم نے ہاؤس جاب بھی ایک ساتھ ہی کیا۔ جب ضوفی نے انکشاف کیا کہ اس کے رشتے آرہے ہیں مما کہتی ہیں۔

''منگنی کرلو ہاؤس جاب کے بعد شادی کردیں گے۔'' ضوفی کا کہنا تھا کزن سے وہ ایک پرانی منگنی توڑ چکی ہے کیونکہ وہ شادی کی جلدی کررہے تھے جبکہ ضوفی نے اپنی مما سے ایف آر سی ایس کرنے پر اصرار کیا اور اصرار ضد میں بدلتا گیا۔ یوں ہم دونوں کو کافی مہلت مل گئی۔ اب اسے کیا کہیے کہ بیچ میں کرنل انکل کے اڑیل بیٹے کو وہ پڑے اور جلد شادی پر اصرار کرنے

لگ گئے۔ دوسرے سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ ہمارے گروپ میں صرف اظہر ہی امتحان کلیئر کرسکا اور سارے بے نیل و مرام رہ گئے۔ اب تو ضوفی کو بھی اپنی مما سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی ایک کمزور سا بہانہ تراشا کہ شافع اگلے سال پھر attempt کرے گا پھر آہستہ آہستہ اس کے اعصاب گھر میں جنگ لڑتے، لڑتے شل ہوگئے پھر وہ میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس کے فون آنا بند ہوگئے۔ موبائل بھی کوئی رسپانس نہیں دے رہا تھا۔ اظہر سے رابطے پر معلوم ہوا کہ کرنل کے بیٹے سے شادی طے ہے، لندن بیاہ کر جائے گی۔ میری تو جیسے دنیا ہی تاریک ہوگئی۔ اظہر کے دلاسے، کوثر کی ہمدردی اور امیدیں کچھ میرے کام نہیں آرہی تھیں۔ اظہر کا کہنا تھا۔

''کسی کے چلے جانے سے زندگی ختم نہیں ہوجاتی۔ تمہارے سارے آپشنز اب کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ اب تم ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہو۔ صرف مسیحائی ہی نہیں ریسرچ پر دھیان دو۔ اسپیشلائزیشن اپنا مقصد بنالو۔ دنیا تمہارے آگے سرنگوں ہوگی۔ میرے دوست مایوسی گناہ ہے۔''

میں نے ستائش بھرے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ان دردمند دوستوں کا دم غنیمت تھا کہ پھر سے جی اٹھا مگر گزرے لمحے یاد آتے تو لگتا آتی جاتی سانس کی دوڑ کہیں اٹک رہی ہے۔ بہرحال وقت ایک مرہم ہے۔ میں برابر جدوجہد میں مصروف تھا۔ پاکستان میں ہونے والے سارے امتحان کلیئر کرلیے۔ اماں شادی کے لیے اصرار کرتی رہیں لیکن میرا ٹارگٹ ایف آر سی ایس تھا اور ہے آج کل میں ایک پرائیویٹ اسپتال میں کام کررہا ہوں جو جدید اور ماڈرن آلات سے مزین ہے۔ دنیا میں اس کا ایک نام ہے۔ وہ اکثر اپنے لائق اور ہونہار ڈاکٹر کو ریسرچ کے لیے باہر بھیجتے رہتے ہیں۔ اب کی قرعۂ فال میرے نام نکل آیا ہے اماں کا اصرار پھر سے سر اٹھانے لگا۔

''اتنے عرصے باہر رہو گے دلہن کو ساتھ لے جاتے۔'' ہائے ساری دنیا کی اماؤں کی ایک مشترک ادا۔ ''اکیلے کیسے رہو گے وغیرہ وغیرہ۔'' اب بھلا بتائیں پڑھنے جانے والا شخص کتابوں کے ساتھ ہوگا کہ بیوی کے ساتھ۔ میں نے بڑی دلسوزی سے سوچا اور رختِ سفر اختیار کرنے پر ترجیح دی۔ تمام پرانے ساتھی ساتھ چھوٹ گئے تھے۔ اظہر سے دو سال سے رابطہ نہیں وہ ہی ایک اختر شیرانی کا ننھا قاصد تھا۔ سنا ہے آئر لینڈ چلا گیا، کوثر گھر بسا کر امریکا چلی گئی اب جاکر میری بھی قسمت نے یاوری کی --- چھوٹی بہن بھی آج کل پریکٹس کررہی تھی میں نے اماں سے البتہ اس کی شادی کی بات کی۔

''مجھے دو سال لگیں گے شادی تو میری پیاری

سی بہن کی ہونی چاہیے۔'' مگر اس کی وہی ناوانی بھری باتیں۔

''بھائی تمہارا بھی زندگی کی خوشیوں پر حق ہے۔ تم ملک کے ایک معتبر اور سینئر ڈاکٹر ہو، اپنی لائف کو یوں رائگاں نہ کرو۔ صرف دوسروں کے اوپر ہی تمہارا حق نہیں ہے۔ کچھ اپنے حصے کی بھی شمع جلاتے جاؤ۔'' وہ بڑی دردمندی سے میرے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی۔

''ارے تم بھی عام سی لڑکی بن گئیں۔ یہ آنسو بہت قیمتی ہیں اور یوں بھی ہم ایسے ہی تھوڑی جا رہے ہیں، تمہیں اسفند کی ڈور سے باندھ کر جائیں گے پھر تم دونوں اپنا ہنی مون پیریڈ لندن میں گزارنا، وہاں ہم سے بھی بھولے سے ملاقات ہو جائے گی۔ ہے ناں پاکستانی افسانوی سین۔'' اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔

''ہاں یہ تو ہے، افسانے بھی حقیقت سے مستعار لیے جاتے ہیں جس طرح آپ وہاں مل سکتے ہیں اور کچھ دشمنِ جاں بھی مل سکتے ہیں پھر دو ستاروں کا ملن...... کیا خوب صورت کلائمکس ہوگا۔'' وہ خود ہی اپنے خیالی احمقانہ پن پر ہنس پڑی۔

☆☆☆

صبح میری روانگی تھی۔ رات آسمان پر ایک تارہ ٹوٹا اور دور تلک روشنی کی ایک لکیر کھینچتا ہوا وسعتوں میں گم ہو گیا۔ شاید میری طرح مگر نہیں میں تو لمحۂ موجود میں ہوں اور جلد دنیا کو امیر کرنے چلا ہوں۔ گلاب لمحوں میں دل کو ملال ہی نہ رہا...... کہ میں نے آگے کچھ نہ سوچا اور آنکھیں موند لیں۔

سات سمندر پار آ کر اندازہ ہوا کہ میڈیکل کی اسٹڈیز کے لیے کتنی جان مارنا پڑتی ہے اور دن رات ایک کرنا پڑتا ہے جب کہیں جا کر شب کے بطن سے ہوتی ہے سحر پیدا۔ دن مہینوں اور مہینے سال میں تبدیل ہونے لگے۔ ایک دن لائبریری میں بیٹھے بیٹھے ذہن اسی ظالم کی طرف چلا گیا۔ اس کا دیس بھی تو یہی ہے جہاں ایک پری وش کو ایک کوہ قاف کا جن اٹھا کر لے گیا مجھے ایک پرانا فلمی گیت یاد آ گیا۔

''پرانے زخم لو دینے لگے تھے۔ قید میں ہے بلبل صیاد مسکرائے۔ کاش اس وقت میں اتنا طاقت ور ہوتا کہ کوئی میری ضوفی کو مجھ سے چھین نہیں سکتا۔ ہوتا تو وہی ہے جو مقدر میں لکھا ہے لیکن وہ میرے خواب، میرے خواب......!''

☆☆☆

لندن کے بھیگے بھیگے سے نم آلود موسم نے میرے اندر شاید کچھ سستی سی پیدا کر دی تھی۔ میں اٹھ کر کیفے ٹیریا چلا گیا اور گرما گرم کافی کا مگ اٹھا کر راہداری میں آ گیا۔ پروفیسر جارج سے میری اچھی کیمسٹری بن گئی تھی اس نے ریسرچ میں میری بہت مدد کی۔ اس کا کہنا تھا ''تم پی ایچ ڈی کرو میری نگرانی میں ایسے ہی اسٹوڈنٹ مجھے چاہئیں۔'' مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہاں پاکستانی ڈاکٹرز کی بڑی عزت ہے۔ وہ بڑی محنت اور لگن سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن نے مجھے انوائٹ کیا تھا کیونکہ میری ریسرچ مکمل ہو چکی تھی۔ وہاں بڑے بڑے ممتاز سرجن اور بڑے جوہر قابل مدعو تھے۔ مقالے پڑھے جا رہے تھے۔ اسٹیج پر ایک پُروقار سی خاتون آئی اور اپنا مقالہ پیش کیا۔ بڑا پُرمغز مقالہ تھا ایشیائی ممالک کی زبوں حالی اور میڈیکل فیلڈ میں نئی راہوں پر تقابلی موازنہ پیش کیا بڑی صاف اور شستہ آکسفورڈ لہجے میں انگریزی بولتی کوئی اور نہیں ایک ہونہار لائق پاکستانی خاتون تھی۔ میں تو حیرت کے دریا میں غوطہ زن تھا مقالے کے خاتمے پر لوگ سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور زبردست تالیوں کی گونج میں وہ پُروقار طریقے سے اسٹیج سے نیچے اتر گئی۔ اسٹیج سیکریٹری نے اعلان کیا۔

''یہ ہیں ہمارے ملک کی مایہ ناز سرجن مسز مزمل زندی جنہوں نے ہمارے وطن کا نام روشن کیا اور دشوار اور نامساعد حالات کے باوجود سرجری میں کئی معرکے سر کیے۔'' آپ یقین کریں گے یہ خاتون کوئی اور نہیں میری...... او وہ سوری ضوافشاں تھی۔ میں تو اس کی چال سے ہی پہچان گیا تھا کہ ضوفی ہے تو ہو گیا تھا ''افسانہ ایک حقیقت......'' ڈنر پر پروفیسر حضرات نے میرا دوسرے معروف سرجن اور ڈاکٹرز سے تعارف کروایا جب ضوفی کے پاس پہنچے۔

''یہ مسز پروفیسر مزمل ہیں۔'' میرا حیرت سے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا جب اس نے مجھے نظر انداز کیا۔

''اوہ اچھا پاکستانی' آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' بڑے اوپری دل سے کہا گیا۔ لوگ سب خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے اس کے بعد میوزیکل نائٹ کا پروگرام تھا جس میں شریک ہوئے بغیر میں طلسم ہوشربا سے نکل آیا۔ میرا ایک پل بھی وہاں دل نہیں لگ رہا تھا۔ سر جارج کے ساتھ پروفیسر مزمل بھی میرے مددگار تھے اور میں بے خبر کہ یہ میرے مونس، میرے غم خوار میرا ہر دم خیال رکھنے والے بہت سینئر اور عمر رسیدہ اور کوئی نہیں ضوفی کے شوہر ہیں مگر وہ کرنل کا بیٹا...... میرے دماغ میں آندھیاں سی چل پڑیں۔

آج کل میری الوداعی پارٹیاں چل رہی تھیں۔ فیکلٹی میں چند دن کا مہمان تھا۔ ایسے ہی ایک جل تھل موسم میں جب میرے اندر بھی بڑی برسات تھی پروفیسر مزمل نے مجھے اپنے گھر ڈنر پر انوائٹ کر دیا اور میں چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر سکا۔ جانے کیوں؟

کیمپس کے ساتھ ہی سرخ بوگن ویلیا سے ڈھکا چھوٹا سا کاٹیج اُن کا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار نے ٹھنڈ میں اضافہ کر دیا تھا۔ میں اپنے اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے جب کاٹیج کے قریب پہنچا تو اس وقت میرے دل کی ایک عجیب سی کیفیت تھی مگر ایسی ملگجی سی شامِ ویراں میں اس دشمنِ جاں کی دہلیز پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب بھی وقت ہے پلٹ جاؤ، واپس لوٹ جاؤ۔ وہ ایک معتبر شخص کی بیوی ہے مجھے بہت سلیقے اور احتیاط سے بات کرنا ہوگی۔ جانے یہ مجھ سے کیا بے وقوفی ہو گئی میں کچھ بہانہ بھی تو کر سکتا تھا۔ میں تو پلٹنے کو ہی تھا کہ پسِ دروازہ کسی کی آہٹ ہوئی مجھے اپنا آپ ڈولتا محسوس ہوا اور پھر دروازے کے پٹ وا کیے وہ کھڑی تھی۔ خوب صورت آنچل کاندھے پر ڈالے وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملی۔

''آیئے، آیئے مسٹر شافع۔'' میں نے نگاہیں نہ ملائیں۔ بس اسی قدر کہہ سکا۔

''بچھڑ گیا ہے تو ایک، ایک سے پوچھتا ہے مجھے۔''

''اوہ آپ کی شاعری ابھی تک چل رہی ہے۔'' میں اس کی سنگت میں نفاست سے سجے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

''آپ بیٹھیں، پروفیسر ابھی آتے ہیں۔ باہر سے کوئی کال آئی ہوئی ہے۔'' اس نے رسمی سی گفتگو کی اور ریشمی پردوں کے پیچھے سے کسی کو آواز دی۔

''زلفی، جینی، چیکو۔'' میں نے سوچا اسے کیا ہوا اس کا ذوق ہی بدل گیا۔ غیر رومانی سے نام ہیں۔ جب وہ تین پھول سے بچوں کو لیے آ موجود ہوئے۔

''یہ ہمارے آنگن کے تارے...... بچوں انکل کو سلام کرو۔'' تینوں نے گویا حکم بجا لایا اور کورس میں سلام ہوا۔ میں نے پیار سے بچوں کو چمکارتے ہوئے قریب بلایا۔

''بہت پیارے ہیں آپ کے بچے...... کس پر گئے ہیں، آپ پر تو نہیں......'' میں نے بات کا آغاز کرنا چاہا۔

''ہاں سب یہی کہتے ہیں۔'' اس نے مختصر سی گفتگو کی اور ساتھ ہی بچے بھی روبوٹ کی طرح ماں کے ساتھ اندر گم ہو گئے۔ میری یہ حالت کہ مسکرائے نہ بنے' اشک بہائے نہ بنے۔ خیر اتنی دیر میں پروفیسر سادہ

سے لباس میں ملبوس سلیپر پہنے نمودار ہوئے۔

''سوری ینگ مین، ایک ضروری کال آئی ہوئی تھی۔ ضوافشاں کو ڈاکٹر ایسوسی ایشن مدعو کر رہے ہیں اور ساتھ ہی میرا لیکچر بھی رکھ دیا اسی کو فائنل کر رہا تھا۔ خیر تم سناؤ، اب تمہارا کیا لائحہ عمل ہے۔ وطن جا کر ٹیچنگ میں آنا چاہتے ہو یا پریکٹس...... اگر یہاں ہی ٹیچنگ کرنا چاہو تو میں تمہاری ہیلپ کر سکتا ہوں۔'' انہوں نے محبت سے کندھا تھپتھپایا۔

''فی الحال تو ابھی تو ملک ہی جانا چاہوں گا وطن کے ایک بڑے اسپتال میں کام کر رہا تھا۔ وہاں میری قوم کو میری زیادہ ضرورت ہے۔ ویسے آفر پر تھینکس۔'' اب وہ بھی آ کر ہمارے مقابل آ بیٹھی اپنے آنچل سے کھیلتی اس وقت بھی وہ کتنی معصوم لگ رہی تھی۔

''وہاں تو آپ کی لائف بہت بزی ہوگی؟'' پروفیسر کی طرف سے سوال آیا۔

''جی بہت مصروف۔'' میں نے اذیتوں کے رت جگے نظر انداز کرتے ہوئے خوش دلی سے جواب دیا۔

''پھر اپنی فیملی کے لیے تو ٹائم نکالنا مشکل ہو جاتا ہوگا؟'' پروفیسر کی اس بات پر اس نے..... بے چین ہو کر بے اختیار میری جانب نگاہ اٹھائی۔ میں نے یادوں کے جھلملاتے جگنوؤں کو بند مٹھی سے نکل جانے دیا۔

''جی..... بالکل سر وہ لوگ بہت شاکی رہتے ہیں۔'' اس وقت اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر چلے گئے۔ اس کا چہرہ ستا سا گیا اور وہ خفت زدہ سی ہوگئی جب ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کھانے کے لیے ٹیبل پر آنے کا اشارہ کیا۔ آتی جاتی سانسوں، چمچوں کی دھمک اور کھانوں کی مہک میں آہستہ، آہستہ کھانا کھایا گیا۔ میری کیفیت عجیب تھی نہ تو مجھ سے ٹھیک سے کھانا کھایا جا رہا تھا اور نہ ہی یہاں بیٹھا جا رہا تھا اور اس کے نامساعد حالات کے متعلق جاننے کا بھی ایک عزم سا دل میں لیے میں نے جانے کی اجازت چاہی۔ یہ ڈر الگ کہیں ایسا نہ ہو وہ کم سخن بدنام ہو جائے۔ جب ہی پروفیسر اپنی مسز کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

''یہ دیکھیں ذہین اور بلند ہمت نوجوان کو وطن کی مٹی واپس لوٹنے پر مجبور کر رہی ہے۔ آپ تصور کر سکتی ہیں حالانکہ اس کے لیے یہاں بہت اسکوپ ہے۔'' ان کے دردمندانہ جملے پر اچانک اس کی دیدہ نم اور لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

''ہاں ہم لوگ اپنی Roots سے جدا نہیں رہ سکتے۔ ہمیں ایک نہ ایک دن لوٹنا ہی ہوتا ہے۔'' پروفیسر نے اپنی بیوی کو حیرت سے دیکھا اور میں جلد اس ماحول سے نکل آیا۔

☆☆☆

لندن کے ایک خاموش کاٹیج کی ایک اداس رات تھی۔ پروفیسر نے ایک پارکر پین مجھے تحفے میں دیا تھا جو میری مٹھی میں دبا ہوا تھا بعد میں میرے دوسرے کولیگ نے بتایا۔ ''سر واپس جانے والے پنچھی کی ایک الوداعی دعوت ضرور کرتے ہیں۔ یار ان کی مسز بڑی کمال چیز ہیں۔ ان کا پہلا شوہر ایک بچے کا تحفہ دے کر لندن کی دھند میں غائب ہو گیا۔ پروفیسر نے ان کی بڑی دلجوئی کی، آگے منقطع تعلیم کا سلسلہ دوبارہ جوڑا۔ وہ خود بھی تنہا تھے دو بچوں کی ماں دنیا میں موجود نہیں تھی ابھی پچھلے سال پروفیسر..... ضوافشاں نے دو بچوں کے باپ سے شادی کر لی۔ بیچاری نے دو سال بڑے تکلیف سے بسر کیے۔ شکر ہے ایک پُرخلوص اور ہمدرد شخص جو انتہائی قابل بھی ہے اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔'' وہ جانے کیا کچھ کہتا رہا... میرے تو کان جیسے سنسنا رہے تھے بہرحال میں اپنے جلتے بجھتے دل کے ساتھ وطن لوٹ آیا جہاں میرے اپنے اور میرے مریض میرے منتظر تھے۔

بے بسی

غزالہ جلیل راؤ



اس کی نظریں بار بار حسنہ آپا کے پژمردہ چہرے پر جا کر ٹھہر جاتی تھیں۔ عجیب سا دکھ ان کے اندر سرایت کرتا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ ان کا دل کسی اتھاہ گہرائی میں جیسے اتر رہا تھا۔

''میں کیا بتاؤں بہن! کتنے ہی دنوں سے آنے کا سوچ رہی تھی مگر جو ذرا سانس لینے کی بھی مہلت ملی ہو...... ایک تو موا یہ گھٹنوں کے درد نے... چارپائی سے باندھ دیا ہے۔ اب تو جانو میری ہڈیاں

بوڑھی ہوگئی ہیں۔ اب وہ دم خم کہاں......؟" وہ ہانپ رہی تھیں۔

"نہیں آپا ابھی آپ بوڑھی کہاں......؟" عائشہ نے یونہی ہنس کر کہا۔

"ارے تو پھر کیا میں جوان ہوں؟" وہ عجیب ہی طرح ہنسیں جیسے خود اپنا مذاق اڑا رہی ہوں۔ "ارے مشین بھی چلتے، چلتے تھک جاتی ہے تو کیا اب یہ مشین سدا ویسے ہی چلتی رہے گی۔" آپا وہ یک دم افسردہ ہوگئیں۔

"چھوڑیں آپا...... آپ سنائیں، وہاں محلے میں تو سب لوگ ٹھیک ہیں ناں......اب آپ ہی سے خیریت ملتی ہے ورنہ اور تو کسی کو کسی سے اب واسطہ ہی نہیں۔ خو د میں بھی کہاں نکل پاتی ہوں اُدھر۔" عائشہ باتوں کے ساتھ ساتھ اپنے کام بھی نمٹاتی ... جارہی تھی۔

"ہاں بہن اب وہ پہلے والی محبتیں کہاں...... اچھا وقت گزر گیا، وہ سچی محبتیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ اب تو نفسا نفسی پھیلی ہے ہر طرف...... چھوٹے بڑے کا وہ ادب احترام...... وہ لحاظ مروت کچھ بھی تو نہیں رہا۔" آپا دُکھے دل سے کہہ رہی تھیں۔

"ہاں آپا ایک ہمارا زمانہ تھا...... اور اب یہ دور کہ سچی محبتیں عنقا ہوگئی ہیں۔" عائشہ بھی ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔

"آپا کچھ کمزور ہورہی ہو؟"

"ہاں، شوگر کی بیماری کے بعد تو نظر بھی کمزور ہوگئی ہے، بس اللہ نے اتنی ہمت دی ہے کہ چل پھر لیتی ہوں...... کسی کی محتاج نہیں......بس یہی کافی ہے، احسان ہے اس کا مالک کا، جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔" انہوں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اللہ سب کو خوش رکھے...... ایک بھائی تھے، بہت خیال رکھا۔ بھائی تو ایسے گئے کہ میں ان کی صورت کو بھی ترس گئی۔ ارے کہنے کو تو بہن، ہمارا منہ بولا ہی رشتہ تھا مگر انہوں نے ہمیشہ مجھے پورا پورا مان دیا۔ میں تو اپنے سگے بھائیوں پر تم لوگوں کو ترجیح دیتی تھی۔ اللہ تم لوگوں کو خوش رکھے۔ سب کچھ بھائی کے دم قدم سے تھا۔" وہ عائشہ کے بھائی کا ذکر کرتے، کرتے آبدیدہ سی ہوگئیں۔

"ہاں میں جانتی ہوں آپا...... بہت محبت کرتے تھے وہ آپ سے......بس انہیں باہر جانے کا شوق چرایا اور پھر باہر کے ہی ہو کر رہ گئے۔ کسی کی بھی یاد انہیں وطن کھینچ کر نہ لا سکی...چلیں جہاں بھی رہیں ہمیشہ خوش و خرم رہیں......" بھائی کے ذکر پر عائشہ کی بھی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"ارے آپا...... آپ ہماری بھی تو آپا ہیں۔" عائشہ نے بھی انہیں خوش کرنا چاہا۔

"ہاں، بہن میں جگت آپا ہوں، تم تو جانتی ہی ہو کیا بچے، کیا بوڑھے سب ہی مجھے جگت آپا کہتے ہیں۔" وہ زور سے ہنس پڑیں مگر حیرت کی بات یہ تھی آنکھیں ان کی ہنسی کا ساتھ بالکل نہیں دے رہی تھیں۔

عائشہ کو یاد آیا۔ آپا تو ہمیشہ سے ہی ہنس مکھ ہوا کرتی تھیں۔ محلے کی لڑکیوں، بالیوں کو ان کی محبت بہت اچھی لگتی تھی۔ جانے کہاں کہاں کے قصے انہیں یاد تھے۔ خوب مزے لے، لے کر سناتی تھیں۔ بعض دفعہ تو قصے کو چٹ پٹا بنانے کے لیے وہ ایسے ایسے موضوعات بھی چھیڑ دیتیں کہ امی کو ٹوکنا پڑتا۔

"ہوش میں آؤ حسنہ، کہاں، کہاں کی سنا رہی ہو...... کچھ خیال کرو، لڑکیوں بالیوں کے سامنے......تم تو بالکل ہی بے وقوف ہو۔" مگر ایک بات تھی۔ وہ برا بالکل نہیں مانتی تھیں۔ بس ہنس کر چپ ہوجاتیں۔

"جاؤ بھئی خالہ منع کررہی ہیں، میں اب کچھ نہیں سنانے والی۔" پھر کچھ دیر بعد بھول

بھال کر وہ پھر شروع ہوجاتیں۔ کپڑے اتنے اچھے سیتیں کہ ہر کوئی ان سے سلوانا پسند کرتا۔ یہی ان کی آمدنی کا ذریعہ بھی تھا۔ میاں زندگی بھر نکھٹو رہے مگر زبان کے حد درجہ چٹورے...... حسنہ آپا بے چاری مشین کے ساتھ، ساتھ ہانڈی چولہا بھی کرتے کھپتی رہتیں مگر مجال تھی جو ایک شکن بھی پیشانی پر پڑتی، یہی تو کمال تھا ان کا...... عائشہ چائے بناتے، بناتے مسلسل سوچے جارہی تھی کہ آپا کی آواز پر چونک گئی۔

"عائشہ...... میں بس اب چلوں گی۔"

"کہاں آپا...... ارے بیٹھیں ناں، میں آپ کے لیے چائے بنارہی ہوں۔ ہاں تو آپ کیا بتارہی تھیں؟" عائشہ چائے کے ساتھ وائے بھی لے کر آگئی۔

"گھر پر اس وقت کوئی نہیں اس لیے مجھے چائے بنانا پڑی ورنہ یہ لوگ کوئی کام ہی نہیں کرنے دیتیں۔" وہ اپنی بہو اور بیٹی کے متعلق بتانے لگی جو بازار گئی ہوئی تھیں۔

"ہاں تو عائشہ میں بتارہی تھی کہ ایک تو گھٹنوں کے درد نے عاجز کر رکھا تھا۔ اس پر تمہارے بھائی اسپتال میں داخل ہوگئے۔ ارے نہ پوچھو، وہ افراتفری رہی کہ کیا بتاؤں......ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ آکسیجن تک لگ گئی تھی۔ پورے پندرہ دن اسی حالت میں گزرے۔ ذرا سوچو تو پورے پندرہ دن بالکل آنکھ بند کیے پڑے رہے......بس کیا بتاؤں کتنی پریشانی تھی؟" انہوں نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی وہ بسکٹ بھی کھارہی تھیں۔

"ہاں پریشانی کی تو بات ہے آپا...... اتنی بیماری میں پریشان ہونا فطری بات ہے۔"

"ارے بہن...... میری تو قسمت میں ہی شاید پریشانیاں ہیں۔ پوری زندگی کسی نہ کسی وجہ سے پریشان رہی۔ بس میرا ہی جگرا تھا جو ان تکلیفوں کے



باوجود خستی ہنساتی رہی۔"

"ہاں یہ تو ہے آپا...... آپ بہت بہادر ہیں۔" عائشہ نے دل سے اعتراف کیا۔

"مگر اب نہیں سہا جاتا۔ اب تو جیسے ہمت ہی ختم ہوگئی ہے۔" انہوں نے اپنی نم آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا۔

"اور آپا، فائزہ اور بینا کیسی ہیں؟" عائشہ نے موضوع بدلنے کی خاطر ان کی بچیوں کے بارے میں پوچھا۔

"ٹھیک ہیں، بس اپنی، اپنی زندگی میں مگن ہیں۔ آئی تھیں باپ کو دیکھنے، بس شام ہی شام کو آئیں اور فوراً ہی چلی گئیں۔ ارے کون روکتا اور رکتیں بھی کیسے؟"

"کیوں آپا، آپ کی بہویں اچھی نہیں ہیں کیا؟"

"اچھی تو ہیں مگر اب سب اپنی، اپنی زندگیوں میں مست ہیں، کس کے پاس اتنی فرصت ہے کہ دوسرے کے دکھ درد سنے، اب اتنا کسی میں یارا نہیں۔"

"ہاں، آپا یہ تو ہے مصروف تو سب ہی ہیں۔"

"اب دیکھو بہن مصروفیات تو اپنی جگہ پر، پیسے روپے کی تنگی سے دل اور تنگ ہو جاتے ہیں۔"

"ارے کیوں آپا، فہد کا تو اتنا اچھا بزنس چل رہا ہے اور ارشاد کی جاب بھی اچھی خاصی چل رہی ہے۔" عائشہ نے آپا کے لڑکوں کی بابت کہا۔

"مگر یہ باپ کی بیماری یہ تو بیٹھے بٹھائے اتنا لمبا خرچا پڑ گیا ناں وہ بھی اتنی گرانی میں۔"

"ہاں آپا مگر بیٹے اور کاہے کے لیے ہوتے ہیں! بھلا بوڑھے والدین کا ساتھ نہیں دیں گے کیا؟"

"مگر عائشہ میری قسمت تو بس ایسی ہی ہے، میں تو بار بار یہی سمجھتی رہی کہ بس اب وہ گئے۔ بچے الگ پریشان تھے، فہد تو مایوس ہو کر رونے ہی بیٹھ گیا تھا۔ میرے لعن طعن سے ارشاد بھی دو دفعہ باپ کو دیکھنے چلا گیا۔"

"چلیں آپا پریشانیاں تو آتی ہی رہتی ہیں، خیر سے اب بھائی کیسے ہیں؟"

"بس کیا بتاؤں......" آپا ہاتھ ملنے لگیں۔

"ہائیں......" عائشہ کو حیرت و پشیمانی نے گھیر لیا، یعنی اتنی دیر سے آپا اسے کیا بتا رہی ہیں اور وہ سمجھ ہی نہیں پا رہی۔

آپا نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں، بس گردن جھکائے ہاتھ ملتی رہیں۔

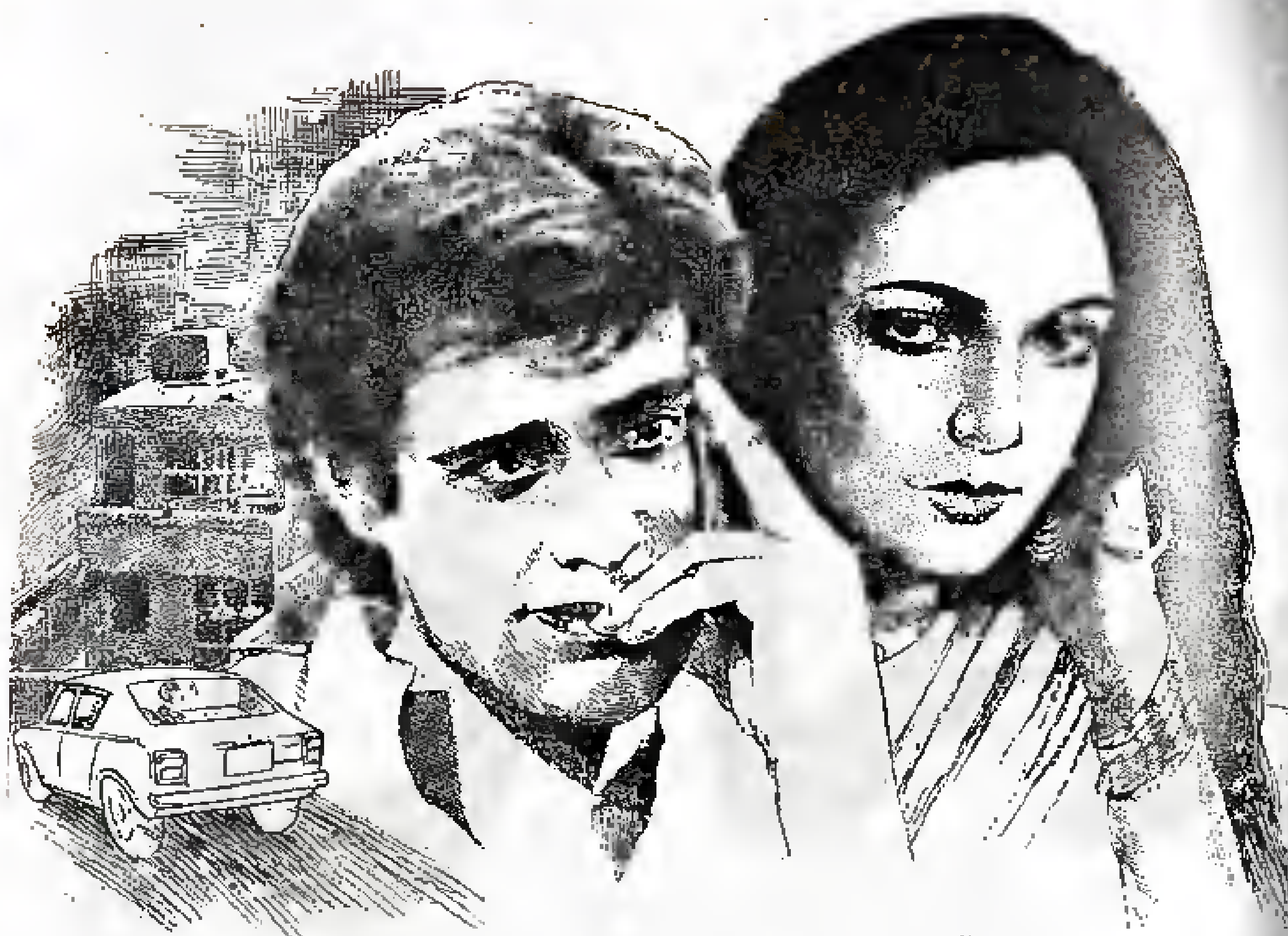
"بس کیا بتاؤں بہن، میری قسمت ہی خراب ہے، اتنے بیمار تھے، اتنی حالت خراب تھی، میں بھی بس اب نہیں بچیں گے مگر......"

"مگر کیا آپا......؟" عائشہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"اے بہن وہ تو بھلے چنگے ہو کر واپس آگئے ہیں، جیسے کبھی بیمار ہی نہیں تھے۔ اسے پہلے بستر پر ہی ہر وقت پڑے کھوں، کھوں کرتے رہتے تھے۔ اب تو بالکل ٹھیک ہو کر برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔"

"ارے آپا یہ تو اچھا ہوا ناں، ان سے آپ کو بڑا سہارا ہے، شوہر بستر پر بھی رہے تو وارث ہوتا ہے۔" عائشہ نے جیسے الجھ کر کہا۔

"پتا نہیں کیا ہوا یہ......" آپا زور، زور سے رونے لگیں۔ "میرا بھلا کون وارث ہے بہن......؟ میرا تو بس اللہ ہی وارث ہے، کوئی لاوارثی سی لاوارثی ہے، بے بسی سی بے بسی ہے...... اب اس قدر تنگ کرتے ہیں کہ اللہ کی پناہ...... زبان کھولوں تو بری کہلاؤں...... میں تو کچھ کہہ ہی نہیں سکتی بس......" ان کی آواز ہچکیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔



بی پازیٹو

صائمہ قیصر

آج بھی دونوں بچے منہ لٹکائے خالی ہاتھ جھلاتے، تھکاوٹ بھرے انداز میں واپس آ کر لاؤنج میں رکھے صوفوں پر گر سے گئے۔

"زین، کرن کہاں، کہاں گئے تھے؟ بڑی دیر لگا دی؟ لگتا ہے خوب سیر کی ہے آج؟" زویا کے پُرتجسس انداز پر قریب ہی اونگھتے ہوئے علی بھی ادھ کھلی آنکھوں سے بچوں کے تاثرات پر غور کرنے لگے۔

"آج چاچو ہمیں اسلام آباد کے سب سے بڑے شاپنگ مال سینٹورس لے کر گئے تھے۔" زین اپنی خوب صورت سی بڑی، بڑی آنکھیں گھما کر کہنے لگا۔

''ارے واہ، بڑی ہمت کرلی آج تو۔'' علی نے غنودگی بھری آواز میں خوشی اور حیرت کا اظہار کیا مگر کرن آخر کو ایک لڑکی تھی سو فوراً پھٹ پڑی۔

''پتا ہے وہ کیوں ہمیں بھی ساتھ لے گئے کیونکہ انہیں خود وہاں کسی سے ملنا تھا۔ اپنے دوست کا لایا ہوا امپورٹڈ وڈیو گیم ان کے کسی عزیز کو سینٹورس میں ڈلیور کرنا تھا سو وہ ہمیں بھی ساتھ لے گئے۔ جیسے عشا اور منال کو لے گئے تھے۔'' وہ زویا کے دیور حسن اور اس کی دونوں بیٹیوں کا ذکر کر رہی تھی۔ اسے وہ زین کے مانند مطمئن نہ لگی۔

''کیا بات ہے کرن، موڈ کچھ آف سا لگ رہا ہے بچے؟'' زویا نے پچکارتے ہوئے پوچھا۔

''مام، اسے بہت زیادہ بھوک لگی ہے۔ وہاں بھی چکرا رہی تھی حال تو میرا ابھی بھی ہے مگر یو نو کہ آپ کا بیٹا تو شیر ہے ایک دم سولڈ۔'' کہانی بیان ہوتے ہی کمرے کا معصوم اور خوشگوار سا ماحول یکلخت بدل گیا۔ زویا کی پیشانی شکن آلود ہونے لگی اور علی اپنی شرمندگی چھپاتے ہوئے بستر پر کروٹیں بدلنے لگے۔

دونوں بچے پچھلے پانچ گھنٹوں سے اپنے چچا کے ساتھ تھے اور ہمیشہ کی طرح بھوکے پیاسے واپس آئے تھے۔ زویا نے شکایتی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

''تم تو جانتی ہو امینہ کی عادت...... جب تک ہم دونوں میں سے کوئی عشا اور منال کو کہیں سیر پر لے جا کر خوب کھلائے پلائے گا نہیں تب تک وہ بھی حسن کو اس کی اجازت نہیں دے گی۔'' علی خفت سے اپنی اکلوتی بھابی یعنی حسن کی بیوی کا ذکر کرتے ہوئے گویا اپنی صفائی پیش کرنے لگے۔ زویا غصے سے سر جھٹک... کر بچوں کے لیے کھانا گرم کرنے کچن میں چلی گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شوہر سے بحث کرنا اور وہ بھی ان کے بھائی حسن کی فیملی پر...... بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔

حسن کی بیوی امینہ کی ایک عجیب عادت تھی جس پر وہ گزشتہ دس برس میں بڑی پابندی سے کاربند رہی۔ جیسا کرو جواباً ویسا ہی کرتی تھی۔ سوٹ دو تو کچھ دنوں بعد آپ کو بھی ویسا ہی ملتا جلتا جوڑا مل جاتا۔ کچھ خاص پکتا تو زویا بڑے چاؤ سے نئی دلہن کو بھاگ کر سیڑھیاں پھلانگتی بالائی منزل پر دے آتی۔ ٹھیک دو چار روز بعد اس کی طرف سے کوئی اچھی سی ڈش آپ کے حضور بھی حاضر ہوتی۔ زویا کا مارکیٹ کا چکر لگتا تو وہ دیور کی خوشنودی کو امینہ کے لیے دہی بڑے، فروٹ چاٹ یا شورمہ لے کر ہی پلٹتی مگر امینہ اگلے ہی روز ذرا فخریہ سے انداز میں ہی بڑی مہارت سے ہی سہی پر اپنے ہاتھ کے بنے دہی بڑے، فروٹ چاٹ یا پراٹھا رول گھر بھر سمیت زویا کو بھی بھیج کر حساب برابر کر دیتی۔

حسن کی شادی کے پہلے سال یہ کھیل تماشا یونہی چلتا رہا۔ ہاں بس دیورانی کی ادلے کے بدلے والی عادت زویا کو ضرور کھلنے لگی تھی۔

''علی! آپ نے نوٹس کیا کچھ؟'' وہ ٹی وی پر چلتے گھمسان کی جنگ والے سیاست دانوں کے ٹاک شو میں گم علی سے پوچھنے لگی۔

''ہاں، ہاں...... کر رہا ہوں نوٹس۔ دیکھو تو کیسے علی الاعلان جھوٹ پر جھوٹ بولے چلا جا رہا ہے حالانکہ ملک بھر کا مانا ہوا کرپٹ بندہ ہے یہ۔'' دوسرے پاکستانی کی طرح علی کا دماغ بھی جھوٹے اور کرپٹ سیاست دان کے سچائی اور حب الوطنی کے دعوے سن کر ابل رہا تھا۔

''میں اس جیمنی کی نہیں آپ کی بھاوج امینہ کی بات کر رہی ہوں علی۔'' برا سا منہ بنا کر زویا نے احساس دلایا۔

''کیوں بھئی، خیر تو ہے ناں؟'' پہلی بار علی کو بھی بیوی کا یہ انداز مختلف سا لگا۔

''بھئی عجیب منطق ہے محترمہ کی۔ سال بھر

ہو چکا، مسلسل ایک ہی انداز اور تکرار...... جو کرو وہی جواباً کرتی ہے۔ بھلا اس کے علاوہ اسے خود سے کچھ کرنا نہیں آتا ہمارے لیے؟'' زویا صاف گوئی سے بولی۔

''مثلاً...... میں کچھ سمجھا نہیں یار؟'' مردوں کو اکثر گھریلو سیاستوں کی خبر تب ہوتی ہے جب پانی کندھے بھگوئے گردن تک پہنچ رہا ہو۔

''آپ ذرا غور تو کریں۔ جب سے وہ ہمارے گھر بیاہ کر آئی ہے۔ ادلے کا بدلہ کرنے کے علاوہ رتی بھر بھی زیادہ نہیں کرتی۔ قسم لے لیں...... بھئی میں تو ہمیشہ محض حسن بھائی کی خوشی کے لیے اسے کچھ نہ کچھ گفٹ کرتی ہوں پر وہ فوراً اتنا ہی ویسا ہی بلکہ بسا اوقات ہم وزن و ہم رنگ تحفہ دے کر جیسے سر سے احسان کا بوجھ اتار پھینکتی ہے۔'' زویا اپنا دکھڑا نان اسٹاپ انداز میں بیان کرنے لگی۔

''اُفوہ...... مگر یہ اس کی اپنی عادت ہوگی۔ تمہیں کیا پرابلم ہے سوچو اگر وہ صرف تحفے سمیٹنے کی عادی ہوتی اور کبھی کچھ نہ لوٹاتی تو بھی شاید تمہیں برا لگتا۔'' علی نے زویا کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر اس طرح انفرادیت تو نہ رہی ناں۔ جو ہم نے کیا ویسا ہی اس نے کر ڈالا۔ مزہ تو تب ہے جب وہ اپنی سوچ اور جذبے سے ہمارے لیے کچھ خاص کرے جیسا کہ میں......''

''اوکے، تم ایسا کرو کہ کچھ روز کے لیے تحفے دینا بند کر دو پھر دیکھنا کہ وہ کیا کرتی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری اور اس کی پسند و ناپسند ایک سی ہو جسے تم امینہ کے ادلے کا بدلہ والی فطرت سمجھ رہی ہو۔'' علی نے تیزی سے ایک حل بتا کر ٹی وی کا والیوم بلند کر لیا۔ زویا سمجھ گئی کہ علی کو اس وقت گرما گرم ٹاک شو میں زیادہ دلچسپی ہے لہٰذا وہ اثبات میں سر ہلاتی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☆☆☆

عاشر، زویا کا بھائی کئی روز بعد چھٹی پر زویا کے گھر آیا تھا۔ وہ ائیر فورس جوائن کر چکا تھا۔ ماں کی کمی وہ بہن کا چہرہ دیکھ کر پوری کیا کرتا تھا۔ ننھے زین اور کرن کے لیے چاکلیٹس، قیمتی کپڑے اور ڈھیر ساری فرائڈ چکن بھی لایا۔ زویا کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے جو اس نے اپنی نرم گرم پوروں سے چن لیے۔

''زوئی!'' بہن کو وہ ہمیشہ اسی نام سے پکارتا۔ ''امی ابو کی روحیں دکھی ہوں گی مت رو ناں۔'' وہ بھائی کے کہنے پر سارا دکھ نگل گئی جسے بعد میں واش روم میں اُگلا جانا تھا ورنہ شاید دل کو مضروب کر ڈالتا۔

''تھینک یو ماموں۔'' زین اور کرن ایک، ایک فرائڈ لیگ پیس معصومیت سے کھاتے ہوئے کہنے لگے۔

''تم کتنے اچھے بھائی ہو عاشر کبھی بچوں کو نانا، نانی کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تم نے۔'' زویا کے لہجے میں عجیب سا تجھوتا سکا۔

''جاؤ جا کر تھوڑا سا فرائڈ چکن اپنی اس غیر جذباتی دیورانی کو بھی دے آؤ۔ خوشبو تو جا رہی ہوگی اسے۔'' عاشر نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ زویا نے بڑی گہری نظروں سے بھائی کو دیکھا۔

''غیر جذباتی......؟ ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔'' وہ ہنسی۔

''بچے تو جذبے بولتے ہیں۔ جذباتی لوگ پہچانے جاتے ہیں۔ ہر اچھائی کے باوجود پاگل کہلانے والے...... ارے وہ تو صاف، صاف سیانی ہے۔ دیکھا نہیں، تمہاری نندیں اسے ہماری عقل مند بھابی کا خطاب دے چکی ہیں اور عقل مند وہی کہلاتا ہے جو جذباتی نہیں ہوتا...... ہوئی ناں غیر جذباتی!'' عاشر کی خود ساختہ مگر حقیقت سے قریب ترین منطق پر وہ کافی ہنسی۔

''نہیں عاشر، آج میں اسے یہ چکن نہیں دوں گی۔'' زویا نے صاف جواب دے دیا۔

"مگر کیوں؟ ایسے نہیں کرتے زوئی۔ دیکھو تمہاری ریسپیکٹ رہے اسی لیے تو اتنی زیادہ لایا ہوں۔"

"ذرا صبر کرلو عاشر جانتی ہوں تم بہن کی عزت بنا رہے ہو مگر میں اور علی دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے گفٹ نہ کرنے پر امینہ کا کیا ردِعمل ہوگا۔ وہ ادلے بدلے کی عادی ہے یا محض میرا وہم ہے یہ۔"

"اوکے جی...... جیسے تم کہو بائے دا وے یہ پڑوسی ملک کے ڈرامے ذرا کم دیکھا کرو ورنہ ہم لوگوں کو بھی سیڑھیوں والے بڑے بالز اور رنگ برنگی ساڑیاں خریدنا پڑیں گی۔"

"اور وہ سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک کی جیولری، اس کا کیا؟" عاشر کے چڑانے پر وہ بالکل بھی شرمندہ نہیں ہوئی بلکہ الٹا اسے ان ڈراموں کی ہیروئنز یاد دلا دیں اور پھر سارا وقت ہنستے ہنستے کٹ گیا۔ عاشر ڈھیر ساری خوشیاں بکھیر کر واپس چلا گیا اور زویا کی توجہ پھر سے دیورانی کی جانب مبذول ہونے لگی۔ اکثر طرح، طرح کے پکوانوں کی خوشبو اڑتے اُڑتے نیچے زویا تک بھی پہنچ جاتی اور وہ اپنے اِدھر اُدھر منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے پر تولنے لگتی مگر امینہ حسب معمول کچھ بھی نہ بھیجتی جبھی زویا کا شک یقین کی طرف گامزن ہونے لگا اور پھر اس دن تو یقین کو گواہی مل ہی گئی۔ جب شب برات کا ڈھیر سارا کھانا امینہ کے میکے والے لائے۔ حسن پھولے نہیں سما رہا تھا کیونکہ کھانا ایک مخصوص اور مہنگے ہوٹل سے خریدا گیا تھا جو کئی ڈشز پر مشتمل تھا۔

پوریاں، پراٹھے، کباب، بھجی، کابلی پلاؤ اور حلوا وغیرہ ان کھانوں کی مہک نیچے بھی جا رہی تھی۔ امینہ کی والدہ اپنی پاٹ دار آواز میں داماد سے کھانے کی تعریفیں کر رہی تھیں پھر وہ کہنے لگیں۔

"سنو امینہ، کھانے میں تمہارے جیٹھ کا بھی حصہ ہے انہیں گرم، گرم بھجوا دو تو اچھا ہے۔" یہی جملہ سن کر زویا نے ٹرے میں چنی ہوئی ماش کی دال کو فوراً واپس پلاسٹک جار میں انڈیل دیا کہ شاید کھانا اوپر سے آنے والا ہے خواہ مخواہ ہی دال پکائے گی۔ ابھی وہ کچھ اور سوچ رہی تھی کہ علی کی آواز سنائی دی۔

"بھئی آج کیا گائے کے پائے چڑھائے بیٹھی ہو زویا تم کچن سے باہر بھی آؤ...... بتاؤ آج کیا پکایا ہے؟" رات پرائم ٹائم کا نیا ٹاک شو شروع ہوتے ہی لائٹ چلی گئی تو علی ہوش میں آگئے اور انہیں اندر اٹھتی ہوئی بھوک کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

جواباً زویا ان کے انتہائی قریب آگئی۔ علی خواہ مخواہ شپٹا اٹھے۔

"کیا کر رہی ہو زویا؟ بچے جاگ رہے ہیں یار۔"

"کتنے ہونق لگ رہے ہیں علی آپ...... ہاہاہا۔" علی کے ہونق بننے کے جواب میں وہ ایک بھونڈا سا قہقہہ لگا کے بولی۔

"لائیں! کان اِدھر لائیں میں تو بس ایک سیکرٹ شیئر کرنے کی کوشش میں تھی اور آپ کیا سمجھ بیٹھے۔ اتنے سالوں بعد اب دیبا اندھا دھند پیار کہاں آتا ہے آپ کے اس سخت ترین شیو والے چہرے پر!" علی کو فضول سا پنچ کافی گہرا لگا۔

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے آج بھی کئی مہ جبینیں اس معصوم چہرے کو تاڑنے گزرتی گاڑی میں بھی جھانکتی دکھائی دیتی ہیں۔ خیر تم اپنی بات بتاؤ...... کرو شیئر اپنا سیکرٹ؟"

"تو دس منٹ مزید صبر کرلیں ابھی امینہ کے میکے والے روانہ ہو ہی رہے ہیں۔ ان کے نکلتے ہی وہ میکے سے آیا ہوا کھانا ہمیں دینے آجائے گی اور ہم وہی تناول فرمائیں گے آج...... ہاں۔" قدرے سرگوشی میں کہا گیا۔

"اوہ...... تو یہ بات ہے۔ ندیدی کہیں کی کیا گھر میں کچھ پکانے کو نہیں تھا کہ تم پکا لیتیں اگر اس نے ہمیشہ کی طرح کھانا نہ بھیجا تو......؟ نہیں نہیں مجھے رات کے وقت آملیٹ پراٹھے سے بڑی وحشت

ہوتی ہے جو تم دوسنٹ کا کہہ کر لے آؤ گی۔'' ڈرے ڈرے سے علی نے خفگی سے خدشات کا اظہار کیا۔

''آج ایسا بالکل نہیں کرسکتی وہ......اس کی اماں اونچی آواز میں فرمارہی تھیں کہ کھانے میں تمہارے جیٹھ، جیٹھانی کا بھی حصہ ہے۔'' زویا کمر پر دونوں ہاتھ دھرے دونوں آنکھوں کو چائنیز اسٹائل میں لاکر بولی تو علی صبر کا گھونٹ پی کر خاموش ہوگئے۔

رات بارہ بجے تک امینہ کے میکے والوں کو گئے کافی دیر گزر چکی تھی۔ علی اور بچے خنظر کچھ نیند میں اپنے، اپنے بستر پر بیٹھے اونگھ رہے تھے تبھی زویا ٹرے میں آملیٹ اور پراٹھے دھرے علی کے بستر تک چلی آئی۔

''علی......علی اٹھیں، کھانا کھالیں۔'' زویا کی آواز میں شرمندگی، غصہ اور انتظار کی کوفت سب کچھ شامل تھا۔

''مجھے نہیں کھانا۔'' علی کروٹ بدل کر خفگی سے بولے۔

''افوہ بھئی کھالیں ناں پلیز......میرا کیا قصور ہے۔ آپ کی لاڈلی بھابی کو ہی توفیق نہیں ہوئی کہ اتنی بابرکت رات کو ہی حقِ ہمسائیگی، حقِ رشتے داری یعنی صلہ رحمی کا مظاہرہ کردیتی۔ کنجوس خاندان کی عورت۔ جانے کہاں سے ڈھونڈلی آپ لوگوں نے۔'' وہ شوہر کو خفا دیکھ کر دیورانی پر غصہ نکالنے لگی۔ جسے علی گہری نیند کے باعث بالکل بھی سن نہ پائے تھے اور وہ ٹرے اٹھا کر بچوں کے کمرے کی طرف چل دی۔

اگلی صبح وہ بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرتے ہوئے خاصی خاموش اور خفا خفا سی تھی۔ جانے کیوں دل غم آلود اور حلق میں عجیب سی کڑواہٹ گھلی تھی۔

''ایسے رشتے داروں سے تو دور ہی رہنا اچھا بلکہ خود غرض قسم کے ایسے بہن بھائی تو خدا کسی دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔'' جذبات کی انتہا کو پہنچ کر اس کے دل نے دہائیاں دیں مگر بچوں کو اسکول بھیج کر وہ حسبِ عادت علی کے کپڑے پریس کرکے برآمدے میں پڑے ہینگر پر ہینگ کرآئی پھر سات تہوں اور نئی

محتاط و غیر محتاط

قدرت اللہ شہاب مرحوم روم گئے تو ان کی کار ایک دوست ڈرائیو کررہا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد دوست نے کہا۔ ''شہاب صاحب مبارک ہو، آپ بچ گئے۔'' مزید ایک گھنٹے بعد اس نے پھر کہا۔ ''شہاب صاحب مبارک ہو آپ پھر بچ گئے۔'' شہاب صاحب نے وجہ پوچھی تو بولا۔ ''اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ یہاں ہر گھنٹے کے بعد ایک حادثہ ہوتا ہے۔'' ہمارے ہاں بھی ہر گھنٹے کے بعد جو حادثہ ہوتا ہے وہ ایک ناخواندہ فرد کا اضافہ ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق سو سال بعد اتنی آبادی ہوجائے گی کہ ایک چارپائی پر سو، سو آدمی سوئیں گے۔ اگرچہ ہمیں یہ غیر محتاط تخمینہ ہی لگتا ہے جیسے ایک ڈرائیور نے ایکسیڈنٹ کیا۔ اسے عدالت نے کہا۔ ''تم غیر محتاط ہو، تمہیں ضرور سزا ملنی چاہیے۔'' اس نے کہا۔ ''میں تو بڑا محتاط بندہ ہوں، مجھ پر رحم کریں، میرے سات چھوٹے، چھوٹے بچے ہیں۔'' تو عدالت نے کہا۔ ''اس کے باوجود کہتے ہو کہ میں محتاط بندہ ہوں؟''

اقتباس از مزاحیات تحریر: ڈاکٹر یونس بٹ
پسند: کائنات عبدالحلیم، میرپور خاص

پیار بھرا خوف

جنگلوں میں رہتا ہوں، آدمی سے ڈرتا ہوں
بستیوں کی بے اماں زندگی سے ڈرتا ہوں
پُر فریب دنیا میں کس طرح جیے گا تو
حسنِ یار میں تیری سادگی سے ڈرتا ہوں

ارم کمال......فیصل آباد

ترکیب والا پراٹھا بناتے ہوئے بھی وہ یہی سوچتی رہی کہ ایسی خود غرض مزاج دیورانی سے بات چیت کرنا بھی چھوڑ دے گی۔ انہی پراگندہ سی سوچوں کے دوران علی کے واش روم سے باہر آنے کا احساس ہوا۔ ناشتے کی ٹرے اٹھائے وہ جونہی کچن سے نکل کر برآمدے سے گزری تو اسے ٹھٹک کر رکنا پڑا سامنے اوپر کی گرل پر حسن کا ایک سوٹ پریس کیا ہوا لٹک رہا تھا۔ بالکل علی کے سوٹ سے ہم رنگ۔

''اوہ..... تو برآمدے تک تاکا جھانکی چل رہی تھی محترمہ کی۔'' اس نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں سوچا۔

''بھابی ذرا موٹر چلا دیں پلیز۔'' سوچوں میں غلطاں زویا کو سامنے گرل پر وہ دشمنِ جاں کھڑی دکھائی دی۔ اس کے زیب تن کیے سوٹ سے ملتا جلتا گلابی اور کالا سوٹ پہنے بے حد مسکراتے ہوئے بڑے بے پروا انداز میں زویا کا جی چاہا کہ ہاتھوں میں تھامی ٹرے اپنے ہی سر پر دے مارے۔ اتنی دیدہ دلیری، امینہ کی چیٹر کو مسکراتا دیکھ کر مانو اس کا خون ہی کھولنے لگا۔ جواب دیے بغیر وہ سیدھی اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔

''ہونہہ اس کے باوا کی ملازم ہوں ناں، موٹر چلا دیں۔'' اس نے ہو بہو امینہ کی آواز و انداز کو کاپی کیا تو علی چونک اٹھے۔

''یہ کیا مالیخولیا قسم کی حرکات کرتی پھر رہی ہو؟ اور آج کل امینہ کا بھوت کیوں دماغ پر سوار ہے تمہارے؟''

''بس آج سے میری اور امینہ کی بول چال ختم۔ آپ کو جس سے ملنا ہے ملتے رہیں۔''

''اُفوہ، بتاؤ تو ہوا کیا ہے آخر؟ جھگڑ پڑی ہو کیا آپس میں؟'' علی کے چہرے پر خاصی ٹینشن در آئی۔

''نہیں تو...... میں کوئی جاہل عورت ہوں جو جھگڑے کروں گی۔'' زویا نے تنک کر کہا۔

''تو پھر مسئلہ کیا ہے تمہیں امینہ سے؟''

''مسئلہ...... مسئلہ مجھے نہیں اسے ہے مجھ سے۔'' اس کی آواز خاصی غصیلی اور بلند تھی۔ علی کو ٹالتے ہی سوجھی۔

''اوکے...... اوکے رکو۔ ایسا کرتے ہیں کہ میرے آفس سے واپسی تک تھوڑا اور برداشت کرلو پھر اکیلے لانگ ڈرائیو پر نکلیں گے۔ تم بہتر طریقے سے مجھے سارا معاملہ سمجھا دینا۔'' علی ناشتا کرتے ہوئے بپھری ہوئی بیوی کو بہلانے لگے۔ اسے بھی جیسے ٹانک مل گیا۔ وہ ہمیشہ شوہر کی محبت اور کیئر کو بیوی کا ٹانک کہا کرتی تھی لہٰذا ہشاش بشاش ہو کر گھر کے کاموں میں لگ گئی۔

دوپہر ایک بجے ڈور بیل کی آواز پر اس نے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول کر جھانکا۔ کوئی چھبیس برس کا جوان تھا۔

''جی یہ علی صاحب کا گھر ہے؟''

''جی ہاں۔'' زویا بہت کچھ بھانپتے ہوئے بولی۔

''جی یہ ہماری کمپنی کا ڈبل ڈور فریج ہے۔ حسن صاحب نے آرڈر دیا تھا کہ جیسا فریج علی لے کر گئے ہیں ویسا ہی ان کے گھر بھی پہنچا دیا جائے۔ اگر آپ ہی مسز امینہ حسن ہیں تو یہاں سائن کر دیجیے۔'' کمپنی کا نمائندہ ایک رسید نما پرچہ صفحہ اسے تھمانے ہی والا تھا کہ اس نے اپنے کباب ہوتے دل پر صبر و برداشت کا ٹھنڈا چھینٹا دیتے ہوئے جلدی سے انکار میں سر ہلایا اور نمائندے کے اشارے کا تعاقب کرتے ہوئے دائیں جانب کھڑی پک اپ سے اَن لوڈ ہوتے اپنے ہی جیسے فریج کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں، خدانخواستہ میں امینہ نہیں ہوں۔ اگر آپ ان سے ملنا چاہتے ہیں تو پلیز یہ اوپر والی بیل بجا دیجیے۔ وہ جھٹ سے نمودار ہو جائیں گی۔'' اور پھر اس ناپ کی گفتگو کے ردِعمل میں اس نمائندے کے چہرے پر نمودار ہونے والی حیرتوں کا مشاہدہ کیے بغیر وہ دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔

☆☆☆

رات چاندنی بھری تھی قدرے خنک بھی۔

بڑے عرصے بعد زویا اور علی بچوں سے یوٹیلٹی اسٹورز سے ماہانہ گروسری لینے کا بہانہ بنا کر اکیلے نکلے تھے۔ ورنہ تو اب انہیں کچھ ایسا لگا کرتا تھا جیسے وہ دونوں اور ان کے بچے ایک ہی سن میں پیدا ہوئے تھے اور ہمیشہ ہمیشہ سے ان کے ساتھ ہی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

''ہاں بھئی بتاؤ پہلے کھانا یا لانگ ڈرائیو؟'' کالونی ایریا سے نکلتے ہی علی نے ونڈ اسکرین سے باہر جھانکتے ہوئے زویا سے پوچھا پر وہ خاموش رہی۔

''یار جواب دو ناں تا کہ اسی سمت چلیں۔''

''علی آپ نے دیکھا کتنی مشکل سے ہم لوگ آج گھر سے نکل پائے ہیں؟'' اس کے لہجے سے چڑچڑاپن عیاں تھا۔

''ہاں، بچوں نے بے حد مشکل سے گھر میں رہنا قبول کیا مگر پھر کسی دن انہیں بھی ساتھ لے آئیں گے۔''

''جی نہیں، میں حسن اور آمنہ کی بات کر رہی ہوں۔ انہیں تو جب بھی خبر ہوتی ہے کہ ہمیں کہیں باہر جانا ہے تو فوراً ہم سے پہلے گاڑی لے کر رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ آج تو آپ نے زبردستی گاڑی کی چابی اپنے پاس رکھ لی ورنہ......''

''ہاں...... میں مانتا ہوں اکثر ایسا ہی ہوا ہے۔ خیر وہ دونوں اچھے خاصے سمجھ دار ہیں۔ انہیں خود ہی میچور ہونے چاہئیں، پتا نہیں یہ حسن بھی کیوں پگلا سا گیا ہے اب۔ خیر تم بتاؤ کہ تمہیں امینہ سے رنجش کیوں ہے؟''

''کیونکہ وہ ہمیشہ میری کاپی کرتی ہے یوں میری قابلیت اور انفرادیت دونوں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ دیکھنے والے کو کیا پتا چلتا ہے کہ کون کس کو کاپی کرتا ہے۔'' جھٹ سے اپنی پرابلم علی کے حضور اس نے پیش کی۔

''ہونہہ...... تو اس کی یہ شعوری یا لاشعوری طور پر کی گئی چیزیں تمہیں بالکل بھی ہضم نہیں ہوتیں، ہے ناں!'' جواباً گہری سانس بھرتے ہوئے علی نے جانچتی انداز میں پوچھا۔

''ہوں......'' زویا نے معصومیت سے سر اقرار میں ہلایا تو علی نے بڑے رومینٹک انداز میں بائیں ہاتھ سے اس کی گھنے بالوں کی اونچی سی پونی ٹیل کو عین سرے سے تھام لیا۔ وہ مزید کچھ بھی کہتے کہتے رک گئی لمحے بھر کے لیے اپنے اور صرف اپنے علی کی گہری، چمکیلی آنکھوں میں ڈوب سی گئی جو محض چند ہی لمحے ان کے خوب صورت چہرے کا احاطہ کر پائی تھیں۔

☆☆☆

رات گہری ہو رہی تھی۔ تہجد کے لیے اٹھتے وقت سب سے پہلے زویا نے بڑے مطمئن انداز میں آنکھوں کے پٹ وا کر کے اپنے مقابل لیٹے اپنے شریکِ حیات کو دیکھا۔ علی گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ ان کے چہرے پر کچھ گھنٹوں پہلے کے واقعات پڑھنے لگی۔ جب ان دونوں نے جھیل کنارے بنے ہوئے چائنیز ریستوران میں بے حد لذیذ کھانا کھایا اور پھر گرین ٹی کے گرما گرم پستہ بادام سے بھرے ڈسپوزیبل گلاس اٹھا کے وہ دونوں جھیل میں ڈولتے چاند کی چاندنی کو لہروں پر رقص کرتا دیر تک دیکھتے رہے۔ اپنی بہت سی پرانی یادوں کو ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہوئے دنیا ومافیہا سے بیگانہ ہوئے کتنی ہی دیر ہنستے رہے تھے پھر علی جھک کر اس کا ہاتھ تھامے اسے گاڑی تک لائے اور بڑے اسٹائل سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے لانگ روٹ پکڑ لیا۔ زویا، علی کی اِک، اِک حرکت کو صرف اور صرف اپنے لیے محسوس کرتے ہوئے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔ دو سے تین گھنٹوں کے دوران حیرت انگیز طور پر وہ گھر کا خود غرض اور مقابلے بازی والا ماحول بھول کر لمحہ بہ لمحہ ملنے والی مسرتوں پر اپنے معبود کا شکر ہی تو ادا کرتی رہی اور کرتی بھی تو کیا؟ وہ خود پر ہی شرمندہ تھی پھر علی کے وہ الفاظ اور سمجھانے کا انداز جو لانگ ڈرائیو کے دوران تھا۔ بیڈ روم کی ملگجی سی نیلی روشنی میں ابھر آیا۔ علی پوچھ رہے تھے۔

''زویا آج گھر میں کیا پکایا تھا؟''

''آج...... آج کوکنگ شو کی اسپیشل ڈش، خاص مسالوں کے کمبی نیشن کے ساتھ گھر جا کر ٹرائی کیجیے گا انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے جناب۔''

''یعنی کہ تم نے آج کا کھانا کسی خاص شیف سے متاثر ہو کر بنایا ہے؟'' زویا نے حیران ہو کر سوال پر غور کیا۔

''جی ہاں...... واقعی کوکنگ چینلز کے شیف حضرات اور چند خواتین اسی قابل ہیں کہ ان کی بتائی ترکیبوں پر بخوبی کچن چلایا اور دسترخوان سجایا جا سکتا ہے...... اس میں ایسا کیا؟'' مگر علی نے پھر ایک سوال داغ دیا۔ بڑے ہی سکون سے۔

''ذرا بتانا عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ پر کن اداکاراؤں سے متاثر ہو کر تم نے جوڑے سلوائے؟ آئی مین ان کے ملبوسات کے ڈیزائن لے کر؟'' زویا تجھنے میں ڈوبی علی کی منطق سمجھنے تک جواب دینے پر مجبور تھی۔

''عیدالفطر پر تو فلاں کا پہنا لباس اچھا لگا تھا اور عیدالاضحیٰ پر...... ہاں یاد آیا وہ میں نے دوسرے والے مارننگ شو کی ہوسٹ سے متاثر ہو کر بنوایا تھا۔''

''مگر کیوں؟ تم نے انہیں کیوں کاپی کیا زویا؟'' علی کے لہجے میں گہرا استفسار تھا وہ ٹپٹا اٹھی۔

''کیونکہ وہ لوگ ہیں ہی اس قابل...... اوپر سے ان کی ڈریسنگ بھی متاثر کن ہوتی ہے اسی لیے علی...... مگر بہت بار میں خود بھی تو کوکنگ کرتی اور ڈریسز ڈیزائن کرتی ہوں۔ آپ نہ جانے آج کیسے سوالات پوچھے چلے جا رہے ہیں۔'' زویا کو اپنا آپ خواہ مخواہ ہی کمتر سا لگنے لگا۔

''چلو تم یہ تو مانیں کہ تم بہت سے لوگوں کو اس لیے کاپی کرتی ہو...... کیونکہ وہ کاپی کیے جانے کے قابل ہوتے ہیں اور ان کے کام، رہن سہن، اندازِ گفتگو اور لباس بھی قابلِ ستائش ہوتا ہے، ہے ناں یہی بات؟''

''علی آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' وہ آخر کار گڑبڑا اٹھی۔

''کہنا نہیں جناب...... گزارش ہے کہ اپنے سر سے اپنی پیاری دیورانی محترمہ امینہ حسن صاحبہ کا بھوت اتار دیجیے جو آپ کو بھی محض اس لیے کاپی کرتی ہیں کہ آپ میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو اس بے چاری کو کاپی کرنے پر اکساتی ہیں۔ یہ الگ بات کہ تمہاری اور تمہاری سلیکشنز کی کاپی کرنے کے بعد وہ محترمہ اِدھر اُدھر نگاہیں چرائے تم سے اوجھل اور دور، دور ہوئی پھرتی ہیں تا کہ اس نقل کا بھرم قائم رہ سکے۔'' علی نے دوٹوک الفاظ میں اس کے دماغ پر چھائی امینہ کی حرکات کی گرد کو جھاڑ سا دیا۔

''اوہ......'' جیسے وہ بہت کچھ سمجھ گئی۔

''زویا be positive...... اگر تمہارا مدِمقابل منفی سوچ کا حامل ہو تو کیا تم خود بھی اپنی مثبت فطرت چھوڑ دو گی؟ انسان کو انسانیت کا شرف اور معراج تبھی ملتی ہے جب وہ اندھیرے کے مقابلے میں اجالا لائے، جھوٹ کے جواب میں سچ اور خدا کی ملی نعمتوں کا احساس پورے خلوص اور نیک نیتی سے کرے...... اوروں کی عادتوں پر کڑھنے کے بجائے اپنے اردگرد بکھری مسرتوں پر راضی بہ رضا ہو کر ایک بار کی ملی زندگی کو گلزار بنا لے...... بولو! کیا کچھ سمجھ میں آیا؟''

''ہوں۔'' اس نے ہلکے پھلکے سے خوشگوار انداز میں سر کو زور سے جھٹکا دیا۔

''یعنی کیا؟ امینہ جیسے لوگوں کی حرکات پر کڑھنا؟'' علی نے پھر امتحان لیا۔

''جی نہیں...... بی پازیٹو ہو کر جینا۔'' وہ کھلکھلائی تھی۔ علی کے انداز میں اس کے لیے ڈھیروں پیار تھا۔

ناولٹ

کاشانۂ الفت

سکینہ فرخ

کاشانۂ الفت میں جب سے الفت کا بسیرا ہوا تھا در و دیوار اور دریچوں سے الفتیں ہی ٹپکتی تھیں...... گھر کے پچھواڑے لگے آم اور چیکو کے پیڑوں پہ لگے پھلوں کی مٹھاس سے الفتیں چھلکتی تھیں، گھر کے داخلی دروازے کے دائیں جانب باغیچے میں خوشنما پھولوں سے آراستہ کیاریوں کی خوشبو میں الفتیں مہکتی تھیں اور تو اور منڈیر پر آکے بیٹھنے والے پرندے بھی الفت کا راگ ہی الاپتے تھے۔



محبتوں سے جوڑے گئے اس گھر میں چار سو خوشیوں کا بسیرا تھا۔ ماں، باپ، تین بیٹوں اور دو بیٹیوں پر مشتمل اس خاندان کو کسی کی دعا تھی، باپ کی جدوجہد تھی یا ماں کی قربانیاں جو خوشی ان کے گھر کی مکین تھی۔

چھوٹی سی دکان سے کاروبار کا آغاز کرنے والے اعجاز احمد کو قدم جمانے میں کافی عرصہ لگا...... کاروبار پہلے جما پھر پھلا، پھولا...... سولہ برس کی محنتِ شاقہ کے بعد کہیں جاکے وہ اس قابل ہوئے کہ الفت کو "کاشانۂ الفت" کا تحفہ دے سکیں...... انہوں نے دھیرے، دھیرے اس گھر کو اپنی نگرانی میں تعمیر کروایا تھا...... چھوٹی سے چھوٹی بات کا خیال رکھا...... بچے جوانی کی سرحدوں پر پہنچ رہے تھے اور وقت آگیا تھا کہ یکے بعد دیگرے ان کی ذمے داریوں کو پورا کیا جائے...... بچوں کی تعلیم و تربیت، ان کی شادی بیاہ کے فرائض...... بڑے کام تھے کرنے کو...... جو اَب یہیں رہ کے کرنے تھے۔

الفت کو اس گھر میں طلوع ہونے والی پہلی صبح بہت اچھی طرح یاد تھی۔

اعجاز احمد نماز سے فارغ ہو کے اپنے بیڈ روم سے ملحقہ ٹیرس پر آ کھڑے ہوئے تھے اور وہ بھی ان کے پیچھے، پیچھے وہیں چلی آئیں...... ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا...... صبح کا ہلکا سا جھٹ پٹا آسمان پر نمودار ہونے لگا تھا...... دونوں خاموشی سے اس منظر سے محظوظ ہونے لگے...... نسیم سحر کی تازگی انہیں مسحور کر رہی تھی...... نیچے باغیچے کا منظر بھی بہت دلکش نظر آ رہا تھا...... یہاں شفٹ ہونے سے پہلے ان لوگوں نے باغیچے کا لے آؤٹ بنا لیا تھا...... نئی لگی ہوئی گھاس میں تیزی سے سبز رنگ جھلکنے لگا تھا...... پھولوں کی کیاریوں میں ننھی، ننھی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں...... زرد سا سورج افق پر آہستہ آہستہ نمودار ہونے لگا تھا۔

"اس گھر کی پہلی صبح مبارک ہو......" جبھی اعجاز نے الفت کا ہاتھ محبت سے تھام کر کہا۔

"آپ کو بھی بہت مبارک ہو۔" الفت بے ساختہ شرما گئیں۔

"آپ نے میرا گھر بسایا...... آپ سے اللہ نے مجھے اولاد دی اور آپ نے محبت سے ان کو پالا پوسا...... میری طرف سے آپ کے لیے یہ حقیر سا نذرانہ......" انہوں نے مسکرا کے بیوی کو خود سے قریب کرتے ہوئے کہا...... الفت نے ایک طائرانہ نگاہ پورے گھر کے اطراف میں دوڑائی۔ خوب صورتی سے بنا ہوا نیا نویلا چمچماتا ہوا بڑا سا گھر...... حقیر سا نذرانہ......؟ وہ پھر شرما گئیں۔

"یہ حقیر تو نہیں...... اتنا عالیشان گھر ہے۔" انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"آپ کی محبت اور قربانیوں کے سامنے اینٹ گارے سے بنا ہوا یہ مکان حقیر ہی تو ہے...... اسے گھر تو آپ ہی بنائیں گی، اپنی محبتوں سے سجائیں گی...... آپ سے یہی امید ہے کہ آپ اسے ہم سب کے لیے بہت خاص بنا دیں گی۔"

وہ مسکراتی رہیں۔

"کاشانۂ الفت میں آج اپنے پہلے دن کو اپنے بچوں کے ساتھ مناتے ہیں۔ آئیں دیکھیں بچے کیا کر رہے ہیں، سو رہے ہیں تو انہیں بھی جگا دیتے ہیں۔" اعجاز احمد نے ان کا ہاتھ تھام کے کہا۔

"ایک تو جب میں نے گھر کے ماتھے پر اپنا نام اتنے رنگین پیراہن میں کندہ دیکھا تو مجھے بہت شرم آئی......" انہوں نے جھینپ کر کہا۔

"اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ یہ تو فخر کی بات ہے...... اس گھر کا مرکز تو آپ ہی ہیں...... آپ کے دم سے ہی یہاں الفتوں کا بسیرا ہوگا......" وہ ہنس کے بولے۔ الفت آرا مسکرائیں تو مگر اس لمحے انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے اس گھر کا سارا وزن ان کے نازک کندھوں پر آ پڑا ہو...... شوہر نے ان پر بہت

بھاری ذمے داری ڈال دی تھی۔

☆☆☆

وقت کیسے گزرتا گیا، کسی کو احساس ہی نہیں ہوا...... انہوں نے اس گھر کو بنانے سنوارنے اور آباد رکھنے میں اپنی ساری جوانی، ہمت و طاقت اور زندگی کے کئی سال لگا دیے...... بچے بڑے ہوتے گئے، تعلیم حاصل کرتے گئے اور وہ ایک، ایک کی شادی بیاہ سے سبکدوش ہوتے گئے یہاں تک کہ سب سے چھوٹے بیٹے کے فرض سے بھی سبکدوش ہو گئیں۔ پچیس چھبیس سال تو جیسے چٹکی بجاتے گزر گئے...... اب گھر میں دونوں بڑے بیٹے وقاص اور وہاب اور ان کے بیوی بچوں کے دم سے رونق تھی...... دونوں بیٹیاں حسنہ اور اسما اپنے، اپنے گھروں کو رخصت ہو چکی تھیں...... سب سے چھوٹا بیٹا شہاب شادی کے بعد اپنی بیوی کو لے کر دبئی سدھار چکا تھا...... جہاں اس کی بہت اچھی جاب تھی...... اسے کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور انہوں نے دل پر پتھر رکھ کے بیٹے کی خوشی میں خوش ہونے ہی میں بھلائی سمجھی۔

اتنا سب کچھ ہونے کے بعد انہیں لگا کہ اب ان کے ستانے کے دن آگئے۔ دبلی، پتلی، نازک اندام، شرمیلی سی الفت نے الفی سے اماں اور اماں سے بڑی اماں تک کا سفر گویا ایک جست میں طے کر لیا تھا۔ لوگوں کو شاید اس سفر کی مسافت میں ایک نہ دو پورے بیالیس برس نظر آتے ہوں گے مگر انہیں تو ایسا ہی لگا جیسے سب کچھ پلک جھپکتے ہی ہو گیا ہو۔

بڑی اماں کا چولا پہننا کچھ اتنا آسان کام نہیں تھا۔

میاں کے اصرار پر نئی دیدہ زیب ساڑی باندھ کے آنکھوں میں ہلکا سا کاجل لگا لیتیں تو بہوئیں معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا تیں۔ وہ شرمندہ ہو کے جھٹ نئی ساڑی اتار کر پرانی باندھ لیتیں۔ کبھی آئس کریم یا چاکلیٹ کھانے لگتیں تو پوتے اور نواسے کھی، کھی کر کے ہنستے ہوئے ان کے ہاتھ سے جھپٹ کے لے جاتے۔

ان کا دل گرمیوں کی لمبی دوپہروں یا سردیوں کی طویل راتوں میں بستر پر لیٹ کر کسی دلچسپ کتاب کو پڑھنے کا چاہتا تو اعجاز احمد کو اپنے پاؤں دبوانے اور ماضی کے قصے دُہرانے کے لیے وہی وقت مناسب لگتا...... وہ بے چارے بڑھاپے اور بیماری کے باعث کمزور اور چڑچڑے ہو گئے تھے۔ کاروبار دونوں بڑے بیٹے ہی سنبھال رہے تھے اور اب ان کی توجہ کا مرکز صرف اور صرف الفت آرا ہی تھیں اور وہ ان کی طرف سے پوری توجہ کے طالب رہتے تھے اور الفت آرا دل و جان سے ان کی خدمت پر کمر بستہ رہتیں...... گو وہ خود بھی بوڑھی اور کمزور ہو چکی تھیں مگر شوہر کو خوش رکھنے کی ہر ممکن سعی کرتی رہتیں۔

رفتہ رفتہ ان کی دلچسپیاں اور شوق گھٹتے، گھٹتے صرف باغیچے میں تھوڑی سی چہل قدمی تک ہی محدود ہو کر رہ گیا...... وہ ہر روز صبح فجر کی نماز کے بعد وہاں تھوڑی دیر ٹہل لیتیں اور وہیں رکھی کرسی پر کچھ دیر بیٹھ کر تسبیح کیا کرتیں...... اپنے سارے بچوں کے لیے دعائیں مانگا کرتیں۔

بڑا بیٹا کبھی ان کے قدموں میں آ کے بیٹھ جاتا...... ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر پریشانی سے کہتا۔

"اماں، بہت مسئلہ ہو گیا ہے...... ڈیل پھنس گئی ہے دعا کیجیے گا میرے لیے۔"

"ہاں بیٹا ضرور......" وہ اسے دلاسہ دیتیں۔

"اماں، مال پورٹ پر روک لیا گیا ہے...... دعا کریں نکل جائے۔" کبھی منجھلا آ کے کہتا وہ اسے بھی اطمینان دلاتیں۔

"ضرور میرے بچے ضرور......"

"میری پروموشن ڈیو ہے مگر وقت لگ رہا ہے...... اماں دعا کیجیے جلد ہو جائے۔" چھوٹے کی دبئی سے کال آتی۔

"انشاء اللہ ہو جائے گی پروموشن میرے

نعل۔" وہ پسیج جاتیں۔

کبھی بڑی بیٹی سسرال سے فون کرتی۔ "اماں دعا کیجیے گا اس بار تو مجھے بیٹا ہو جائے۔" اس کی آواز کا دکھ ان کا کلیجا دہلا دیتا......

"اللہ تجھے چاند سا بیٹا دے میری بچی...... دعا بھی کر رہی ہوں اور منت بھی مان لی ہے۔" وہ اسے دلاسہ دیتیں۔

کبھی چھوٹی اور سب سے زیادہ لاابالی بیٹی فون کرکے انہیں دہلا دیتی۔

"اماں میرے سونے کی چوڑیاں گم ہوگئی ہیں...... خدا جانے کہاں رکھ کے بھول گئی ہوں یا کوئی اٹھا کے لے گیا ہے، ماسی بھی دو دنوں سے نہیں آرہی ہے، اماں دعا کریں مل جائے۔" وہ رونے لگتی......

اسما کی پرانی عادت تھی۔ شادی کے بعد سے نہ جانے کتنے ٹاپس اور انگوٹھیاں گم کر چکی تھی...... مگر سونے کی چوڑیاں وہ بھی ایک ایک تولے کی ایک چوڑی پوری بارہ عدد...... کوئی چھوٹی سی چیز تو نہیں کہ کہیں رکھ کے بھول جائے...... وہ سخت پریشان ہو جاتیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ اس معاملے میں انہیں دعا کے ساتھ ساتھ دوا بھی کرنی پڑے گی...... وہ مصلے پر بیٹھتیں تو اٹھنا بھول جاتیں...... تھوڑا وقت اور سرک گیا...... اعجاز احمد کو فالج کا اٹیک ہوا اور وہ چند ہفتوں میں چٹ پٹ ہوگئے...... الفت آرا کو سکتہ ہوگیا۔

وہ پچھلے چند سالوں سے بیمار تھے...... گوشہ نشین ہو کے رہ گئے تھے مگر کچھ بھی تھا ان کے سر کے اوپر سائبان کے مانند تھے، ان کے وجود سے الفت آرا کو بہت ڈھارس تھی...... ان کی زندگی کی بچی کھچی رنگینیوں کا وہی تو سبب تھے...... یہ انہوں نے سر پر سفید چادر اوڑھتے ہوئے سوچا۔ ان کے لیے ہزار گز پر محیط کاشانۂ الفت تیار کروانے والے خود دو گز قبر میں جا سوئے تھے۔

سارا گھر ان کی اولادوں اور اولادوں کی اولادوں سے بھر گیا...... دیگر رشتے دار بھی پہنچ گئے۔

پہلا دن سخت تھا...... سب کی آنکھوں میں آنسو تھے، گھٹی گھٹی سی آہیں تھیں...... دوسرا دن نارمل تھا...... لوگ سنجیدہ تھے۔ تیسرے دن دبی دبائی گفتگو اور بچوں کا کھیلنا کودنا شروع ہوگیا۔ چوتھے دن چہل پہل لوٹ آئی۔

دور پار کے عزیز تو پہلے ہی واپس جاچکے تھے۔ اب صرف گھر والے ہی رہ گئے تھے۔ دونوں بیٹیاں جانے کے لیے سامان باندھے بیٹھی تھیں۔

"ایک دن اور رک جاتیں......" انہوں نے بڑی امید سے حسنہ اور اسما کی طرف دیکھا۔

"اماں بچوں کے اسکول کا بہت نقصان ہوگیا ہے...... ہم آتے جاتے رہیں گے آپ فکر مت کریں......" حسنہ نے دلاسہ دیا۔

نقصان تو اور بھی زیادہ ہوا تھا...... مگر شاید ان دونوں کو اس نقصان کی زیادہ پروا نہیں تھی...... انہوں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے سر ہلایا۔

"ارے حسنہ آپا، فاریہ کے لیے جو رشتہ آیا تھا اس کا کیا بنا......؟" وقاص کی بیوی عائزہ کو ایک دم یاد آیا۔

"پسند تو کر گئے تھے لڑکے والے، پھر ابا کی بیماری کا سلسلہ ہی شروع ہوگیا...... اب فائنل کردوں گی...... ہائے ابا بے چارے ہمیشہ کہا کرتے تھے سب سے بڑی نواسی ہے فاریہ اس کی شادی اپنے ہاتھوں سے کروں گا، وقت قریب آنے لگا شادی کا تو وہ چلے گئے۔" حسنہ نے ایک دم ہچکیاں لینی شروع کردیں...... نہ جانے غم ابا کے جانے کا تھا یا شادی کے متوقع خرچے کا۔

عائزہ ناک سکوڑ کے چپ ہوگئی...... ابا نے حسنہ کا کون، کون سا خرچہ اٹھایا ہوا تھا۔ یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

عید بقر عید، بچوں کی سالگرہ اور کامیابیوں پر تحائف انعامات کے سو سو خرچے تو ویسے ہی تھے جو

اماں بخوشی کیا کرتے تھے اس کے علاوہ دونوں بیٹیوں کے لیے ان کا ہاتھ ہمیشہ سے کھلا تھا...... اس پر عائزہ کو دل ہی دل میں بہت سی شکایتیں تھیں...... عائزہ کو دونوں نندوں کے علاوہ دیوروں اور دیورانیوں سے بھی گلے تھے اس کا خیال تھا کہ صرف اس کا شوہر وقاص اس دنیا کا سب سے بے وقوف انسان ہے جو ہر وقت ماں، باپ، بہنوں اور بھائیوں کی فکروں میں گھلتا رہتا ہے جبکہ دوسرے عیش کررہے ہیں...... اسے یہ بھی شک تھا کہ وقاص کے دیگر بھائی بہن، ماں، باپ سے چپکے چپکے مالی فوائد حاصل کررہے ہیں جبکہ وقاص اس معاملے میں بھی بہت پیچھے ہے...... بڑا بیٹا ہونے کے ناتے کاروبار کا زیادہ لوڈ وقاص ہی کے کندھوں پر تھا، وہ چاہتا تو کیا نہیں کرسکتا تھا۔

"اسما یہ تمہارے موبائل کا چارجر روم میں رہ گیا تھا۔" ثمن اسما کا چارجر لیے اندر داخل ہوئی۔

"اوہ شکریہ بھابی......" اسما نے چارجر لے کر اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ثمن، عائزہ کے برابر میں آکر بیٹھ گئی۔

"وہاب کہاں ہے؟ آج نظر نہیں آیا صبح سے۔" الفت نے بہو کو مخاطب کیا۔

"اماں، آج وہ ذرا آفس کی طرف گئے ہیں، کچھ اہم معاملات دیکھنے تھے۔" ثمن نے جواب دیا۔

"ہاں ظاہر ہے کاروبار کا زیادہ حرج تو نہیں ہونا چاہیے، تین دنوں سے دونوں بھائی گھر ہی پہ تھے، میں تو وقاص سے بھی کہہ رہی تھی کہ آپ بھی چلے جائیں، مگر وہ......" عائزہ نے کندھے اچکا کر کہا، اس کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

"جانے والے چلے جاتے ہیں، دنیا کے معاملات تو چلتے ہی رہتے ہیں۔" الفت نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ماما چلیں بابا بلا رہے ہیں۔" اسما کے بڑے بیٹے نے کمرے میں جھانکا...... اسما اپنا بیگ اٹھا کے کھڑی ہوگئی۔

"اماں، میں بھی چلتی ہوں......" حسنہ بھی ساتھ ہی کھڑی ہوگئی۔ الفت نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"ارم اور شہاب بھی ایک ڈیڑھ ہفتے تک جانے کا کہہ رہے ہیں۔" عائزہ نے ان دونوں کے نکلتے ہی شوشا چھوڑ دیا۔

"ایک ڈیڑھ ہفتہ...... بس اتنا ذرا سا......؟ اتنے دنوں کے بعد آئے تھے وہ بھی اتنی دور سے، کچھ دن تو رہتے......" الفت نے چونک کر کہا۔

"یہ تو آپ ان ہی سے کہیے...... میں ذرا کچن دیکھ لوں...... ملازمین کے سر پر نہ کھڑے ہو تو کوئی کام ہی نہیں ہوتا...... تین چار دنوں میں پورا گھر تہس نہس ہوگیا ہے......" عائزہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"تمہارے بچے کہاں ہیں نظر نہیں آرہے۔" الفت نے چھوٹی بہو ثمن سے پوچھا جو میز پر پڑے رسالوں میں سے ایک کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

"اماں، وہ سب اسکول گئے ہیں...... ایگزامز ہونے والے ہیں ناں...... زیادہ چھٹیاں نہیں کرواسکتے......" اس نے انہیں دیکھے بغیر جواب دیا۔

"ہاں صحیح بات ہے۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"اماں مجھے پچیس ہزار روپے چاہیے تھے۔" ثمن دو چار منٹ رسالے الٹتی پلٹتی رہی...... پھر اچانک بولی۔

"پچیس ہزار......؟" الفت نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ایک ضروری کام تھا......" اس بار اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے آہستہ سے کہا۔

ثمن سسر کی زندگی میں بھی ان سے بلا جھجک ضرورت کی رقم لے لیا کرتی تھی، وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھیں مگر ان کے مرنے کے بعد اس نے کچھ دن انتظار تک نہیں کیا...... یہ بات انہیں اچھی

نہیں لگی..... کاروبار بے شک دونوں بیٹے سنبھال رہے تھے مگر اکاؤنٹ کا معاملہ اعجاز احمد کے ہاتھ ہی میں تھا..... کوئی بھی چیک اُن کے دستخط کے بغیر کیش نہیں ہوسکتا تھا۔ انہوں نے ایک بار بیوی سے کہا تھا کہ یہ نازک معاملات ہیں..... کسی ایک یا دونوں بیٹوں کو اگر یہ اختیار مل گیا تو کسی بھی وقت بڑا تنازعہ ہوسکتا ہے، وقت آنے پر یہ سب کچھ ان بچوں ہی کا تو ہوگا مگر ابھی نہیں.....

''میرے پاس سردست تو اتنی رقم موجود نہیں ہے..... کل تک کچھ ہوجائے گا۔'' انہوں نے ثمن کو تسلی دی۔

وہ بھی اٹھ کے باہر چلی گئی۔ الفت آرا اپنے کمرے میں اکیلی رہ گئیں..... ان کا بیڈ روم ان کے لیے جنت تھا۔ کتنا کشادہ، خوب صورتی کے ساتھ بنا اور سجا ہوا..... جس کا ایک دروازہ ٹیرس میں کھلتا تھا..... اس ٹیرس اور اس کمرے میں ان کی زندگی کے حسین ترین دن گزرے تھے..... چپے چپے پر اعجاز احمد کی یادیں موجود تھیں..... ان کی آنکھیں گیلی ہونے لگیں۔

اعجاز احمد کو اور انہیں اپنے بچوں سے بے تحاشا محبت تھی..... سب اکٹھا ہوتے تو ان کے لیے وہی دن عید بقرعید کا بن جاتا..... اب بھی سب اکٹھا ہوئے تھے..... مگر ان کے ہوتے ہوئے بھی نہ جانے کیسا سناٹا تھا جو ہر طرف پھیلا ہوا محسوس ہورہا تھا اور ان کے جانے کے بعد مزید خوف ناک ہونے لگا تھا..... ''یہ سناٹا تو شاید اب زندگی کا حصہ بننے والا ہے..... ایک آپ کیا گئے ہر چیز ہی ویران ہوگئی ہے۔'' شوہر کے جانے کا غم ان کے وجود کو توڑنے لگا تھا۔

☆☆☆

گھڑی رات کے بارہ بجا رہی تھی..... وقاص اپنے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز تھا..... اس کے ہاتھ میں موبائل تھا..... نہ جانے وہ کس سے میسجنگ کررہا تھا کہ دفعتاً عائزہ اندر داخل ہوئی..... اس کے ماتھے پر..... سلوٹیں تھیں..... وقاص نے چونک کر بیوی کی طرف دیکھا۔

''بالآخر بلی تھیلے سے باہر آگئی۔'' وہ تنک کے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا..... خیریت.....؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے عائزہ کو دیکھا۔

''ابا کے انتقال کی خبر سن کر دوڑے چلے آنے والے لوگ ان کی محبت اور چاہت میں تو آ نہیں سکتے..... ارے جن کو ان کی خدمت کرنے کی کبھی توفیق نہیں ہوئی ہو انہیں بھلا ان کی موت کا کیا غم ہوسکتا ہے۔'' وہ غصے سے بولی۔

''ہوا کیا ہے..... تمہارا اشارہ کس کی طرف ہے؟'' وقاص جھنجلا کے بولا۔

''آپ کی بھاوج صاحبہ فرما رہی تھیں کہ وہ لوگ زیادہ دن نہیں رک سکتے..... اس لیے جائداد وغیرہ کی تقسیم ان کی موجودگی ہی میں ہوجائے تو اچھا ہے..... ابا کے جنازے میں شریک ہونے نہیں بلکہ جائداد ہتھیانے آئے ہیں یہ لوگ۔'' عائزہ جل کے بولی۔

''تو اس میں حیرانی و پریشانی والی کیا بات ہے.....؟ یہ تو ایک دن ہونا ہی ہے..... ابا کی جائداد کے شرعی طور پر تو سارے بہن بھائی وارث ہیں۔'' وقاص تحمل سے بولا۔

''واہ! ابا کئی مہینوں تک بستر پر پڑے رہے، آخری دس بارہ دن اسپتال میں داخل رہے، ان کی خدمت کرنے والے ہم لوگ، ان کی وجہ سے پریشانی اٹھائی ہم نے، کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ وہ باپ جسے ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے، کو آ کے ایک نظر دیکھ جائیں اور جو خدمت ہوسکے کریں بیٹیاں مہمانوں کی طرح گھڑی دو گھڑی کو شکل دکھانے آتی تھیں، وہاب صاحب کو ابا سے زیادہ کاروبار کی فکر لاحق تھی..... شہاب صاحب دبئی میں آرام سے بیٹھے تھے، جب ساری ذمے داری آپ نے اٹھائی تو یہ کون ہوتے ہیں حقدار بننے والے۔'' عائزہ پھٹ پڑی۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کس نے کیا، کیا اور کیا نہیں کیا..... ماں، باپ کی خدمت کا وراثت سے کوئی تعلق نہیں..... وہ ایک سعادت ہے جو خوش نصیب اولاد کے حصے میں آتی ہے اور یہ ایک شرعی تقاضا ہے جو بہر حال میں پورا کروں گا.....'' وقاص نے سخت لہجے میں کہا۔

''کرلیں جو آپ کا دل چاہے۔'' عائزہ تنک کر بیڈ سے اٹھ گئی۔

''ویسے مناسب یہی ہے کہ یہ سارے معاملات شہاب کی موجودگی ہی میں ہوجائیں۔'' وقاص کسی گہری سوچ میں گم نظر آنے لگا۔

☆☆☆

''یہ کیا ہے کہ آپ ہر وقت لیپ ٹاپ میں سر گھسائے بیٹھے رہتے ہیں، اردگرد کی کوئی خبر بھی ہے آپ کو؟'' ثمن نے وہاب کو مسلسل لیپ ٹاپ پہ جھکے دیکھ کر کوفت بھرے انداز میں کہا۔

''میں نہ تو کوئی گیم کھیل رہا ہوں اور نہ ہی فیس بک کھول کر بیٹھا ہوں۔ کام کررہا ہوں ضروری.....'' اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

''اچھا کرلیجیے گا کام بھی..... پہلے میری سنیں.....'' ثمن اس کے نزدیک ہوتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا..... کوئی ضروری بات.....؟'' اس بار وہاب نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو کچھ اندازہ ہے ابا نے پیچھے کیا کچھ چھوڑا ہے.....؟'' وہ رازداری سے بولی۔

''ٹھیک سے تو نہیں معلوم البتہ ان کے کاروبار کے علاوہ کچھ پراپرٹی ہے، پلاٹس ہیں، شیئر وغیرہ ہیں۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''ہمیں کتنا مل جائے گا؟'' ثمن دلچسپی سے بولی۔

''یہ کوئی وقت ہے ان باتوں کا..... جائداد کی تقسیم کا تو کوئی حساب کتاب ہوا ہی نہیں ہے اور شاید ابھی ہو بھی نہ۔'' وہاب بیزاری سے بولا۔

''ایسے معاملات کی خبر رکھنی چاہیے..... ورنہ ابا تو اب رہے نہیں، کون کہاں کیا ہاتھ دکھا جائے، پتا بھی نہیں چلے گا۔'' ثمن اس کے سامنے ہاتھ نچا کے بولی۔

''تم میرے بھائیوں کو اس قسم کا سمجھتی ہو۔'' وہاب خفگی سے بولا۔

''دولت، زمین، جائداد..... یہ سب بڑے بڑوں کا ایمان خراب کردینے والی چیزیں ہیں، خون کو سفید ہونے میں چند لمحے لگتے ہیں۔'' ثمن کندھے اچکا کے بولی۔

''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں..... جب وقت آئے گا، دیکھا جائے گا۔'' وہ دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''ہونہہ..... جب وقت آئے گا..... پتا ہی نہیں ہے انہیں کہ وقت آچکا ہے۔'' وہ منہ بنا کر کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

''آپ نے وقاص بھائی سے کوئی بات کی؟'' ارم نے شہاب سے پوچھا۔

''ابھی ایسا موقع نہیں ہے کہ میں جائداد کا حساب کتاب مانگنے کھڑا ہوجاؤں..... ویسے بھی میں نے کبھی کاروبار میں دلچسپی نہیں لی پھر ملک سے باہر بھی چلا گیا..... اچھا نہیں لگتا بڑے بھائیوں سے یہ سوال کروں۔'' شہاب نے جواب دیا۔

''اس میں اچھا یا برا لگنے کی کیا بات ہے..... ابا جان کے بعد یہ سارے فیصلے تو ہونے ہی ہیں۔'' ارم جلدی سے بولی۔

''اُفوہ..... بھئی تم مجھے الٹی سیدھی پٹیاں مت پڑھاؤ۔'' شہاب جھنجلایا۔

"اتنی گھنی اور چالاک ہیں عائزہ بھابی، میں نے تو باتوں ہی باتوں میں ان سے پراپرٹی کے بارے میں پوچھنا چاہا مگر انہوں نے مجھے ہوا تک نہیں لگنے دی۔" وہ اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی بھابی سے اس طرح کی بات کرنے کی؟" شہاب چونک کے بولا۔

"کیوں نہ کرتی...... ہم ٹھہرے پردیسی لوگ، روز روز پاکستان آنا آسان ہے کیا......؟ اب ویسے بھی علی اور کاشان دونوں بڑے ہو رہے ہیں اسکول سے چھٹی بھی کروانا اتنا آسان نہیں رہا...... میں نے تو انہیں کہہ دیا ہے کہ جو کرنا ہے جلدی کریں۔" ارم نے بھویں اچکا کر جواب دیا۔

"کیا...... کیا کہا تم نے......؟" شہاب ہڑ بڑا کر سیدھا ہو گیا۔

"اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہیں......" اس نے اطمینان سے کہا۔

"میں بہن، بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں، اتنی بڑی بات منہ سے نکالنے کی میری اوقات ہے اور نہ ہی تمہاری...... ویسے بھی ابھی اماں جان حیات ہیں، وہی سب کی سرپرست ہیں، تمہاری ہمت کیسے ہوئی، ایسی بات کرنے کی۔" شہاب غصے میں پھٹ پڑا۔

"اب جو ہونا تھا ہو چکا...... ویسے بھی یہ سب کچھ ایک دن تو ہونا ہی ہے...... آپ حقیقت پسندی سے کام لیں۔" ارم کے... اطمینان میں ذرا برابر بھی فرق نہیں آیا۔

"حقیقت پسندی اور سنگدلی میں فرق ہونا چاہیے۔" شہاب نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ "میرا باپ دنیا سے چلا گیا اور تمہیں بٹوارے کی پڑی ہے۔"

"جانے والے کو تو جانا ہی ہوتا ہے...... آپ ان کے ایصال ثواب کے لیے ساری عمر کچھ نہ کچھ کرتے رہیے گا، اب تو ان کے وہی کام آئے گا لیکن جو دنیا میں رہ جاتے ہیں ان کو بھی تو اپنی زندگی گزارنی ہوتی ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

شہاب اپنی حد سے زیادہ پریکٹیکل بیوی کو محض دیکھتا ہی رہ گیا۔

☆☆☆

کچھ ٹھہرنے اور ستانے کا موقع آیا تھا تو وہ چل دیے...... اور خود انہیں اکیلا کر گئے۔

وہ بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھیں...... انہیں محسوس ہوا جیسے اعجاز احمد نے انہیں آواز دی ہو...... زندگی کے آخری ایام کی شدید بیماری میں وہ ان کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی تھیں...... کھٹکے کی نیند سونے لگی تھیں کہ نہ جانے رات کے کس پہر انہیں ان کی ضرورت پڑ جائے۔

بیڈ کا داہنا سرا خالی تھا...... ان کا کلیجا جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔ وہ دل تھام کے سانس برابر کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

ان کی نظر اپنے ہاتھوں پر گئی...... ان کا دل دھک سے رہ گیا...... ان کی انگلی میں برسوں کی پڑی جڑاؤ انگوٹھی موجود نہیں تھی۔

ان کے حواس آج کل قابو میں نہیں تھے...... وہ چیزیں اِدھر اُدھر رکھ کے بھول جاتیں...... وضو کے لیے اتارتی تھیں اور پھر فوراً ہی پہن لیتی تھیں۔

"کہاں رکھ کے بھول گئی......" وہ ایک دم گھبرا گئیں۔

بڑے سے نیلم کے چاروں طرف ننھے ننھے ہیروں سے مزین یہ انگوٹھی ان کی منہ دکھائی تھی...... اعجاز احمد کی طرف سے ملنے والا پہلا تحفہ جو انہیں جان سے بڑھ کر عزیز تھا...... وہ جلدی سے بیڈ کی دراز میں کھنگالنے لگیں، باتھ روم دیکھا، بیڈ روم کو اچھی طرح جھاڑ کے دیکھا...... انگوٹھی ندارد......

پھر جیسے انہیں کچھ خیال آیا وہ الماری کی طرف

لپکیں...... لا کر کھولا اور ایک پرانی وضع کا بڑا سا جیولری باکس نکالا...... اس کا تالا کھولا...... دیگر زیورات کے ساتھ وہ انگوٹھی اوپر ہی پڑی تھی۔ ان کی جان میں جان آ گئی...... انہوں نے جلدی سے وہ انگوٹھی اپنی انگلی میں ڈال لی۔ انہوں نے دو تین دن پہلے اپنے ہاتھوں میں پڑی چوڑیاں اتار کے جیولری باکس میں رکھ دی تھیں بے خیالی میں جانے کیسے انگوٹھی بھی اس میں رہ گئی...... اور حیرت کی بات تھی کہ انہیں اس کی خبر ہوئی نہ لگے دو تین دنوں تک اس کے انگلی میں نہ ہونے کا احساس ہوا...... وہ اپنے مکمل حواسوں میں کہاں تھیں...... انگلی میں انگوٹھی پہنتے ہی انہیں احساس ہوا جیسے اعجاز احمد دوبارہ ان کے پاس آ گئے ہوں...... وہ چپکے سے ماضی کے جھروکوں سے ہوتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئیں جہاں وہ تھیں اور اعجاز احمد......

خوب صورتی سے سجا ہوا حجلۂ عروسی جہاں وہ گھونگٹ نکالے شرمائی شرمائی بیٹھی تھیں...... اعجاز احمد دبے پاؤں اندر داخل ہوئے اور بولے۔

"آداب......" انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اور زیادہ سمٹ گئیں۔

"میں اس گھر میں اس کمرے میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔" وہ ان کے برابر بیٹھتے ہوئے بولے...... انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے اپنا سر مزید جھکا لیا۔

"اور دل میں بھی خوش آمدید کہتا ہوں۔" وہ مزید قریب آ کے بولے...... اور وہ گھبرا کے کچھ پیچھے ہو گئیں۔

"آپ تو کچھ بول ہی نہیں رہیں...... کہیں میری دلہن گونگی تو نہیں۔" اعجاز احمد کے لہجے میں شوخی بھانپنے کے بجائے وہ ان کے جملے میں الجھ گئیں اور کسمسا کے رہ گئیں۔

"اوہو لگتا ہے کچھ گڑ بڑ ہے...... ہماری اماں بہت سیدھی سادی ہیں...... کہہ رہی تھیں کہ لڑکی بہت خوب صورت ہے اور سُریلی آواز کی مالک ہے...... ہوسکتا ہے کہ عین شادی کے وقت لڑکی بدل گئی ہو...... چہ چہ...... دھوکا ہو گیا میرے ساتھ۔" انہوں نے افسوس بھرے انداز میں کہا اور الفت آرا نے گھبرا کر اپنا داہنا ہاتھ ان کے سامنے بڑھاتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"کوئی دھوکا نہیں ہوا آپ کے ساتھ...... میں الفت آرا ہی ہوں...... میرے ماں، باپ دھوکے باز تھوڑا ہی ہیں...... یہ دیکھیں میری انگلی میں وہی انگوٹھی ہے جو آپ کی اماں منگنی پر پہنا کے گئی تھیں۔" اعجاز احمد نے محبت سے ان کا بڑھا ہوا حنائی ہاتھ تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے آہستہ سے گھونگٹ اٹھایا اور بولے۔

"ماشاء اللہ...... آپ تو وہی ہیں...... مجھے یقین آ گیا۔" پھر ان کی انگلی میں نیلم کی انگوٹھی پہناتے ہوئے بولے۔

"یہ انگوٹھی ہمیشہ اپنی انگلی میں میرے یقین اور میری محبت کی نشانی سمجھ کے پہنے رہیے گا جو آج سے میں نے آپ کے نام کیا۔"

انہوں نے شرما کے سر جھکا دیا۔

وہی مسکراہٹ پھر سے ان کے لبوں پر پھیل گئی...... آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے خود بخود باہر نکل آئے...... ایک ٹھنڈی سانس بھر کے وہ جیولری بکس بند کرنے لگی تھیں کہ ان کی نظر دو خوب صورت جڑاؤ کنگن پر پڑی۔ انہوں نے بے ساختہ وہ کنگن اٹھا لیے۔ یہ کنگن ان کی اماں جان کے تھے۔

برسوں پہلے جب ان کا رشتہ اعجاز احمد سے طے ہوا تھا اور گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں، ایک دن صبح ہی صبح ان کی اماں نے انہیں اپنے پاس بلایا، وہ اپنا صندوقچہ کھولے بیٹھی تھیں...... الفت آرا اماں کے پاس جا کے بیٹھ گئیں۔ اماں نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

"یہ دیکھیں!" انہوں نے اپنا ہاتھ آگے کیا...... ان کی ہتھیلی پر دو خوب صورت جڑاؤ کنگن رکھے ہوئے تھے۔ الفت آرا چونک اٹھیں۔

"اماں یہ تو آپ کے کنگن ہیں...... وہی جو نانا آپ کی شادی کے وقت لکھنؤ سے لائے تھے۔"

"ہاں یہ وہی کنگن ہیں...... اب میں نے آپ کے زیورات کے ساتھ رکھ دیے ہیں۔ ذرا پہن کے تو دکھائیں۔" اماں مسکرائیں۔

"لیکن اماں یہ تو آپ کے ہیں...... نانا ابا کی نشانی...... آپ کو تو اپنے زیورات میں یہ سب سے زیادہ پسند ہیں۔" وہ جھجکی۔

"آپ بھی تو ہماری بہت پیاری بیٹی ہیں...... اب آپ...... دوسرے گھر جا رہی ہیں وہاں آپ کو اپنے خاندان کا نام اونچا رکھنا ہے۔ سب کے دلوں میں اپنی جگہ بنانی ہے...... بڑی ذمے داریاں پڑنے والی ہیں آپ پر...... سب کو نبھانا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولیں۔

"اماں یہ سب کچھ کیسے ہو پائے گا......؟" الفت آرا گھبرا گئیں۔

"نیت صاف اور حوصلہ بلند رکھنا ہوگا...... باقی وقت خود بخود سکھاتا رہے گا اور آپ سیکھتی رہیں گی۔" اماں نے انہیں گلے سے لگا کر کہا...... الفت آرا نے آنکھیں بند کر کے ماں کے لمس کو محسوس کیا...... ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

ان کے زیورات کے ڈبے میں وہ بالیاں بھی تھیں جو اُن کے ابا ان کے قرآن پاک ختم کرنے کے موقع پر لائے تھے۔ انہوں نے ان بالیوں کو ہتھیلی پر رکھ کے بغور دیکھا...... پرانی وضع کی وزنی بالیوں میں انہیں ابا کا چہرہ مسکراتا ہوا دکھائی دیا اور ان کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

وقاص کی پیدائش پر اعجاز احمد کی طرف سے ملنے والا بریسلیٹ، شادی کی پہلی سالگرہ پر ملنے والی چین اور کتنی یادیں اس ڈبے میں سے جھانک رہی تھیں۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر ڈبا بند کر دیا...... جیسے ماضی کی کھڑکیوں کو بند کر کے چھن چھن اندر آنے والی یادوں کا راستہ بند کر دیا ہو۔

☆☆☆

اگلی صبح ناشتے کی میز پر تینوں بہوؤں عائزہ، ثمن اور ارم کے منہ پھولے ہوئے تھے...... تینوں بھائی بھی کسی سوچ میں گم نظر آ رہے تھے...... اماں نے باری باری سب کے چہروں کو بغور دیکھا۔

"کیا بات ہے...... آج کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خاموشی ہے......؟" ساری رات جاگے رہنے اور رونے کی وجہ سے متورم تو ان کی اپنی آنکھیں بھی تھیں مگر شاید کسی نے ان کے چہرے پر غور نہیں کیا تھا۔

"سب ٹھیک ہے اماں۔" وقاص نے چونک کر کہا۔ عائزہ منہ بنا کے دوسری طرف دیکھنے لگی، اس کی یہ حرکت الفت آرا کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہی۔

عائزہ ان کی سب سے بڑی بہو تھی...... انہوں نے اس کے ہمراہ بیس برس گزار دیے تھے۔ وہ تیز مزاج تھی...... الفت آرا نے اس کا مزاج سمجھتے ہوئے اسے بڑے تحمل کے ساتھ ہینڈل کیا تھا کہ اتنے برسوں میں کوئی بڑی بدمزگی نہ ہو پائی تھی۔ مجھلی بہو ثمن کی فطرت میں لالچ بہت زیادہ تھا...... وہ حیلے بہانے سے ان سے بڑی، بڑی رقم اینٹھتی رہتی تھی...... وہ خاموشی سے اس کا ہر مطالبہ پورا کر دیتیں...... ارم کی طبیعت میں بچپنا اور لاابالی پن تھا...... وہ اس کے ساتھ زیادہ نہیں رہی تھیں اس لیے وہ جب آتی اسے مہمانوں ہی کی طرح ٹریٹ کیا جاتا...... کچھ بھی تھا اعجاز احمد ان کی طاقت تھے ان کے جانے کے بعد وہ خود کو غیر محفوظ اور کمزور سمجھنے لگی تھیں۔ ان کے ہوتے ہوئے وہ بڑے سے بڑا معاملہ بہ آسانی سنبھال لیتی تھیں مگر اب بہوؤں کے

تیور انہیں ڈرا رہے تھے اور بیٹوں کی پُراسرار خاموشی دہلا رہی تھی...... خاموشی وقاص کے جملے سے ٹوٹی۔

"اماں میں چاہ رہا تھا کہ شہاب کی موجودگی ہی میں ابا کے کاروبار اور جائیداد کے معاملات کا تصفیہ ہو جائے۔" انہوں نے چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا۔

"آج شام میں نے وکیل صاحب کو گھر پر بلوایا ہے، آپ اسما اور حسنہ کو بھی بلا لیں تاکہ سب کی موجودگی میں وراثت کے معاملات طے ہو جائیں۔"

انہوں نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

"یہ بھلا کیا بات ہوئی...... کاروبار میں سب کا حصہ اور وہ بھی اس انداز میں کہ فوری طور پر کاروبار کی تقسیم نہیں ہو سکتی بلکہ ہر ماہ منافع سب کے حصے میں آئے گا...... باقی کی ساری پراپرٹی اور یہ گھر اماں کے نام...... ہم تو خالی کے خالی ہاتھ ہی رہ گئے۔"

ارم پر ڈپریشن کا شدید حملہ ہو رہا تھا۔ وہ بے چینی سے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہی تھی...... شہاب کرسی پر سر پکڑے بیٹھا تھا۔

"آپ کچھ بولتے کیوں نہیں ہیں۔" وہ چڑ کے اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"کیا بولوں، میں پہلے ہی پریشان ہوں میرا دماغ اور مت خراب کرو......"

"بڑی زیادتی ہو گئی ہے ہمارے ساتھ...... باقی تو سب یہاں عیش کر رہے ہیں ہم تو پردیس کی خاک چھان رہے ہیں، کیا، کیا سوچا تھا میں نے...... کچھ ہاتھ آئے گا تو ذرا کھل کے سانس لوں گی۔" وہ خفگی سے بولی۔

"بات ویسے غلط بھی نہیں، ابا کے کاروبار کی تقسیم ہو گی تو ہر ایک کے ہاتھ زیادہ نہیں آئے گا پھر چلتا ہوا بزنس ٹوٹنے کے بعد منافع بھی بہت کم ہو جائے گا، ہم تو ویسے بھی یہاں نہیں رہتے بس تھوڑی بہت رقم ہی ہاتھ آئے گی...... تو بہتر ہے کہ کچھ عرصہ منافع پر گزارہ کر لیا جائے۔" شہاب نے بیوی کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"یہی تو مصیبت ہے کہ ہم یہاں نہیں رہتے...... جو لوگ یہاں رہتے ہیں فائدے تو ان کے ہی ہیں، بڑے سے گھر میں رہتے ہیں، کھل کے کھاتے پیتے ہیں اور کاروبار بھی دونوں بھائیوں کے قبضے میں ہے...... ہائے...... میں نے سوچا تھا کہ ڈھیر سارے روپے ملیں گے تو ہم اپنا فلیٹ چھوڑ کے کوئی اچھا سا گھر لے لیں گے...... تھک گئی ہوں میں بیسویں منزل کے تین کمروں کے فلیٹ میں رہتے، رہتے......" وہ بیزاری سے بولی۔

"بس تھوڑا انتظار کر لو...... ہو سکتا ہے اماں پراپرٹی کی ہی فروخت کروا دیں...... اور وہ کیا کریں گی اس کا...... امید ہے کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا۔" شہاب نے پھر تسلی دی۔

ارم منہ سے کچھ نہیں بولی...... بس خاموشی سے بیٹھی خلا میں گھورتی رہی۔

☆☆☆

"جان کھپائیں آپ اور وقاص بھائی...... اور کاروبار کا منافع سب کو ملے گا...... یہ کہاں کا انصاف ہے بھئی۔" ثمن تنک کر بولی۔

"بس کمرے میں داخل ہونے کی دیر ہو اور تم شروع ہو جایا کرو......" وہاب جھنجلایا۔

"تو کیا غلط کہہ رہی ہوں...... ارے آپ دونوں کی محنت سے کاروبار پھل پھول رہا ہے تو صلہ بھی تو زیادہ ملنا چاہیے۔" وہ شوہر کے برابر بیٹھتے ہوئی بولی۔

"کاروبار تو ابا کی محبت سے پھلا پھولا...... ایک دکان سے تین ڈپارٹمنٹل اسٹور بنے۔ ہم لوگ تو محض ان کو چلانے والے ہیں اور وہ بھی چند سالوں سے...... ہم دونوں کے لیے ابا جان نے منافع کے علاوہ اچھی بھلی بھاری بھرکم تنخواہ بھی مقرر

کروی تھی۔ کم تو نہیں ہے یہ سب، شکر ادا کرو۔‘‘
’’تنخواہ...... ہنہ!‘‘ وہ منہ چڑا کے بولی۔
وہاب سر جھٹکتا ہوا اٹھا اور باتھ روم میں گھس گیا۔
’’ان مردوں کی سمجھ آخر اتنی مختصر کیوں ہوتی ہے...... کاروبار چلا لیں گے مگر ایسے نازک معاملات کی باریکیاں سمجھ ہی نہیں پاتے...... اپنے بچوں کا مستقبل نظر ہی نہیں آتا...... آخر کب تک ہم ایسے ہی پڑے رہیں گے۔‘‘ ثمن منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور غصے میں دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔

☆☆☆

’’بڑی خوش نصیب ہیں اماں...... ابا نے شادی کے صرف سولہ برسوں کے بعد انہیں یہ گھر دیا تھا جس کی وہ بلاشرکت غیرے مالک تھیں...... خوب راج کیا انہوں نے یہاں...... میں تو سمجھتی تھی کہ گھر ہوگا تو ابا کے نام ہی مگر آج پتا چلا یہ گھر اماں کے نام ہے...... بڑا دل تھا سسر صاحب کا......‘‘ عائزہ کے لہجے میں تعریف تھی یا طنز...... وقاص فوری طور پر سمجھ نہیں پایا۔
’’اماں نے پندرہ برسوں تک ساس سسر کی بلکہ ساری سسرال کی دل و جان سے خدمت کی...... پھر تایا ابو نے اپنا گھر لے لیا...... وہ الگ ہو گئے، چھوٹے چچا ملک سے باہر چلے گئے...... ابا نے جب یہ گھر بنوانے کا آغاز کیا تو ان کے پاس اس وقت بہت زیادہ پیسے نہیں تھے...... کاروبار میں کافی بہتری تو آ گئی تھی مگر یک مشت بڑی رقم نکالنا ممکن نہیں تھا اس لیے یہ گھر دھیرے، دھیرے تکمیل کے مرحلے طے کر رہا تھا...... اسی دوران دادا، دادی کا انتقال ہو گیا...... پھر یہ گھر مکمل ہوا اور اماں، ابا ہم سب کو لے کر یہاں آ گئے...... مجھے میرا ددھیالی گھر یاد ہے...... وہ بہت زیادہ بڑا نہیں تھا...... جب ہم لوگ وہاں سے یہاں آئے تو ایسا لگا جیسے جنت میں آ گئے ہوں۔‘‘ وقاص ایک دم ماضی میں کھو گیا۔

’’اچھی رہیں اماں...... ہم تو شادی کے بیس برس بعد بھی اتنے خوش نصیب نہیں ہو سکے کہ ہمارے نام بھی کوئی گھر خریدا جائے اور اس کے ماتھے پر ہمارا نام جگمگائے۔‘‘ عائزہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔
’’تم مجھے طعنہ دے رہی ہو......؟‘‘ وقاص نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
’’طعنے کی کیا بات ہے...... ہر مرد ابا کی طرح تھوڑا ہی سوچتا ہے۔ بیویوں کے نام جائیداد کرنے والوں کا بڑا حوصلہ ہوتا ہے۔‘‘ عائزہ نے جلتی پر تیل چھڑکا۔
’’میں نے تو فی الحال اپنے ہی لیے کوئی جائیداد نہیں بنائی...... تمہاری شکایت میری سمجھ سے باہر ہے۔‘‘ وقاص آہستہ سے بولا۔
’’نہیں بنائی تو کیوں نہیں بنائی، کس نے روکا ہے آپ کو......؟ کیا ساری عمر ہم اسی طرح تین کمروں میں اپنے بچوں کے لیے بیٹھے رہیں گے......؟ ماشاء اللہ پانچ بچے، سب جوانی کی سرحدوں پر پہنچ چکے ہیں۔ کل کلاں کو سب کی شادی بیاہ ہونی ہے ایسے کس طرح کام چلے گا۔‘‘ عائزہ نے جلدی سے کہا۔
’’وقت آئے گا تو سب ہو جائے گا۔‘‘ وقاص نے بیوی کو تسلی دی۔
’’اب اور کون سا وقت آئے گا...... میں تو سمجھ رہی تھی کہ اب ہمارا اپنا گھر بھی ہو جائے...... لیکن......‘‘ وہ کہتے، کہتے چپ ہو گئی۔
’’عائزہ اس گھر میں بھی کیا برائی ہے، اتنا بڑا اور آرام دہ گھر ہے۔‘‘ وقاص نے کہا۔
’’آپ تو سارا دن باہر رہتے ہیں رات میں گھر آ کے بیڈ پکڑ لیتے ہیں...... آپ کو کیا معلوم جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہنا اتنا آسان نہیں ہے گھر میں اماں کا حکم چلتا ہے...... شہاب، حسنہ اور اسما کے تین کمروں کو پکا لاک رکھا جاتا ہے کہ وہی آئیں

گے تو کھلے گا...... تین کمرے وہاب اور ثمن کے، ایک اماں کا...... اب وہاب اور ثمن کے تو تین بچے ہیں...... دونوں لڑکیاں ایک میں اور بیٹا ٹھاٹ سے الگ ایک میں رہتا ہے۔ ایک ان دونوں میاں، بیوی کا ہے...... ہمارے ماشاء اللہ چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے...... ان بے چاروں کو کس قدر دشواری ہو جاتی ہے دو کمروں میں آپ کو کیا معلوم...... اماں سے اتنا کہا کہ حسنہ اور اسما کے کمرے بچوں کو دے دیں، جب وہ لوگ رہنے آئیں گی تو بچے خالی کر دیں گے مگر وہ نہ مانیں...... اب سال میں ایک دو دفعہ دو تین دن کے لیے آنے والوں کا تو اتنا خیال ہے اور یہاں مستقل رہنے والوں کی تکلیف کا کچھ اندازہ نہیں......؟‘‘ عائزہ جیسے پھٹ پڑی۔
’’اماں کا دل بیٹیوں کے لیے بہت حساس ہے، تم اس کا مقابلہ کسی چیز سے مت کرو۔‘‘ وقاص نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔
’’وقاص ویسے بھی یہ گھر اب بہت پرانا اور آؤٹ ڈیٹڈ ہو گیا ہے، اب آج کل تو اتنے خوب صورت گھر بن رہے ہیں کہ میں آپ کو کیا بتاؤں...... آپ نے بھی دیکھا تو ہوگا فائزہ نے جو نیا گھر لیا ہے...... وہ بھی ہزار گز کا ہے...... پورا محل لگتا ہے۔‘‘ عائزہ نے جلدی سے اپنی بہن کا حوالہ دیا۔
’’جو چیز بھی نئی ہوتی ہے، ایک دن پرانی ہو جاتی ہے...... یہ گھر بھی جب نیا تھا تو بہت شاندار لگتا تھا۔ لوگ دور دور سے ہمارے گھر کی تعریف سن کے اسے دیکھنے آتے تھے...... آج تم منہ بنا کے اسے پرانا اور آؤٹ ڈیٹڈ قرار دے رہی ہو۔ ہر چیز فنا ہونے ہی کے لیے وجود پاتی ہے...... بس رہے نام اللہ کا۔‘‘ وقاص نے کسی سادھو کی طرح ہانک لگائی۔
’’آپ شاید اس وقت ناسٹلجک (nostalgic) ہو رہے ہیں...... ماضی آپ کے دماغ پر مسلسل سوار ہے...... بعد میں بات کریں

کے بس یہ ذہن میں رکھیں مجھے میرا گھر چاہیے۔" عائزہ نے حتمی انداز میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

☆☆☆

پچھلی کئی راتوں کی طرح اس رات بھی نیند ان کی آنکھوں سے دور تھی۔ وہ ٹیرس پہ رکھی ہوئی کرسی پر خاموشی سے بیٹھی اس چودھویں کے چاند کو دیکھ رہی تھیں جو کبھی ظاہر ہوتا کبھی بادلوں میں چھپ جاتا۔

ان کے سامنے رکھی ہوئی کرسی خالی تھی...... ان کا اور اعجاز صاحب کا معمول تھا کہ ہر رات سونے سے پہلے کچھ دیر یہاں ضرور بیٹھتے تھے...... یہاں تک کہ بیماری کے ایام میں بھی جب تک وہ چلنے پھرنے کے قابل تھے انہوں نے یہاں بیٹھنا نہیں چھوڑا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں یہاں بہت سکون ملتا ہے...... خود الفت کا بھی یہی خیال تھا...... یہاں بیٹھ کر وہ دونوں نہ جانے کہاں، کہاں کی باتیں کیا کرتے تھے، کبھی پرانے قصے تو کبھی مستقبل کی باتیں......

"ہم کتنے خوش نصیب ہیں الفت...... اللہ نے ہمیں کس قدر نوازا ہے...... اور جو سب سے بڑی نعمت ہمیں ملی ہے وہ ہے ہماری اولاد......" اعجاز احمد کی آواز کی بازگشت ان کے کانوں میں گونجی......

"میں انہیں دیکھ، دیکھ کر جیتا ہوں، تمہیں پتا ہے میں نے اتنا بڑا گھر کیوں بنوایا...... جس میں بہت سارے کمرے ہیں۔" انہوں نے پوچھا۔

"کیوں......؟" الفت کی آواز ابھری۔

"تاکہ میرے سارے بچے مل جل کے ہنسی خوشی یہاں اپنے بچوں کے ساتھ رہیں...... اور ہاں میری بیٹیاں بھلے رخصت ہو جائیں، ان کے لیے کمرے آپ کو ہمیشہ مخصوص رکھنے ہوں گے۔" بیٹیوں کی رخصتی کے ذکر سے ان کا لہجہ پُرنم ہو گیا تھا۔

"کتنا اچھا لگے گا جب یہ گھر بیٹوں، بیٹیوں، بہوؤں، دامادوں، پوتے، پوتیوں اور نواسے، نواسیوں سے بھر جائے گا...... تب میں اور آپ اپنے خاندان کو پھلتے پھولتے دیکھ کر کتنا خوش ہوں گے ہمارا اصل اثاثہ تو یہی لوگ ہیں......" ان کی آواز کی بازگشت آہستہ، آہستہ معدوم ہوتی چلی گئی...... الفت آرا کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

"پتا نہیں گھر بھرا ہونے کے بعد بھی خالی کیوں لگتا ہے؟" انہوں نے خود سے پوچھا۔

☆☆☆

"یہ عائزہ بھابی آج کل اتنے پھولے ہوئے منہ کے ساتھ گھومتی کیوں دکھائی دے رہی ہیں، سیدھے منہ بات ہی نہیں کر رہی ہیں۔" ارم نے ثمن سے سرگوشی کی۔

"پتا نہیں...... تم لوگ تو چند دنوں کے لیے آتے ہو، اس لیے ان کی چار روزہ مسکراہٹ سے مستفید ہو کے چلے جاتے ہو، ہم تو ساتھ رہتے ہیں اور میں عادی ہوں ان کے اس قسم کے انداز دیکھنے کی۔" ثمن نے کندھے اچکائے۔

"ویسے بڑی ہوپ لیس سچویشن ہے...... میں تو سمجھتی تھی کہ معاملات آرام سے سلجھ جائیں گے مگر یہاں تو......" ارم نے آدھی انگریزی اور آدھی اردو میں بھویں اچکا کر بیزاری سے کہا۔

"تم کیا، میں خود یہی سمجھ رہی تھی...... تمہارا شوہر تو کاروبار سے الگ ہے، میرے میاں کو دیکھو، ساری ذمے داریاں اٹھانے کے بعد بھی دودھ پیتے بچے کی طرح سے بی ہیو کر رہے ہیں...... میں کیا کروں مجھے کیا معلوم...... ہونہہ......" ثمن چڑ کے بولی۔

"کاروبار تو ایک طرف...... اب تو گھر بھی نہیں بک سکتا...... اس کے لیے بھی اماں کے گزرنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔" ارم سنگدلی سے بولی۔

"میں تو خود تھک گئی ہوں جوائنٹ فیملی کی ذمے داریاں نبھاتے، نبھاتے...... نندوں کی اور دوسرے مہمانوں کی آمد و رفت برداشت کرو

عائزہ بھابی کے ہمہ وقت پھولے ہوئے منہ کے ساتھ گزارہ کرو...... اور اماں کے لیے لیکچرز سنتے رہو...... اب تو دل آزادی مانگتا ہے مگر ہنوز دلی دور است......" ثمن نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

"بھابی...... آپ وہاب بھائی سے کہیں ناں...... ابھی کاروبار الگ نہیں ہو سکتا...... تو باقی ماندہ پراپرٹی ہی کا کچھ تصفیہ کروا دیں...... میں یہاں سے خالی ہاتھ جانا نہیں چاہتی ہوں۔" ارم نے لجاجت سے کہا۔

"جیسے وہاب میری ہی تو سنتے ہیں...... کتنی بار تو کہہ چکی ہوں۔ سمجھ میں کوئی بات ہی نہیں آ رہی ہے موصوف کے...... سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں...... ذرا اماں کو تو دیکھو کیسے منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھی ہیں...... اور کچھ نہیں تو کم سے کم اپنے زیورات کا ہی فیصلہ کر دیتیں۔" ثمن جیسے پھٹ پڑی۔

"صحیح کہہ رہی ہیں بھابی آپ...... ان کے پاس تو لاکھوں کا سونا ہوگا۔" ارم نے چونک کر کہا۔

"تو اور کیا...... بالکل صحیح تو مجھے بھی نہیں پتا مگر ایک بار دونوں نندوں کو کھسر پھسر کرتے سنا تھا...... بیٹیوں کو سب معلوم ہے۔" ثمن چڑ کے بولی۔

"اور وہی دونوں لے اُڑیں گی سب کچھ، ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔" ارم جلدی سے بولی۔

"ارے، ایسے کیسے لے اڑیں گی۔" ثمن نے آنکھیں گھمائیں۔

"اماں کو چاہیے کہ اپنی زندگی میں جس کو جو دینا ہو دے دیں، بعد میں تو افراتفری ہی مچے گی۔" ارم نے کہا۔

"افراتفری کیوں مچے گی؟ اس پر بھی شرعی وارثت لاگو کریں گے ناں ان کے ایماندار بیٹے۔" ثمن نے کندھے اچکا کر طنز سے کہا۔

"بالکل...... جو نظر آئے گا اس پر شرعی وارثت لاگو ہوگی ناں اور جو اندر ہی اندر غائب ہو جائے گا اس کا کیا کریں گی آپ؟" ارم جلدی سے بولی۔

"اماں کو کچھ ہوگا تو سب سے پہلے میں ان کی الماری کی چابی ہی غائب کروں گی۔ پھر بولو کیا کریں گی بیٹیاں......؟" ثمن نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"واہ بھابی جینیئس ہیں آپ...... مگر مجھے نہ بھولیے گا...... میرا حصہ مجھے ہی دیجیے گا۔" ارم نے ہنس کے کہا اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

☆☆☆

"گھر کا ماحول کچھ عجیب سا نہیں لگ رہا......؟ تینوں بھابیاں عجیب سا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔" اسما نے حسنہ کے کان میں سرگوشی کی۔

"عائزہ تو شروع ہی سے عجیب و غریب ہیں وہ تو اماں ہی نے بڑی عقل مندی سے انہیں قابو کیے رکھا، ہاں البتہ ارم اور ثمن واقعی بہت اکھڑی، اکھڑی ہیں۔" حسنہ نے جواب دیا۔

"نہ جانے کیا چل رہا ہے...... ایک تو ہماری اماں اتنی سیدھی ہیں کہ انہیں کوئی خبر ہی نہیں ہوتی ان کی بہویں کون سی کھچڑی پکا کے بگھار لگا دیں۔" اسما خفگی سے بولی۔

"یہ تو ہے...... اماں کی سادگی ہے یا مصلحت...... وہ گھر میں جو کچھ بھی چل رہا ہوتا ہے ہمیں تک نہیں بتاتیں......" حسنہ نے سر ہلایا۔

"لیکن اب حالات دوسرے ہیں، ابا رہے نہیں...... کروڑوں کا کاروبار اب بھائیوں کے ہاتھوں میں ہے اور بھائیوں کی چابیاں بھابیوں کے قبضے میں ہیں۔" اسما نے جلدی سے کہا۔

"لیکن کچھ بھی ہو...... یہ لوگ کاروبار اور جائداد پہ قبضہ تو کر نہیں سکتے...... ابا نے ایک بار بیماری کے دنوں میں بتایا تھا کہ ان کے بعد یہ سب کچھ سارے بہن بھائیوں میں تقسیم ہو جائے گا۔" حسنہ نے اسما کو تسلی دی۔

"لیکن آپا، آپ اماں کو سمجھائیں...... مجھے کچھ

اندازہ ہے وہ عائزہ اور ثمن بھابی کے مانگنے پر بڑی، بڑی رقوم یونہی ان کے ہاتھوں پہ خاموشی سے رکھ دیتی ہیں...... وہ بھلا کس گنتی میں ڈالے جائیں گے......؟‘‘ اسمانے کمرے کے کھلے دروازے سے لاؤنج میں دیکھتے ہوئے کہا جہاں ثمن آکے بیٹھتی ہوئی دکھائی دی۔

’’اچھی طرح جانتی ہوں سب...... بس دعا کرو کہ سارے معاملات خوش اسلوبی سے جلد از جلد طے ہو جائیں اور کسی کی حق تلفی نہیں ہو۔‘‘ حسنہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

’’مجھے تو تشویش اس بات کی بھی ہے کہ یہ تینوں مل کے اماں کے زیورات نہ ہتھیالیں۔‘‘ اسما نے سرگوشی کی۔

’’خیر اب اماں اتنی ناسمجھ بھی نہیں ہیں کہ اپنے لاکھوں کے زیورات بہوؤں میں لٹا دیں۔‘‘ حسنہ چمک کے بولی۔

’’یہ اماں ہیں کہاں...... اپنے کمرے میں بھی نہیں تھیں۔‘‘ اسما کو کچھ یاد آیا۔

’’نیچے گئی ہوں گی...... چلو ہم بھی وہیں چلتے ہیں۔‘‘ حسنہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

’’اماں کو اس عمر میں چین نہیں ہے، ہر وقت گھر کی اور سب کی فکر کرتی رہتی ہیں۔‘‘ اسما نے کہا۔

’’اماں کی عادت ہے ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی...... ابا نے ان کی آسائی کے لیے کتنے ملازم رکھ دیے تھے مگر وہ باز نہ آتیں...... کچھ خود کرتی رہیں کچھ ملازمین سے کرواتی رہیں...... ان کی بہوؤں کو تو آج تک گھر سنبھالنا نہیں آیا۔‘‘ حسنہ بیزاری سے بولی۔ دونوں ثمن پہ ایک نگاہِ غلط ڈال کر زینے کی طرف بڑھنے لگیں۔

☆☆☆

’’اماں آپ ہٹیں...... میں بنا دیتی ہوں آپ کا سوپ......‘‘ عائزہ کے لہجے میں بیزاری تھی، طنز تھا یا خلوص...... الفت آرا فوری طور پر سمجھ نہ پائیں۔

’’نہیں، آج میرا دل چاہ رہا ہے کچھ کرنے کا...... مجھے کرنے دو۔‘‘ انہوں نے جواب دیا۔

’’بھئی آپ لوگ کیوں گھسی ہیں کچن میں...... ریاض کہاں چلا گیا......؟‘‘ ارم نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے چاروں طرف دیکھ کر کہا...... وہ اپنے کسی کام سے آئی تھی۔

’’گھسنا تو پڑتا ہی ہے کچن میں...... سب کچھ ملازموں پر تو چھوڑا نہیں جا سکتا ناں......‘‘ عائزہ نے موقع غنیمت جان کر ارم کو جتایا جو جب بھی پاکستان آتی تھی ہمیشہ خود کو مہمان سمجھ کے الگ تھلگ رہتی تھی...... ارم نے جیٹھانی کے اس طنز کا کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور جو کرنے آئی تھی وہ کر کے نکل گئی۔ اس کے نکلتے ہی اسما اور حسنہ اندر داخل ہوئیں۔

’’اماں آپ یہاں ہیں۔‘‘ حسنہ انہیں چولہے کے پاس کھڑا دیکھ کر چونکی۔

’’وہ بس بیٹا دل گھبرا رہا تھا...... سوچا تم سب کے لیے سوپ ہی بنا لوں۔‘‘ وہ مسکرائیں۔

’’اچھا چلیں، کمرے میں آئیں...... بن جائے گا سوپ بھی، خواہ مخواہ یہاں آکر کھڑی ہو گئی ہیں۔‘‘ اسما نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

عائزہ نے کن انکھیوں سے ماں بیٹیوں کو دیکھا اور منہ بنا کے کچن سے نکل گئی۔

الفت آرا کی نگاہوں سے عائزہ کے چہرے کے بگڑے زاویے چھپے نہیں رہ سکے۔

’’تم لوگ چلو میں آرہی ہوں بس تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔‘‘ انہوں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ حسنہ نے ایک طائرانہ نگاہ کچن میں دوڑائی۔

’’یہی کچن تھا...... یہی چولہا...... جہاں میں نے کھانا پکانا سیکھا...... اماں آپ بہت سخت تھیں اس معاملے میں کہ چاہے ملازم ہوں یا نہیں ہوں لڑکیوں کو کھانا پکانا آنا ہی چاہیے......‘‘ حسنہ نے یادوں کے در کھولے۔

’’آپ تو پھر بھی اچھی رہیں آپا کہ آپ کے گھر میں پرانے دھرانے ایک آدھ ملازم موجود تھے...... مصیبت تو میری ہے...... فل ٹائم نوکر افورڈ نہیں کر سکتے...... دو تین گھنٹے والی ماسیوں سے کام چلانا پڑتا ہے اور وہ بھی ان کے سو، سو نخرے اٹھا کے...... اور کھانا تو بہر صورت پکانا ہی پڑتا ہے۔‘‘ اسما نے ٹھنڈی سانس بھری۔

’’جوائنٹ فیملی سسٹم میں جہاں کچھ برائیاں ہیں وہاں کچھ فائدے بھی ہیں...... ہماری ساس کے زمانے کے ملازمین آج تک کام چلا رہے ہیں...... سب اکٹھے رہتے ہیں، کام زیادہ ہوتا ہے تو مل جل کے ہو ہی جاتا ہے...... پھر ساس صاحبہ ہیں تو ہم بہوؤں کو بے فکری ہے...... تم علیحدہ رہتی ہو...... اس لیے شروع سے آخر تک کی ذمے داری اکیلے تمہارے اوپر ہے۔‘‘ حسنہ نے کہا۔

’’تم دونوں اللہ کا شکر ادا کرو...... عزت کی خوشحال زندگی گزار رہی ہو...... ماشاء اللہ شوہر اور بچے ہیں...... اپنی، اپنی گرہستی کی مالکائیں ہو...... گھر کی ذمے داریاں، اپنے بچوں کی پرورش اور شوہر کا خیال رکھنا ہی ایک عورت کی زندگی کا حسن ہوتا ہے......‘‘ الفت نے بیٹیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

’’ارے اماں کس دور کی باتیں لے کے بیٹھ گئیں آپ...... ان ہی ساری فضولیات میں عورت اپنی ساری زندگی لگا دیتی ہے...... اور اس خدمت گزاری کے عوض اس کے ہاتھ بھلا کیا آتا ہے......؟ کتنے فیصد شوہر ہیں جو بیویوں کے اس عمل کو سراہتے ہیں......؟ زیادہ تر یہی کہتے ہیں کہ تم کرتی ہی کیا ہو......؟ بچے جوان ہو کے اپنی، اپنی راہ لیتے ہیں...... بیٹیاں اپنے گھروں کو اور بیٹے اپنی بیویوں کو پیارے ہو جاتے ہیں...... اور آخر میں وہ عورت بے چاری اپنے گھٹنوں کے درد، بلڈ پریشر اور شوگر کے ساتھ اکیلی رہ جاتی ہے۔‘‘ اسما تنک کے بولی۔

’’عمر کے آخری حصے میں جوڑوں کا درد... بلڈ پریشر، شوگر اور نظر کی کمزوری نہیں ملے گی تو بھلا اور کیا ملے گا۔‘‘ الفت آرا بے ساختہ مسکرا دیں۔ ’’یہ تو وہ تحفے ہیں جو ہر عورت کے حصے میں آجاتے ہیں خواہ اس نے زندگی بچوں پر لٹا دی ہو یا اپنے پروفیشن پر۔‘‘

’’کم سے کم ایک پروفیشنل عورت کو عزت اور چار پیسے تو نصیب ہو جاتے ہیں کچھ کرنے کا اطمینان تو مل جاتا ہے۔‘‘ اسما نے پھر بحث کی۔

’’جتنی جھاڑیں جس کے نصیب میں ہوں ملتی ہیں، خواہ شوہر سے ملیں، خواہ اپنے باس سے...... جتنا پیسہ جن کے نصیب میں ہو وہ مل جاتا ہے، خواہ وہ شوہر کے گھر میں بیٹھ کے حاصل ہو...... چاہے باہر کی دھول پھانک کر...... جتنی عزت ہو وہ بھی مل جاتی ہے، گھر کے اندر اور گھر کے باہر بھی...... آفس والے بھی تو ریٹائر کر دیتے ہیں، کہتے ہیں بہت، بہت شکریہ اب ہمیں آپ کی ضرورت نہیں رہی......‘‘ وہ مسکرائیں۔

’’آج کی عورت تو ایسا نہیں سوچتی...... وہ تو کچھ کرنے کی لگن رکھتی ہے۔‘‘ اسما نے پھر کہا۔

’’کچھ کرنے کی لگن رکھنا تو بہت اچھی بات ہے...... اور اس کی ابتدا اپنے گھر سے کرلی چاہیے...... اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کرنا اور اس کا درست استعمال کرنا تو بہت اچھی بات ہے...... لیکن اپنی کسی بھی ذمے داری کو حقیر سمجھنا غلط ہے۔‘‘ انہوں نے کہا اسی اثنا ریاض کچن میں داخل ہوا۔

’’ارے بیگم صاحبہ آپ......؟‘‘ وہ گڑبڑا گیا۔

’’چلو بھئی...... سوپ تیار ہو گیا ہے...... باقی کام تم دیکھ لینا۔‘‘ وہ کہتے ہوئے کچن سے باہر نکل آئیں...... حسنہ نے ایک تاسف بھری نگاہ ماں پر ڈالی...... سفید شلوار قمیص پر بڑی سی سفید چادر اوڑھے، خالی کلائیاں اور خالی کان...... چند ہفتوں میں ان کا وجود کس قدر ویران ہو گیا تھا...... ان کے اس دکھ کا مداوا کس کے پاس تھا......؟ ان کے اس

نقصان کی تلافی بھلا کیسے ممکن تھی؟

☆☆☆

''کہاں تو ایک ہفتے کے بعد جانے والے تھے کہاں آج سولھواں دن ہے...... جم کے بیٹھ گئے ہیں آپ کے بھائی بھاوج...... ارادے کیا ہیں ان کے......؟'' عائزہ کچن سے نکل کے جھنجلائی ہوئی بیڈروم میں پہنچی اور نیم دراز وقاص پر گویا چڑھ دوڑی۔

''ہوا کیا ہے تمہیں...... اب کچھ نیا ہوگیا کیا؟'' وہ بیزاری سے بولا۔

''ہاں، آپ تو چھٹی انجوائے کریں...... اور اِدھر میں آپ کے خاندان کی مہمانداری کر کے فنا ہوجاؤں گی۔'' عائزہ جھنجلائی۔

''مثال کے طور پر کون سی مہمانداریاں......؟ تمہیں سوائے ملازموں کو آرڈر دینے اور تھوڑا بہت ان پر نظر رکھنے کے علاوہ اور کون سا کام کرنا پڑ رہا ہے...... پریشان تو ایسے ہورہی ہو جیسے ابھی بیس کلو کی دیگ چڑھا کے آئی ہو۔'' وقاص نے حیرت سے کہا۔

''سو کام نکلتے رہتے ہیں گھر کے کونوں کھدروں سے، آپ کو کیا معلوم؟ اور کیا بات ہوگی، سب لوگ مہمان بن کے بیٹھے رہتے ہیں...... ارم صاحبہ تو اب گھر میں نظر نہیں آتیں، خدا معلوم کہاں گھومنے پھرنے اور شاپنگ میں لگی ہوئی ہیں...... دونوں نندیں، بال بچوں سمیت ہر چوتھے، پانچویں دن آجاتی ہیں...... اور تو اور ثمن بیگم بیماری کا بہانہ کر کے اپنے پورشن میں مقید ہوگئی ہیں...... ہر کام کے پیچھے مجھے ہی دوڑنا پڑتا ہے...... اب مجھ سے نہیں ہوتا سب کچھ...... تھک گئی ہوں میں اور اب میں آرام چاہتی ہوں......'' عائزہ خفگی سے بولی۔

''خیریت تو ہے...... بھری جوانی میں عمر رسیدہ عورتوں والا واویلا......'' وقاص نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا جس پر عائزہ اور زیادہ بھڑک گئی۔

''رہنے دیں یہ چونچلے...... آپ بس یہی کر سکتے ہیں......'' بیوی کی بات پر اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی وہ سیدھا ہوکے بیٹھ گیا۔

''تو تم ہی بتادو مجھے کیا کرنا چاہیے......'' وہ چڑ کے بولا۔

''مجھے الگ گھر لے کے دیں...... چاہے جیسے بھی ہو...... میں اور اب یہاں نہیں رہوں گی......'' وہ بدستور اسی موڈ میں بولی۔

''سرِدست یہ ممکن نہیں...... ابھی تو نہ جائداد کا بٹوارا ہورہا ہے اور نہ ہی میں اس پوزیشن میں ہوں کہ تمہیں الگ گھر لے کر دے سکوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو ٹھیک ہے جس کی جو مرضی کرے...... میں بھی سسرالی خدمتیں کر کر کے عاجز آچکی ہوں بلکہ سے کسی کام کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی اور نہ کوئی ذمے داری لوں گی...... بس میں اور میرے بچے، باقی کسی سے میرا کوئی تعلق نہیں۔'' مارے غصے کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''اماں نے بہنوں کو اس بار کسی ضروری کام سے بلوایا ہے...... وہ پہلے بھی اتنا کہاں آتی تھیں یہ تو بس ابھی ابا کی بیماری اور انتقال کی وجہ سے ان کی آمدورفت بڑھ گئی ہے...... شہاب بھی واپس جانے کا کہہ رہا تھا...... چند دن اور صبر کرلو...... پھر وہی پرانی روٹین واپس آجائے گی۔'' وقاص نے اپنے بگڑے موڈ پر قابو پاتے ہوئے بیوی کی حالت دیکھ کر اسے نرمی سے سمجھایا۔

عائزہ کچھ بھی نہیں بولی بس آنسو پونچھنے لگی۔

''دیکھو میں تو خود بھی چاہتا ہوں کہ یہ سارے معاملات جلد از جلد طے ہوجائیں...... اس سے پہلے کہ سب کے تیور بگڑیں سب کچھ تقسیم ہوجائے تو اچھا ہے...... زر، زمین جائداد بری چیزیں ہیں...... یہ خون کا لحاظ نہیں رکھتیں......'' وقاص کا لہجہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا۔

☆☆☆

کھانے کی میز پر ضرورت سے زیادہ خاموشی تھی...... صرف برتنوں کے رکھنے، اٹھانے کی معمولی آوازیں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر دیتیں اور بس...... الفت آرا بھی میز پر موجود تھیں...... کئی دنوں کے بعد وہ سب کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں ورنہ وہ اپنا کھانا کمرے ہی میں منگوانے لگی تھیں...... انہوں نے ایک طائرانہ نگاہ میز پر ڈالی...... طویل و عریض ڈائننگ ٹیبل پر ان کے تینوں بیٹے، تینوں بہویں اور دونوں بیٹیاں موجود تھیں...... اعجاز احمد کی کرسی خالی تھی...... الفت آرا کی نگاہ بار بار اس خالی کرسی کی طرف اٹھ رہی تھی...... اعجاز احمد اپنے پورے خاندان کو اس میز پر جمع دیکھ کر بے حد خوش ہوا کرتے تھے...... انہوں نے آرڈر پر اتنی بڑی میز بنوائی ہی اس لیے تھی کہ ان کے بیٹے، بہویں، بیٹیاں داماد سب اس میں بہ آسانی سما سکیں...... ان کے جاتے ہی سب کے ہونے کے باوجود رونق چلی گئی تھی...... کم از کم الفت آرا کو تو یہی محسوس ہورہا تھا۔ انہوں نے بہ مشکل چند نوالے کھائے...... اور اٹھتے ہوئے بولیں۔

''تم لوگ کھانے سے فارغ ہوکر لاؤنج میں آجاؤ...... مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

سب نے ایک دوسرے کی طرف حیرانی سے دیکھا...... سب کے دلوں میں عجیب سی دھکڑ پکڑ شروع ہوچکی تھی۔

☆☆☆

الفت آرا ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نظر آرہی تھیں...... ان کی آنکھیں متورم تھیں جیسے روتی رہی ہوں...... چہرے پر سے وہ مخصوص مسکراہٹ غائب تھی جو ہمیشہ ان کے لبوں پر رہتی تھی...... ان کے انداز سے تھکاوٹ جھلک رہی تھی۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں......'' وہ کچھ کہتے، کہتے رکیں۔

''میرا خیال ہے اس سے پہلے کہ میں اپنا فیصلہ سناؤں تم لوگ میری کچھ باتیں سن لو۔'' وہ آہستہ سے بولیں۔

''کہیے اماں...... کیا بات ہے؟'' وقاص نے پریشانی سے ماں کی طرف دیکھا۔

''بہت ساری باتیں انسان کے ذہن میں گردش کرتی رہتی ہیں۔ جسے کہنے کا اکثر موقع ہی نہیں ملتا...... پھر وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور وہ باتیں بے معنی ہوجاتی ہیں...... شاید ایسا کوئی دن اب بہت بعد میں آئے جب تم سب یوں اکٹھا ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے تم لوگ دوبارہ اکٹھا ہو اور اس وقت میں نہ ہوں...... اس لیے میں نے سوچا آج اس موقع کا فائدہ اٹھالوں...... تم سب کو ایک بار غور سے دیکھ لوں...... کچھ اپنے دل کی باتیں تم سے کہہ لوں۔'' وہ رک رک کے بولیں۔

غزل

اُجڑے ہوئے شہر کی سسکیاں، ایسی تھیں صدائیں اس کی بھی
پاگل تھی نہیں، پاگلوں جیسی تھی باتیں اس کی بھی

تاروں بھری شب میں آنکھوں سے موتیوں کا گرنا
گزرتی تھیں کچھ ایسی ہی راتیں اس کی بھی

ساتھ رہیں ہم مل کے سالوں نہیں صدیوں
کچھ ایسی ہی تھیں تمنائیں اس کی بھی

اداس بھرے رستے میں جو ساتھ تھے
آج جو مڑ کے دیکھا تو جدا تھیں راہیں اس کی بھی

ساتھ رہنے کی دعا کی تھی خضر اس نے
تھم گئیں آج سانسیں اس کی بھی

شاعر: محمد امین خضر

مرسلہ: ملیحہ شاہ، اسلام آباد

سب خاموشی سے ان کی طرف متوجہ تھے۔

"میرے بچوں، زندگی کی مصروفیات کبھی، کبھی انسان کو زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیتیں...... بحیثیت ایک ماں ...... میں نے بہت مصروف زندگی گزاری...... تم بچوں کی پیدائش، پرورش پھر تمہاری تعلیم و تربیت تمہاری چھوٹی سے چھوٹی تکلیف میں بھی تڑپ اٹھنا، تم لوگوں کے چھوٹے بڑے مسائل حل کرنا پھر شادی بیاہ، پھر تمہارے بچوں کی پیدائش اور پرورش میں اپنے حصے کے فرائض پورے کرنا......" وہ ذرا دیر کو رکیں...... "مگر مجھے میری ان تمام ذمے داریوں کو پورا کرنے میں تمہارے ابا کا مکمل تعاون حاصل رہا...... الحمد للہ فرائض پورے ہوئے اور تمہارے ابا سرخرو ہو کے اپنی اصل منزل کی طرف روانہ ہوگئے...... ظاہر ہے اب میری باری ہے، میں بھی اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو کے منتظر ہوں کہ کب میرا بلاوا آ جائے...... اب میرے پاس کرنے کو زیادہ نہیں اس لیے سوچنے کو... کچھ زیادہ ہوگیا ہے...... اس سوچنے نے مجھے تھکا دیا ہے...... ذہن میں ہمہ وقت اٹھنے والے خیالات جو ماضی، حال اور مستقبل کے الجھے ہوئے تانوں بانوں کو جوڑے رکھتے ہیں کبھی، کبھی تکلیف دہ بھی ہو جاتے ہیں...... تمہارے ابا کے جانے کے بعد میں نے ماضی، حال، مستقبل کے درمیان اتنے ہچکولے کھائے ہیں کہ سب کچھ گڈ مڈ ہوگیا ہے۔" انہوں نے کچھ دیر توقف اختیار کیا اور بچوں پر ایک نظر ڈال کر دوبارہ اپنی بات شروع کی۔

"ماں، باپ کے لیے اولاد کو پالنا آسان اور خوشگوار ہوتا ہے، اس لیے نہیں کہ یہ واقعی کوئی آسان کام ہے بلکہ اس لیے کہ ماں، باپ یہ کام بہت ہنسی خوشی کر لیتے ہیں، اس میں پیش آنے والی تکالیف کو بھی ہنس کے جھیل لیتے ہیں لیکن اولاد کے لیے ماں، باپ کو سنبھالنا ایک اضافی بوجھ بن جاتا ہے...... انتہائی صبر آزما کام...... بوڑھے، بیمار اور چڑچڑے والدین کی دیکھ بھال اور انہیں خوش رکھنا ایک بہت بڑی آزمائش ہے جو بہ آسانی اس سے گزر جاتا ہے اس کے لیے کتنا بڑا انعام ہے یہ تو وہی جانتا ہے جس نے اولاد کو اپنے والدین کو "اف" تک نہ کہنے کا حکم دیا ہے۔" انہوں نے نظریں چرائے بیٹھے بیٹوں پر ایک نظر ڈالی۔

"تمہارے باپ اپنی بیماری کے آخری ایام میں بہت زیادہ چڑچڑے ہوگئے تھے، تم بیٹوں کو انہیں برداشت کرنا مشکل ہوگیا تھا...... تم اپنی ماں کے پاس آ کر باپ کے غصے کی شکایت کرتے اور بیزاری کا اظہار بھی......"

"اماں جان کیا آپ کو ہم سے کوئی شکایت ہے؟" وقاص نے ان کی اس بات پر پہلو بدل کے جلدی سے کہا۔

"تم لوگوں سے مجھے بھلا کوئی شکایت کیوں ہوگی......؟ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ میں اپنے کسی کام یا کسی ضرورت کے لیے تم لوگوں کی شکل دیکھوں...... ابھی تو میں ہی اس قابل ہوں کہ تم لوگوں کے لیے کچھ کر سکوں...... شکایت تو تب کروں گی جب تم سے کچھ مانگوں اور تم نہ دے سکو۔" وہ ٹھہر ٹھہر کے بولیں۔

"اماں آپ کے اور ابا کے سلسلے میں اگر ہم سے کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو آپ ہمیں معاف کر دیں۔" شہاب اپنی جگہ سے اٹھ کر ماں کے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔

الفت آرا نے بیٹے کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

"یہی تو مشکل ہے...... تم لوگوں کی صورتیں دیکھ کر میں تم لوگوں کی ساری کوتاہیاں ہی بھول جاتی ہوں...... میری اب یہ جو عمر ہے ناں اس عمر میں ماں، باپ بہت زیادہ حساس ہو جاتے ہیں...... انہیں اولاد کی ذرا سی بے اعتنائی کرچی، کرچی کر دیتی ہے...... اور ایک محبت بھری نظر دوبارہ جوڑ دیتی ہے...... پھر کوئی معمولی سی بات دوبارہ بکھیر دیتی ہے...... ٹوٹنے جڑنے کا یہ سلسلہ بہت سخت ہوتا ہے۔ والدین اپنی اولاد سے کبھی، کبھی بدظن ہونے لگتے ہیں اور اولاد بھی والدین سے بیزار ہونے لگتی ہے۔ قصور دونوں میں سے کسی کا نہیں ہوتا...... قصور در حقیقت ان امیدوں کا ہوتا ہے جو دل کی زمین میں کسی خودرو گھاس کی طرح تیزی سے اگتی اور پھلتی پھولتی جاتی ہیں۔ ایک طرف اولاد کو ماں، باپ سے ان کی جائداد میں حصے کی امید ہوتی ہے...... خواہ وہ کروڑوں کا دھن دولت ہو یا ایک چھوٹے سے صندوق میں رکھا وہ سرمایہ جو اکثر والدین چپ چاپ چھپا کے کہیں رکھ دیتے ہیں اور دوسری طرف والدین، اولاد کی جانب سے ملنے والی توجہ اور خدمت کی امید لگائے بیٹھے رہتے ہیں اور نہ ملنے پر اولاد سے ان نوالوں کا حساب لینے بیٹھ جاتے ہیں جو کبھی انہوں نے اپنے منہ کی جگہ اولاد کے منہ میں ڈال دیے تھے۔ دونوں میں سے جس کسی کی امید ٹوٹتی ہے وہی دوسرے سے بدظن ہو جاتا ہے۔"

"اماں آپ سے کسی نے کچھ کہا ہے؟" وہاب نے دونوں بھائیوں کو بغور دیکھتے ہوئے ماں کو مخاطب کیا۔

"کچھ کہنے کے لیے کبھی، کبھی زبان کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں پڑتی بیٹا...... اس کے لیے نگاہیں ہی کافی ہوتی ہیں......" چند گھونٹ پانی کے پی کے وہ دوبارہ بولیں۔

"تمہارے ابا نے یہ گھر بڑی محبت اور چاہت سے بنوایا تھا...... وہ کہا کرتے تھے کہ میں اتنا بڑا اور مضبوط گھر اس لیے بنوا رہا ہوں کہ اس میں میرا سارا خاندان اکٹھا ہو کر ہنسی خوشی آرام سے رہ سکے...... میرے بیٹے اور ان کے بھی بیٹے یہاں آباد ہو سکیں...... میری بیٹیوں کا میکا آباد رہے...... انہوں نے اس گھر کا نام کاشانۂ الفت میرے نام پر رکھا تھا

اس خواہش کے ساتھ کہ یہاں ہمیشہ الفتوں اور محبتوں کا بسیرا رہے...... لیکن اب ہوا کا رخ بدلنے لگا ہے...... جو آہٹیں میں محسوس کر رہی ہوں، وہ مجھے ڈرا رہی ہیں...... میں اس گھر میں عرصے سے رہ رہی ہوں تم سب کے مزاجوں سے واقف ہوں...... اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہاں کیا چل رہا ہے...... جب دلوں کے اندر گنجائش ختم ہو جائے تو نگاہیں بدل جاتی ہیں اور نگاہوں کے بدلتے ہی زبانوں کے کھلنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا...... میں اس گھر کو کاشانۂ الفت سے کاشانۂ نفرت بنتے نہیں دیکھ سکتی۔" انہوں نے حسنہ کو اشارہ کیا...... حسنہ اور اسما خاموشی سے اٹھیں اور ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں...... کچھ دیر کے بعد جب واپس آئیں تو ان کے ہاتھوں میں کچھ فائلیں اور الفت آرا کا بڑا سا جیولری باکس تھا۔

"میں جانتی ہوں تم لوگوں کا اپنا، اپنا کنبہ ہے، اس کی ضروریات ہیں اور ہر ایک کے مسائل بھی ہیں...... تم لوگ حق بجانب ہو کہ اپنی زندگیاں اپنے حساب سے گزارو...... کاروبار کے معاملات تو تم لوگ مجھ سے بہتر سمجھتے ہو البتہ تمہارے والد نے جو کچھ میرے نام کیا تھا وہ سب میں نے تم لوگوں میں تقسیم کر دیا ہے۔" انہوں نے فائلیں وقاص کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس میں اس گھر کی فائل بھی موجود ہے......" وقاص نے ان کے ہاتھ سے فائل لیتے ہوئے ان کی آنکھوں کو دیکھا جو آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

"اماں مگر......" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"کوئی اگر مگر مت کرو...... عائزہ کی خواہش پوری کرو......" وہ اسے فائل تھماتے ہوئے حتمی انداز میں بولیں۔

"اور یہ رہے میرے زیورات...... تم لوگوں کے لیے اس کی قیمت یہ ہے کہ یہ سونا ہے...... مگر میرے لیے یہ صرف یادیں ہیں...... میری یادوں کا

سرمایہ ہے...... آخری عمر میں انسان کے لیے سونا، سونا نہیں رہتا، گھر، گھر نہیں رہتا، صرف یاد بن جاتا ہے۔ یہ یادیں بہت عجیب ہوتی ہیں...... یہ آخری عمر میں چھلاوہ بن کے ڈراتی ہیں تو کبھی آنسو بن کے آنکھوں سے بہنے لگتی ہیں، کبھی سرکس کا جوکر بن کے ہنسانے لگتی ہیں۔'' وہ گلا کھنکھارنے کو رکی تھیں۔

''میرے پاس جو جمع پونجی ہے وہ تم لوگوں سے بڑھ کے نہیں ہے...... یہ سب تمہیں مبارک ہو...... جو بھی کرنا چاہتے ہو کرو...... یہاں تک کہ اب یہ فیصلہ بھی تم کو ہی کرنا ہوگا کہ ماں کی تقسیم کیسے عمل میں لاؤ گے......'' وہ اٹھیں اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں...... وہ سب وہیں بیٹھے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

☆☆☆

''گھر بہت اچھا ہے...... بہت مضبوط کنسٹرکشن ہے...... ڈیزائن بھی اچھا ہے...... بس تھوڑا بہت آج کل کے حساب سے نئی فٹنگز وغیرہ کروانی پڑیں گی، رنگ و روغن ہوگا انشاء اللہ ایک سے ڈیڑھ ماہ میں زبردست صورت نکل آئے گی۔'' بروکر نے خریدار کو صورتِ حال سمجھائی۔

''میں بیوی بچوں سے بھی مشورہ کرلوں......'' خریدار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''بالکل بالکل۔'' وہ سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

''ہاں کردیں جاوید...... اس سے اچھا گھر ہمیں نہیں مل سکتا۔'' عورت نے ٹیرس پر سے نیچے جھانکتے ہوئے بے صبری سے کہا۔

''کتنے سارے پھلوں کے درخت ہیں...... باغیچہ بھی کتنا خوب صورت بنایا ہوا ہے...... البتہ گھاس سوکھ رہی ہے اور پھول مرجھا رہے ہیں...... کوئی بات نہیں ہم آکے ٹھیک کرلیں گے۔'' بڑی لڑکی ایکسائٹڈ ہوکے بولی۔

''تم کیا ٹھیک کرلوگی......؟ چھ مہینے کے بعد تو تمہاری شادی ہے، تم تو یہاں رہو گی ہی نہیں۔'' چھوٹے بھائی نے بہن کو چھیڑا۔

''اُف نہیں پاپا پلیز...... میری شادی کی ڈیٹ آگے بڑھا دیں...... میں کچھ عرصے اس گھر میں رہنا چاہتی ہوں......'' لڑکی جلدی سے بولی۔

''ارے میری لاڈلی کے لیے یہاں ایک کمرا مخصوص ہوگا وہ جب چاہے گی یہاں آکے رہے گی۔ بنانے والے نے بہت دل سے بنایا ہے اس گھر کو اور نام بھی تو دیکھیں کتنا خوب صورت ہے، کاشانہ الفت......'' عورت کی آنکھوں میں ستائش اور لہجے میں خوشی تھی۔

''تمہیں پسند آگیا تو مجھے پسند آگیا...... گھر کی مالکہ تو تمہی ہو...... میں کل ہی بیعانہ دے دوں گا۔'' وہ سارے گھر کو ستائشی انداز میں دیکھتے ہوئے زینے اترنے لگے۔

''ماما یہاں تو کرکٹ کھیلنے کے لیے بہت ساری جگہ ہے......'' ان کا سب سے چھوٹا بیٹا خوش ہوکے بولا۔

''کرکٹ کھیلنا مگر لان خراب مت کرنا۔'' ماں نے محبت سے بیٹے کو دیکھا۔

''جب ہم یہاں آجائیں گے تو میں بہت سارے دوست بنالوں گا پھر ہر روز کرکٹ کھیلوں گا......'' بچہ خوش ہوکے بولا۔

''ارے بابا پریشان کیوں ہوتے ہو...... تم ہی کیا تمہاری آنے والی نسلیں بھی یہاں آرام سے کرکٹ کھیل سکیں گی...... تم دونوں بھائی اپنی، اپنی ٹیم بنالینا اور بلکہ اپنی بہن کو بھی بال بچوں سمیت بلالینا...... پورا ٹورنامنٹ کھیلنا۔'' باپ نے ہنستے ہوئے بیٹے کو گلے لگالیا...... خوشی سے سب کے چہرے دمکے ہوئے تھے۔ آم، چیکو اور ناریل کے پیڑ خاموشی سے کھڑے ان ہنستے ہوئے مگن چہروں کو دیکھ رہے تھے۔



پاکٹ منی

صائمہ سعید

''چلو شاباش جلدی سے اپنا ناشتا ختم کرو۔'' شمیلا کے ہاتھ نہایت تیزی سے لنچ باکسز پیک کررہے تھے، ساتھ ہی بچوں کو جلدی ناشتا کرنے کی ہدایت دیتی اپنے شوہر شہریار صدیقی اور ساس کو بھی ناشتے کا پوچھتی جاتی۔

''پاپا، پاکٹ منی۔'' علی نے پاپا کے سامنے اپنا ننھا سا ہاتھ پھیلایا تو فاطمہ نے بھی اس کی تقلید کی اور اپنے بابا کی طرف معصوم نظروں سے تکنے لگی، شہریار نے پچاس، پچاس روپے دونوں کے ہاتھ میں تھما دیے۔ دلیہ کھاتی دادی نے کچھ کہنا چاہا مگر اپنے

سابقہ تجربات کو یاد کر کے چپ ہی رہیں۔ اسی اثنا میں دین کا ہارن سنائی دیا تو شمیلا دونوں بچوں کو گیٹ تک چھوڑنے گئی۔ بچوں کے جانے کے بعد گھر میں گہرا سکوت چھا گیا، اب دونوں میاں، بیوی قدرے ریلیکس انداز میں ناشتا کر رہے تھے اور ساتھ ہی معمول کی گفتگو بھی جاری تھی۔

''شہر یار، علی کی کلاس پکنک پر جا رہی ہے اس کی ٹیچر نے 800 روپے منگوائے ہیں اور فاطمہ کی کلاس میں کلرز ڈے منایا جا رہا ہے۔ اس کے لیے ریڈ اینڈ وائٹ فراک لینا ہے تو پلیز آپ کچھ پیسے دے کر جایئے گا۔'' چائے کا ایک گھونٹ لے کر شمیلا نے کہا۔

''یار یہ مہینے کے آخر میں اس قسم کے خرچے کچھ سمجھ میں نہیں آتے۔'' شہر یار نے کچھ بدمزگی سے اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔

''ہاں تو میں خود بھی ان آئے روز کے خرچوں سے بہت عاجز ہوں مگر کیا کروں پھر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتی ہوں کہ اچھے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانے کا اتنا خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑے گا۔ ایجوکیشن بھی تو دیکھیے وہاں کی کتنی زبردست ہے ہمارا علی کلاس ٹو میں ہے اور کیسی فرفر انگریزی بولتا ہے۔''

''ہاں، تمہاری اس بات سے تو میں بھی متفق ہوں۔'' شہر یار بولا۔ ''ٹھیک ہے کرتے ہیں کچھ انتظام......'' آفس کے لیے نکلنے سے قبل شہر یار نے ماں جی کے سامنے نہایت تابعداری سے سر جھکایا اور صباحت بیگم نے ہمیشہ کی طرح ڈھیروں دعائیں اور دم درود کر کے بیٹے کو اپنے رب کے حوالے کیا۔ ایک لمبی سانس بھر کر بیٹے کے جانے کے بعد ماں جی گاؤ تکیے کے سہارے اپنے تخت پر نیم دراز ہو گئیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں اب بھی دواؤں کا وہ نسخہ تھا جو وہ بیٹے کو دینا چاہتی تھیں مگر بیٹا اور بہو کی گفتگو کے پیش نظر انہوں نے اپنا یہ ارادہ ملتوی کر دیا...... جانتی تھیں کہ اگر اس وقت دواؤں کا یہ نسخہ بیٹے کو تھمایا تو بہو بیگم کے تیور لازمی طور پر بگڑ جائیں گے، ان کی بوڑھی آنکھوں میں ماضی کے وہ منظر گھوم گئے جب وہ خود کسی گھر کی بہو ہوا کرتی تھیں۔

''ہاہ کیسا پُرسکون زمانہ تھا، ہر چیز میں برکت تھی نہ ہی مہنگائی کا رونا تھا اور نہ ہی اخراجات کے بڑھ جانے کا خدشہ کیونکہ اصل سرپرست گھر کے بزرگ ہوا کرتے تھے۔ اللہ بخشے ساس مرحومہ کو کس طرح سلیقہ مندی سے گھر کا خرچ چلایا کرتی تھیں۔ دور پار کا بھی کوئی عزیز آجاتا تو کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دیا جاتا۔ آج کل کے دور کی طرح تھوڑی کہ صرف خالی چائے یا کولڈ ڈرنک کے گلاس پر ٹرخا دیا جائے۔ وجہ یہ تھی کہ بزرگوں کے دم قدم سے گھر میں برکت ہوا کرتی تھی ہر معاملے میں ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ ظاہر ہے ہر معاملے میں ان کا تجربہ زیادہ تھا۔ آج کل کے دور کی طرح نہیں کہ گھر کے بڑے بزرگ کو اب ایک فالتو شے کی طرح ایک کونے میں ڈال دیا جاتا ہے۔'' ہلکے سے کھٹکے پر ان کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ سامنے بہو نک سک سے تیار کھڑی ہے۔

''اچھا اماں...... میں دراصل سیکنڈ فلور والی میمونہ بھابی کے ساتھ نزدیکی مارکیٹ تک جا رہی ہوں، لان کی زبردست سیل لگی ہوئی ہے اگر آپ کو کچھ چاہیے تو بتا دیں، میں لیتی آؤں گی۔'' انداز سراسر خانہ پُری والا تھا نہ لہجے میں کوئی پیار بھرا اصرار تھا نہ مٹھاس، صباحت بیگم کا سر خود بخود ہی نفی میں ہل گیا۔

''ٹھیک ہے...... اماں پھر میں چلتی ہوں اور ہاں اماں، ماسی بس آنے ہی والی ہوگی اس سے ذرا اپنی نگرانی میں صفائی کروا لیجیے گا ورنہ جب تک سر پر نہ کھڑے رہو، یہ ڈنڈی مار جاتی ہے، ویسے تو میں جلدی واپس آنے کی پوری کوشش کروں گی لیکن پھر بھی اگر دیر ہو جائے تو پلیز بچوں کے یونیفارم وغیرہ بدلوا کر انہیں کھانا کھلا دیجیے گا، ٹھیک ہے اللہ حافظ۔''

☆☆☆

ہمیشہ کی طرح اس ویک اینڈ پر بھی جب شمیلا ماں کے گھر پہنچی تو سارا گھر بھائیں، بھائیں کر رہا تھا۔ شمیلا کی ماں لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ بیٹی کو سامنے پا کر کھل سی اٹھیں۔ انہوں نے بیٹی کو سینے سے لگا کر بھینچ ڈالا خود اسے بھی اپنے وجود میں اک ٹھنڈک سی اترتی محسوس ہوئی۔ واقعی ماں چیز ہی ایسی ہے کہ جسے دیکھ کر اک ٹھنڈے میٹھے چشمے کا سا احساس ہوتا ہے، جب ماں کی خیر خیریت کے بعد اس نے خالی گھر کا سبب دریافت کیا تو پتا چلا کہ دونوں بھابیاں اپنے، اپنے شوہروں اور بچوں سمیت میکے سدھاری ہوئی ہیں...... اسے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی۔

''مگر امی دونوں بھائیوں کے بچوں میں سے کسی ایک کو تو آپ کے پاس رکنا چاہیے تھا...... کم از کم آپ کی بیماری اور تنہائی کے خیال سے ہی سہی۔'' اور ایسا کہتے ہوئے وہ یہ بالکل بھول گئی کہ وہ خود بھی تو اپنی ساس کو تنہا چھوڑ کر آئی ہے۔ بچے اس کے ساتھ ہی آئے تھے اور شوہر آفیشل میٹنگ کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا۔

''ارے بیٹا میں اکیلی کہاں ہوں، یہ ٹی وی دھرا ہے ناں میرے سامنے، بس ایک بٹن دبانے کی دیر ہے، پٹر پٹر بولنے والے دس لوگ حاضر ہو جاتے ہیں۔ جب تک جی چاہے انہیں سنتے اور دیکھتے رہو۔'' بیٹی کی بات سن کر انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مگر پھر بھی امی آپ کو......''

''ارے جانے دے ناں بیٹا۔'' ماں نے اس کی بات کاٹی۔ ''یہ بتا تو ٹھیک تو ہے ناں، تیرے میاں اور ساس کا کیا حال ہے؟''

''ہاں امی اللہ تعالیٰ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے کہ سب بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں اور ہماری ساس کا کیا پوچھتی ہیں مزے میں ہیں، دوا کھانا، سردی، گرمی کے کپڑے سب کچھ بیٹھے بٹھائے ان کے سامنے حاضر ہو جاتا ہے۔'' یہ سب باتیں سن کر شمیلا کی ماں کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا کہ یہ سب کچھ تو انہیں بھی میسر تھا مگر کیا یہ سب کچھ زندگی گزارنے کے لیے کافی تھا۔

''اچھا بس......'' یہ سب سن کر انہوں نے بیٹی کو گھور کر دیکھا۔ ''ساس کے بارے میں اس طرح سے بات کرتے ہیں کیا، میں نے تمہیں یہی سب کچھ سکھا کر بھیجا تھا؟''

''اچھا سوری امی چھوڑیں ناں ان سب باتوں کو...... یہ بتائیں یہ کلر مجھ پر کیسا لگ رہا ہے؟''

''ہاں، ہاں ماشاء اللہ سے بہت پیاری لگ رہی ہو، میری بیٹی تو ہے ہی اتنی اچھی کہ ہر رنگ تجھ پر کھل جاتا ہے۔'' ان کے لہجے میں بھرپور ممتا بول رہی تھی۔ زمانے بھر کے موضوعات سے بات ہو کر مہنگائی پر آ کر رکی اور شمیلا لگی مہنگائی کا رونا رونے...... دونوں بچے جو کارٹون دیکھنے میں مگن تھے آئس کریم والے کا میوزک سن کر ماں اور نانی کے پیچھے پڑ گئے۔

''مما آئس کریم مما آئس کریم۔'' بچوں کو آئس کریم دلانے کے لیے شمیلا نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے چھوٹا پرس نکالنا چاہا تو بے اختیار اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھ کر اپنی یادداشت کو کوسا۔ وہ اپنے اس بھلکڑپن کی عادت کے باعث اکثر ہی کبھی پرس کبھی چابیاں وغیرہ لیے بغیر ہی گھر سے نکل جاتی تھی اور پھر بعد میں بے حد پریشانی اٹھانا پڑتی۔ اب بھی پیسوں والا چھوٹا پرس نہ پا کر وہ ہینڈ بیگ کی چھوٹی بڑی تمام جیبوں میں ہاتھ مار رہی تھی کہ شاید کہیں سے پچاس روپے ہی برآمد ہو جائیں لیکن سوائے چند سکوں کے کچھ بھی برآمد نہیں ہو سکا ناچار اسے اپنی امی سے کہنا پڑا۔

''امی پلیز سو روپے تو دے دیجیے گا، میرا پرس گھر پر ہی رہ گیا ہے۔'' یہ بات سن کر اس کی ماں کے چہرے کا رنگ اک دم پھیکا پڑ گیا تاہم انہوں نے اپنا

بھرم رکھنے کی کوشش کی۔

”ارے بیٹا پیسوں والا پرس تو میرا الماری کے اندر ہے اور چابیاں میں نہ جانے کہاں رکھ کر بھول گئی ہوں چھوٹی دلہن آجائیں تو وہی ڈھونڈ کر دیں گی۔“ لیکن شہنیلا بھی آخر انہی کی بیٹی تھی صاف جان گئی کہ ماں کے چہرے کے تاثرات اور ان کی آواز میں کتنا نمایاں فرق تھا۔ وہ بچوں کی آئس کریم کی فکر چھوڑ چھاڑ جھٹ ماں کے قدموں میں جا بیٹھی اور ان کے دونوں ہاتھ تھام کر بولی۔

”سچ بتایئے گا امی! یہ دونوں بھائی آپ کو ماہانہ جیب خرچ دیتے ہیں ناں.....؟“ اس کے ضد بھرے اصرار کے سامنے اس کی ماں کو گھٹنے ٹیکنے ہی پڑے۔

”دوائیں، کھانا، گرمی سردی کے کپڑے سب کچھ مل جاتا ہے سوائے نقد رقم کے بقول میری بہوؤں کے کہ ماں جی کے اس عمر میں خرچے ہی کیا ہیں بھلا۔“ یہ سب بتاتے ہوئے وہ دلگیر لہجے میں بولیں۔

”ارے کوئی ان جوانوں سے یہ پوچھے کہ جب چھوٹے، چھوٹے بچوں کو جیب خرچ کی ضرورت ہو سکتی ہے تو بڑھاپے میں کیا ضرورتیں اور شوق دونوں ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ ارے بوڑھا اور بچہ تو یوں بھی برابر ہی ہوتے ہیں۔“ یہ سب کہتے ہوئے اس کی ماں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ شہنیلا نے غور سے اماں کی طرف دیکھا تو بے اختیار ہی اسے ماں کی آنکھیں ماں جی (ساس) کی پُرنم آنکھوں میں تبدیل ہوتی محسوس ہوئیں اور اسی لمحے وہ ایک فیصلہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

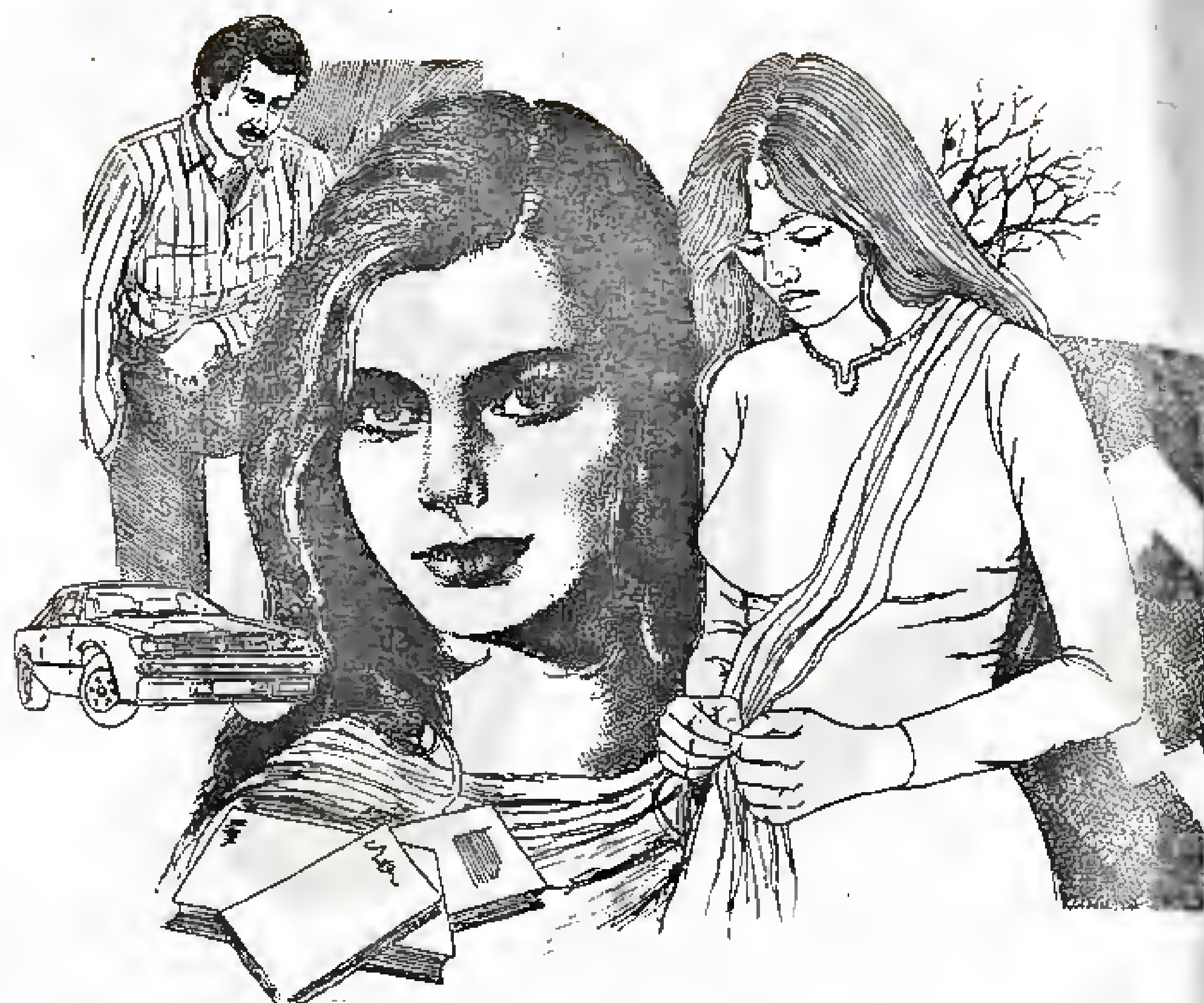
یکم تاریخ کو گھر کا... بجٹ بناتے وقت سب سے پہلے اس نے ساس کے لیے تین ہزار روپے مختص کیے اور پھر اس کے شوہر کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جو پچھلے سات برسوں میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شہنیلا ساس کے تخت پر بیٹھی ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انتہائی شرمندہ لہجہ میں معافی طلب کر رہی تھی۔

”مگر کس بات کی معافی بیٹا...... تم نے تو کوئی غلطی ہی نہیں کی۔“

”غلطی کی ہے اماں جی بہت بڑی غلطی!“ شہنیلا نے بھرّائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ایک ایسی غلطی جس کا کفارہ ہم ابھی ادا کر سکتے ہیں کیونکہ ابھی وقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم بھول گئے تھے کہ بزرگ تو گھنا سایہ ہوتے ہیں ماں جی...... جو اپنی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میں ہمیں زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ رکھتے ہیں اور ہم دنیا داری کے معاملات میں الجھ کر اپنے اصلی فرائض سے منہ موڑ لیتے ہیں۔“ اس نے ایک بند لفافہ اپنی ساس کے تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

”ماں جی یہ بھول جو میں اتنے سالوں سے کرتی آرہی ہوں اس کے لیے ایک بار پھر معذرت لیکن میں آپ سے یہ وعدہ کرتی ہوں کہ جب تک زندہ ہوں اپنے اس فرض سے منہ نہیں موڑوں گی۔“ اور سدا کی شفیق اور دلگداز ماں جی نے بے اختیار ہی اپنی بہو کو اپنے سینے سے لگا لیا کہ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے اور ماں جی کے سینے سے لگے، لگے شہنیلا یہ سوچ رہی تھی کہ کاش اس کی یہ چھوٹی سی نیکی اس کی ماں کی پریشانی دور کرنے کا سبب بن جائے اور بے اختیار ہی اس کے دل سے یہ دعا نکلی۔

”اے رب العالمین جس طرح تو نے ایک چھوٹے سے واقعے کے ذریعے میری آنکھوں پر پڑا ہوا یہ غفلت کا پردہ ہٹا دیا بالکل اسی طرح میرے بھائیوں کی آنکھوں کو بھی وہ بصیرت عطا کر جس سے وہ صحیح اور غلط کی پہچان کر سکیں۔“



یہی ایک راہ ہے

اسما قادری

"شِلو نے نئی گاڑی خرید لی ہے۔" میں ابھی ابھی کالج سے آئی تھی۔ پریکٹیکل ڈے ہونے کی وجہ سے آج دیر سے آف ہوا تھا۔ ناشتا صبح کیا ہی نہیں جاتا تھا اور پریکٹیکل جرنل تیار کرنے کی بدحواسی میں فری پیریڈ میں بھی کچھ نہ کھا سکی تھی اس لیے گھر آتے ہی منہ پر پانی کے دو چار چھپاکے مارے اور یونیفارم تبدیل کیے بغیر ہی کھانا لے کر اس تخت پر آبیٹھی جہاں اماں براجمان سروتے سے چھالیا کتر

رہی تھیں...... میرے دال، چاول اور اچار سے بھرپور انصاف کرنے کے دوران انہوں نے یہ خبر سنائی تو مجھے پتنگے لگ گئے۔

”شہباز میاں کے ساتھ بارہ بجے کے قریب آئی تھی۔ کہنے لگی اماں آج آپ کی خاطر کالج سے جلدی چھٹی لے کر آئی ہوں۔ پچھلے ہفتے لبیہا سے بات ہوئی تو اس نے بتایا آپ کے جوڑوں کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ میں نے آپ کے لیے اسپیشلسٹ سے ٹائم لے رکھا ہے، چلیں چل کر چیک اپ کروالیں، میں نے لاکھ انکار کیا لیکن اس نے ساتھ لے جا کر ہی دم لیا۔ واپسی میں دونوں میاں، بیوی چھوڑنے بھی خود آئے، میں نے کہا بھی کہ کھانا کھا کر جانا مگر راضی نہیں ہوئے۔ ٹائم ہی کہاں ہوتا ہے شگو غریب کے پاس...... میں تو ترس کر رہ جاتی ہوں کہ کبھی جی بھر کر اپنی بچی کی شکل دیکھ سکوں۔“ اماں کے لہجے میں ممتا بھری محبت تھی اور وہ میری دلی کیفیت سے بے خبر اپنی سنائے جارہی تھیں۔

شگو آپا جن کا اصل نام شگفتہ تھا ہم چھ عدد بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں۔ اللہ نے انہیں حسن اور ذہانت دونوں ہی چیزیں بڑی فراخ دلی سے عطا کی تھیں...... ایم سی ایس میں گولڈ میڈلسٹ خاتون کو لیکچرر شپ ملی تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ خوب صورت اور ذہین لڑکیوں کے رشتے بھی کثرت سے آتے ہیں اور ان رشتوں میں سے شہباز جمیل کو حسن و ذہانت میں شگو آپا کے مساوی پا کر فٹافٹ ان کی شادی کر دی گئی۔ شادی کے بعد ان کی گود بھی پہلے سال ہی بھر گئی۔ ساتھ ہی ان کی مصروفیات بھی بڑھتی چلی گئیں۔ انہوں نے پہلے ایک کوچنگ سینٹر میں پڑھانا شروع کیا اور پھر خود اپنا ذاتی کمپیوٹر سینٹر کھول کر بیٹھ گئیں۔ یہ سینٹر صبح سے رات تک اتنی شفٹوں میں کام کرتا تھا کہ لگتا کبھی بند ہی نہیں ہوتا۔ شروع، شروع میں آپا پھر بھی میکے آتی جاتی رہتی تھیں لیکن سینٹر والے کام میں مصروف ہونے کے بعد ان کے پاس ملنے ملاقات کی فرصت نہیں رہی۔ مجھ سے بڑی اور خود سے چھوٹی درمیان کی تین بہنوں کی شادی میں شرکت بھی انہوں نے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر ہی کی البتہ ہر بار تحائف پہلے سے زیادہ قیمتی دیے...... بھائی ہمارا سب سے چھوٹا تھا۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ماں، باپ کے لیے ایک کے بعد ایک بیٹی کی شادی کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا چنانچہ شگو آپا کے بے حد مالی تعاون پر اماں، ابا دونوں ان کے مشکور تھے اور دل کھول کر انہیں دعائیں دیتے تھے۔ باقی سب بھی ان کی بہت تعریف کرتے تھے۔ شگو آپا نے تو خود کو ایک مثال بنا ڈالا تھا۔ ترقی کے لیے اتنی محنت تو مرد بھی نہیں کرتے جتنی وہ کرتی تھیں...... ذاتی گھر، گاڑی اور بیٹی کے لیے شہر کے مہنگے ترین اسکول کا انتخاب یہ سب ان کی شب و روز کی محنت کے بدلے ہی تو ممکن ہو سکا تھا۔ اتنی کامیابیوں کے لیے یقیناً وہ سراہے جانے کے لائق تھیں لیکن میں تھی جو اُن کی ترقی کی یہ خبریں سن کر خوش ہونے کے بجائے جل بھن جاتی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ دال، چاول کو تیزی سے معدے میں منتقل کرتے ہاتھوں کی رفتار خود بخود ہی سست پڑ گئی اور کھانے سے بے رغبتی سی محسوس ہونے لگی۔ مزید رہی سہی کسر دروازے سے داخل ہوتی خالہ صغریٰ نے پوری کر دی۔

”اے یہ کون......؟“ انہوں نے آنکھوں کے اوپر ہاتھ کا چھجا سا بنا کر مجھے گھورا اور گویا یہ مشکل شناخت کا مرحلہ طے کرنے کے بعد بولیں۔ ”اچھا اپنی لبیہا ہے...... کالج جا کر تو بالکل ہی ماٹھی ہو گئی ہے۔ چار مہینے پہلے میرا چکر لگا تھا تو رنگت اتنی گہری نہیں تھی۔“ کوئی نہ تھا جو خالہ صغریٰ کو ان کے بے لاگ تبصرے سے روک سکتا...... میں بھی بس خاموش واک آؤٹ ہی کر سکتی تھی چنانچہ برتن سمیٹ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ادھر اماں، خالہ صغریٰ سے کہہ رہی تھیں۔

”گرمی بہت پڑ رہی ہے ناں...... بسوں کے دھکے کھا کر کالج آتی جاتی ہے، بچی اس لیے کملا گئی ہے۔“

”تو کاہے کو اسے کالج میں داخل کروا دیا۔ گھر بٹھا کر ہی پرائیویٹ بی اے کروالیتیں۔ تم کو بری تو بے شک لگے گی میری بات لیکن تم جانتی ہو کہ میں ہوں زبان کی صاف...... یہ تمہاری چھوٹی جو ہے ناں باقی چاروں سے بالکل الگ ہے، شگو کی تو چلو بالکل ہی الگ بات تھی لیکن باقی تینوں بھی اچھے نقوش اور صاف، صاف رنگت کی تھیں اس لیے آسانی سے اٹھ گئیں پر اس کا بر ڈھونڈنا مشکل ہو جائے گا۔ میری مانو تو اسے گھر بٹھا کر پرائیویٹ پڑھوالو اور کچھ ٹوٹکے وو ٹکے استعمال کرواؤ۔ رنگت نکھر گئی تو کچھ نہ کچھ آسرا ہو جائے گا۔“ ابھی شگو آپا کی نئی گاڑی خریدنے کی خبر کی جلن ہی باقی تھی کہ خالہ صغریٰ کا یہ بے لاگ تبصرہ سرتا پا جھلسا گیا۔ دل چاہا کہ باہر نکل کر انہیں اتنی کھری، کھری سناؤں کہ دوبارہ یہاں قدم ہی نہیں رکھ سکیں لیکن اماں کے ڈر سے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

”اب تو بچی نے داخلہ لے لیا ہے۔ بیچ سال میں کیا رکاوٹ ڈالوں، آپ دعا کرتی رہا کریں۔ اللہ نے چاہا تو اس کے نصیب کا جوڑ بھی مل ہی جائے گا۔“ اماں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے عاجزی سے انہیں جواب دیا تو مجھے مزید پتنگے لگ گئے۔

”دعا کی کیا کہتی ہو ساجدہ وہ تو میں سب بچیوں کے لیے کرتی ہوں اور تمہاری بیٹیوں کے لیے تو میں نے صرف دعا ہی نہیں کی بلکہ کوششیں بھی بہت کیں...... اپنی لبیہا کے لیے بھی پیچھے نہیں رہوں گی۔“

وہ اپنی لبیہا تو ایسے بولتی تھیں جیسے مجھ سے بہت محبت کرتی ہوں لیکن میں جانتی تھی کہ یہ وہ... ”بامعاوضہ محبت“ ہے جو وہ محلے کی ہر جوان لڑکی سے جتاتی ہیں۔ آخر رشتے کروانے والی جو ٹھہریں۔

☆☆☆

خالہ صغریٰ کی باتوں نے میرا موڈ خاصا آف کر دیا تھا اس لیے وقتی طور پر شگو آپا کی گاڑی والی خبر میرے ذہن سے نکل گئی لیکن بہرحال یہ ایسی خبر نہیں تھی جسے میں زیادہ دیر تک بھولی رہتی۔ گھنٹے بھر بعد مجھے پھر اس خبر کا خیال آ گیا اور برداشت نہ ہوا تو شگو آپا سے چھوٹی عافیہ آپی کا نمبر ملا ڈالا۔ اماں، ابا کنواری لڑکیوں کے پاس موبائل فون کی موجودگی کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے میں آج کے دور میں بھی لینڈ لائن پر ہی گزارہ کرتی تھی۔ نمبر ملانے کے بعد کافی دیر تک بیل جاتی رہی پھر جا کر بڑی مشکل سے عافیہ آپی کی ہانپتی کانپتی آواز سنائی دی۔

”آپ کیا کسی ریس میں حصہ لے کر آ رہی ہیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”شادی ہوئی ہے تب سے مانو ریس لگا رہے ہیں، تم سناؤ کیا حال ہے؟“ انہوں نے قدرے بیزاری سے جواب دیا۔ وہ عموماً ایسی ہی بیزار رہتی تھیں حالانکہ میری چاروں شادی شدہ بہنوں میں وہی سب سے خوش حال تھیں کہ ان کے میاں کا ذاتی کاروبار تھا اور وہ کھلا کماتے تھے۔

”میں ٹھیک ہوں، بس آپ کو ایک خبر سنانے کے لیے فون کیا تھا۔“

”کیسی خبر......؟“ ان کی بیزاری قدرے کم ہوئی اور لہجے میں تجسس در آیا۔

”شگو آپا نے نئی گاڑی خرید لی ہے۔ آج کالج سے واپسی پہ آئی تھیں اپنے شوہر نامدار کے ساتھ اماں کا کسی اسپیشلسٹ سے چیک اپ کروانے لے گئی تھیں۔“ میں نے بریکنگ نیوز نشر کی۔

”ہاں بھئی، ان کی کیا بات ہے وہ ایک چھوڑ دو گاڑیاں لے سکتی ہیں اور میاں کو بھی انگلیوں کے اشارے پر نچا سکتی ہیں۔ آخر اپنا کمایا کھا رہی ہیں، یہ تو ہم احمق تھے کہ پڑھنا لکھنا چھوڑ کر انٹر کے بعد ہی گھر داری سنبھال لی اور پھر اماں ابا نے اللہ میاں کی

گائے کی طرح جس سے چاہا بیاہ دیا۔'' عافیہ آپی نے فوراً حسرت ناک لہجے میں جوابی تبصرہ کیا۔ کہنے کی تو بات نہیں لیکن سچ یہ ہے کہ وہ پڑھائی کے معاملے میں ہم سب سے زیادہ نکمی تھیں اور اپنے جس ''انٹر کے بعد'' گھرداری سنبھالنے کا رونا رو رہی تھیں اسے بھی کبھی کلیئر نہیں کر سکی تھیں...... اور اماں نے بار بار سپلی کی فیسیں جمع کروانے سے بیزار ہو کر ہی انہیں گھرداری کے دھندوں میں الجھا دیا تھا۔ ظاہر ہے میں عافیہ آپی سے اپنی صاف گوئی کا مظاہرہ کر کے ''آ بیل مجھے مار'' ... نہیں کہہ سکتی تھی چنانچہ ذرا سی ہمدردی کر لینا ہی مناسب سمجھا۔

''کیا بات ہے آپ اتنی خفا کیوں لگ رہی ہیں۔ اشفاق بھائی سے کھٹ پٹ ہوگئی ہے یا بچوں نے ستایا ہے؟''

''ابا، بچے سب مل کر ہی میرا جینا دوبھر کیے رکھتے ہیں...... سب کو مفت کی کنیز ملی ہوئی ہے، صبح جاتے ہوئے سب کسی خانساماں کی طرح مجھے اپنی، اپنی پسند کے کھانے نوٹ کروا جاتے ہیں۔ چار طرح کے کھانے تیار کرتے ہوئے کبھی کسی کی شرٹ استری کرنے کے لیے دوڑ لگاتی ہوں تو کبھی کسی کی گم شدہ پینٹ تلاش کرنے کے لیے اس کی الماری میں سر دینا پڑتا ہے۔ کام والی ماسی اتنی نمک حرام ہے کہ اس کے پیچھے، پیچھے نہ پھروں تو آدھا کچرا کمروں میں ہی چھوڑ کر نکل جاتی ہے اس پر سے سودا سلف لانے کی ذمے داری بھی میری ہے۔ ابھی ابھی بازار سے ہی آ کر بیٹھی تھی۔ دھوپ میں سبزی گوشت والوں کے درمیان پھر، پھر کر بی پی لو ہو گیا ہے۔ میاں صاحب خود تو اے سی والی گاڑی میں بیٹھ کر نکل جاتے ہیں، پیچھے میں رکشا، ٹیکسی کے لیے خوار ہوتی پھرتی ہوں۔'' انہوں نے اپنی داستان سناتے، سناتے بھرپور خفگی کا اظہار کیا۔

''شکر کریں رکشا، ٹیکسی افورڈ کرنے کے قابل ہیں۔ اشفاق بھائی کھلے دل سے آپ کو خرچہ دیتے ہیں ورنہ ہمارے ہاں تو بے چاری عورتوں کی اکثریت گرہستی کے چکر میں پیدل یا بسوں کے دھکے کھاتے ہوئے خوار ہوتی ہے۔'' میں نے ان کے اندر شکر گزاری کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی اور مزید تقریر جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ برا نہ مانیں تو کہوں آپی آپ بہت سی عورتوں کے مقابلے میں خاصی خوش قسمت ہیں۔ ذرا شگو آپا کو ہی دیکھیں، صبح سے رات تک پیسہ کمانے کی دُھن میں کیسی خوار ہو رہی ہیں کہ اپنوں سے ملنے تک کی فرصت نہیں۔ آج اتنے دنوں بعد یہاں آئی تھیں لیکن یہ نہیں ہوا کہ میرے کالج سے واپس آنے تک رک جاتیں کب سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔'' میں نے اپنے ملال کو آخر زبان دے ہی دی۔

''میں بھی یہی کہوں گی میری بہنا کہ تم مانو نہ مانو لیکن شگو آپا میرے مقابلے میں پھر بھی بہتر ہیں۔ اب دیکھو کیسے وہ اپنی مرضی سے آئیں اور اماں کو ڈاکٹر کے پاس بھی لے گئیں۔ ان کے میاں کی مجال تھی کہ ان کے حکم کے آگے چوں بھی بولتے۔ دوسری طرف ہمارے میاں ہیں پچھلی بار اماں، عثمان کے ساتھ ملنے گھر آئی تھیں تو واپسی میں، میں نے اشفاق کی ہزار خوشامدیں کرلیں کہ اماں اور عثمان کو گھر چھوڑ آئیں لیکن مجال ہے جو وہ آدمی ٹس سے مس ہوا ہو۔ تمہیں کیا خبر کہ میرے دل پر اس وقت کیا گزری جب عثمان گھر سے اتنی دور جا کر رکشا ڈھونڈ کر لایا اور وہ اور اماں رکشے میں واپس گئے۔ سچ میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ گھر کے پورچ میں کھڑی کرولا کو آگ لگا دوں لیکن کیسے لگاتی وہ تو میاں کا مال تھا جس پر میرا حق بس اسی صورت ہوتا ہے کہ جب وہ تسلیم کریں۔'' انہوں نے اپنا دکھ بیان کیا تو میں مزید اپ سیٹ ہوگئی۔ شگو آپا کے لیے محسوس کیے جانے والے دکھ میں عافیہ آپی کا دکھ بھی شامل ہو گیا۔ آپ

سوچ رہے ہوں گے کہ شگو آپا کو بھلا کیا مسئلہ ہے تو جناب ان کا مسئلہ بھی ان کے میاں ہی ہیں۔ خوب صورت، پڑھے لکھے اور اچھی جاب والے شہباز بھائی نے شادی کے بعد مشکل سے ڈیڑھ سال تک ہی ملازمت کی اور اس کے بعد ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر بیٹھ گئے۔ جی ہاں وہ مردوں کی اس قسم میں سے ہیں جو فطرتاً نکھٹو ہوتے ہیں۔ اچھا خاندانی پس منظر، تعلیم اور شکل صورت رکھنے والے شہباز بھائی میں یہ عیب تھا کہ وہ ٹِک کر کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ ماں باپ نے ان کی طبیعت کا یہ لاابالی پن دیکھا تو شادی کو مجرب نسخہ سمجھتے ہوئے آپا کو ان کے لیے بیاہ کر لے گئے۔ زمانہ شناس ماں باپ نے یہ عقل مندی دکھائی کہ بہو ڈھونڈتے ہوئے محض شکل صورت پر توجہ نہیں دی بلکہ یہ بھی خیال رکھا کہ لڑکی ایسی ہو کہ جو برے حالات میں گھر کو سنبھال سکے یوں شادی کے ڈیڑھ سال بعد ہی گھر کی کل ذمے داری آپا کے شانوں پر آ گئی اور وہ پچھلے تیرہ سالوں سے یہ ذمے داری اس خوبی سے نبھا رہی تھیں کہ مجھے شہباز بھائی کی قسمت پر رشک آتا تھا۔ ان کے تو نصیب جاگ گئے تھے۔ خوب صورت اور کماؤ بیوی جس کے دم سے وہ زندگی کی ساری لگژریز سے لطف اٹھا رہے تھے اور آج بھی ویسے ہی تر و تازہ تھے جیسے تیرہ سال قبل شگو آپا کو بیاہ کر لے جاتے وقت تھے۔ ہاں آپا ضرور اتنے سالوں میں مجھے تھکی، تھکی سی اور کمزور لگنے لگی تھیں لیکن سب یہی کہتے تھے کہ شگفتہ بہت ایکٹیو اور اسمارٹ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لوگوں کی رائے درست ہو لیکن میں آپا سے بے تحاشا محبت کرنے کی وجہ سے ان کے لیے کڑھتی رہتی تھی۔ سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے آپا نے ہمیشہ میرے بہت لاڈ اٹھائے تھے اور جب میں اپنی اتنی پیاری بہن کی صورت دیکھنے کے لیے ترس، ترس جاتی تھی تو شہباز بھائی پر ڈھیروں غصہ آتا تھا حالانکہ وہ ہمیشہ مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آتے تھے لیکن میرے نزدیک ان کی اس خوش اخلاقی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بیوی کی کمائی کھانے والوں کو اس کے میکے والوں کے ساتھ اچھا سلوک تو کرنا ہی تھا۔ جیسے آج وہ اماں کو نئی کار میں بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے اور یہ نئی کار میرے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی خریداری میں خرچ ہونے والے لاکھوں روپوں کے لیے میری بہن نے کولہو کی بیل کی طرح دن رات محنت کی ہوگی۔ جانے کب سے وہ بے چاری پوری نیند بھی نہ سوئی تھیں۔ کسی تفریح کے لیے نہیں گئی تھیں اور انہیں اپنی پسند کی کوئی رومینٹک فلم دیکھنے یا ناول پڑھنے کا موقع بھی نہیں ملا ہوگا۔

خیالات کی یلغار میں گھری میں کچن میں پہنچ گئی۔ پہلے فریزر سے قیمہ نکال کر رکھا پھر چائے کا پانی چڑھایا۔ عثمان کے اکیڈمی جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ چائے تیار ہونے تک میں نے پاپڑ بھی تل لیے۔ پاپڑوں کے ساتھ چائے نوش کرنے کے بعد عثمان اکیڈمی چلا گیا اور میں اماں کے ساتھ بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کر کے اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

''ایسا سالن چڑھا دو بیٹا، اپنے ابا کا پتا ہے ناں کہ مغرب کے فوراً بعد کھانا چاہیے ہوتا ہے اگر دیر ہوگئی تو ان کا موڈ خراب ہوگا۔'' اماں نے دو چار منٹ بعد ہی مجھے ٹوک دیا تو میرا اپنا موڈ خراب ہونے لگا۔

''ابھی مغرب میں بہت دیر ہے اماں۔'' میں نے انہیں احساس دلا دیا۔ گرمی کے دن ہونے کی وجہ سے مغرب واقعی دیر سے ہو رہی تھی۔

''پھر بھی تم چڑھا دو۔ وقت سے پہلے ہی کھانا تیار ہو جائے تو اچھا ہے۔ ہیز دیڑ میں ڈھنگ کا پکا بھی نہیں ہے اور تمہارے ابا بگڑنے لگتے ہیں۔ میں آج اسپتال جا کر بہت تھک گئی ہوں ورنہ خود ہی پکا لیتی۔'' اس بار انہوں نے میرے لیے کوئی گنجائش

نہیں چھوڑی تھی اس لیے مجھے کچن کا رخ کرنا پڑا۔ خود اماں نے تکیے سے کمر لگاتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے ہمیشہ سے انہیں ابا کا بہت خیال رکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ ابا بھی ہم لوگوں کے لیے دن رات محنت کرتے تھے لیکن ان میں ذرا نازک مزاجی تھی اور خلافِ مزاج کسی بھی بات پر فوراً ہی برہم ہوجاتے تھے اس لیے سب کی کوشش ہوتی تھی کہ ایسا کوئی کام نہ ہونے پائے جو ابا کی مرضی کے خلاف ہو۔

کچن میں آنے کے بعد میں نے قیمہ چڑھایا اور چائے کے برتن دھونے کے بعد آٹا گوندھ کر رکھا۔ روٹیاں میں بالکل ابا کے آنے کے وقت پر ہی پکاتی تھی تاکہ تازہ اور گرم رہیں۔ آٹے کا پیالہ فریج میں رکھنے کے بعد میں نے چولھے کی آنچ دھیمی کی اور خود باہر تخت پر آبیٹھی۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اندر جاکر فون اٹھایا۔ دوسری طرف مجھ سے بڑی والی سونیا تھی جس کی شادی ابھی پچھلے ہی سال ہوئی تھی۔

''اماں کہاں ہیں؟'' مجھ سے سلام دعا کرنے کے بعد اس نے اماں کے بارے میں دریافت کیا۔

''میرے خیال میں سوگئی ہیں، طبیعت ٹھیک نہیں ہے ان کی۔ خلافِ معمول جوڑوں کا درد گرمیوں میں بھی تنگ کررہا ہے۔ آج شگو آپا اور شہباز بھائی انہیں کسی اسپیشلسٹ کے پاس بھی لے گئے تھے۔ لگتا ہے اس کی دوا سے کچھ آرام ہے جو وہ اس وقت سوگئی ہیں ورنہ آج کل تو رات کو بھی ڈھنگ سے نہیں سو پاتیں۔'' میں نے قدرے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا کہ مبادا وہ اماں کو نیند سے جگانے کی فرمائش کر ڈالے۔ وہ ہم بہنوں میں سب سے زیادہ بے صبری اور نازک مزاج تھی اور عموماً اپنے مطلب ہی کی بات کرتی تھی۔

''اچھا آپا آئی تھیں شہباز بھائی کے ساتھ...... کتنے اچھے لگتے ہیں ناں وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے۔ شہباز بھائی پر تو وقت نے لگتا ہے کوئی اثر ہی نہیں ڈالا۔ پہلے سے زیادہ ینگ اور ڈشنگ لگنے لگے ہیں۔'' بجائے اس کے کہ وہ اماں کی طبیعت کے بارے میں دریافت کرتی آپا اور شہباز بھائی کے کپل کے بارے میں رائے زنی کرنے لگی۔ اصل میں آپا کے بعد ہم بہنوں میں وہ ہی سب سے زیادہ خوش شکل تھی۔ اسے فلمیں دیکھنے اور رومانی ناول پڑھنے کا بڑا چسکا تھا اور اس کے ذہن میں لائف پارٹنر کے طور پر کوئی فلمی سا ہیرو ہی بسا ہوا تھا لیکن اس کی شادی ہوگئی سولہ گریڈ کے ایک ہائی اسکول ٹیچر سے جو عمر میں اس سے کم و بیش دس سال بڑے تھے۔ عمر کے اس تفاوت کو اس لیے اہمیت نہیں دی گئی تھی کہ باقی ہر اعتبار سے رشتہ اچھا تھا۔ سب سے بڑھ کر سہیل بھائی کا خاندان بہت مختصر تھا۔ وہ اکلوتے تھے اور ان کے صرف والد حیات تھے۔ سونیا کے مزاج میں ذرا تیزی تھی اس لیے اماں کا خیال تھا کہ اس کے لیے لمبی چوڑی، بھری پُری سسرال کو نبھانا مشکل ہوگا۔ سہیل بھائی نے اسے اچھی طرح رکھا ہوا تھا لیکن میں نے کئی بار نوٹ کیا تھا کہ اس کے ذہن پر سوار فلمی ہیرو کا بھوت سال بھر میں بھی اتر نہیں سکا۔

''ینگ اور ڈشنگ تو نظر آتا ہی ہے انہوں نے۔ وہ کون سا کھانے کمانے کی فکر میں اپنی ہڈیاں گھلا رہے ہیں۔ سارا بوجھ تو بے چاری آپا نے اٹھا رکھا ہے۔'' سونیا کے تبصرے پر میں نے جل کر کہا تو وہ اپنی فطری بدلحاظی سے بولی۔

''یہ تو آپا کا قصور ہے، کیوں میاں کو اتنی چھوٹ دے رکھی ہے۔ ڈرتی ہوں گی کہ کہیں چوں چراں کرنے سے اتنا خوب صورت شوہر ہاتھ سے نہ نکل جائے۔''

''فضول مت بولو، تمہارے سر پر تو ہمیشہ خوب صورتی کا بھوت سوار رہتا ہے۔ اگر شہباز بھائی خوب صورت ہیں تو کیا آپا گری پڑی ہیں۔ آج بھی

کسی محفل میں چلی جائیں تو سب سے الگ چمکتی دمکتی نظر آتی ہیں لیکن تم اپنی ناپختہ سوچوں میں گھری کچھ دیکھ ہی کہاں پاتی ہو۔ میاں بے چارے تمہارے اسکول کے بعد ٹیوشنز کے درمیان گھرے تمہاری سہولت اور آرام کے لیے دن رات محنت کررہے ہیں، تم ان کی کمائی پر عیش کرتی، دن رات بستر پر پڑا جمان فلموں اور رسالوں سے لطف اٹھاتی ہو اور پھر اس بات پر آہیں بھرتی ہو کہ تمہارا شوہر فلاں ہیرو جیسا اسمارٹ اور ینگ کیوں نہیں ہے؟ چھوڑ دو یہ بچکانہ خیالات اور حرکتیں۔ اب تم خود ماں بننے والی ہو ذرا سمجھ دار ہوجاؤ۔'' میں دوپہر سے پہلے ہی بھری بیٹھی تھی، سونیا کی باتوں نے بالکل ہی فیوز اڑا دیا چنانچہ بغیر کسی لگی لپٹی کے اچھی طرح اس کی طبیعت صاف کی اور کھٹ سے فون بند کرکے کچن کی طرف دوڑی کہ کہیں قیمہ جل جانے سے گھر میں نقصِ امن کا اندیشہ نہ ہوجائے۔

☆☆☆

''آخر تمہیں اعتراض کیا ہے اس رشتے پر؟'' ستارہ بجیا نے کڑے تیوریوں سے مجھے گھورتے ہوئے کوئی دسویں بار یہ سوال کیا اور ایک بار پھر اپنے لائے ہوئے رشتے کی خصوصیات گنوانے لگیں۔

''اچھا شریف لڑکا ہے۔ اپنا کاروبار ہے، بہنوں کی شادی سے فارغ ہوچکا ہے۔ گھر میں صرف ماں باپ اور ایک چھوٹا بھائی ہے، مزے سے رہوگی تم وہاں۔ مجھ سے پوچھو کیسے اتنی بڑی سسرال کے جھنجٹ سے نمٹتی ہوں۔ شادی کے سات سالوں میں پوری چار نندیں نمٹائی ہیں۔ ان کا جہیز جوڑنے کے چکر میں کتنی بار اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹنا پڑا ہے اب تو یہ گنتی بھی یاد نہیں رہی۔ سسر، میاں صاحب اور اسکول، کالج میں پڑھتے تین، تین دیوروں کو حسبِ منشا ناشتا کروا کر لفن سمیت گھر سے روانہ کرنے میں صبح، صبح کیسی گھن چکر بن جاتی ہوں یہ مجھے ہی پتا ہے

چاند کے تمنائی

شہرِ دل کی گلیوں میں
شام سے بھٹکتے ہیں
چاند کے تمنائی
بے قرار سودائی
دل گداز تاریکی
جاں گداز تنہائی
روح و جاں کو ڈستی ہے
روح و جاں میں بستی ہے

کلام: ابنِ انشا

پسند: شہلا محمود، واہ کینٹ

پھر جب بیاہی نندیں میکے آتی ہیں تو ان کی اور ان کی شوہروں کی خاطر داریوں میں جو پریڈ لگتی ہے وہ الگ ہے۔ کبھی کبھی تو رونا آجاتا ہے کہ اپنے بے چاروں بچوں کو ہی ڈھنگ سے دیکھ نہیں پاتی۔ مصروفیات میں ان کی فرمائشیں پوری کرنا یاد نہیں رہتا بلکہ چڑچڑاہٹ میں الٹا وہ بے چارے ہی زد پر آجاتے ہیں۔'' مجھے قائل کرنے کے چکر میں وہ زور شور سے اپنا دکھڑا سنانے بیٹھ گئی تھیں۔ اس فن میں تو مجھے لگتا تھا کہ ساری خواتین یکساں مہارت رکھتی ہیں کہ ذکر کوئی بھی چل رہا ہو آخر کار اپنی مظلومیت اور مصائب کا رونا رونے کا موقع تلاش ہی لیتی ہیں جیسا کہ اس وقت ستارہ بجیا کے چہرے پر دنیا بھر کا دکھ سمٹ آیا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ وہ میرے لیے اپنی چچی ساس کے صاحب زادے کا رشتہ لانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ بجیا کی سسرال والے زیادہ تر دکان دار قسم کے لوگ تھے۔ خود ان کے سسر اور میاں مل کر اپنا

جنرل اسٹور چلاتے تھے جبکہ جن موصوف کا وہ میرے لیے رشتہ لے کر آئی تھیں وہ خیر سے مکینک تھے اور بقول ستارہ بجیا کے بہت اچھا کماتے تھے۔

''میں آپ کے دکھ میں برابر کی شریک ہوں بجیا لیکن آپ کے تجربے کی روشنی میں آپ کے چھٹی زاد دیور کو قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔'' ان کی تقریر کے اختتام پر کہے گئے میرے اس جملے نے انہیں بھنا کر رکھ دیا۔

''کیوں، کیا خرابی نظر آتی ہے تمہیں جمشید میں؟'' انہوں نے ایک بار پھر اپنا وہی سوال دُہرایا تو آخر کار میں نے مسٹر جمشید کی برائیاں گنوانے کے لیے کمر کس ہی لی ورنہ عموماً میں اس طرح کی عیب جوئی سے گریز کرتی ہوں۔

''پہلی خرابی تو یہ ہے کہ ان موصوف نے میٹرک تک نہیں کر رکھا۔ دوسرے بہت اول جلول حلیے میں رہتے ہیں اور تقریبات تک میں دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ بندہ مکینک ہے۔ چلو مکینک لگنے میں بھی کوئی برائی نہیں ہے لیکن وہ تو شکل سے ہی نہایت احمق اور ہونق لگتے ہیں۔ اعتماد نام کی کوئی چیز نہیں ہے ان کے اندر۔ کوئی لڑکی قریب جا کر دو چار باتیں کر لے تو چھوئی موئی کی طرح ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہے کم از کم میں ایسے آدمی کو اپنے شوہر کے طور پر ہرگز قبول نہیں کر سکتی۔'' بجیا کی نندوں کی پے در پے ہونے والی شادیوں میں شرکت کرنے کی وجہ سے میں ان کے سسرالی خاندان سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی چنانچہ نہایت آرام سے جمشید صاحب کا حدود اربعہ بیان کر ڈالا۔

''ساری بے تکی باتیں ہیں۔ مرد کی تعلیم سے زیادہ کمائی دیکھی جاتی ہے۔ تمہیں کیا اس سے انگریزی ناول پڑھوا کر سننے ہیں یا شاعروں کے کلام کی تشریح کروانی ہے جو تعلیم کی کمی کا بہانہ بنا رہی ہو۔ بے چارہ کم عمری میں کمانے کی فکر میں لگ گیا تھا اس لیے پڑھ نہ سکا۔ شریف طبیعت کا مالک ہے اس لیے لڑکیوں سے فری نہیں ہوتا اور رہی حلیے وغیرہ کی بات تو وہ تو بیوی بدل ہی دیتی ہے۔ تم ڈھنگ سے سلیقے سے رکھو گی تو سیکھ لے گا وہ بھی طور طریقے۔'' انہوں نے میرے سارے اعتراضات کے پرخچے اُڑا دیے۔

''پلیز بجیا...... میرا شوہر کو پالنے پوسنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' آخر میرا تحمل جواب دینے لگا لیکن مجھ سے زیادہ ان کا ضبط جواب دے گیا۔

''یہ کس انداز میں بات کر رہی ہو تم۔ کبھی آئینے میں شکل دیکھی ہے، ہم دیکھنے میں تم سے ہزار گُنا اچھے تھے لیکن اماں ابا نے جہاں کہا وہاں سر جھکا دیا کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ کون ہے، کیسا ہے، کیا کرتا ہے اور تم ہو کہ ایسے بحث کیے جا رہی ہو کہ جانے کہاں کی حور شمائل ہو۔ ہوش کے ناخن لو بی بی۔ یہ جو رشتہ تمہارے لیے آ گیا ہے وہ بھی صرف میری وجہ سے آیا ہے۔ میری سسرال میں اتنے اچھے طریقے سے نبھا کرنے پر میری چچی ساس نے تمہارے لیے بات ڈالی ہے کہ میری بہن ہو تو میری ہی طرح کے طور طریقے ہوں گے ورنہ جمشید کے لیے کوئی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔'' اس بار انہوں نے میری ذات کے پرخچے اُڑائے تھے۔

''اس صورت میں تو یہ شادی بالکل ہی نامناسب رہے گی بجیا کیونکہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں آپ جیسی نہیں ہوں، مجھے حق کو حق سمجھنا اور کہنا آتا ہے۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ کس رشتے کو کتنی اہمیت دینی ہے۔ مجھ میں آپ کی طرح سسرال میں نمبر بنانے کی خاطر اپنے بچوں کو نظر انداز کرنے اور خود ڈپریشن میں مبتلا رہنے کی صلاحیت اور ہمت نہیں ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ اس بات کو یہیں ختم کر دیں۔'' بظاہر بڑی مضبوطی سے انہیں جواب دے کر میں کمرے سے باہر نکل گئی لیکن اندر کیسی ٹوٹ پھوٹ مچی ہوئی تھی یہ تو میں ہی جانتی تھی۔

صغریٰ خالہ نے میری شکل صورت پر تبصرہ کیا تھا تو تکلیف ہوئی تھی لیکن تکلیف کی انتہا کیا ہوتی ہے اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہو رہا تھا۔ شکل اچھی نہ ہونے کا کیا یہ مطلب تھا کہ میں اپنے تمام بنیادی حقوق سے بھی محروم کر دی جاؤں۔ جمشید شکل میں مجھ سے بھی گیا گزرا تھا۔ اس کا قد بھی چھوٹا تھا لیکن اس کے لیے انکار کرتے ہوئے میں نے یہ خامیاں نہیں گنوائی تھیں کیونکہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن کیا میں یہ خواہش بھی نہیں کر سکتی تھی کہ میرا شوہر تھوڑا تعلیم یافتہ اور باتہذیب ہو...... بے شک مجھے اس سے ادب اور شاعری پر تقریریں نہیں کروانی تھیں لیکن وہ اس لائق تو ہوتا کہ میری بات سمجھ سکتا۔ میرے کسی خوب صورت جملے یا شعر سنانے پر کم از کم ہونقوں کی طرح منہ تو نہیں پھاڑے اور جمشید ایسا ہی تھا۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اس قسم کے آدمی کے ساتھ زندگی گزارنے کی صورت میں میرے اپنے اندر سے زندگی ختم ہو جائے گی لیکن میری سگی بہن نے مجھے میری اوقات جتا دی تھی۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کیونکہ میں کم صورت ہوں۔ اس لیے اپنے لیے زندگی کے ساتھی کے انتخاب کے لیے کسی بھی قسم کی خواہش رکھنے کی حقدار نہیں تھی۔ کیا سچ مچ ایسا ہی تھا؟ اپنے اندر اٹھتے سوالوں کے جواب کی تلاش میں، میں اتنی گم صم ہوئی کہ میرے انکار پر تھوڑی، تھوڑی سی ناراض اماں بھی بوکھلا اٹھیں۔ معاملہ کیونکہ میرا تھا اس لیے انہوں نے شگفتہ آپا سے مدد طلب کی۔ میری خاطر وہ اپنی ہزاروں مصروفیات میں سے وقت نکال کر آ بھی گئیں۔

''کیا بات ہے ابھا گڑیا، کیوں سب کو پریشان کیا ہوا ہے؟ اماں پریشان ہیں کہ ان کی چہکتی بلبل کو کیا ہوا اور تو اور عثمان نے بھی فون کر کے مجھ سے کہا کہ پتا نہیں ابھا کو کیا ہو گیا ہے، آپ آ کر ذرا اس کا موڈ تو بحال کر دیں اور میں تمہاری خاطر دوڑی

نعتِ شریف

ہر اِک زباں پہ درود و سلام آتا ہے
خدا کے بعد محمد ﷺ کا نام آتا ہے
فلک کے چاند ستارو! یہ تم بھی دیکھو آج
زمیں سے عرش پہ خیرُ الانام آتا ہے
چمک اٹھا ہے ہر اِک ذرہ کہکشاں بن کر
پڑھانے نفل فلک پر امام آتا ہے
حضور پاکؐ کی شفقت کا فیض ہے اتنا
کہ ان سے ملنے ہر اِک خاص و عام آتا ہے
چلا ہے آج ہر اِک فرد جانبِ سرورؐ
وہ جن کے پاس خدا کا پیام آتا ہے
اثر یہ رب کا کرم ہے کہ رنج و راحت میں
رسول پاکؐ کا بس لب پہ نام آتا ہے

شاعر: اثر جون پوری
پسند: فضہ بتول، بہارہ کہو

حُسنِ ادائیگی نمازِ پنجگانہ

☆ قرآن پاک کے احکام اور احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں نماز کی حد درجہ اہمیت و فضیلت ہے کہ جس کی بحالتِ مجبوری قضا تو ممکن ہے مگر کسی حالت میں بھی ترک نہیں کی جا سکتی۔

☆ نماز مومن کا نور ہے۔

☆ نماز جنت کی کنجی اور مومن کی معراج ہے۔

☆ نماز قربِ الٰہی کا ذریعہ اور رسول خدا ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

☆ نماز پریشانیوں، بیماریوں اور فقر سے نجات کا ذریعہ ہے۔

مرسلہ: عظمیٰ عنبرین، ڈی جی خان

چلی آئی۔'' انہوں نے اپنے نرم ملائم، مہربان وشگفتہ لہجے میں بولنا شروع کیا تو میرا دل بھر آیا اور ان کے سینے سے لگ کر بہت سے آنسو بہانے کے بعد میں نے سارا قصہ مع اپنے شکووں کے ان کے گوش گزار کردیا۔ وہ پوری توجہ سے سنتی رہیں میرے خاموش ہوجانے پر انہوں نے لب کشائی کی۔

''ستارہ سے میری بات ہوئی تھی۔ مجھ سے بھی اس نے کچھ اس قسم کی ہی باتیں کی تھیں لیکن گڑیا تم اس کی نیت پر شک نہیں کرو۔ وہ بہن ہے اور تمہارے لیے برا ہرگز کبھی نہیں چاہتی۔ قصہ بس اتنا ہے کہ حالات کے مطابق اس نے تمہارے لیے جو مناسب سمجھا وہ پیش کردیا۔ اصل میں ملنے جلنے والوں کی اکثریت نے تمہاری کم صورتی کو جتا، جتا کر اماں کو کچھ اس طرح ہولا دیا ہے کہ وہ ہر وقت تمہاری فکر میں ہی مبتلا رہتی ہیں اور ان کی اس فکرمندی کو دیکھتے ہوئے ہی ستارہ کو جمشید کا رشتہ بہت مناسب لگا تھا۔ حقیقت میں وہ ایک اچھا لڑکا ہے لیکن میں تمہارے اعتراضات کو بھی بے جا یا غیر اہم نہیں کہوں گی۔ تم نے اپنی عمر اور تجربے کے اعتبار سے جو کچھ کہا وہ بالکل درست تھا، ہاں ستارہ کو غصے میں تمہارا دل نہیں دکھانا چاہیے تھا۔ اسے خود بھی اپنے رویے کا احساس ہے۔ فون پر مجھ سے شرمندگی کا اظہار کررہی تھی لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی غم تھا کہ تم زندگی میں سمجھوتے کی اہمیت سے ناآشنا ہو۔ سمجھوتا ہر انسان کو کرنا پڑتا ہے لیکن عورت کے حصے میں یہ ضرورت سے زیادہ ہی دخیل ہوجاتا ہے۔ میں اپنی ذات پر گفتگو کرنا پسند نہیں کرتی لیکن اس وقت میں اپنی مثال ضرور دینا چاہوں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو اور میرے لیے کتنا کڑھتی رہتی ہو مجھ تک ہر خبر پہنچتی ہے لیکن اس لیے ٹال جاتی ہوں کہ وقت تمہیں خود سب کچھ سمجھادے گا۔ تم ذرا چھوٹی تھیں اس لیے تمہیں میری اور شہباز کی شادی کا زمانہ اتنا اچھی طرح یاد نہ ہوگا۔

میرا شہباز سے رشتہ طے ہوا تو ایک دنیا مجھ پر رشک کرتی تھی۔ میں خود بھی خوش تھی کہ خوابوں کے نگر میں بسنے جارہی ہوں لیکن یہ خواب کتنی جلدی ٹوٹا یہ میں ہی جانتی ہوں۔ شادی کے بعد چند مہینوں میں ہی مجھ پر شہباز کی کام چوری کا راز کھل گیا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ سب کیا ہے؟ کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے ہی سارہ میری گود میں آگئی۔ میری ایک قریبی سہیلی نے مجھے مشورہ دیا کہ ایسے نکھٹو بندے سے پیچھا چھڑالو لیکن میں سارہ کی وجہ سے مجبور ہوگئی۔ میں اسے باپ کی محبت سے محروم کرنے کا حوصلہ نہیں کرسکتی تھی۔ تم نے ابا کو دیکھا ہے ناں کہ اماں کے لیے ہمیشہ کتنے سخت مزاج رہے ہیں لیکن ہم بہنوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ہمیں بھی ان کا وجود کسی شجرِ سایہ دار کی طرح محسوس ہوتا ہے پھر میں بھلا اپنی بیٹی کو اس سائے سے کیسے محروم کرتی۔ اپنی معاشی برتری کے زعم میں، میں شہباز سے علیحدگی اختیار کرلیتی تو یہ معاشرہ کب مجھے اور میری بیٹی کو سکون سے جینے دیتا۔ بے شمار تلخ باتیں سننے اور گندی نگاہوں کو سہنے سے بہتر میں نے یہی سمجھا کہ شہباز کی ایک خامی سے سمجھوتا کرلوں۔ وہ بے حسی کی حد تک نکمے ہیں لیکن سارہ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میری معاشی برتری کے باعث انہیں میری بھی بہت سی باتیں ماننی پڑتی ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ بے شک میں ایک مشکل زندگی تو گزار رہی ہوں لیکن بہت سی عورتوں سے پھر بھی بہتر ہوں۔ میں تمہیں اپنی ماسی کے بارے میں بتاؤں۔ اس عورت کے سات بچے ہیں۔ صبح سے شام تک محنت کرکے وہ بچوں سمیت اپنے نکھٹو میاں کا پیٹ پالتی ہے اور اس پر بھی ہر دوسرے دن شوہر سے دار چوٹ کی مار کھاتی ہے۔ اتنی قابلِ رحم عورت کو دیکھ کر میرے اندر ہزار بار جذبۂ شکر ابھرتا ہے شہباز نے کبھی مجھ سے اس قسم کی بدسلوکی نہیں کی۔ میں اپنے گھر کی حکمران ہوں اور سارے فیصلے خود کرتی ہوں۔

نے اپنی زندگی میں ایک سمجھوتا ضرور کیا ہے لیکن باقی ہر طرف سے سکون میں ہوں اور مجھے یہ سودا اس لیے برا نہیں لگتا کہ ہر عورت کو کوئی نہ کوئی سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔'' اپنی پوری داستانِ حیات کو مختصر الفاظ میں سنا کر وہ خاموش ہوئیں تو ان کے چہرے پر وہی ہمیشہ والا نرم ملائم تاثر تھا۔

''کیا آپ کے خیال میں مجھے بھی جمشید سے شادی کا سمجھوتا کرلینا چاہیے؟'' ان کے چہرے پر نظریں ٹکائے میں نے ان سے پوچھا۔

''یہ سوال تمہیں میرے بجائے خود سے کرنا چاہیے کیونکہ یہ صرف تم طے کرسکتی ہو کہ تم کس چیز پر سمجھوتا کرسکتی ہو اور کس پر نہیں۔ ہاں فیصلہ کرتے وقت کسی قسم کے احساسِ کمتری یا محرومی کو خود پر حاوی مت ہونے دینا کیونکہ اس قسم کے دباؤ میں تم سے کوئی درست فیصلہ ہرگز نہیں ہوگا۔'' اپنے باوقار انداز میں دوٹوک جواب دیتے ہوئے انہوں نے مجھے مشورے سے نوازا۔

''بہت شکریہ میری پیاری آپا۔'' میں ایک بار پھر ان کے گلے سے لگ گئی۔ ''آپ نے میری بہت مدد کی۔ آپ کے مشورے کی روشنی میں، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ فی الحال میں شادی وغیرہ کے جھنجٹ میں پڑنے کے بجائے اپنی تعلیم پر توجہ دوں اور اپنا مستقبل سنواروں کیونکہ ایک بے حیثیت انسان کے فیصلے بھی بے حیثیت اور ناپختہ ہوتے ہیں۔ میں اپنی کم مائیگی کے احساس کے ساتھ کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتی کیونکہ اس صورت میں یہ ایک ایسا سمجھوتا ہوگا جس میں مجھے اپنی ذات کی یکسر نفی کرنی پڑے گی اور میں ساری زندگی اس سمجھوتے کا بوجھ اپنے دل و دماغ پر لیے ایک ایسی زندگی گزاروں گی جس کا نتیجہ احساسِ کمتری اور چڑچڑے پن کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ دوسروں کے تجربات سے میں نے جو سبق سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ بے شک زندگی سمجھوتے کا نام ہے لیکن انسان کو زندگی میں وہ سمجھوتے کرنے چاہیے جن سے اس کی عزتِ نفس برقرار رہے۔ آج میں ایک بالکل بے حیثیت لڑکی ہوں اور میرے پاس اپنی کم شکلی کے احساسِ کمتری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں زندگی کی جنگ کو بغیر ہتھیاروں کے لڑنے کی بے وقوفی نہیں کرسکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے چند سال کی مہلت دی جائے تاکہ میں اپنی شخصیت میں کچھ خوبیاں تو ایسی پیدا کرسکوں کہ مجھے لگے کہ میرا ساتھ بھی کسی کے لیے مفید ہے پھر چاہے وہ شخص جمشید ہو یا اس جیسا کوئی اور...... مجھے اس سے فرق نہیں پڑے گا کیونکہ کوئی مجھے یہ نہیں جتا سکے گا کہ میں بالکل ہی بے اوقات تھی اور مجھے اپنانے والے نے مجھ پر کوئی احسان کیا ہے۔ میں اپنی نئی زندگی کا آغاز عزت ووقار سے کرنا چاہتی ہوں تاکہ آگے بھی عزت و وقار سے زندہ رہ سکوں۔'' میں نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا تو شگو آپا نے بے اختیار ہی میرا ماتھا چوم لیا اور پیار سے بولیں۔

''میری چھوٹی سی گڑیا کب اتنی بڑی ہوگئی کہ ایسی بڑی، بڑی باتیں کرنے لگی مجھے معلوم ہی نہیں ہوا لیکن میں تمہارے خیالات سے سو فی صد متفق ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ اماں، ابا کو بھی قائل کرکے چھوڑوں گی۔ تم اطمینان سے اپنی فیوچر پلاننگ کرو اور پوری دل جمعی سے زندگی کی جنگ لڑنے کی تیاری کرو۔ میں اس جنگ میں تمہارا بھرپور ساتھ دوں گی۔'' آپا کی اس یقین دہانی نے میرے اندر ڈھیروں ڈھیر اطمینان اتار دیا اور میں خود سے عہد کرنے لگی کہ کسی بھی قسم کے تساہل کا مظاہرہ کیے بغیر اپنی پوری قوت سے یہ جنگ لڑوں گی کہ باعزت زندگی گزارنے کی یہی ایک راہ ہے۔ سمجھوتے تو عورت کو کرنے ہی ہوتے ہیں لیکن باوقار پوزیشن میں کیے سمجھوتے اور احساسِ کمتری کے ساتھ کیے گئے سمجھوتے میں بہت فرق ہوتا ہے اور میں ہمیشہ اپنا وقار قائم رکھنا چاہتی ہوں۔



شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 16

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے... خیر و شر، نیکی اور بدی... زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت... ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود درانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں تگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغِ مفارقت دے گئے۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہر زاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و ذہانت کا شکار ہو چلا تھا..... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا ہے۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دن طیارے کے دعویں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ نادر اپنے گھر میں زوئی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ زرنگار کو اس خصوصی نمبر سے دبئی روانگی کا پیغام ملتا ہے۔ میرال کو بتایا جاتا ہے کہ اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل ہے اس لیے وہ دبئی نہیں جا سکتی۔ میرال حیران ہوتی ہے کہ وہ لوگ اسے کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ پیٹل، مہر زاد خان کی نیوز اینکر کے ساتھ منعقد کی گئی میٹنگ دیکھتی ہے تو اسے کچھ غیر معمولی محسوس ہوتا ہے۔ فہد اور حمزہ، دانیال اور عافیہ سے ملنے آتے ہیں۔ علینہ، فہد کے جانے کے بعد سوچتی ہے کہ اس کے ہونے سے کتنی رونق ہو گئی تھی۔ فہد، دانیال، عافیہ اور حمزہ سے کہتا ہے کہ اسے اپنے کچھ کا ٹیکٹس آزما لینے دیں۔ مہر زاد کے انداز میں غیر معمولی تبدیلی پر پیٹل حیران ہوتی ہے۔ نادر کی ماں اسے کہتی ہے کہ اس کی بہنیں آ رہی ہیں، وہ دونوں اپنا اپنا گروپ بنا لیتے ہیں۔ مہر زاد کے پاس اس کے نانا کا فون آتا ہے کہ زرنگار جلد ہی اس تک پہنچنے والی ہے اور اب اسے اپنی ماں کی خواہش کا احترام کرنا ہوگا۔ وہ مہر زاد خان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی ٹون بدلے..... فہد، عافیہ اور حمزہ کو بتاتا ہے کہ میرال کو اس رات جس عمارت میں لے جایا گیا اس کا محرک مہر زاد نہیں ہے۔ دانیال کہتا ہے کہ لڑکی کو اگر وہاں سے نکالنا ہے تو پرائیویسی کو چھوڑنا ہوگا جس پر حمزہ، فہد اور عافیہ سب ہی خاموش رہتے ہیں۔ بینش کی ماں اس سے کہتی ہے کہ اب پڑھائی چھوڑ کر شادی کی فکر کرے۔ بینش ماں سے کہتی ہے کہ وہ تھوڑا انتظار کرے۔ زرنگار، مہر زاد سے کہتی ہے کہ اگر اسے پتا ہوتا کہ اسے مہر زاد کے سامنے لایا جا رہا ہے تو وہ یہاں نہ آتی اپنی زندگی ختم کر لیتی۔ مہر زاد، زرنگار کو یقین دلاتا ہے کہ اسے اب یہاں کوئی خطرہ نہیں.....وہ یہاں محفوظ ہے لیکن زرنگار کو اس کی کسی بات پر یقین نہیں آتا......امراؤ بیگم کو پولیس پکڑ لیتی ہے، فہد، چیف منسٹر سے ملتا ہے لیکن اسے چیف منسٹر سے مل کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ حمزہ، تگین کو بتاتا ہے کہ اس نے سیالکوٹ والا گھر ماموؤں سے خرید لیا ہے۔ بینش کی ماں اسے بتاتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کے بیٹے سے اس کا رشتہ کر رہی ہے۔ نادر، زوئی سے کہتا ہے کہ اس کے پاس ایجنسی والوں کا فون آیا تھا۔ مہر زاد، عافیہ کو ملنے کے لیے بلاتا ہے۔ مہر زاد نے عافیہ سے مل کر ان کی بدگمانی، شکوک کو ختم کر دیا تھا۔ سلیم اپنی ماں کو منع کرتا ہے کہ وہ اپنے ماموں کے گھر بینش کا رشتہ کرنے کا سوچے بھی نہ..... میرال اب وہاں رہتے ہوئے اکتانے لگی تھی۔ عافیہ، دانیال کو سمجھاتی ہیں کہ مہر زاد سے مل کر انہیں اندازہ ہوا کہ مہر زاد ویسا انسان نہیں ہے جیسی باتیں اس کے لیے مشہور کی جا رہی ہیں۔ حمزہ، اشعر سے کہتا ہے کہ اسے لگتا ہے کہ تگین گھریلو تے واریوں میں جکڑے جانے کے لیے نہیں بنی یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ نانا جان، مہر زاد خان سے کہتے ہیں کہ ان کی صرف ایک فرمائش تھی اور اگر وہ اس کمٹمنٹ سے ہٹ گیا تو بہت برا ہوگا۔ دانیال بینش کے بھائی سے ملنے آتا ہے تو اسے سمجھ آتی ہے کہ اماں، ماموں ممتاز کے بیٹے کے رشتے کا ذکر کیوں کر رہی تھی۔ دانیال، عافیہ اور جہانگیر کو بینش کے بارے میں بتاتا ہے اور اس کے گھر چلنے کا کہتا ہے۔ ایک اعلیٰ حکومتی عہدے دار اپنے ہی محافظ کی گولی سے شہید ہو جاتا ہے۔ بینش کے دونوں بھائی اپنی اماں کو دانیال کے لیے راضی کر لیتے ہیں۔ امراؤ بیگم جیل کی سیر کر کے آ جاتی ہے۔ پیٹل، مہر زاد کو اپنا استعفیٰ دے دیتی ہے۔ بینش، دانیال کے اپنے بھائیوں سے ملنے پر ان کی روشن خیالی پر حیران ہوتی ہے۔ عافیہ کے پاس میسج آتا ہے کہ وہ میرال کے استقبال کی تیاری شروع کر دیں.....فہد، علینہ کو فون کرتا ہے تو وہ اس کی باتوں سے اندازہ لگاتی ہے کہ میرال کے سلسلے میں کوئی اچھی خبر ہے۔

اب آگے پڑھیں

''جمعہ کے دن صبح دس بجے تک تم تیار ہو جانا، تمہیں آگ کے دریا کے کنارے پر بسی زندگی کی بستی تک پہنچانا ہے۔ اللہ سے میری دعا ہے کہ وہ میری مدد کرے اور رہنمائی بھی۔''

مہر زاد خان کے خصوصی نمبر سے آنے والے اس پیغام کو میرال نے تھکے ذہن اور الجھے ہوئے دل کے ساتھ وصول کیا تھا۔

''ایک سفر اور درپیش ہونے کو ہے گویا۔'' اس نے کُڑھتے ہوئے سوچا۔ ''سفر جس کی راہیں بھی انجانی ہیں اور منزل بھی نامعلوم، سفر کیا ہے چوہے اور بلی کا سا کھیل ہے، نہ بلی کے ہاتھ چوہا لگتا ہے نہ چوہے کی جان بلی سے چھوٹتی ہے۔''

''میں اب مزید کسی وی آئی پی موومنٹ کا حصہ نہیں بنوں گی، مجھے یہاں سے کہیں اور جانا ہے نہ ہی جانے کی خواہش ہے، میں اپنی باقی کی عمر اس چار دیواری سے ٹکریں مارتے ہی گزار دینا چاہتی ہوں۔'' اس نے جواب میں لکھا۔

''چلو تم سے وعدہ رہا..... یہ وی آئی پی موومنٹ نہیں ہوگی..... حالانکہ تم صرف وی آئی پی موومنٹ نہیں، وی وی وی آئی پی موومنٹ کی مستحق ہو۔'' جواب میں مہر زاد نے اس کے پیغام کے دوسرے حصے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''ہونہہ، دیکھتے ہیں یہاں سے کون جاتا ہے۔'' میرال نے غصے میں آتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ جگہ تمہیں اچھی لگی، چلو تمہیں یہاں ہی واپس آنے کے لیے ہی سہی جانا تو پڑے گا۔'' جواب آیا۔

''دیکھتے ہیں، کون جا کر واپس آتا ہے۔'' اس نے لکھا۔

''غصے میں بعض دفعہ تم بغیر سوچے سمجھے بول جاتی ہو، ہر بات یوں نہیں بول دیا کرتے، وقت کے غیظ سے ڈرنا چاہیے۔'' اس کے پیغام کے جواب میں اس بار مہر زاد کی کال آئی تھی۔

''اب ڈرنے کو رہ ہی کیا گیا ہے، کس انہونی سے ڈروں.....؟'' میرال نے تنگ کر کہا۔ ''جو کچھ ہو چکا اس سے گزرنے کے بعد سب ڈر خوف دل سے نکل چکا ہے۔''

''ہاں، یہ بھی درست ہے۔'' جواب میں وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا تھا۔ ''شاید اب تمہارے ڈرنے کا دور ختم ہوا اور میرے ڈرنے کا دور شروع ہو گیا۔''

''آپ اور ڈر.....؟'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ ''کیوں مذاق کرتے ہیں۔''

''جب تک انسان کے پاس کھونے کو بے وقعت چیزیں ہوتی ہیں وہ بے خوف رہتا ہے مگر جب کوئی قیمتی چیز اس کے ہاتھ لگ جاتی ہے تو وہ ایک پیہم خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے، ہاتھ لگی قیمتی چیز کے کھونے کا ڈر ہمہ وقت اسے آن گھیرتا ہے۔''

''میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آتیں.....'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''تم دانستہ جن باتوں کی طرف سے سمجھ کے دروازے بند کر لیتی ہو وہ کیونکر سمجھ آئیں گی..... خیر یاد رہے ایک ہزار راتوں میں سے نصف سے بھی کم گزری ہوں شاید اور تمہارا دن طلوع ہونے کو ہے، مجھے اکثر تمہاری خوش قسمتی پر رشک آتا ہے۔''

''اس سے بڑا لطیفہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔'' میرال کی ہنسی میں تلخی تھی اور شکستگی بھی۔

''تم جلد ہی مذاق اور سنجیدگی میں فرق بھی جان جاؤ گی، بہر حال جمعے کا دن یاد رکھنا، اللہ میری مدد اور

رہنمائی فرمائیے۔'' مہرزاد نے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

''اشعر جب سے سیالکوٹ سے واپس آئے ہیں، تمہارے رینووینڈ گھر کی تعریف ہی میں رطبُ اللسان رہتے ہیں۔'' حمزہ سے بہت دن پیچھے ہونے والی اس ملاقات میں نگین نے اسے کہا تھا۔

''یہ اشعر بھائی کی گریٹ نیس ہے۔'' حمزہ مسکرایا۔ ''یہ بتاؤ وہ صرف گھر کی تعریف میں ہی رطب اللسان رہتے ہیں یا تمہاری تعریف بھی کیا کرتے ہیں کبھی۔''

''ارے گھر اور میں ایک لائن میں کیسے کھڑے ہوگئے، میں گھر کی بات کر رہی ہوں درمیان میں، میں کہاں سے آگئی؟'' نگین ہنسی۔

''دونوں کا کنکشن ہے اسی لیے پوچھ رہا ہوں۔'' حمزہ سنجیدہ تھا۔ ''کیا اشعر بھائی سیالکوٹ سے واپس آکر پہلے سے مختلف رویہ نہیں دینے لگے تمہیں۔''

''کیوں، کیا وہاں کوئی بات ہوئی تھی تمہارے اور اشعر کے درمیان؟'' نگین نے قیافہ لگانے کی کوشش کی۔

''ہاں......!'' حمزہ نے سر ہلایا۔ ''میں نے اشعر بھائی سے گلہ کیا تھا کہ انہوں نے تمہیں صرف گھر گرہستی تک محدود کر رکھا ہے جبکہ تم جتنی ٹیلنٹڈ اور سمجھدار ہو تمہارے مشاغل کا دائرہ وسیع ہونا چاہیے۔''

''ہوں......'' نگین مسکرائی۔ ''جب ہی اشعر مجھ سے کہہ رہے تھے کہ انہیں لگتا ہے وہ میری قدر نہیں کر پائے۔''

''ایگزیکٹلی......'' حمزہ نے فوراً کہا۔ ''وہ واقعی تمہاری قدر نہیں کر پائے۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' نگین نے سادگی سے کہا۔ ''اشعر کو اچھی طرح پتا ہے کہ میں ان کے لیے اور ان کے گھر کے لیے کیا رول پلے کر رہی ہوں، کچھ لوگ فطری طور پر کم گو ہوتے ہیں، اپنے خیال کا اظہار نہیں کر پاتے لیکن جو جذبہ ان کے دل میں ہوتا ہے کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی عیاں ہو ہی جاتا ہے جیسے اشعر بھلے براہِ راست میری تعریف نہ کریں...... ان کی کسی نہ کسی بات سے اظہار ہو ہی جاتا ہے اور میرے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

''کتنی بھلی لوگ ہوتی ہو تم ایسی لڑکیاں بھی......'' حمزہ کو ہنسی آگئی۔ ''نان ڈیمانڈنگ...... ہمیشہ مطمئن و مسرور، کاش میں بھی ایسا ہو سکتا۔''

''تم ایسے نہیں ہو سکتے کیونکہ تم مرد ہو، جس کی فطرت ہی ڈیمانڈنگ ہوتی ہے اور کمانڈنگ بھی...... مرد کی فطرت میں یہ دو عناصر موجود نہ ہوں تو وہ مرد نہیں ہوتا۔''

''مرد نہیں ہوتا تو کیا ہوتا ہے؟''

''پھر وہ عورت اور مرد کے درمیان کی مخلوق کی کوالٹیز کا حامل بہت ہی بے چارہ انسان ہوتا ہے۔''

حمزہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''کیا بات ہے، آج خلافِ معمول بہت خوش نظر آ رہے ہو؟'' نگین چونکی...... ''میرال کا کچھ سراغ ملا کیا؟''

''دونوں سوالات کا آپس میں بظاہر تو کوئی تعلق نہیں نظر آتا پھر تم نے ایک ہی سانس میں کیوں کیے......؟'' حمزہ نے دانستہ سوال کیا۔

''یہ کاز اینڈ افیکٹ کی تھیوری کے سوال ہیں، آپس میں بظاہر تعلق نظر نہیں بھی آئے تو بھی مربوط ہیں۔'' نگین شرارت بھرے انداز میں مسکرائی۔

''گویا میرال کا سراغ ملنا میری خوشی کا کاز ہو سکتا ہے۔'' حمزہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''پچھلے ایک عرصے سے تم جتنے اس کے لیے سرگرداں ہو اور کوئی سراغ نہیں ملنے پر مایوس اور دکھی نظر آتے رہے ہو، اس صورتِ حال میں تو یقیناً۔'' نگین نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو اور میں خود بھی نہ جانتا ہوں۔'' حمزہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

''پھر بتاؤ میرال کا کچھ پتا چلا؟''

''ہاں، امید بندھی ہے، اللہ کرے یہ امیدِ نظر، سماعت اور دل کا دھوکا نہ ہو۔''

''واہ...... یہ تو بہت بڑی خبر ہے، مٹھائی کھلاؤ۔'' نگین خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''اکیلے مجھی کو نہیں، ہر اس شخص کو جو بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف، خواتین کی عزت وعصمت کی حفاظت اور بلند اخلاق و اطوار کی حمایت میں آواز بلند کرتا ہے اسے میرال کی ممکنہ بازیابی پر مٹھائی کھلانی چاہیے۔ چند سو صرف چند سو آوازوں نے اکٹھے بلند ہو کر اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے، کون کہتا ہے مسلسل گرتے پانی کے قطرے پتھروں میں سوراخ نہیں کر پاتے......؟'' حمزہ نے بلند آواز میں کہا۔

''امیزنگ......!'' نگین، حمزہ کا لہجہ سن کر متاثر ہوتے ہوئے بولی۔ ''تم تو خاصے وکل ہوگئے ہو بھائی۔''

''ہاں، میں ہو گیا ہوں کیونکہ اتفاق سے میں ایسے لوگوں سے ملنے لگا ہوں جو دعاؤں کی قبولیت کے معجزوں کی عملی تفسیر ہیں اور ایسے لوگوں کی صحبت انسان کو حوصلہ دلاتی ہے، امید اور ایمان کا پیغام دیتی ہے...... شاید میں تمہیں کبھی بتا نہ سکوں ایک صرف میرال کی تلاش نے مجھے کیسے، کیسے انوکھے تجربوں سے دوچار کرایا ہے۔'' حمزہ نے کہا۔

''مجھے نظر آ رہا ہے۔'' نگین مسکرائی۔ ''اپنی ممی کو ان باتوں کا قائل کر کے دکھاؤ گے تو معجزوں کی تاریخ میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے گا۔''

''ہا...... ہا...... ہا......'' حمزہ دل سے ہنسا۔ ''تم مجھے چیلنج کر رہی ہو؟''

''یونہی سمجھ لو...... وہ کسی گلاس فیکٹری کے مالک کی بیٹی سے تمہارا رشتہ جوڑنے کے لیے ایکسٹریملی میریس ہیں، ان کو مولڈ کر لو کہ وہ ایسا نہ کریں تو میں مان جاؤں تم نے کئی تجربے حاصل کر لیے ہیں۔'' نگین نے کہا۔

''ممی تو چلتی ہی مجھے اونچا اڑانے کے لیے ہیں، ان کی تندی کا کوئی علاج نہیں۔'' حمزہ مسکرایا۔

''دیکھ لو...... بغیر استعمال کیے ہتھیار پھینک رہے ہو۔'' نگین نے اکسایا۔

''میں نے ہتھیار پکڑے ہی نہیں جناب میں دوا کا نہیں دعا کا قائل ہو چکا ہوں اب......''

''یہ بزدلی ہے یا مصلحت پسندی؟''

''اسے ایمان کہتے ہیں محترمہ......!''

''اللہ رے بے ایمانوں کو ایمان کا شوق چرایا ہے، خیر ہو اب تو سب کی۔'' نگین ہنستی چلی گئی۔ حمزہ محظوظ ہوتے ہوئے اسے ہنستے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس روز بچپن کے وہ دو گہرے دوست ایک دوسرے کو خوش دیکھ کر بہت خوش تھے۔

☆☆☆

''ارے بابا روتی کاہے کو ہو، تمہارے رونے سے کیا بات میری سمجھ میں آجائے گی۔ بات کرو بات...... بابا آنسو تو فدوی کو کبھی سمجھ میں آئے نہ آئیں گے۔''

''میں نے کتنی بار آپ سے رابطہ کرنا چاہا، آپ تک رسائی ممکن نہیں ہوئی، خود آپ نے جب سے صاحب شہید ہوئے ہیں ہماری خیر خبر تک نہیں لی۔''

''اب تم بولو گی میں سیریس نہیں ہوتا کبھی، خود بتاؤ اپنے صاحب کو شہید کہہ رہی ہو اور میں افسوس بھی نہیں، بی بی جان تمہارے منہ سے اس کے لیے یہ لفظ جچتا نہیں، تم سے زیادہ اس کے کرتوتوں سے کون واقف ہوگا؟''

''کرتوتوں سے تو خیر میں سب ہی کے واقف ہوں، جن میں سے کئی تو شہادت کا رتبہ پا کر اپنی موت کو قوم کی حیات قرار دلوا چکے ہیں۔ یہ جو آپ کا میڈیا ہے ناں اسی کی کسوٹی پر تو موت کی آزمائش ہوتی ہے، فرسٹ اسٹیپ پر یہ جسے شہید قرار دے، دے وہ شہادت کا رتبہ پا جاتا ہے، یہ شہادت پہلے آپ کے گھر پر راج کرتی تھی اب اپنا ایک حصہ ہمیں عطا کر گئی، جب ہی تو منہ پر چڑھ گئی۔''

''ہاں تو یوں بولو ناں منہ پر چڑھ گئی، اب میڈیا یا عام لوگوں کے سامنے تو منہ پر چڑھی منہ سے نکلے تو خیر ہے سائیں...... لیکن ہم جب آپس میں بیٹھے ہوں تو یہ منہ پر جچتی نہیں۔ اس حمام میں جو ہم سب کا مشترکہ ہے سب ہی بے لباس ہیں بی بی جان...... اور ایک بات اور شہادت جو ہمارے گھر پر راج کر رہی ہے ناں بڑی کرموں والی ہے، اسی کا دیا تو کھا رہے ہیں اور اگلی نسلوں تک کھاتے رہیں گے لیکن تمہارے صاحب والا سلسلہ کچھ اور ہے، اس کی سو کالڈ شہادت آج حال کل ماضی کا قصہ بن جانے والی ہے۔ اس کی شہادت کو کیش کرانے کے خواب مت دیکھنا، نقصان میں رہو گی بابا...... وہ مرنے والا بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ اہلِ علم و دانش کا سپوت ہے تو بس اس سپوت کی شہادت پر کالم، آرٹیکلز، فیچرز اور شاید ایک آدھی کتاب تو لکھی جائے گی اور اسے ادب و ثقافت کا لیجنڈ بنا کر اس کی تصویر شیشے کے فریم میں جڑ کر چائے خانوں، کتب خانوں اور اکیڈمیز کی دیواروں پر تو لگا دی جائے گی اس سے آگے اس کی شہادت کوئی فائدہ نہیں اٹھانے والی...... بہت سمجھاتا تھا اسے نہ پھر و پر پھیلائے مرغے کی طرح مگر وہ سمجھا نہیں، کہا تھا اس کو یہ چند سال ملے ہیں جمع کر لو جتنا کر سکتے ہو آنے والے سالوں کے لیے...... مگر نہیں مانا، سائیں دیکھو، جن کو لیجنڈ بننے کا شوق ہوتا ہے ناں انہیں لیجنڈ کی ہسٹری بھی تو معلوم ہونی چاہیے ناں...... لیجنڈز کی تصویروں پر ہار پھول تو ڈالے جا سکتے ہیں ان پر روپے نہیں لٹائے جاتے، لیجنڈز کو دھن دولت سے کیا مطلب سائیں۔''

''میں سب سمجھتی ہوں صاحب......''

''ہاں میرے کو معلوم ہے تُو سب سمجھتی ہے، ایسے ہی تو تیری عقل کی داد نہیں دیتے بیٹھے یار لوگ۔''

''صاحب یہ آفیشل میٹنگ ہے، جہاں میں عدت سے اٹھ کر فریاد لے کر آئی ہوں، اِدھر تو تکار مت کریں، عزت کا سوال ہے۔''

''اوہ ہاں...... اچھا کیا یاد دلا دیا، اب بولو کیا کہنا ہے؟''

''صاحب، سرکاری رہائش گاہ کے کونے میں پڑے ہیں ہم لوگ، سینٹرل بلڈنگ میں وفاق کا نیا نمائندہ آ گیا، وفاقی حکومت کوئی مالی معاونت کرتی نظر نہیں آتی اور میرے بچے انصاف کے طلب گار ہیں ہر رات نئے چہرے انہیں نیا سبق پڑھانے آ جاتے ہیں، گرم لوہے پر چوٹ لگانے کی باتیں سناتے ہیں، وہ بچے ہیں، کانوں کے کچے ہیں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی باتوں میں آ جاتے ہیں، بہت سمجھاتی ہوں مگر ناکام ہو جاتی ہوں، سردار زادے کو سبق سکھانے کا عہد کیے بیٹھے ہیں، شمال اور جنوب کی چٹانوں میں چھپے بیٹھوں سے اندر کھاتے رابطے ہو رہے ہیں، میں بے بس ہوں میری مدد کیجیے۔''

''باپ پہ پوت پتا پر گھوڑا...... دھت تیرے کی...... بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا، بڑے فخر سے کہتا تھا اہلِ علم و دانش کی اولاد ہوں، عقل بند نکلا اور اس کے پوت وہ جو اس کا دستِ راست تھا ناں جو اکثر اس کے ساتھ آیا کرتا تھا اور ابھی پچھلے دنوں بھی آیا تھا، اس کے پیر تو مجھے پالنے میں ہی نظر آ چکے، وہ بھلا دماغ سے تھوڑی سوچتا ہے، نخوں سے سوچتا ہے، کسی اور کو تو کیا مجھے بھی چیلنج کر گیا، میں کہے دیتا ہوں اس کا آخر اچھا نہیں ہوگا، سمجھا لو اسے۔''

''بتایا تو ہے بے بس ہوں نہیں سنتا، اسی لیے تو عدت توڑ کر میڈیا سے چھپ کر رات کے اندھیروں میں آپ تک پہنچی ہوں۔''

''اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، بیٹیوں کو لے کر لندن سدھار جاؤ، وہاں اچھی بھلی پراپرٹی ہے تم لوگوں کی اور یہ نہیں تو اٹھ آؤ اِدھر ہی میرے پاس بہت جگہ ہے دل میں بھی اور گھر میں بھی۔''

''کیسے چھوڑ دوں اسے اس کے حال پر، وہ آگ میں ہاتھ ڈالنے کو تیار بیٹھا ہے۔''

''جب جلیں گے ہاتھ تو ہی پتا چلے گا ناں اس کو کہ جلنا کیا ہوتا ہے، اسے تجربہ کرنے کا شوق ہے اسے تجربہ کرنے دو...... رہا سردار زادہ تو بابا اسے چھیڑنے کی حماقت مت کرو تم لوگ، وہ ہاتھ نہیں آنے کا، اس کے اگلے قدم کو تو خود نہیں پتا ہوتا کہ کدھر کو اٹھنے والا ہے، اسے کیا پکڑو گے تم لوگ۔''

''کب چاہتی ہوں میں کہ اس پر کوئی ہاتھ ڈالے، اب باپ، بیٹوں کو ہی انتقام لینے کا سودا سمایا تھا۔''

''ارے ایک معمولی سی رکھیل کو لے کر منہ بنا کر بیٹھ گیا وہ اور جان سے بھی گیا اب یہ بیٹا تمہارا بالکل باپ کے قدموں پر قدم رکھ رہا ہے آخر برا ہوگا اس کا، میں پھر کہہ رہا ہوں......''

''وہ سردار زادے کی وجہ سے جان سے نہیں گیا، میں اور آپ تو خوب جانتے ہیں۔''

''فیس سیونگ کرنا سیکھو بی بی جان...... ! تم کو کتنا سکھانے کی کوشش کرتا ہوں، تم سیکھتی ہی نہیں۔''

''گویا کوئی حل نہیں؟''

''نہ...... بالکل نہیں......''

''پھر میں عدت ختم ہوتے ہی انہیں لے کر دبئی چل دوں گی۔''

''دائز سو وائز...... اُدھر تو اپنا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے، یہ ہی کوئی چیک اپ وِیک اپ، کوئی نجی دورہ دورہ......''

"wait will be there"

''سو سویٹ آف یو بی بی جان۔''

☆☆☆

گھر واپسی پر بینش کو جس صورتِ حال کی توقع تھی، وہ اسے نظر نہیں آئی، نہ تو بھائی پستول کے ٹریگر پر انگلی رکھے اس کے منتظر تھے نہ ہی اماں چپل پکڑے اس پر جھپٹ پڑنے کو تیار تھیں...... اماں خاموش مگر خاصے مصروف انداز میں کچن میں کام کر رہی تھیں...... دو عورتیں، جنہیں محلے والے شادی بیاہ کے مواقع پر پیسے دے کر کام کرواتے تھے گھر کی صفائی اور خصوصی برتنوں کی دُھلائی میں مصروف تھیں۔

''کوئی مہمان آنے والے ہیں اماں؟'' کچھ دیر تک خاموشی سے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد اس نے ڈرتے، ڈرتے اماں سے پوچھا۔

''بڑی تو چھنی کاکی ہے ناں...... تجھے تو پتا ہی نہیں جیسے۔'' اماں نے غصے سے کہا۔ ''کشمیریوں کے آسمان

پر سمگلوں کی جھلکی لگانے کا منصوبہ بنا کر معصومیت سے پوچھتی ہے مہمان آنے والے ہیں کیا......؟'' اماں نے منہ بنا کر بینش کی نقل اتاری...... ''آ رہے ہیں وہ تیرے لگتے لانے کوئی، وہ جو تیرے سوہرے بننے والے ہیں اور تیرے بھائیوں کو دوسری ہر بات بھولی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں ذات برادری، کنبہ، قبیلہ، پرانی رسمیں ہیں، لڑکے کا خاندان' لہور (لاہور) کے پانچ بڑے خاندانوں میں سے ایک ہے، تو دیکھ لینا بینش تجھے نوکرانی بنا کر رکھنا ہے انہوں نے...... تجھے جو بڑے چا (شوق) چڑھے ہوئے ہیں ناں تو سارے چا جاتے ہی دور ہو جانے ہیں، اپنے آسمان سے اتر کر دوسرے کے آسمان پر جا سجنے کا ارمان کرنے والے تارے بڑی بری طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ پر میں کیا کروں میری چلتی کدھر ہے، ہائے اب میں تیرے ماموں اور چاچا کو کیا منہ دکھاؤں گی، ساری برادری نے تھو تھو کرنا ہے مجھ پر...... بی صفیہ، یہ چینی کا ڈونگا ہے لوہے کا نہیں جو اتنی زور سے پٹخ رہی ہے، فرانس کا سیٹ ہے بچی چینی کا آرام سے رکھا اسے...... ان بے چاریوں کو کیا پتا برتن، برتن میں فرق ہوتا ہے یہ بے چاریاں اسٹین لیس اسٹیل کے بھانڈے (برتن) دھونے بلی (عادی) ہوتی ہیں......'' اماں کی روبینش کی متوقع سسرال والوں کے رونے، رونے سے چلتی کہیں اور بہہ گئی اور بینش کا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ اماں کے رونے کے درمیان ہی سہی اسے پوری صورت حال کا اندازہ تو ہو چکا تھا۔

''ہائے کیا اتنا بڑا کام اتنی آسانی سے بھی ہو سکتا ہے......'' اس نے اپنے کمرے میں جا کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا عکس دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ ''یوں جیسے جادو کی چھڑی چل گئی ہو، اوہ......'' اس نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں بھینچتے ہوئے اوپر دیکھا...... ''میری قسمت کی مہربان پری، تمہارا بہت شکریہ، تم نے میرے لیے شہزادہ بھیج ہی دیا، کسی دوسرے دیس کا ہی سہی...... ہے تو شہزادہ ناں اور شہزادہ بھی ایسا کہ چہار دیس میں اس جیسا کوئی نہ ہو۔''

اس شام عافیہ، جہانگیر اور دانیال بینش کے گھر پر مہمان تھے۔

''میں تو عرصہ ہوا طبقاتی فرق، ماحول کے فرق اور رہن سہن کے فرق پر یقین کرنا چھوڑ چکی ہوں، میرے لیے سب برابر ہیں، ایک جیسے انسان۔'' عافیہ نے بینش کی اماں کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے کہا تھا۔

''مگر بہن جی، آپ میں اور ہم میں بہت فرق ہے۔'' اماں نے دانیال پر نظر ڈالتے ہوئے ہچکچا کر کہا تھا۔ ''ارے واہ، یہ تو واقعی بانکا سجیلا شہزادہ ہے، ہا ممتاز کے بیٹے تو اس کے سامنے کوئی مال ہی نہیں۔'' وہ دل ہی دل میں قائل ہونے لگی تھیں۔

''ارے بہن...... آپ کیسے فرق کی بات کرتی ہیں، میری تو اپنی اوقات کان میں جھاڑو کے تنکے پہننے کی بھی نہیں، میں دولت، پیسے، ٹھاٹھ باٹھ کا فرق کیسے فرق سمجھوں۔'' عافیہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ''آپ لوگوں پر تو خدا کا بہت فضل ہے، یقین جانیں میرا یہ بیٹا اگر مجھے کسی جھونپڑی میں بھی لے جاتا اور کہتا کہ وہاں وہ لڑکی رہتی ہے جس سے یہ شادی کرنا چاہتا ہے تو میں آنکھیں بند کر کے چلی جاتی۔ اللہ نے میرے اس بیٹے کو جو ''وژن'' عطا کیا ہے بہن، اسے ہم ہی جانتے ہیں، آج ہم آپ کے در پر سوالی بن کر آئے ہیں، بس آپ خیر ڈال دیں ہماری جھولی میں۔''

''اے لو...... یہ اتنی بڑی رئیس بی بی کیسی غریب غربوں والی باتیں کرتی ہے۔'' اماں نے دل میں سوچا۔ ''کیا پتا خود بھی اس کا...... پیکا (میکا) ہمارے، تمہارے جیسا ہی ہو، جب ہی تو بیٹے کے انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں اور دیکھو تو کلیم کہتا تھا پانچ بڑے خاندانوں میں سے ایک ہے ان کا خاندان اور اس بی بی کو دیکھو، دل

(وائل) کا جوڑا پہن کر آ گئی، یہ والا پرنٹ میں نے اچھرے میں بھی دیکھا تھا۔ بائیس سو سے زیادہ قیمت نہیں اس کی، اس سے اچھا تو میرا یہ چکن کا جوڑا ہے، ساڑھے چھ ہزار کا...... اللہ اور دے میرے بیٹے اچھے سے اچھا پہناتے ہیں مجھے...... دل ہونا چاہیے بندے کا...... سچ ہے جو جتنا امیر ہوتا ہے اتنا ہی کنجوس بھی ہوتا ہے، کان، بازو، سب ننگے اس بی بی کے، میرے چار تولے کے کڑے کیسے لالچی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔'' انہوں نے آستین برابر کرتے ہوئے سوچا۔ ''لے پھر بینش شہزادہ تو تجھے مل گیا، پر دل والا نہیں لگتا، اس کی ماں تجھے جھاڑو کے تنکے ہی پہنائے گی اور کر من مانیاں، ماسے ممتاز نے تجھے سونے میں پیلا کر و پنا تھا قسمے۔'' اماں کی سوچ کے زاویے پل، پل بدلتے ہی رہے اور عافیہ جہانگیر، بینش کو سالیٹر ڈائمنڈ کی انگوٹھی پہنا کر اس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت سا پاؤچ پکڑا کر نشانی کر بھی گئیں۔ اماں کے بنائے کشمیری کھانوں کی تعریف کرتے وہ لوگ ان سے جلد ان کے ہاں آنے کا وعدہ لے کر رخصت ہو گئے۔ سلیم اور کلیم مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد خوشی کے مارے یوں گلے مل رہے تھے جیسے ان کے کاروبار کو ابھی سے جاگ لگ گئی ہو اور بینش کے تو شاید قدم ہی زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ دانیال جہانگیر سے بڑھ کر وہ اپنے لیے کیا مانگ سکتی تھی، وہ لڑکا جو قدرت کا عطیہ تھا، ایک چلتا پھرتا معجزہ تھا وہ جوان مولڈ و بینش کو بہترین سانچے میں مولڈ کر لینے کا فن جانتا تھا...... وہی تو اس کا شہزادہ تھا۔

☆☆☆

''جمعہ دوپہر ڈیڑھ بجے انشاء اللہ......'' عافیہ کے فون پر اسی نامعلوم نمبر سے پیغام موصول ہوا جس پر نہ تو

واپس کال کی جاسکتی تھی نہ ہی اس پر پیغام کا جواب جاتا تھا۔ جمعے کی صبح کو ہی ان کا بڑا بیٹا عاصم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان آرہا تھا۔

''کاش یہ جمعہ واقعی میرال کو ہمارے پاس لے آئے، ہم اس کی فیملی کی حیثیت میں اس کا استقبال کریں گے۔'' عافیہ نے سوچا اور فہد اور حمزہ کو بھی اس خبر سے مطلع کرنے میں مصروف ہوگئیں۔

☆☆☆

یشل نے مہرزاد خان کے ذاتی دفتر کی طرف سے موصول ہونے والے خیرسگالی کے تحفے، پھول اور ڈی ایچ اے میں پلاٹ کے کاغذات کی سبز فیتے میں بندھی سربہ مہر فائل وصول کرنے کے بعد حیرت سے سر جھٹکا۔ ''مہرزاد خان اور ایسا کول رسپانس!'' اسے یقین نہیں آرہا تھا جبکہ اس کا خیال تھا کہ استعفیٰ کے بعد اسے اس کے اپنے پاؤں سے کھیڑ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی یا پھر اس کے سامنے انتہائی پرکشش دانے پھینک کر اسے واپس بلانے کی سعی کی جائے گی..... پہلا خیال روایتی خوف اور دوسرا سراسر خوش فہمی کا پیدا کردہ تھا لیکن اس کے دونوں ہی خیال غلط ثابت ہوئے تھے۔ مہرزاد خان کے دفتر سے اسے باقاعدہ خدا حافظ کہہ دیا گیا تھا۔ حسب معمول ایک ایسا عمل جس کی پیش گوئی کرنا ناممکن تھا۔ مہرزاد خان، مخالفین کو معاف کردینے کا عادی تھا یا ان کے راستے میں پھول بچھا کر انہیں اپنا بنالینے کا؟ کوئی ایسا فارمولا یا پیمانہ یشل کے ہاتھ نہیں لگا تھا جو مہرزاد خان کے مخالفین کے بارے میں نقطۂ نظر اور طریقۂ عمل کو جانچ سکے لیکن جس طرح بھی وہ مخالفین کے لیے سوچتا تھا آخر میں وہ پورے منظرنامے پر چھایا ہوا ہی نظر آتا تھا۔

''لیکن میرا معاملہ مختلف ہے سردار زادہ مہرزاد خان!'' یشل نے وصول کردہ تحائف پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ ''میں تمہارے اس جیسچر آف گڈوِل، کو ممنونیت کی نظر سے نہ دیکھ پاؤں گی کیونکہ مجھے انہیں رد کرکے آگے بڑھ کر کا نتیجہ دیکھنے کا شوق ہونے لگا ہے۔ جب شکار جال میں کسی طرح بھی پھنس نہیں پاتا تو تم کیا کرتے ہو مجھے یہ دیکھنا ہے.....''

''چلو ایک promising statesman کا جادو تو تمہارے سر سے اترا۔'' اس کے استعفیٰ کی خبر پر ایک معروف تجزیہ نگار جو اس کا قریبی دوست بھی تھا، نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ لوگ جتنے بھی مختلف نظر آنے کی کوشش کریں، ان کی جڑیں، ان کی پرورش اور ان کے ذہن کی نشوونما ایک سے خطوط پر ہوئی ہوتی ہے۔ نظام کے باہر بیٹھ کر نظام بدلنے کی بات اور دعویٰ کرنا، نظام کے اندر جاکر اس کا حصہ بن جانے سے اجتناب بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ تم نے دیکھا اس نے کتنی کوشش کی مگر خود کو بچا نہیں سکا۔''

''مہرزاد خان سے میری مایوسی کی وجہ یہ نہیں کچھ اور ہے۔'' یشل نے جواب دیا۔ ''ایک ذاتی معاملے کو حل کرنے کے لیے صرف ایک ذاتی معاملے کے حل کے لیے لاکھوں کو جل دینا میرے اور اس کے اختلاف کی اصل وجہ ہے۔'' اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''ایسا بھی کیا کہ ایک فرد کے لیے کل اجتماع کو داؤ پر لگا دیا جائے اور اس ایک فرد کی خاطر اس نے اپنی موجودہ پوزیشن کو کس، کس طرح استعمال کیا، اس کی کہانی تو میں بے نقاب کروں گی۔''

''اور تمہارا خیال ہے وہ کرنے دے گا؟'' تجزیہ نگار نے ...... استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''کم از کم مجھے آنے والے وقت میں ایسا کوئی سین نظر نہیں آرہا کہ مہرزاد خان کو کوئی چیلنج کرسکے۔ نظام سے سمجھوتا کرکے

ہوئے اس نے اپنے پنجے نظام پر کچھ یوں جمالیے ہیں کہ اب تو اس کا بڑا صاحب بھی اس کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ حالیہ مثال وہ قتل ہے جسے ''شہادت'' کی چادر اوڑھا دی گئی۔ کتنوں کو معلوم ہے کہ کس کے ''اثر'' کے سامنے پرانے تعلق کو ''قربان گاہ'' پر چڑھایا گیا۔''

''یہی تو......'' یشل نے دانت پیسے۔ ''الفاظ اور القاب کی ان خودساختہ چادروں کو ہی تو ان میں پوشیدہ ''سچائیوں'' پر سے نوچ پھینکنا ہے مجھے۔''

''اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو...... مجھے تمہارا مستقبل مخدوش لگ رہا ہے، یوں بھی ہوسکتا تھا کہ پھولوں، تحائف اور پلاٹ کی فائل کے ساتھ ایک نمائشی ریوالور بھی بطور تنبیہی علامت تمہیں بھجوایا جاتا اگر ایسا نہیں ہوا تو غنیمت جانو اور اپنی زندگی انجوائے کرو...... زندگی قیمتی چیز ہے اسے اصلی ''سچائیوں'' کو بے نقاب کرنے کے شوق میں کھو دینا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

''شوق کی کوئی قیمت نہیں ہوتی انکل!'' یشل نے بال برابر بھی متاثر نہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہاں جنون کی قیمت ضرور ہوا کرتی ہے اور ادا بھی کرنی پڑتی ہے اور اس کے لیے میں تیار ہوں۔'' اس کے لہجے میں عزم تھا اور پختگی بھی......

وہ مہرزاد خان کو باور کرادینا چاہتی تھی کہ دنیا میں ایسے بھی تھے جو اس سے زیادہ سرپھرے اور موت سے بے نیاز تھے؛ ہر کسی کو خیرسگالی، دشمنی، تنبیہہ یا طاقت کے زور پر خاموش کرادینا ممکن نہیں...... مہرزاد خان کے بقول اس نے اسے پیڑ پر چڑھنا نہیں سکھایا تھا اور اب اسے ہر حال میں کسی بھی طرح پیڑ پر چڑھنا تھا۔ پیڑ سے چمٹ کر رینگ، رینگ کر، سرک، سرک کر یا پھر رسی کے سہارے......لیکن وقت کا منصوبہ اس کے منصوبے سے کتنا مختلف تھا اس کا ادراک اسے اس شام ہوا جب وہ ایک نامور بیوروکریٹ کے ہاں ہاؤس وارمنگ پارٹی پر مدعو تھی۔ رنگوں اور روشنیوں سے جگمگاتے اس نوتعمیر شدہ محل کے وسیع لان میں مدھر موسیقی کی لہریں ہوا کے سنگ سب طرف ...بکھر رہی تھیں...... بے شمار شناسا چہرے، قیمتی لباس، بیش قیمت زیورات، جدید ہیر اسٹائل اور میک اپ میں سجی خوب صورتیاں اس کے سامنے تھیں اور وہ خود بھی بہت دنوں بعد فریش موڈ میں ادھر اُدھر گفتگو میں مصروف، وقت سے لطف اٹھا رہی تھی۔ جب ہی اچانک موسیقی کی آواز مدھم ہوئی، خوش گپیاں چہ مگوئیوں میں تبدیل ہوئیں اور ہنستے مسکراتے چہروں پر عجیب سی سراسیمگی پھیلتی دکھائی دینے لگی۔

''کیا ہوا.....؟'' کسی انہونی کے احساس سے مغلوب ہوتے ہوئے اس نے بوکھلا کر کسی سے پوچھا تھا۔

''انفارمیشن منسٹر مہرزاد خان کی گاڑی پر حملہ ہوا ہے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ بچا یا نہیں......اس کا محافظ جو ڈرائیو بھی کررہا تھا کے مارے جانے کی تو مصدقہ اطلاعات آرہی ہیں۔'' اسے کس نے جواب دیا تھا یہ اُسے پتا نہیں چلا تھا مگر اسے یہ یاد تھا کہ یہ خبر سننے کے بعد رنگوں اور روشنیوں کا سیلاب تاریکی میں ڈوبنے لگا تھا۔۔ مہرزاد خان کے متعلق اسے سبق سکھا دینے کے دعوے، اڑ کر کہیں دور جا گرے تھے یا ہواؤں ہی میں بکھر کر رہ گئے تھے۔ اسے یاد تھا تو بس اتنا کہ اس کا دل مہرزاد خان کی خیریت اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ وہ تھا تو اس سے اختلاف بھی تھا، اگر وہ نہیں رہا تھا تو جو بھی اس کے بارے میں ذہن میں آرہا تھا وہ محض اس کی خوبیاں تھیں، اس کی دلیری، اس کی ذہانت، مستقل مزاجی، خاموشیوں میں چھپے طوفان، کسی عظیم سپہ سالار کی طرح سامنے سے تیر کھانے کا حوصلہ، اس کی گفتگو جس میں دلائل ہوتے، تعقل ہوتا اور دوسرے کو خود سے متفق کرلینے کا وصف بھی، چہ مگوئیوں، آئی فونز، اسمارٹ فونز، بلیک بیریز، سٹیلائٹ فونز پر اِدھر سے اُدھر معلومات منتقل ہونے کے ساتھ ساتھ چند لمحوں کی سراسیمگی کے بعد پارٹی پھر اُسی جوش سے جاری تھی...... مگر بہت دنوں کے

بعد خود کو فریش محسوس کرنے والی ییشل کا دل بیٹھا جارہا تھا۔

"کیا انسان کی صرف اتنی وقعت ہے کہ اس کے مرنے کی خبر پر بس دم بھر کو ہنگامہ رکے اور پھر سے شروع ہوجائے؟" اس نے رنگ ونور کے اس سیلاب سے گھبرا کر باہر نکلنے کے بعد سوچا تھا۔ باہر سڑکوں پر روشنیوں اور اندھیروں کے امتزاج کے درمیان زندگی رواں دواں تھی۔ اس نے اپنے فون کی اسکرین آن کی...... اس کے فون پر مختلف دوستوں کے پیغامات آئے ہوئے تھے۔

"خبریں متضاد اور کنفیوزنگ ہیں، کچھ کا خیال ہے کہ وہ مرچکا ہے مگر بتایا نہیں جارہا۔ کچھ کہہ رہے ہیں اسے غائب کردیا گیا ہے کیونکہ جائے حادثہ سے اس کی گاڑی پُراسرار طور پر غائب ہوچکی ہے لیکن اس کا ڈرائیور جو آج اس کے ساتھ دیکھا گیا تھا کی لاش سرکاری اسپتال میں وصول کی جاچکی ہے۔ عجیب پُراسرار صورت حال ہے۔" اس کی ایک دوست جو وزارتِ داخلہ سے منسلک تھی نے خبر دی تھی۔

"نہیں!" ییشل نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے ہینڈ فری پر کسی سے بات کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اسے موت نہیں آنی چاہیے، وہ بہت سوں کی طرح جاتا ہوا لگتا تھا مگر وہ بہت سوں سے مختلف تھا۔ اسے زندہ رہنا چاہیے کیونکہ اس کی زندگی سے زندگی کا ایک معجزہ مشروط ہے۔" وہ جو کہہ رہی تھی اس کا مفہوم صرف وہ جانتی تھی مگر وہ جو کہہ رہی تھی اسے کہتے ہوئے وہ پاگلوں کی طرح رو رہی تھی یہ اس کی مخاطب بھی جانتی تھی۔

☆☆☆

"نیلور سے اسلام آباد جاتے ہوئے سردارزادہ مہرزاد خان کی گاڑی پر نامعلوم افراد کا حملہ، اس حملے میں وفاقی وزیر اطلاعات ونشریات کا ذاتی ڈرائیور مجید خان مارا گیا، سردارزادہ مہرزاد خان کی اس گاڑی میں موجودگی کی تاحال تصدیق نہیں ہوسکی۔" الیکٹرانک میڈیا پر نیوز چینلز دوپہر بارہ بجے سے شام تک یہ بریکنگ نیوز اور اس پر ہونے والے تبصروں اور تجزیوں کے سوا کچھ اور پیش نہیں کرپائے تھے۔

"سردارزادہ مہرزاد خان، اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے آج رحیم یار خان میں ہیں، جس گاڑی پر حملہ ہوا اس میں صرف مجید خان موجود تھا جسے وہ گاڑی چند روز قبل ہی سردار صاحب نے تحفے کے طور پر دی تھی...... مجید خان کا کسی سے یہ ذاتی اولڈ اسکور تھا جسے آج پورا کیا گیا۔ سردارزادہ صاحب بفضلِ تعالیٰ محفوظ ہیں اور بالکل خیریت سے ہیں۔" رات گئے وزارتِ اطلاعات ونشریات کے ترجمان نے ایک پریس ریلیز جاری کرتے ہوئے کہا تھا۔

جس وقت ٹی وی چینلز اور پریس کلبز سے لے کر عام ریستورانوں، چائے خانوں اور گھروں کے لاؤنجز میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے والے عام عوام کے تبصرے جاری تھے اسی وقت اسلام آباد سے لاہور جانے والی موٹر وے پر موجود ٹریفک میں ایک عام گاڑی بھی اپنی منزل کی طرف رواں تھی جس کے سوار مجید خان کی گاڑی سے نکل کر اس دوسری عام نمبر والی گاڑی پر سوار ہوئے تھے۔ گاڑی ڈرائیو کرنے والے کے بازو پر پٹی بندھی تھی اور اس کے چہرے پر تکلیف کی شدت کے آثار بھی تھے۔ عام گاڑیوں کے درمیان چلتی یہ گاڑی یقیناً وی آئی پی موومنٹ نہیں کررہی تھی۔ اسے اپنی منزل تک پہنچنے میں اگرچہ تاخیر ہوچکی تھی مگر اسے بہرحال اسی روز وہاں پہنچنا تھا کیونکہ وہ وعدہ کیے گئے جمعے کا روز تھا۔

☆☆☆

"ان سے ملو نادر...... یہ شہباز صاحب اور ان کی بیگم ہیں......" زوئی نے گھر کے مختصر سے ڈرائنگ روم

میں بیٹھے دو مہمانوں کا نادر سے تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ......" نادر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے زوئی کی طرف دیکھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تو تھا نادر... وہ یہی شہباز صاحب ہی تو تھے جنہوں نے مجھے اور میرال کو پناہ دی تھی سیالکوٹ جاتے ہوئے۔ تمہاری ایجنسیز والے ان کے بھی پیچھے پڑے ہوئے ہیں، یہ لوگ بے چارے کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ چھپتے پھر رہے ہیں، بہت ڈرے ہوئے ہیں، یہ بہت معصوم اور سیدھے سادے لوگ ہیں۔" زوئی نے تاسف کے ساتھ بتایا تھا۔

"انہیں ہمارے گھر کا پتا کیسے معلوم ہوا......؟" نادر نے ہولتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"انہیں کیسے معلوم ہوتا تھا، میں نے خود بتا کر انہیں یہاں بلوایا ہے۔" زوئی متوقع صورتِ حال سے بے خبر بتا رہی تھی۔ "بڑی مشکل سے ان سے رابطہ ہوا تھا۔ میں نے اس روز بتایا تھا ناں تمہیں، ان کی صورتِ حال سن کر مجھے بڑا دکھ ہوا، اس لیے میں نے انہیں یہاں بلالیا۔ ہماری بیسمنٹ میں رہ لیں گے چھپنا ہی ہے ناں......"

"اوہ میرے خدا...... زوئی......" نادر کا دل چاہا وہ اپنا سر پیٹ لے۔ پچھلی مصیبت ختم نہیں ہوئی تھی زوئی نے اپنے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی کرلی تھی۔

"تم ذرا باہر آؤ۔" وہ زوئی کو گھورتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ نادر کی بداخلاقی پر شرمندہ ہوتی زوئی کمرے سے باہر آئی۔

"وہ ایجنسیز والے تمہاری جان ابھی تک نہیں چھوڑ رہے، اگرچہ وہ اس کیس سے کچھ نکال نہیں پائے لیکن وہ لوگوں کو تنگ کرنے کے عادی ہیں جانتی ہو ناں...... پھر کیا ضرورت تھی، کیا ضرورت تھی تمہیں ان لوگوں کو بھی یہاں بلالینے کی......؟" نادر زوئی کے باہر آتے ہی چیخنے لگا تھا۔

"آرام سے نادر......" زوئی گھبرا کر بولی۔

"کیا آرام سے......؟" نادر نے جھنجلا کر کہا۔ "زوئی ان لوگوں کے پیچھے بھی وہ پڑے ہوئے ہیں اور تمہارے بھی، تم تینوں ایک جگہ اکٹھے ہوجاؤ گے تو سوچو کیا نقشہ بنے گا ان کے ذہن میں، وہ کیا، کیا کڑیاں نہیں ملائیں گے۔"

"لیکن انہیں کیسے پتا چلے گا کہ یہ یہاں ہیں؟" زوئی کو نادر کی بات سمجھ آنے لگی تھی۔ پھر بھی اس نے ایک کمزور سا سوال کیا۔

"انہیں کس بات کا پتا نہیں ہوتا زوئی...... تم سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔" نادر نے بے بسی سے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"وہ پہلے کون سا ہمیں بخش رہے ہیں نادر......" زوئی نے ایک بے بس سی دلیل دینے کی کوشش کی۔

"کاہے کو جھگڑ رہے ہو اس بے چاری سے۔" نادر کی اماں نہ جانے کدھر سے ہمیشہ کی طرح زوئی کے لیے فرشتہ بن کر کمرے میں آگئیں۔

"پلیز اماں اس وقت اس کی حمایت مت کیجیے گا، آپ نہیں جانتیں اس نے......" نادر کو واقعی زوئی پر غصہ آرہا تھا۔

"میں سب سن چکی ہوں، خدا کا خوف کرو نادر، مہمان تو رحمت ہوتے ہیں، کیا پتا اسی رحمت کے باعث تمہاری جان بھی اس منحوس ماری مصیبت سے چھوٹ جائے۔ چلو زوئی چل کر مہمانوں کے کھانے پینے، سونے

کا انتظام کرتے ہیں۔" اماں، زوئی کا بازو پکڑ کر اسے باہر لے گئیں...... نادر بے چارگی سے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

اس کی آنکھیں وحشت اور دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ ہونٹ سفید پڑ رہے تھے اور بال بکھر چکے تھے، اس روز جو خونیں ڈراما وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی، اس کی دہشت سے اسے مہرزاد خان کی موجودگی بھی باہر نہیں نکال پا رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے مجید خان کو مرتے دیکھا تھا، مجید خان جو اُسے اس ٹھکانے سے لے کر چلا تھا جہاں وہ اتنے دن سے رہ رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح بار بار سوال کیا تھا وہ کہاں جا رہا ہے جاسے کہاں لے کر جایا جا رہا ہے؟ جواب میں مجید خان پہلے کی طرح...... "ہم حکم کے غلام ہیں بی بی صاحب، اشارے کے منتظر، ہمیں اس سے آگے نہ تو کچھ بولنے کی اجازت ہے نہ بتانے کی۔"

اس روز مجید خان نے اسے یہ بھی تو بتایا تھا کہ اس بار اس کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کا حکم نہیں دیا گیا اور وہ کسی ائرپورٹ کی طرف بھی نہیں لے جائی جائے گی، اسے یاد تھا صرف اپنا ذہن بٹانے کی خاطر اس نے مجید خان سے پوچھا تھا کہ اس کے کتنے بچے تھے اور اس کی فیملی کہاں رہتی تھی۔ مجید خان نے یہ بھی بتایا تھا کہ اسے نوکری سے آزادی مل چکی تھی اور میرال کو بتائی گئی منزل پر پہنچانا اس کا آخری ٹاسک تھا، اس کے بعد وہ اپنے بیوی، بچوں کے پاس جانے والا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اس نے مجید خان سے اس دوسرے شخص کے بارے میں پوچھا تھا جس کی باتیں اس نے آنکھوں پر پٹی باندھ کر کیے جانے والے سفر کے دوران سنی تھیں۔ مجید خان نے اسے بتایا تھا کہ وہ دوسرا شخص اپنے عزم میں کامیاب رہا تھا اور اپنا ٹاسک پورا کر چکا تھا۔ کون سا ٹاسک اور کیا ٹاسک اس کی نشان دہی اس نے نہیں کی تھی۔ وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ جب گاڑی پر فائرنگ شروع ہوئی تھی۔ گاڑی کے پہیے برسٹ کر گئے اور گاڑی کے رکنے پر نہ جانے کیسے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا گیا تھا، مجید خان اکیلا اور نہتا تھا۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی تھی مگر وہ کیا اور کتنی مزاحمت کرتا...... اس کے سر اور گردن میں گولی لگتے اس نے خود دیکھا تھا، خون کی دھاریں مجید خان کے سر اور گردن سے پھوٹی تھیں اور پل کی پل میں وہ خون میں نہا کر دوسری سیٹ پر جا گرا تھا۔ میرال کو یاد آیا کہ وہ کلمہ پڑھ چکی تھی جب اس کی سائڈ کا دروازہ کھول کر کسی نے اسے باہر کھینچا تھا اور ایک پل کے ہزارویں حصے میں وہ کسی دوسری گاڑی میں پھینک دی گئی تھی۔ اس کا سر کسی چیز سے ٹکرانے سے وہ بے ہوش ہوئی تھی یا خوف اور صدمے سے یہ اسے یاد نہیں تھا...... مگر جب اس کی آنکھ کھلی وہ ایک گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لیٹی ہوئی تھی اور اس گاڑی کو کوئی اور نہیں خود مہرزاد خان چلا رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے پچھلا پورا منظر گھوم گیا تھا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے...... وہ سب کیا تھا؟" اس نے ہوش میں آتے ہی اٹھ کر پوچھا تھا۔

"وہ وہی تھا جس کا مجھے ڈر تھا۔ وہی جس سے بچنے کی خاطر میں نے اتنا سادہ پلان بنایا کہ جس کی کسی کو خبر ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا...... لیکن غلطی میری ہی تھی، میں بھول گیا تھا کہ سانپ کا بیٹا سنپولیا ہوتا ہے اور سنپولیے کی صفات بھی سانپ سے کم نہیں ہوتیں۔" وہ بغیر تمہید باندھے بولا تھا۔ "مگر ہے ناں سنپولیا، صرف دودھ پر پلنے والا سنپولیا...... بھول گیا کہ سنپولیے کے لیے تو صرف نیولا ہی کافی ہوتا ہے، پلان بی کا دھوکا کھا گیا، پلان اے اس کے وہم میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔"

"یہ سب کیا ہے، میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی......؟" وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی تھی۔ مجید خان اسے پھر سے یاد آیا۔ "مجید خان کہاں ہے، اس کا کیا بنا؟"

"مر گیا......" وہ تلخی سے بولا۔ "اسے بھی اپنی سی کرنے کی مار پڑی، لاکھ سمجھایا تھا چھوٹی گاڑی پر نکلنا اسے منسٹر کی عطا کردہ گاڑی کا خمار چڑھا تھا عین وقت پر ارادہ بدل گیا، نیت کے فتور کی سزا پا گیا احمق۔"

"وہ مر گیا اور آپ یہ بات اتنی آسانی سے کہہ رہے ہیں۔" میرال کی آنکھیں وحشت زدہ ہوئیں اور پھر مہرزاد خان کے بازو پر ٹک گئیں جس پر بندھی پٹی سے خون ابھی تک رِس رہا تھا یوں جیسے عجلت میں ادھوری اور بیکار سی فرسٹ ایڈ لینے کے بعد اس کی پروا ہی نہیں کی ہو۔ ایک ہی دن میں ایسے جیتے جاگتے انسانی خون کو یوں بہتے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہوئے جا رہے تھے۔

"ایک اچھے بھلے صحت مند انسان کا یوں مر جانا آپ کے لیے معمولی بات ہے کیا......؟" اس نے وحشت زدہ انداز میں کہا۔

"میرے لیے اس وقت سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم بچ گئیں؟ تمہارے دفاع میں، میں خود بھی مر جاتا تو یہ اتنی ہی آسان بات ہوتی جتنی مجید خان کے مرنے کی ہے۔" اس نے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی نظروں سے میرال کی نظریں ٹکرائی تھیں اور اسے جیسے ایک دھچکا سا لگا تھا۔ اس شخص کی نظروں میں کیا تھا...... سوال تھے...... جواب تھے...... کہانیاں تھیں...... قصے تھے...... داستانیں تھیں...... فسانے تھے...... کیا تھا جس نے اسے فوری طور پر نظریں چرا لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ہم لاہور شہر میں داخل ہو چکے ہیں۔" اس کی آواز گاڑی میں گونجی تھی۔ "نہ جانے کتنے عرصے کے بعد خود کسی پروٹوکول کے بغیر گاڑی ڈرائیو کر کے یہاں پہنچا ہوں، بہت سے پرانے وقت یاد آ گئے۔"

میرال نے بے ساختہ کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی، کھڑکی کے شیشے سیاہ تھے، ونڈ اسکرین کا اوپری حصہ بھی سیاہ تھا اور نیچے کا شیشہ ٹنڈ تھا۔

"آپ کی نیلی سٹی میری رہنمائی کر رہی ہے، میں آپ کے پیچھے ہی آ رہا ہوں۔" پھر اس نے فون پر کسی سے کہا تھا۔ اگلے آدھے گھنٹے تک صبر آزما خاموشی چھائی رہی اور پھر جیسے گاڑی کسی عمارت میں داخل ہو رہی تھی۔ گیٹ کھلنے کی آواز میرال نے خود سنی تھی۔ کسی ایک جگہ جا کر گاڑی رک گئی تھی اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر مہرزاد خان باہر نکلا تھا۔

"ہم نے حادثے کی خبر سنی، میرا تو دم اوپر کا اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔" ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ میرال کے کان کھڑے ہو گئے۔ "اب کیا ہونے والا ہے؟" پھر اس کی سائڈ کا دروازہ کھولا گیا اور مہرزاد خان نے اندر جھانک کر اس سے کہا۔

"باہر آ جاؤ میرال، تم آگ کے دریا کے کنارے بسی بستی تک پہنچ چکی ہو، یہاں جہاں زندگی اپنی تمام تر خوب صورتیوں کے ساتھ بسی نظر آئے گی۔"

وہ اس سے نظریں ملائے، اس کی طرف دیکھے بغیر کسی معمول کی طرح گاڑی سے باہر نکل آئی تھی۔ یہ ایک وسیع اور عالی شان گھر کا ڈرائیو وے تھا۔ جس پر اس کے سامنے کتنے ہی لوگ کھڑے تھے۔ اس کے قدموں تلے سرخ قالین بچھا تھا اور سامنے کھڑے لوگوں کے ہاتھ میں پھولوں کے گلدستے تھے، ان کی آنکھوں میں محبت تھی، آنسو تھے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"ویلکم بیک میرال...... ویلکم بیک ٹو لائف......" ایک ہنستی مسکراتی لڑکی اور ایک بڑی عمر کی خاتون نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ سب چہرے اس نے پہلے بھی دیکھ رکھے تھے، کہاں...... خواب

میں......یاخیال میں......اس کا ذہن ایک بار پھر ماؤف ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

"its so heartening to know that you are ok" اُس کو موصول ہونے والی لاتعداد کالز اور پیغامات میں ایک پیغام یشل رئیس کا بھی تھا۔ جسے پڑھ کر وہ زیرِلب مسکرایا تھا۔

"its so heart'ening to know that you are happy on the sur)vival of a so called black sheep"

اُس نے اسی وقت یشل کے نمبر پر واپس جواب بھیجا تھا اور یہ واحد جواب تھا جو اس نے اپنی خیریت دریافت کرنے والے کسی پیغام پر بھیجا تھا۔

☆☆☆

"میں عافیہ جہانگیر ہوں اور یہ میرے ہزبینڈ جہانگیر سہگل......"

"میں عاصم جہانگیر اور یہ میری وائف شاندانہ......"

"مجھے دانیال جہانگیر کہتے ہیں۔"

"میں حمزہ محمود ہوں۔"

"اور میں فہد صدیقی......"

ان سب نے جو اس کے سامنے بیٹھے تھے اپنا تعارف اس سے کروایا تھا، شاید ان میں سے کوئی چہرہ بھی نامانوس نہیں تھا مگر شاید وہ سب کے سب اجنبی تھے۔ فاصلے پر کھڑے اجنبی اور اس کمرے میں موجود فقط ایک ہی بہت مانوس چہرہ اس کے بالکل ساتھ کھڑا تھا۔

"عافیہ آنٹی......!" بواجی کی وہ حادثاتی سہیلی جنہیں صوفی صاحب جیسے مشترکہ نکتے نے آپس میں ملایا۔

"دانیال جہانگیر......" وہ لڑکا جسے کئی برس پیچھے اس نے بے حس و حرکت اسپتال کے بیڈ پر زندگی بچانے والی مشینوں سے جڑے دیکھا تھا اور جس کے بارے میں اس نے فتویٰ دیا تھا کہ اگر وہ بچ گیا تو اس نئے دور کا frankenstein ہی بنے گا۔

"حمزہ محمود......" وہ مسکین طبع، کم گو لڑکا جو بواجی کی بچپن کی سہیلی بی اماں کے ساتھ ان کے گھر ایبٹ آباد آیا کرتا تھا۔ جو بہت ذہین تھا اور اسے مضمون لکھ کر دیا کرتا تھا۔

"فہد صدیقی......" اس کے بچپن کا دوست، ٹینس کورٹ کا ساتھی، ذہین، لائق، ایکٹو، بریلینٹ اسٹوڈنٹ فہد صدیقی جس سے آگے نکلنے کی کوشش میں وہ بے حال ہو، ہو جایا کرتی تھی۔

وہ سب اس کے سامنے موجود تھے اور ان کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ سب اسے ہی تلاش کرتے ایک فورم پر اکٹھے ہوئے تھے۔

"آپ فکر نہیں کریں بی بی، میرال کی حفاظت کے لیے ہم نے خصوصی دعا کی ہے، یہ زندگی کی ہر مشکل اور ہر امتحان سے یوں نکلے گی جیسے مکھن سے بال نکلتا ہے۔ اسے ایسی، ایسی جگہ سے مدد اور محبت ملے گی جہاں سے اس کا یہ تصور بھی نہ کر سکتی ہوگی۔" صوفی صاحب نے بواجی سے فرمایا تھا، آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے بہے چلے جا رہے تھے، یہ آنسو ان اذیتوں کی یاد کے تھے جن سے وہ گزری تھی یا ان راحتوں کے شکرانے کے جن سے وہ اس روز دوچار ہوئی تھی۔ کیا واقعی یہ وہ بستی تھی جو آگ کے دریا کے دوسرے کنارے پر بستی تھی اور

جہاں زندگی اپنی تمام تر خوب صورتیوں کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے بے یقینی سے ان سب کو دیکھا تھا۔ کیا اب زندگی میں کوئی امتحان، آزمائش، کڑا وقت اور اذیت نہ ہوگی....؟ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہاں ان میں سے کوئی بھی چہرہ نامانوس نہیں تھا مگر ایک عجیب سی اجنبیت کا احساس تھا۔ ایسے میں کمرے میں موجود صرف ایک چہرہ ہی مانوس لگ رہا تھا اور وہی چہرہ اسے اپنے ساتھ بھی کھڑا محسوس ہو رہا تھا اور وہ چہرہ مہرزاد خان کا چہرہ تھا۔

☆☆☆

”میں نے آپ سے کہا تھا صاحب، فریاد کی تھی آپ سے کہ وہ میرے بچوں کو ورغلا رہے ہیں، میرے بچے انجان اور ناتجربے کار ہیں انہیں سمجھائیں۔ آپ نے ان سے کچھ نہیں کہا، دیکھا وہ اس معصوم کو ورغلا کر اٹھا لے گئے۔“

”وہ کسی کے کہنے میں تھا کہاں بی بی جان.....؟ اس کا آخر اچھا نہیں ہوگا اسے سمجھاؤ کہا تھا ناں دیکھا وہی ہوا..... اب ہاتھ جلیں گے تو جانے گا کہ تپش کیا ہوتی ہے۔“

”نہ کہیں ایسا، اللہ کا واسطہ ہے اس کا پتا لگائیں۔“

”ارے میں کیسے پتا لگا سکتا ہوں بی بی جان، وہ تو بابا اپنے دوستوں کے پاس ہے، جن کو نوٹوں کی پوٹلیاں دکھا کر بولتا تھا، سردار زادے کو اُڑا دو..... ارے میں نے کہا تھا ناں اس سردار زادے کے تو اپنے قدموں کو بھی خبر نہیں ہوتی انہوں نے کدھر کو اٹھنا ہے، کھا گیا ناں دھوکا ایک گاڑی کے میک سے، عقل بند، آنکھوں کا اندھا، یہ نہ جان سکا کہ وہ اتنا معصوم ہے کہ اپنی ہی گاڑی کو عام آمد و رفت والی ٹریفک میں ڈال دے گا، اس کے ہاتھ کیا آیا ایک ڈرائیور کی لاش اور اپنا اغوا برائے تاوان..... بڑے ہی اعلیٰ قسم کے اُلو تھے دونوں باپ، بیٹے چچ..... چچ..... اہلِ علم و دانش کی اولادیں بے چاری۔“

”آپ کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، آپ بارگیننگ کروا دیں پلیز.....“

”کس سے بارگیننگ کروا دوں بابا..... سردار زادے سے.....؟ نہ سائیں نہ..... اسے تو چھیڑنے سے میرے کو خود کو ڈر لگنے لگا ہے۔ پیسہ دے کر حملہ کروانے والوں کے ہاتھوں تمہارا بیٹا اٹھوا دیا اس نے، میں تو حیران ہوں کا ہے کا ناشتا کرتا ہے یہ خبیث کی اولاد جو ایسا ذہن پایا اس نے۔“

”پلیز..... آپ بات کریں، آپ بات کروا دیں..... میرا بلڈ پریشر شوٹ کر چکا ہے۔ ہارٹ بیٹ نارمل نہیں رہی۔“

”ہاں ناں ایسا ہی ہونا تھا تمہارے ساتھ، گھسیاروں کے ساتھ رہو گی تو گھاس ہی کاٹنے کو ملے گی، کتنا کہا تھا کہ اِدھر آ جاؤ، بہت جگہ ہے دل میں اور گھر میں بھی۔“

”موقع ہی کہاں ملا، کہیں آنے جانے کو..... ابھی سوچ رہی تھی کہ یہ ہو گیا، اللہ کا واسطہ بات کروا دیں۔“

”ارے بی بی جان تم تو ایسے بول رہی ہو بات کروا دیں جیسے اِدھر ہی کہیں پڑا ہے میرے آس پاس۔“

”یہ aspect بھی rule out نہیں کیا جا سکتا۔“

”اچھا..... اب تم بھی مجھے چیلنج کرنے پر اتر آئیں..... اپنے miserably ended شوہر اور اپنے دام میں آنے والے صیاد بیٹے کا انجام بھول گئیں کیا.....؟“

”نہیں، میں نہیں بھولی..... جانتی ہوں کہ اس وقت قبلۂ عالم کا اقبال بلندیوں کی انتہا پر ہے۔“

”وائز لیڈی، چلو شاباش پریس کانفرنس کرو، واویلا مچاؤ، مارچ کرو ڈیزائنرز سوٹ پہن کر اپنے جیسی لیڈیز کے ساتھ، جو جوڑے اپنے ہزبینڈ کی تعزیت کے دنوں کے لیے تم نے معروف ڈیزائنرز سے سلوائے تھے ان کی

ایک لاٹ مجھے معلوم ہے لیٹ ڈیلیور ہوئی تھی، بس سمجھو ان کو پہننے کا خوب موقع ہاتھ آیا ہے، پہن ڈالو ایک، ایک کر کے سب، تمہارا بیٹا جن کا مہمان ہے وہ لاکھوں میں نہیں کروڑوں پر ٹلیں گے۔ لہٰذا فی الحال صرف شور مچانے پر اکتفا کرو، اسے اپنی حماقتوں کی سزا کاٹنے دو۔“

”بات سنیں صاحب، بات سنیں۔“

”ہاہاہا..... لائن آف ہو گئی..... کیا بات سنوں..... اب تم ایسے ڈھلتے سورج کی بابا..... آسمانوں پر نئے، نئے سورج چمک رہے ہیں، اُدھر کو نظر نہ کروں اور تمہاری سنوں..... تمہارے احمق بیٹے کو جس حویلی میں ان کے حوالے کیا گیا ہے، وہ تو برسوں نہیں نظر آنے والا تمہیں سوائے اسکائپ کے..... ارے عیاشی کرنے دو اسے وہاں..... مہمان ہے مہمان وہ بھی بہترین میزبانوں کا..... ہاہاہا۔“

☆☆☆

”تم میرا سامنا کرنے سے بچنے کے لیے مجھ سے فرار حاصل کرتے رہے ہو ناں..... لو میں آج خود تمہارے سامنے آ گئی ہوں۔ شہروں کے درمیان اب فاصلے ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ ایک سابقہ منسٹر کی بیوی اور ایک موجودہ منسٹر کی ماں کے لیے تو یہ فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے، ہیں ناں.....؟“ مہرزاد نے اپنی اماں کے دبنگ انداز میں کہے الفاظ سنے اور آنکھیں بند کر لیں۔

”یاد کرو کتنے مہینے گزرے میری تمہاری آخری ملاقات کو..... کتنی بار تم علاقے میں آئے اور مجھ سے ملے بغیر مردانے ہی میں وقت گزار کے واپس چلے گئے، کس بات کی شرم ہے مہرزاد خاناں جو ماں کا سامنا کرنے سے روکتی ہے تمہیں؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ میری مصروفیت سے واقف ہیں۔“

”میں تمہاری مصروفیت سے واقف ہوں، پوری دنیا کے لیے چوبیس گھنٹے حاضر اور ماں کے لیے کسی بھی دن کا ایک لمحہ بھی نہیں، تم جانتے ہو ناں ماں حجرے سے نکلنے کی عادی نہیں، سوچا ہوگا کہ نہیں جاؤں گا تو سارا دن ملاقات نہیں ہوگی۔“

”ایسی بات نہیں ہے، آپ جانتی ہیں میں اتنا برا نہیں ہوں۔“

”میں نے برے کا لفظ استعمال نہیں کیا، میں ماں ہوں خاناں تمہاری، سوچو جب ماموں جان نے مجھے فون پر بتایا ہوگا کہ تمہاری زندگی کو خطرہ ہے اور مجھ سے کہا ہوگا کہ بیٹے کی جوانی پر ترس نہیں آتا تو میرے دل پر کیا گزری ہوگی..... میں نے کتنی بار تم سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی مگر تم نے بات نہیں کی، نتیجہ دیکھ لیا کیسے ٹی وی کی اسکرینوں پر تم پر حملے کی خبریں چل رہی ہیں۔ ماں کی ممتا کا امتحان لیتے ہو کیا، دیکھ لو پھر ماں اپنی ممتا سمیت امتحان دینے خود آ کر تمہارے سامنے کھڑی ہے، اب بتاؤ کدھر بھاگو گے؟“

”کس نے کہا کہ میں بھاگ رہا ہوں، آپ سے بھاگ کر کدھر جاؤں گا۔“ مہرزاد نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”بھاگ ہی تو رہے تھے میں نے آ لیا۔“ وہ بولیں۔

”وہم ہے آپ کا۔“

”وہم تو میرے دل میں نہ جانے کیا، کیا آتے ہیں، مہرزاد خاناں کیوں پچھاڑ دیتا ہے برادری کو، قبیلے کو وعدہ کر لینے کے بعد۔“

یہ وہ سوال تھا جس سے وہ بچنا چاہتا تھا مگر وہ اس کے سامنے بیٹھی پوچھ رہی تھیں۔ ”دنیا کا ایک نہ ایک شخص ضرور آپ کا چوبے دان ثابت ہوتا ہے، اس سے کیسے بچا جائے ؟“ اس نے سوچا تھا۔

”میں نے برادری سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔“ وہ دانستہ رکھائی سے بولا تھا۔

”تم نے مجھ سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ تم نے برادری سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا، ٹھیک ہے تم صرف اپنے کام نکلوانا جانتے ہو۔“ وہ ڈانٹنے کے انداز میں بولیں...... ”اور وہ بھی ایک رکھیل کے لیے۔“

”اماں پلیز......“ وہ بے اختیار بولا۔

”یاد کرو خاناں میں نے تمہیں کہا تھا نہ آؤ اس سیاست میں، بھاگ جاؤ، تم نے کہا نہیں بھاگوں گا ہرگز نہیں، اسی میں رہ کر اسی سے مختلف بن کر دکھاؤں گا...... بتاؤ کہا تھا کہ نہیں؟“

”میرا اب تک کا ریکارڈ دیکھ لیں، مجھے اپنی بات پوری کرنے کے لیے زیادہ تردّد نہیں کرنا پڑا۔“ وہ بھاری آواز میں بولا۔

”میں نے کہا تھا وعدہ کرو...... اپنی سیج پر خاندانی لڑکی لاؤ گے......“

”میں ایسا ہی کرنے والا ہوں، وعدہ خلافی کا کوئی ارادہ نہیں میرا۔“

”وہ لڑکی...؟ جس کے لیے تم نے اپنی آن، بان، نام، عزت، خاندان، قبیلہ، برادری سب داؤ پر لگا دیا...... جسے طوائفوں کے گروہ سے نکال کر لائے ہو، جس کے ساتھ نکاح کے بغیر راتیں گزارتے رہے ہو؟“ وہ گرجی تھیں۔

”بس اماں جان......!“ اب کے اس کی برداشت سے بات باہر ہوگئی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ”بہتر ہوتا کہ آپ کے رپورٹرز جو خبریں آپ کو دیتے ہیں ان کو منہ سے نکالنے سے پہلے اپنے بیٹے سے پوچھ لیتیں...... مجھ سے بات تو کر لیتیں، کیا میرا آپ پر کوئی حق نہیں ہے؟“ اس نے ان کی طرف دیکھا۔ ”کیا آپ مجھے اتنا چھوٹا اور گرا ہوا سمجھ سکتی ہیں؟“

”مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت تب ہوتی اگر میں خود جا کر گدی کی مسند کو نشانی نہ ڈال آئی ہوتی۔“

”وہ آپ کا اپنا فیصلہ تھا...... میرا اس میں دخل نہیں۔“

”میرا ہی سہی...... تمہیں میرا فیصلہ اپنانے سے انکار رہا، قبیلہ تمہارے سامنے ڈٹ گیا، وہی قبیلہ جو تمہارے پیچھے کھڑا تھا۔ سامنے ڈٹ گیا...... ارے ایسے نکمے چالباز نکلو گے تم، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ باتیں تو بڑے، بڑے سپہ سالاروں کی کرتے تھے اور نکلے اتنے احمق کہ اپنوں کو بھی دشمن بنا لیا۔“ وہ یقیناً اس کی ایموشنل برین واشنگ کرنا چاہ رہی تھیں۔ ”ایک جھلک تو دکھا دی ناں انہوں نے تمہیں اپنی...... کل تک تمہاری گاڑی پر حملے کے چرچے ہیں...... ہزار منہ ہزار باتیں ہیں۔“

”وہ حملہ ان بزدلوں نے نہیں کیا تھا۔ جس نے کیا تھا اس کے ساتھیوں کا چہرہ دکھا دوں تو دنگ رہ جائیں آپ۔“ وہ اپنی آواز کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے تمہاری سیاستوں میں کوئی دلچسپی نہیں مہرزاد، میرے لیے صرف ایک چیز اہم ہے اور وہ تمہاری زندگی ہے۔“ انہوں نے حسبِ توقع اس کی بات پر غور کیے بغیر کہا۔ ”ماموں جان مجھے بتا چکے ہیں، اگر تم اویس خان کے گھر شادی کے فیصلے سے پیچھے ہٹتے ہو تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے، میری بوڑھی مامتا اور کمزور ہاتھوں پر رحم کرو خاناں...... میرے پاس تمہارے علاوہ کوئی دوسری قیمتی متاع نہیں ہے۔“

”آئی ایم سوری اماں جان......! یہ میں نہیں کرسکتا، آپ کوئی اور حکم سنا دیں، میں بلا چون و چرا...... مان جاؤں گا مگر اویس خان کی بہن سے شادی ناممکن بات ہے۔“ مہرزاد اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”میں نے تمہاری جان کی امان مانگی ہے ان سے مہرزاد خان اور اس کی صرف یہی ایک صورت ہے۔“ وہ اپنی لرزتی آواز کو مضبوط بنانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن اس میں ناکام ثابت ہو رہی تھیں، ان کی آواز بھیگنے لگی تھی۔

”آپ میرے ساتھ آئیں۔“ مہرزاد نے کہا اور انہیں سہارا دے کر چلاتا ہوا اپنے بیڈروم میں لے آیا۔ وہ اس کے بیڈ پر بیٹھی تھیں اور ان کے سامنے کاغذات اور تصویروں کا ایک ڈھیر تھا، وہ اپنی نظروں سے اس لڑکی کی تصویریں دیکھ رہی تھیں جو اُن کی نظر میں خاندانی تھی، شریف تھی اور جس کے بطن سے پیدا ہونے والی پاک، صاف نسل ان کے خوابوں کی تعبیر بننے والی تھی۔

”آپ جس خواہش کو لے کر کریم خان کے گھر پہنچی تھیں اور جس کو پورا کرنے کا آپ نے مجھ سے بھی وعدہ لیا تھا...... کیا یہ لڑکی اس خواہش کو اس خواب کو پورا کرے گی؟“ ان کی نظروں کے سامنے رکھی تصویروں کو ہاتھ میں اٹھا کر واپس پھینکتے ہوئے مہرزاد نے کہا تھا۔

”میں نیک آدمی نہیں ہوں، مجھ میں ہر عام کم عمل انسان والی خصوصیات موجود ہیں مگر یہ......“ اس نے تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ طوق جو آپ میرے گلے میں لٹکانا چاہتی ہیں اس سے تو وہ موت ہی اچھی ہے جو اویس خان اور قبیلہ مجھے انکار کی صورت میں دینے والا ہے۔“

”ٹھیک ہے......“ وہ کسی زومبی کی طرح نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولیں، ان کی نظریں اب بھی تصویروں پر جمی تھیں۔ ”ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی اس سارے کھیل کو جو تمہاری گاڑی پر حملہ کرنے کے لیے کھیلا گیا...... ٹھیک ہے۔“ انہوں نے سر اٹھا کر مہرزاد خان کی طرف دیکھا۔ ”نہ کرو اس مہ جبیں سے شادی...... مگر ابھی تم نے مجھ سے کہا اس کے علاوہ جو کہوں گی مانو گے۔“

”بالکل مانوں گا......“ وہ سر سے ایک بڑا بوجھ اتر جانے کی خوشی میں سرشار تھا...... اپنی کہی بات کا اعادہ کرتے ہوئے اس نے لمحے بھر کے لیے بھی نہیں سوچا کہ ان کا دوسرا حکم اس پر کیسا کڑا پڑنے والا ہے۔

”اگر مجھے دل سے ماں سمجھتے ہو اور ماں کے احترام کو واجب جانتے ہو تو وعدہ کرو تم اُس لڑکی سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے جس کی وجہ سے یہ سارا فساد پڑا۔“ وہ کہہ رہی تھیں اور مہرزاد کی سماعت اچانک جواب دینے لگی تھی۔

”یہ کیسی شرط ہے؟“ اس کے منہ سے الفاظ بہ مشکل نکلے تھے۔

”یہ شرط نہیں ہے، یہ ایک ماں کی التجا ہے۔“ ان کی آواز کانپنے لگی۔ ”اسے ساتھ لگائے رکھو گے، اس کی قربت میں سکون ڈھونڈو گے، اس سے نسل بڑھانے کی خواہش کرو گے تو کچھ بھی ہونے سے پہلے، پہلے قدم پر ہی خاک و خون میں لوٹ جاؤ گے، قبیلہ نہ اِدھر ہلنے دے گا نہ اُدھر۔“

”میں قبیلے کو فیس کرنے کی ہمت رکھتا ہوں اماں جی!“

”ہمت کو چھوڑو تم قبیلے کی فطرت سے واقف نہیں ہو۔“ وہ کمزور لہجے میں بولیں۔ ”انہوں نے اس بات کو انا کا مسئلہ بنا لیا ہے، قبیلے کی، برادری کی کوئی لڑکی نہیں تو وہ بھی نہیں بلکہ اگر دس لڑکیاں قبیلے اور برادری سے بیاہ کر اپنے حجرے بسا لو تو پھر بھی وہ نہیں آسکتی تمہاری زندگی میں جس کی خاطر تم قول سے پھرے تھے۔“ ان کی آواز کپکپانے لگی۔

”یہ شاہ مات تھی یا چیک میٹ کی صرف کال تھی۔“ اس کا زیرک ذہن لمحوں میں کیلکولیٹ کرنے

میں مصروف ہوا۔

''دیکھ خاناں......!'' اماں نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑے۔ ''یہ میرے ہاتھ دیکھ، میں ماں ہوں تیری۔ میری ان آنکھوں نے ان کی نسلوں کی تاریخ کو دیکھ رکھا ہے، تو لاکھ پہلو بچائے گا ان کی ضد کی مار تیرا پیچھا کرے گی، نہ رول اپنی جوانی کو، اس پر ترس کھا، مجھ پر ترس کھا، میں تیرا غم سہنے کے قابل نہیں، میں بہت سے رشتے پہلے ہی گنوا بیٹھی ہوں، اب میں تجھے کھونے کا حوصلہ نہیں کرسکتی، چھوڑ دے مہرزاد خاناں بھول جا...... بھول جا کہ کوئی ایسی بھی تیری زندگی میں آئی تھی جس کی تو نے چاہ کی تھی...... چاہت کو پانے کی کوشش کرے گا تو جان کو کھو دے گا...... جان گئی تو گئی جان نہ اس کے کام کی نہ میرے کام کی...... میں بڑھیا تکتی رہوں گی اور وہ بیرا گن خون رنگ سفید دوپٹا اوڑھے خاک میں رُلے گی۔ چھوڑ دے ضد، بھول جا خاناں...... ماں کی التجا نہ سہی، ماں کا حکم مان کر ہی بھول جا۔''

وہ کہہ رہی تھیں اور مہرزاد خان سن رہا تھا۔ جس کی خاطر ساری دنیا کو چکمہ دے آیا تھا، ماں کے چند جملوں نے اس کے حصول کی خواہش کو اپنا شکار بنا کر چاروں شانے چت گرا دیا تھا۔ وہ ماں تھیں انہیں اندھے تیر چلانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ انہیں تو صرف ایک حکم سنا دینا ہی کافی تھا اور دنیا کے کسی عظیم ترین سپہ سالار نے بھی ماں کے حکم کو کسی ڈھال پر روکنے کا گر سیکھا تھا نہ سکھایا تھا۔

☆☆☆

''میں نے تم سے کہا تھا ناں دانیال...... کہ مہرزاد خان کی گفتگو میں مجھے سچائی نظر آتی ہے۔ اس نے بغیر کسی شعوری کوشش کے میرے لاشعور کو قائل کرلیا کہ ہمیں اسے اتنا وقت دینا چاہیے جو وہ مانگ رہا تھا۔'' عافیہ نے دانیال سے کہا تھا۔

''اور تم میرال...... یقین کرلو کہ مہرزاد خان ہی صوفی صاحب کی وہ دعا ہے جو انہوں نے تمہارے حق میں اپنے رب کے ہاں مانگی تھی۔'' انہوں نے میرال کی طرف دیکھا تھا۔

''میں کیا کہوں، کیا بولوں، زندگی کے زنداں سے نکلی ہوں تو آزاد فضا کی سانسوں نے مجھے، میرے اعصاب کو اور میری سوچ کو حق وق کر رکھا ہے، میں کن حالات سے گزرتی رہی، مشکل میں پڑتی رہی، آزمائش سے بچتی رہی، آزمائش سے نکلتی رہی، نئی مشکل میں پڑتی رہی مگر ہر نئے مرحلے سے یوں نکل جیسے مکھن سے بال اور پھر مجھ پر وہ کڑا وقت بھی آیا جب میں نے ہر مصیبت کی وجہ مہرزاد خان کو گرداننا شروع کردیا...... میں سدا کی ناشکری، محسن کش اور بڑے بول بولنے والی اپنے طعنے اور بدگمانی کے جال سے زندگی کی اتنی مار کھا کر بھی نہ نکل سکی، اپنے پر پڑنے والی آزمائشوں کے رونے روتے، کبھی ان سے بے بس ہوکر خودکشی کے منصوبے بناتے کبھی شکست خوردہ انداز میں ان سے مصالحت کرلینے کا عزم کرتے ہوئے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان سب حالات سے باہر تقدیر میرے لیے کیا تدبیر کررہی ہے، برے سے برے حالات میں بھی بچاؤ کی ایک ڈھال اچانک کیسے اور کہاں سے میرے سامنے آتی رہی، بچاؤ کی وہ ڈھال تھی کہ بواجی کی لگن یا صوفی صاحب کی دعا یا پھر مہرزاد خان کی محبت......'' سوچتے، سوچتے اس نقطے پر پہنچ کر جیسے اسے ایک زوردار جھٹکا لگا......

''مہرزاد کی محبت'' اس نے سیدھی ہوکر بیٹھتے ہوئے گلاس وال سے باہر دیکھا، عافیہ کے گھر کے لان میں اندھیرا اتر رہا تھا اور وسیع لان میں جا بجا لگے آرائشی قمقمے روشن ہورہے تھے، لان سے پار دور گیٹ پر باوردی گارڈ مستعد کھڑے تھے، یہ خصوصی گارڈ مہرزاد خان کی طرف سے بھجوائے گئے تھے۔ اسے میرال کی عافیہ کے گھر

میں موجودگی کے سلسلے میں تحفظات تھے اسی لیے یہ خصوصی فورس یہاں بھجوائی گئی تھی۔

''ایک گھر، چند بہت اپنے لوگ، ایک پُرکیف دپُرسکون زندگی۔'' پھر اس نے اس کمرے کے چاروں کونوں پر نظر ڈالی جس میں وہ بیٹھی تھی۔ مغرب کی اذان کی آواز سنتے ہی عافیہ اور دانیال نماز کے لیے اٹھ گئے تھے۔ ''خواب وخیال ہوچکے تھے وہ احساسات جن کا اب کبھی تصور بھی نہیں آیا تھا۔ کس طرح ممکن بن کر میری زندگی میں واپس آگئے۔'' دانیال نے اسے اس کی تلاش کے سلسلے میں اپنی ایک، ایک کوشش کا حال سنایا تھا۔ حمزہ نے اسے بتایا تھا اسے کیسے خبر ہوئی وہ غائب ہوچکی تھی اور پھر کیسے اس کا دل ودماغ اس کی جستجو میں لگ گیا۔ فہد نے علینہ اور نادیہ آنٹی سے ری یونین اور پھر اپنے دل کا احوال اسے تفصیل سے سنایا۔ کون اقتدار کے ایوانوں تک اس کی کھوج میں پہنچا، کون خفیہ ایجنسیوں پر پانی کی طرح پیسہ لٹاتا رہا، کس کس طریقے سے اس کے لیے مہم چلائی جاتی رہی۔ ''یہ سب کس طرح ممکن ہوا۔'' اس نے سوچا۔ ''کس نے دنیا کے مختلف حصوں میں بیٹھے ان لوگوں کے ذہنوں میں میرا خیال ڈالا...... کس نے ان سب کو میری طرف موڑا۔''

''یہ سب بارگاہِ الٰہی سے جاری ہونے والے احکامات کا کرشمہ ہے۔'' عافیہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ ''انسان دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے، اپنی درخواست بارگاہِ الٰہی میں رجسٹر کراتا ہے، دعا مانگتے وقت انسانوں کے دلوں کے احساسات کم وبیش ایک سے ہی ہوتے ہیں مگر کچھ لوگ اپنی ریاضت، اپنی عبادت اور اپنی سعی کے نتیجے میں اس بارگاہ میں دوسرے انسانوں کی نسبت زیادہ خصوصیت سے سنے جاتے ہیں کیونکہ ان کا اور محبوب کا رشتہ دوسرے انسانوں کی نسبت زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ تمہاری بواجی تمہارے لیے پریشان تھیں، انہوں نے صوفی صاحب سے دعا کے لیے کہا، صوفی صاحب محبت تھے اور محبوب سے ان کا رشتہ گہرا تھا، اسی لیے مجھے یقین ہے ان کی دعا قبولیت سے سنی گئی، جب ہی تو ہم سب ایک نکتے پر اکٹھے ہوئے، جب ہی تو...... مہرزاد خان جیسے شخص نے تمہیں اپنی زندگی میں مرکزی حیثیت دے دی، یہ ہم سب خود نہیں کررہے تھے، ہم سے کروایا جارہا تھا۔ کائنات کا سارا نظام علت اور معلول کے قانون پر چل رہا ہے، جب ہی تمہارے لیے دعا کے معلول ہم اور علت تمہاری آزمائش بنی۔''

وہ ششدر بیٹھی عافیہ کی باتیں سن رہی تھی۔

''پھر تم اگر غور سے دیکھو تو تمہیں ہم مرکزی کرداروں کے علاوہ اس سلسلے میں ایک مہین سی چلمن بناتے اور لوگ بھی نظر آئیں گے۔ بینش، علینہ، نگین، زرقی، نادرا اور نہ جانے کتنے ہی اور...... ان سب کو بھی ایک چلمن میں تمہاری علت نے باندھا...... مجھ پر تو یہ سلسلہ خود ایسے گزرا ہے کہ نظر کے سامنے اب کوئی راز، راز نہیں رہا، میرے بیٹے دانیال کے حادثے اور اس کے بعد ہونے والے واقعات نے میری اور میری فیملی کی آنکھیں کھول کر رکھ دیں، مجھ سے زیادہ اس معاملے کو کون سمجھ سکتا ہے۔'' آنکھیں تو میرال کی بھی کھل گئی تھیں، ایک، ایک کرکے اپنی زندگی کا ہر واقعہ یاد آرہا تھا، کیسے وہ بواجی کو ستاتی اور اپنی قسمت پر شکوہ کناں رہتی تھی، کیسے ہر مثبت میں سے منفی پہلو ڈھونڈ نکالا کرتی تھی اور کیسے اسے اس کی کم مائیگی کا، بے بسی کا، بے چارگی کا آئینہ دکھایا گیا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم وہ اپنے کردار میں عموماً کیسا ہے مگر تمہارے لیے وہ خصوصاً فرشتہ ثابت ہوا۔'' حمزہ نے مہرزاد خان کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس پر کیچڑ اچھلتی دیکھی ہے، تمہارے لیے بنایا گیا وہ صفحہ جو ہم سب چلا رہے تھے اور جسے اب ڈی ایکٹو کردیا گیا ہے، اس پر لوگوں کی زبانیں لپلپاتی تھیں اور لفظ اس کی پگڑی اچھالتے تھے اور

اس کے ہاتھ میں ان ہی سب چیزوں کا کنٹرول تھا، کوئی اور ہوتا تو ہم سب کو ایسا غائب کرواتا کہ ہمارا نام ونشان تک نہیں ملتا مگر اس نے خود کو داغ دار کر کے تمہیں داغ دار ہونے سے بچائے رکھا۔‘‘ فہد نے کہا تھا۔

’’میرے لیے کسی پاکستانی سیاست دان کا یہ کردار ایک انوکھا تجربہ ہے، جو خوشگوار ہونے کے ساتھ ساتھ حیرت کا باعث بھی ثابت ہو رہا ہے۔‘‘ عافیہ کے بڑے بیٹے عاصم نے کہا تھا۔

’’جو کچھ بھی ہو گزرا، وہ ماضی۔ اور اب حقیقت یہ ہے کہ تم آزاد ہو اور ہم سب تمہارے ہر فیصلے میں تمہارے ساتھ ہیں۔‘‘ عاصم کی بیوی شاندانہ نے کہا تھا۔

’’میرا فیصلہ......؟‘‘ میرال نے سوچا تھا۔ ’’اس کے فیصلے سے مشروط ہے جو میرے لیے صوفی صاحب کی دعا ثابت ہوا۔‘‘ چند دن کے اندر جانوروں کی سی صفات رکھنے والا، مکمل ترین انسان بن چکا تھا، وہ وہی تھا جسے دیکھ کر اور جس کی باتیں سن کر وہ کہانیاں کہنے اور سننے پر تیار ہوئی تھی، وہی تھا جس کے کہنے پر اس نے اپنے کارڈ میز پر رکھ دیے تھے۔ وہ اس کے لیے کہاں اور کیسے، کیسے ڈھال بنا...... اس کی نابینا نظر کو اب بینائی ملی تھی۔ وہ جیسے ایک طویل خوفناک خواب سے جاگی تھی۔

☆☆☆

’’مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔‘‘ اسی ہفتے ایک دن مہرزاد خان نے عافیہ سے بات کی تھی۔

’’بیٹا میں نے تمہاری نظروں میں اس کے لیے جو جذبہ دیکھا تھا اور جس فکر کے ساتھ تم نے اس کی عزت و عصمت کی حفاظت کا اہتمام کیا، وہ کوئی اور ہی کہانی سنا رہے تھے، میں نے اسے بیٹی کہا ہی نہیں، میں اس کی ماں بن کر دکھاؤں گی، تمہارے جیسے شخص کا ساتھ اپنی بیٹی کے لیے قبول کرتے ہوئے مجھ سے زیادہ خوش شاید ہی کوئی اور ہو۔‘‘ عافیہ نے ہی مہرزاد خان سے یہ بات چھیڑی تھی۔

’’شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔‘‘ اس کے جواب نے عافیہ کو حیران کر دیا تھا۔

’’میں میرال کو زر نگار کے ’’کلوک‘‘ سے نکال کر باہر لانے والا، میں اس کی عزت و عصمت کی حفاظت کے لیے لانگ ٹرم پلاننگ کرنے والا، میں ہی اس کے لیے دل میں شدت سے ایک جذبہ محسوس کرنے کے باوجود اس کے اپنے اختیار میں ہوتے ہوئے اپنے خدا سے اپنے نفس کی سرکشی دبا دینے کی دعا کرنے والا، میں ہی اسے ایک باعزت زندگی میں واپسی کے راستے تراش کے، تلاش کے دینے والا شخص ہوں اور میں ہی کروڑوں انسانوں کے ہجوم میں کسی بھی فورم پر کھڑے ہو کر اس کی عزت و عصمت کی پاکیزگی کی قسم کھا کے گواہی دینے کو بھی تیار ہوں گا لیکن اس کا حصول، اس پر اختیار، اس کا ساتھ میرا مقسوم نہیں ہے۔‘‘ وہ کہہ رہا تھا۔ ’’میرے راستے جنون کے راستے ہیں، جو کٹھن اور مشکل ہیں۔ میرے ساتھ میں اس کے لیے عزت اور معتبری مقدر نہیں ہوگی کیونکہ میرے کوچے اور میرے بازار کے رنگ ڈھنگ ہی اور ہیں...... میں اسے مزید دکھ اور کٹھنائیاں سہتے نہیں دیکھ سکوں گا کیونکہ میری راہ خار دار ہے اور اس کے پیر تو پہلے ہی آبلہ پا ہیں، آپ سے میری درخواست ہے کہ کسی بہت اچھے...... بہت قدر کرنے والے انسان سے اس کی شادی کروا دیں، میرا دل اور میری سوچ اس سے دست بردار ہوئے۔‘‘

عافیہ کی سماعت پر جیسے بم برس رہے تھے، ان کا خیال تھا میرال کو یوں باعزت طور پر ان کے حوالے کرنے کے پیچھے مہرزاد خاندان کا ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا اور وہ یہ ہی تھا کہ وہ اسے ایک معتبر گھر کے سائے سے اپنے ساتھ رخصت کروا لے، جس منظر میں وہ جیتا تھا وہاں اپنے سروائیول کے لیے اس کا ایسا کرنا ضروری

تھا...... لیکن وہ تو میرال صلاح الدین سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہی ہو گیا۔

’’شاید اس نے ٹھیک فیصلہ کیا، ہمارے، تمہارے اور ان نادیدہ لوگوں کے ہاتھوں جو میرال کے سلسلے میں انوالو رہے میرال کا وجود، ایک شک بن کر سامنے آیا ہے، اگر مہرزاد خان اسے اپناتا ہے تو شاید شک کے اس بیج کو اپنے کیریئر کے پورٹ فولیو سے نکال نہ پائے، ایسا ہوتا ہے تو نقصان سراسر میرال کا ہے، وہ باقی کی عمر ایک سوالیہ نشان بن کر جیے گی کیا؟‘‘ جہانگیر نے عافیہ کی زبانی مہرزاد کی بات سن کر کہا۔ ’’مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ مہرزاد خان، میرال سے اپنی محبت کی شدت کا ایک اور ثبوت دے رہا ہے، وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ محبت ایسے عظیم جذبے پر کالم نگاروں کے قلم سیاہ الفاظ اگلیں اور لیڈنگ میگزین چٹ پٹی، سنسنی خیزی سے بھرپور اسٹوریز بنا کر پیش کریں۔ میرے دل میں مہرزاد خان کی عزت و احترام میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔‘‘

’’لیکن اگر میرال کا وجود ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا...... اور ہم سب کی گواہیاں بھی اس کا دفاع نہیں کر پائیں گی تو پھر اسے کون جی دار اپنائے گا؟‘‘ عافیہ نے ان سب سے سوال کیا جو اُن کے ساتھ میرال کی بازیابی مہم میں شامل تھے۔

’’میں......‘‘ سب سے پہلے حمزہ محمود کا جواب آیا تھا اور فوری طور پر آیا تھا۔

’’میں اور تہ دل سے۔‘‘ فہد صدیقی نے کہا تھا۔ ’’اور مجھے اس پر فخر محسوس ہوگا۔‘‘

’’اگر کوئی اتنی ہمت نہیں کرتا تو ہم میرال کو اپنے ساتھ امریکا لے جائیں گے، وہاں اس کے لیے باعزت زندگی میں واپسی کے زیادہ چانسز ہوں گے۔‘‘ عاصم اور شاندانہ نے کہا تھا۔

عافیہ نے پوری صورتِ حال بلا کم و کاست میرال کے سامنے رکھ دی تھی۔ مہرزاد خان کے جواب نے میرال کے دل کو چند ثانیوں کے لیے دھڑکنا بھلا دیا تھا۔

’’شاید وہ ٹھیک کہتا ہے۔‘‘ پھر وہ ٹرانس کی سی کیفیت میں بولی تھی۔ ’’میں جیسی ہوں، ویسی لڑکی اسے ڈیزرو ہی نہیں کرتی...... اسے میری ناشکریوں اور ناگزاریوں کی سزا ہی بن جاتا تھا، رسائی کے اتنا قریب اور رسائی سے میلوں دور...... خوش قسمتی نے میرے ہی سر کا ہما بن جانے کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ناں......‘‘ اس کا لہجہ بھیگنے لگا تھا۔

’’گلہ مت کرنا بیٹا، شکوہ مت کرنا۔‘‘ عافیہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ ’’دیکھو وہ اپنی limits کا ذکر کرتے ہوئے تم سے دست بردار ہونے کا کہہ رہا ہے، نہ تو تم سے محبت کا انکار ہے نہ تمہاری پاکیزگی پر کسی شک کا اظہار ہے۔‘‘

’’میری اوقات کی یاد دہانی تو ہے ناں...... انسانی ہمدردی کا جذبہ اپنی جگہ، اپنی عزت، انا اور خودداری کی حفاظت ایک مختلف معاملہ ہے۔‘‘ میرال کے لہجے میں ایک مرتبہ پھر تلخی عود کر آئی۔

’’پھر گلہ، وہی شکوے شکایتیں؟‘‘ عافیہ نے اسے تنبیہہ کی۔ ’’اس کے الفاظ یاد کرو، میں اسے ڈیزرو نہیں کرتا اور غور کرو کہ وہ تمہیں کس مقام پر رکھتا ہے، ورنہ تم تو اس کے اختیار میں تھیں وہ جو چاہے کر سکتا تھا تمہارے ساتھ...... مگر تم نے دیکھا کیچڑ اس پر اچھلی، داغ دار بھی وہ ہوا...... وہ بھی کس کے لیے، کس کی خاطر......؟‘‘

میرال نے عافیہ کی بات سنی اور خاموش ہو گئی۔

’’ہم کسی کے اندرونی معاملات کو نہیں جانتے ہیں بیٹا۔ اور جب علم نہیں تو سوال بھی نہیں کرنے چاہئیں، گلے بھی نہیں کرنے چاہئیں۔ تم تصویر کا دوسرا رخ بھی تو دیکھو...... مہرزاد تو تمہاری عصمت کی پاکیزگی کا خود گواہ

ہے مگر حمزہ اور فہد کے لیے یہ صرف کانوں سنی باتیں ہیں، ان کے اعتبار کا عالم تو دیکھو، بغیر کسی حیل وحجت وہ تم سے شادی کرنے کو تیار ہیں، کیا یہ اللہ کا خصوصی کرم نہیں تم پر؟" عافیہ کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ میرال کو کس طرح سمجھائیں۔

شاید وہ میرال کے محسوسات کو سمجھ نہیں پائی تھیں، مہرزاد کا وجود، مہرزاد کا سایہ اور پھر اس سائے سے بے دلی..... شاید میرال کسی اور کے لیے سوچنے کے قابل ہی نہیں رہ چکی تھی۔

"میں علینہ بات کر رہی ہوں میرال۔" انہی دنوں اسے علینہ کا فون آیا تھا۔ "فہد سے تمہارے بارے میں معلوم ہوا، شکر اللہ کا تم مل گئیں، فہد کو تمہارے لیے اتنا پریشان دیکھ کر..... مجھے تو تم پر بہت رشک آتا تھا تم خوش قسمت ہو میرال کھو کر بھی مل گئیں ہم ایسے کہ سامنے موجود ہو کر بھی نظر نہیں آتے۔" میرال نے علینہ کی طویل گفتگو کا نچوڑ نکالا تھا اور اسے اس لڑکی کی کہی اصل بات سمجھنے میں ذرا بھی وقت نہیں لگا تھا۔ وہ بات جو علینہ نے کہی ہی نہیں تھی اور کہہ بھی گئی تھی۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ میں ضرور ہی شادی کرلوں، کیا میں ایسے ہی زندگی نہیں گزار سکتی؟" اس نے عافیہ سے پوچھا تھا۔

"ہاں یہ ضروری ہے، میں جلد از جلد تمہیں اس معاشرے میں باعزت مقام پر دیکھنا چاہتی ہوں..... اور باعزت مقام کسی باعزت شخص کے ساتھ ہی میں ہے، زندگی کے اتنے بھیانک تجربوں نے تمہیں اتنا تو سکھایا ہی ہوگا۔" عافیہ نے جواب دیا تھا۔

☆☆☆

وزارت اطلاعات ونشریات سے ایک رپورٹ کی سمری ایوانِ صدر میں وزیراعظم کے تائیدی دستخطوں کے ساتھ بھجوائی گئی تھی، اس سمری میں چند سفارشات درج تھیں، ایوانِ صدر سے یہ سمری منظوری پا کر ری ڈائریکٹ کردی گئی تھی۔

☆☆☆

کسی نے کال بیل پر انگلی رکھی تھی اور پھر جیسے اپنی انگلی اٹھانا ہی بھول گیا تھا۔ زوئی، نادر اور اماں گھر کے پچھلے صحن میں مولسری کے درخت کے نیچے چارپائی بچھائے بیٹھے تھے۔

"دیکھ لے نادر..... بیل شارٹ ہے کوئی اس کے ساتھ چپڑ (چمٹ) تو نہیں گیا بیچارہ بدقسمت....." اماں نے نادر کو اٹھ کر دیکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ نادر اٹھ کر گیٹ تک گیا تھا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔

"میں دیکھتی ہوں۔" زوئی نے کچھ دیر انتظار کرتے رہنے کے بعد کہا۔

"تم دیکھو میں اس بے چارے شہباز صاحب کو کچھ کھانے کو دے آؤں، غم اور فکر نے بے چارے کو گھر سے بے گھر بھی کردیا اور شوگر، بلڈ پریشر جیسی بیماریاں بھی لگادیں۔ نہ کرنی کی سزا پا رہے ہیں، بے چارے دونوں۔" اماں بھی زوئی کے پیچھے آتے ہوئے بولیں۔

"کون ہے نادر؟" زوئی نے برآمدے میں کھڑے ہو کر بلند آواز میں پوچھا، نادر نے مڑ کر دیکھا..... زوئی کا رنگ فق ہوگیا..... نادر کے سامنے خفیہ ایجنسی کے وہی تین چہرے موجود تھے، جنہوں نے اِس گزرے وقت میں خود کو زوئی اور نادر کی جان کا جنجال بنا رکھا تھا۔

جاری ہے

واپسی

فرح طاہر قریشی



"اتنا لیٹ..... میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں کہاں تھیں تم.....؟" بے تابی سے کہتی وہ اسے دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھی تھی۔

"اگر آج میں لیٹ ہوگئی تھی تو تم چلی آتیں میرے پاس....." اس کی بے تابی دیکھ کر وہ مسکراتی ہوئی اس کے نزدیک ہوئی تھی۔

"کیوں.....؟ میں کیوں چلی آتی..... تم شاید بھول رہی ہو، ہمارے درمیان یہ طے ہے کہ ایک دن تم

میرے گھر آؤ گی تو اگلے دن میں تمہارے گھر...... آج تم نے آنا تھا تو میں کیوں چلی آتی؟" اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"تم تو اس طرح کہہ رہی ہو جیسے تم صدرِ پاکستان ہو اور میں وزیر......" اسے ساتھ لیے ہوئے وہ بیڈ پر بیٹھ چکی تھی۔

صوفیہ اسے یوں ہنستے دیکھ کر منہ پھلا کر چہرے کا رخ موڑ گئی۔

"اچھا بابا...... سوری، تم ناراض مت ہو۔" ثمینہ اسے منانے کی کوشش کرنے لگی۔ ان دونوں کی دوستی ایسی ہی تھی...... پل میں ناراض ہو جانا تو پل میں مان جانا...... وہ دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں...... دونوں کے درمیان شروع سے اتنی محبت تھی گویا "یک جان دو قالب......" دونوں کے گھر بھی ساتھ ساتھ تھے، گھروں کی طرح مکینوں کے آپس کے تعلقات بھی اچھے تھے۔ ان کی اتنی دوستی سے ہر فرد واقف تھا اسی لیے کسی تیسرے نے ان کے درمیان آنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی...... نہ ہی بڑوں نے ان کی دوستی پر کسی قسم کا کوئی اعتراض کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی دوستی مزید گہری ہوتی چلی گئی۔

دسویں جماعت تک دونوں نے تعلیم بھی ایک ہی اسکول سے ایک ساتھ حاصل کی مگر دسویں کے بعد صوفیہ کو گھریلو ذمے داریوں کی وجہ سے تعلیم کے سلسلے کو روکنا پڑا جبکہ ثمینہ نے اپنی تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھا اور کالج میں داخلہ لے لیا۔ کالج سے واپس آ کر وہ سب سے پہلے ثمینہ سے ملتی، دن بھر کی روداد اس کے گوش گزار کرتی پھر کسی دوسری طرف توجہ کرتی...... یہ ان کی شروع سے عادت تھی اسی لیے ان کی اس عادت پر گھر والوں نے کبھی اعتراض نہیں کیا تھا...... صوفیہ کبھی کالج نہیں گئی تھی مگر ثمینہ کی بدولت وہ وہاں کی ہر ایک چیز سے واقف تھی۔ اب ثمینہ چاہتی تھی کہ صوفیہ اس کے ساتھ اس کے کالج چلے تاکہ وہ اس کی وہاں اپنے کلاس فیلو اور دوست رمیز سے ملاقات کروا سکے...... جسے ثمینہ حد سے زیادہ پسند کرتی تھی...... بقول ثمینہ، رمیز بھی اسے اتنا ہی پسند کرتا ہے جتنا کہ وہ اسے...... صوفیہ نے اس کے ساتھ جانے کی اگر حامی نہیں بھری تھی تو انکار بھی نہیں کیا تھا...... نہ جانے کیوں اسے رمیز کا ثمینہ کی زندگی میں آ جانا پسند نہیں آیا تھا...... وہ اپنے اور ثمینہ کے گھریلو ماحول سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسی لیے چاہتی تھی کہ ثمینہ اس طرح کی کسی بھی راہ پر مزید قدم آگے نہ بڑھائے...... اسی لیے پہلے دن جب ثمینہ نے اسے رمیز کے متعلق بتایا تو اس نے اسے اس سب سے باز رکھنا چاہا...... اور بہت آرام سے اسے سمجھانا چاہا۔

"ثمینہ یہ تم کیا بے وقوفی کرنے جا رہی ہو، تمہارے گھر والوں نے تم پر اعتبار و بھروسا کر کے تمہیں لڑکوں کے ساتھ کالج میں پڑھنے کی اجازت دی ہے، تمہاری توجہ صرف تمہاری پڑھائی کی طرف ہونی چاہیے...... ان خرافات میں پڑ کر تم کیوں اپنے گھر والوں کا اعتبار توڑنا چاہتی ہو......؟" اس کے انداز میں اس کے لیے بہت زیادہ فکر تھی۔ مگر ثمینہ جو ہمیشہ اس کی ہر بات کو حکم سمجھ کر مان جایا کرتی تھی پہلی بار اس سے اختلاف کرنے لگی۔

"اس سب میں اعتبار کو ٹھیس پہنچانے کی بات کہاں سے آ گئی؟ مجھے رمیز سے محبت ہے میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں...... اور خود وہ بھی......" کچھ توقف کے بعد وہ مزید گویا ہوئی...... "رہے گھر والے تو مجھے یقین ہے وہ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں وہ میری پسند سے انکار نہیں کریں گے...... اور اگر کیا بھی تو میں انہیں منا لوں گی۔"

اس کے انداز میں اب یقین تھا جسے محسوس کر کے صوفیہ خاموش ہو گئی...... وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ اس کی پیاری سہیلی کے سر پر محبت کا بھوت چڑھ چکا ہے

جس حالت میں وہ اس کی کوئی بات کبھی نہیں سمجھے گی...... تب اس نے یہی سوچا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ثمینہ کو اپنی بات پر قائل کر لے گی اسے اس راہ سے واپس لے آئے گی...... مگر یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ثمینہ پہلے سے کہیں زیادہ رمیز کے لیے سیریس ہوتی گئی۔ صوفیہ اس کے لیے بہت پریشان تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ رمیز اس سے کس حد تک سنجیدہ ہے...... مگر اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی عزیز از جان سہیلی کو کس طرح سمجھائے...... ثمینہ کی دیوانگی اسے ہر وقت پریشان رکھنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آج وہ لیٹ ہوئی تو وہ اس کے لیے فکر مند ہو گئی تھی۔

"ایک تو میں تب سے اتنا پریشان ہوں جب سے تم نے کہا ہے کہ تم گھر میں رمیز کا بتاؤ گی، اوپر سے آج ملنے بھی نہیں آئیں...... کب سے طرح طرح کے وسوسے دل کو پریشان کیے جا رہے تھے......" اس نے انتظار کے لمحات کو یاد کر کے ... بے ساختہ جھرجھری لی تھی۔

"اب میں کیا کہوں...... تمہارا اپنا دماغ شیطان کا گھر ہے جو اس طرح کی باتیں سوچے جاتی ہو......" ثمینہ نے بے پروائی سے کہا تھا۔

"اچھا چھوڑو...... تم بتاؤ، تم نے گھر میں بات کی......؟" وہ ساری ناراضی بھلائے اس کی طرف مکمل توجہ سے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں......"

"مگر کیوں......؟ اس سے پہلے کہ میں امی سے کچھ کہتی انہوں نے مجھ سے نعیمہ خالہ کے بیٹے کے رشتے کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا......" منہ لٹکائے اس نے بتایا تھا۔

"وہی نعیمہ خالہ ناں...... جن کا بیٹا بینک میں منیجر ہے......؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"ہاں وہی......" اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

"واہ...... یہ تو بہت اچھا رشتہ ہے، نعیمہ خالہ بھی تم سے اتنی محبت کرتی ہیں، تمہیں خوش رکھیں گی......" صوفیہ کے انداز میں دبا دبا جوش تھا مگر ثمینہ کو اس کا انداز ناگوار گزرا۔

"تم پاگل ہو گیا......؟ سب جانتے ہوئے بھی اس طرح کی بات کر رہی ہو...... مجھے صرف رمیز سے شادی کرنی ہے بس......" اس کا انداز حتمی تھا۔

"تو پھر اب تم کیا کرو گی......؟" صوفیہ کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں ابھریں۔

"امی نے مجھے سوچنے کے لیے وقت دیا ہے...... ویسے سوچنا تو مجھے کچھ نہیں ہے، اگلی بار جب وہ بات کریں گی تو میں انہیں رمیز کا بتا دوں گی۔"

"کیا ایسا کرنا ٹھیک رہے گا؟" صوفیہ نے اچانک ایسا سوال کیا تھا۔

"ٹھیک ہے یا نہیں مگر میں ایسا ہی کروں گی......" وہ اپنے ارادوں میں پختہ دکھائی دے رہی تھی۔ جب صوفیہ نے اس سے ایک اور سوال کیا۔

"تم آنٹی جی کو رمیز کا کیا بتاؤ گی......؟ کیا اس نے تمہیں شادی کی آفر کی ہے......؟ اس نے اپنے والدین کو تمہاری طرف بھیجنے کے متعلق کچھ کہا......؟"

"نہیں ابھی اس نے ایسا تو کچھ نہیں کہا......" ثمینہ نا سمجھی کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"شادی کی آفر بھی نہیں کی؟"

"نہیں...... ابھی تک تو نہیں کی......" اس کے پے در پے سوالوں نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

"پھر تو یہ سب بڑا ہی عجیب ہے......"

"کیا مطلب ہے تمہارا......؟" ثمینہ نے تیزی سے پوچھا تھا۔

"مطلب تو کوئی نہیں سوائے اس کے کہ تم اپنے ساتھ نادانی کر رہی ہو......"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو، صاف کہو......" ناگواری کی چند ایک سلوٹیں اس کی پیشانی پر نمودار

ہوئی تھیں۔

''میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں ثمینہ کہ اس لڑکے نے نہ تو کبھی تم سے محبت کا اظہار کیا اور نہ ہی تمہیں شادی کی کوئی آفر کی...... اس سب کے باوجود تم اس کی محبت میں اس حد تک اندھی ہو چکی ہو کہ تمہیں میری کوئی بات سمجھ ہی نہیں آرہی ہے۔ سب کچھ تم نے خود ہی طے کرلیا ہے ایسا کیوں......؟'' وہ استفہامیہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''سب کچھ میں نے خود ہی طے نہیں کرلیا ہے یار...... اس نے شروع دن سے مجھے جو اہمیت دی ہے وہ کسی اور کو نہیں دی...... وہ مجھے پسند کرتا ہے اور اس کا اعتراف وہ برملا کرتا ہے...... اور پھر جس کو پسند کیا جاتا ہے اسی سے محبت کی جاتی ہے...... تم نہ جانے کیوں ہمیشہ اس کے خلاف بولتی ہو......!'' اس کی بات سن کر صوفیہ نے فوراً کہا تھا۔

''یہ تمہیں کس نے کہہ دیا کہ جس کو پسند کیا جائے اسی سے محبت بھی کی جاتی ہے؟ یہ لازمی تو نہیں ہے ہر پسندیدہ چیز سے محبت نہیں ہوتی......''

''تم کیا جانو محبت کے بارے میں، کبھی کی ہو تو معلوم ہو......'' ثمینہ نے اپنے انداز میں کہا جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔

''ہاں میں نے محبت نہیں کی...... مگر میں تمہاری طرح بے وقوف بھی نہیں ہوں...... اتنا تو سمجھتی ہوں جو محبت کرتا ہے وہ اس کا اظہار برملا کرتا ہے...... جیسے تمہارا وہ رمیز تم نے پسندیدگی کا اظہار برملا کرتا ہے...... تو پھر وہ محبت کا اظہار کرتے کیوں ڈرتا ہے......؟ بقول تمہارے 'وہ امیر ہے، بے باک ہے، حد سے زیادہ منہ پھٹ ہے' تو اس سب کے باوجود وہ ابھی تک چپ کیوں ہے۔ اس کی پسندیدگی کو تم محبت کا نام کیوں دیتی ہو......؟'' وہ گھر پر رہتی تھی مگر ثمینہ سے زیادہ سمجھداری کی باتیں کررہی تھی۔ ''تم نے خود بتایا اس کی تمہارے علاوہ اور بھی بہت سی لڑکیوں سے دوستی ہے تو ان لڑکیوں میں سے بھی تو وہ کسی کو پسند کرتا ہی ہوگا...... اس بارے میں تم کیا کہوگی......؟''

''تم بات کو غلط رنگ مت دو صوفیہ...... اس نے ان لڑکیوں کے لیے کبھی اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا......'' اس کے خیالات جان کر ثمینہ ایک دم جھنجلا گئی تھی۔

''میں بات کو غلط رنگ نہیں دے رہی ہوں، ہمیشہ کی طرح تمہیں سدھارنے کی کوشش کررہی ہوں تاکہ تم اس بنا منزل کے راستے سے پلٹ آؤ۔'' روز کی طرح صوفیہ آج بھی اسے سمجھانے کی کوشش کررہی تھی مگر وہ تھی کہ سمجھ کے نہیں دے رہی تھی۔

''آنٹی جی تمہارا رشتہ طے کرنے کے چکر میں ہیں اور ایسے میں تم انہیں رمیز کا بتاؤ گی اور وہ نہ مانیں تو بتاؤ تم کیا کروگی......؟'' گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے جیسے تھک کر اپنی دوست کا آخری فیصلہ جاننا چاہا تھا۔

''اس کے متعلق تو میں نے ابھی کچھ نہیں سوچا ہے...... مگر میں کل خود رمیز سے اس ٹاپک پر بات کروں گی......'' اس نے جواب دیا تھا جسے سن کر صوفیہ اچھل ہی پڑی۔

''کیا...... تم خود اس سے شادی کی بات کروگی......؟''

''ہاں، بالکل......'' اس کا انداز حتمی تھا۔ اس سے وہ اسے پاگل ہی لگی تھی۔ جسے اپنی نسوانیت کا پاس تک نہیں تھا۔ لڑکی ہو کر وہ خود اس لڑکے سے بات کرنے کو تیار تھی۔ صوفیہ اسے ہر طرح سے سمجھا کر دیکھ چکی تھی اب ایک ہی حل باقی تھا کہ اس پر اپنی ناراضی ظاہر کرکے اسے ایسا کرنے سے روک لے...... یہی سوچ کر اس نے ناراض سے لہجے میں کہا۔

''اوکے...... جو تمہارا دل کرے تم وہ کرو...... میں کچھ نہیں کہوں گی۔'' اس کے لفظوں میں ناراضی کا بھرپور اظہار تھا مگر ثمینہ تو اپنے ہی خیالوں میں گم تھی اس کی ناراضی کو کیا محسوس کرتی...... وہ صوفیہ کو خدا حافظ کہتی اس کے کمرے سے نکل گئی تھی اور پیچھے صوفیہ سر پکڑ کر بیٹھ ہی گئی۔

☆☆☆

ابھی تک اسے رمیز سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ امی جی نے اس سے نعیمہ خالہ کے بیٹے کے لیے دوبارہ سے پوچھا۔

''ثمینہ تم نے کیا سوچا......؟ میں نعیمہ کو ہاں کردوں......؟''

''نہیں امی......'' جھکے سر کے ساتھ انگلیاں مروڑتی وہ جیسے خود میں اپنی بات کہنے کی ہمت پیدا کررہی تھی۔

''کیا مطلب......؟''

''امی میں نعیمہ خالہ کے بیٹے سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔'' بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔ جسے سن کر امی جی کے ماتھے پر تفکر کے تاثرات ابھرے تھے۔

''تو پھر کس سے کرنا چاہتی ہو......؟''

''رمیز سے......'' سر جھکائے وہ ان کے سوالوں کے جواب دیے جارہی تھی۔

''کون رمیز۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے......؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم......؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں امی......'' انہیں جواب دیتی وہ ذرا نہیں ڈر رہی تھی۔ شاید محبت انسان کو یونہی بے خوف بنا دیتی ہے۔

''ثمینہ......!'' ان کے انداز میں ایک دم غیظ بھرا تھا۔

وہ اپنی جگہ دبک سی گئی جب امی جی اس کی طرف بڑھتی تیزی سے بولی تھیں۔

''کون ہے یہ......؟''

''میرا کلاس فیلو ہے......'' دھیمے سے انداز میں اس نے بتایا۔ ''میں اس سے محبت کرتی ہوں امی......'' اس نے تو جیسے بے شرمی کی حد کردی تھی۔

اس کا انداز، اس کی ڈھٹائی دیکھ کر ان کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھا تھا...... انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ اب ثمینہ پر ان کے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوتا...... وہ تھک کر اس کے قریب بیٹھی تھیں۔

”یہ کیا، کیا تم نے ثمینہ......؟ کیا اس دن کے لیے تمہیں پیدا کیا تھا......؟ تم پر اندھا اعتبار کر کے کیا یہ سب کرنے کے لیے تمہیں کالج پڑھنے بھیجا تھا......؟ تم نے یہ سب کر کے ہمیں شرمندہ کردیا ثمینہ...... تمہارے باپ بھائیوں کو کیا کہوں گی میں......؟“ آنے والے وقت کے اندیشے ناگ کی طرح سر اٹھائے انہیں دہلائے دے رہے تھے۔

”امی آپ اس طرح کا ردِعمل کیوں دکھا رہی ہیں......؟ میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا......؟“ نہ جانے اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی کہ نڈر انداز میں ماں سے سوال جواب کیے جارہی تھی۔

”ہاں، تم نے کوئی جرم نہیں کیا...... جرم ہم نے کیا جو بیٹی پر اعتبار کیا، اس کی خواہش جان کر اسے لڑکوں کے ساتھ پڑھنے کی اجازت دے دی مگر اپنے جرم کو میں اپنے لیے سزا نہیں بننے دوں گی...... کل سے تمہارا کالج جانا بند...... اور آج ہی میں نعیمہ کو ہاں کررہی ہوں، سلمان سے شادی کے لیے خود کو تیار کرلو......“ فیصلہ کن انداز میں کہتی امی ایک غصیلی نظر ڈال کر اس کے پاس سے اٹھ گئیں۔

”سلمان سے شادی تو میں ہرگز نہیں کروں گی......“ ماں کی طرح اس کا انداز بھی حتمی تھا...... وہ دونوں ہی ضد پر آگئی تھیں نہ جانے اب آگے کیا ہونا باقی تھا۔

☆☆☆

”میں تم سے ناراض تھی، تم منانے کیوں نہیں آئیں؟“ صوفیہ اس سے ناراض تھی اور آس لگائے بیٹھی تھی کہ وہ اسے منانے ضرور آئے گی مگر یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی اگلا پورا دن وہ اس کے انتظار میں بیٹھی رہی جب انتظار حد سے سوا ہونے لگا تو ساری ناراضی ایک طرف کیے وہ خود اس سے ملنے چلی آئی اور اب اس کے سامنے کھڑی سوال کررہی تھی۔

ثمینہ نے نظر اٹھا کر ذرا اس کی طرف دیکھا پھر کہنے لگی۔

”تمہیں شوخیاں سوجھ رہی ہیں یہاں میری جان سولی پر لٹکی ہے۔“ اسے اس کا انداز خاصا ناگوار گزرا تھا مگر نظر انداز کیے فکرمندی اس کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

”کیوں، ایسا کیا ہوا......؟“

”کل امی نے نعیمہ خالہ کے بیٹے کے لیے دوبارہ پوچھا تو میں نے انہیں رمیز کا بتادیا۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوئی تو صوفیہ فوراً جلدی سے بولی۔

”تو پھر آنٹی جی نے کیا کہا......؟“

”کہنا کیا تھا میرا کالج جانا بند کردیا...... اور کہہ گئی ہیں کہ وہ نعیمہ خالہ کو ہاں کردیں گی۔“

”اوہ...... تو اب کیا ہوگا......؟“

”پتا نہیں...... مگر میں نے رمیز سے بات کی ہے ابھی کچھ دیر پہلے......“

”کیا بات کی......؟“ اس نے بڑی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”یہی کہ امی میری شادی کہیں اور طے کررہی ہیں وہ اپنے والدین کو میرے گھر بھیجے...... میں چاہتی ہوں اس کے والدین آ کر امی، ابو سے ملیں تاکہ کہیں کوئی لچک پیدا ہوجائے ورنہ امی نے تو رمیز کا نام سنتے ہی صاف انکار کردیا...... نہ جانے وہ کیوں اس طرح کررہی ہیں، زندگی تو مجھے گزارنی ہے میرا دل جسے چاہے گا میں اسی سے شادی کروں گی...... وہ سمجھ ہی نہیں رہیں......“

”ہوں...... آنٹی جی کی سمجھ کو تم رہنے دو...... وہ ماں ہیں تمہاری...... تمہارے لیے برا نہیں سوچیں گی...... خیر تم مجھے رمیز کا بتاؤ، تمہاری بات سن کر اس نے کیا کہا......؟“

”اس نے کہا وہ سوچ کر کوئی جواب دے گا۔“

ثمینہ کی زبانی رمیز کا جواب سن کر وہ بڑی طنزیہ ہنسی کے ساتھ بولی تھی۔

”سوچ کر جواب دے گا...... ہونہہ، یہ کوئی مسئلہ کشمیر تو نہیں ہے جس پر وہ غور و فکر کرے گا...... بقول تمہارے وہ تم سے محبت کرتا ہے...... تو محبت کے اس دعوے دار کو تمہاری شادی کی خبر سن کر جھٹکا کیوں نہیں لگا......؟ اس نے تمہاری بات مان کر کیوں نہیں کہا کہ وہ کل ہی اپنے والدین کو تمہارے گھر بھیجے گا......؟ تمہاری آنکھیں اب بھی کیوں نہیں کھل رہیں ثمینہ......؟ تم ایسی تو کبھی نہیں تھیں کیوں جان بوجھ کر بے وقوف بن رہی ہو......؟“ اسے دوست کی اس درجہ ناسمجھی بہت کھل رہی تھی اسی کیفیت کے زیرِ اثر اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا۔ ”ایسا کیا گھول کے پلا دیا ہے اس شخص نے چند ملاقاتوں میں تمہیں...... کہ تم خود اپنی بھی نہیں رہی......؟“

اس پل بڑی شدت سے اپنی عزیز دوست کو کھو دینے کا احساس اس کے دل میں جاگا تھا جبھی وہ تڑپ اٹھی تھی۔

”پلیز، سنبھل جاؤ ثمینہ......“ لجاجت سے کہتی صوفی نے مزید کچھ کہنے کو اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر ثمینہ نے اس سے پہلے ہی ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

”بس اب مزید کچھ مت کہو...... میرے سر میں بہت درد ہے خود آؤں گی تم سے ملنے ابھی تم جاؤ۔“

صوفیہ نے بڑی بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور روتی ہوئی اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی...... پھر تین دن گزر جانے کے باوجود ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی آپس میں ملنے کی کوشش نہیں کی...... صوفیہ کو ثمینہ کی بے وقوفی دکھ دے رہی تھی تو دوسری طرف اس کا رویہ تکلیف میں مبتلا کررہا تھا...... اسی لیے وہ اس سے دور ہوتے جارہی تھی...... اس کے باوجود بھی اسے ثمینہ کی فکر طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا کیے دے رہی تھی...... مگر دونوں طرف فی الحال خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

پانچویں روز ثمینہ خود بڑی پُرجوش سی اس سے ملنے چلی آئی اور آتے ہی خوشی کے مارے اس سے لپٹ گئی۔ صوفیہ ناسمجھی سے اس کے کھلتے چہرے کو دیکھنے لگی۔

”آج میں بہت خوش ہوں......“

”ہاں وہ تو دکھائی دے رہا ہے، تم وجہ بتاؤ جس نے اس درجہ خوش کردیا تمہیں......“ بڑے سنجیدہ سے انداز میں اسے خود سے الگ کرتی صوفیہ نے استفہامیہ اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے رمیز مل گیا......“ آنکھیں بند کیے اس نے بڑے جذب سے بتایا تھا۔ صوفیہ بری طرح چونکتے ہوئے غور سے اسے دیکھنے لگی۔

”رمیز مل گیا......؟ کیا مطلب تمہارا......؟“

”مطلب یہ...... کہ کل رات میں نے فون پر رمیز سے نکاح کرلیا......“

”واٹ؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو...... ہوش میں تو ہو تم......؟“ صوفیہ کو بڑا گہرا شاک لگا تھا...... یہ انہونی اسے ہضم نہیں ہورہی تھی۔

”بالکل ہوش میں ہوں...... اس کے والدین بزنس ٹور پر ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں اس لیے اس نے مجھے انتظار کرنے کو کہا مگر تمہیں تو پتا ہے امی کس طرح سلمان کے ساتھ میری شادی کرنے کو اتاؤلی ہوئے جارہی تھیں اسی لیے جب میں نے یہ سب رمیز کو بتایا تو اس نے بہترین حل یہی پیش کیا کہ ہم فون پر نکاح کرلیتے ہیں اسی لیے رات ہم نے نکاح کرلیا......“ خوشی اس کے انگ، انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

”فون پر نکاح کرلیا......؟ یہ تم نے کیا، کیا ثمینہ......؟ تمہارے اس نکاح کا گواہ کون ہوگا......؟“

”ہاں گواہ تھے ناں رمیز کے دو دوست نکاح

کے وقت وہاں موجود تھے۔'' اس کے پاس تو جیسے ہر سوال کا جواب تھا۔

''اور تمہاری طرف کے گواہ اور نکاح خواں......''

صوفیہ کو اب تک یقین نہیں آرہا تھا۔

''یہ مسئلہ بھی کل حل ہو جائے گا...... اس کی طرف سے مجھے تسلی ہو گئی ہے۔ اب باقاعدہ نکاح ہم کورٹ میں جا کر کرلیں گے......'' وہ تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہونے کے باوجود اس قدر نا سمجھی کی باتیں کررہی تھی کہ صوفیہ کا دل چاہا تھپڑ مار، مار کر اس کا مسکراتا ہوا چہرہ لال کردے...... مگر خود پر ضبط رکھتے ہوئے بولی۔

''پہلی بات تو یہ کہ ٹیلی فون پر ایسے نکاح ہوتا ہی نہیں، تمہارے اس نکاح کو میں تو کیا کوئی نہیں مانے گا۔ جس میں نہ تو تمہاری طرف سے کوئی گواہ تھا نہ ہی نکاح خواں...... اسی لیے برائے مہربانی تم اس فریب کی دنیا سے اب باہر آجاؤ۔'' وہ بری طرح تپ چکی تھی۔

''تمہارے ماننے نہ ماننے سے مجھے کیا مطلب......؟ میں جانتی ہوں میرا نکاح ہوا ہے، مولوی صاحب نے خود نکاح پڑھایا اور میں نے اپنی رضامندی بھی دی۔''

''اپنے اسی فرضی نکاح کی فوٹو کاپی اس سے لے لینا...... ذرا حقیقت تو معلوم ہو......'' وہ اسے جتنا بھی سمجھا سکتی تھی سمجھا چکی تھی مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا...... وہ اس حد تک جا چکی تھی اسی لیے اس نے ہار مانتے ہوئے ایک آخری نصیحت کی تھی۔

''ہاں کل اس نے مجھے ملنے کے لیے بلایا ہے، جاؤں گی تو تمہیں کاپی لا کر دکھاؤں گی......''

''تم اس سے ملنے جاؤ گی......؟'' وہ چونکی تھی۔

''ہاں اور کیا......''

''اچھا...... تو اس نکاح کا اور اس ملاقات کا اپنے گھر میں کیا بتاؤ گی......؟''

''وقت آنے پر بتادوں گی......'' اس کا انداز بڑا لاابالی تھا۔

''ثمینہ تم......'' صوفیہ نے مزید کچھ کہنا چاہا تو اس نے روک دیا۔

''بس...... مجھے پتا ہے تم نے کچھ الٹا سیدھا ہی بولنا ہے اس لیے خدارا مزید کچھ مت بولو، میں خود سمجھدار ہوں اپنا اچھا برا سمجھ سکتی ہوں، تمہیں اس طرح مجھے نصیحتیں کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔'' وہ تو جیسے سب لحاظ بھول چکی تھی۔

''ہاں تم کتنی سمجھدار ہو وہ تو میں دیکھ ہی چکی ہوں......'' اب کی بار صوفیہ نے بھی بڑے دل جلے انداز میں جواب دیا تھا جس پر ثمینہ نے ایک غصیلی نظر اس پر ڈالی اور مزید کچھ کہے بنا وہاں سے نکل گئی۔

☆☆☆

اور پھر جب اس نے امی جی سے ایک آخری بار کالج جا کر دوستوں سے ملنے کی اجازت طلب کی تو امی جی نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ان سے ایک آخری بار کالج جانے کی اجازت طلب کررہی تھی یعنی اس نے ان کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کرلیا تھا...... گو کہ اب انہیں اس پر اعتبار نہیں رہا تھا...... مگر پھر بھی نہ جانے کیا سوچ کر انہوں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

وقتِ مقررہ پر تیار ہو کر وہ رمیز کے دیے پتے پر اس سے ملنے پہنچ گئی۔

رمیز نے بڑی خوشی خوشی اس کا استقبال کیا تھا۔

''آؤ ثمینہ...... تم نے بڑی راہ دکھائی......''

''جی نہیں...... پورے وقت پر یہاں پہنچی ہوں......'' بڑی اِٹھلا کر جواب دیتی وہ اس کے ساتھ ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''ہاں مگر میں تو کل ہی سے بڑی بے صبری کے ساتھ تمہاری آمد کا منتظر تھا۔ آفٹر آل اب تم بیوی بن گئی ہو میری......'' وہ خاصا چہک رہا تھا۔

ثمینہ شرما کر نظریں جھکا گئی تھی...... اس کی یہ ادا دیکھ کر رمیز بے وجہ ہی کھلکھلا کر ہنسا تھا۔ پھر بھی رک کر گویا ہوا۔

''گھر پر تو اس وقت کوئی بھی نہیں ہے اسی لیے تمہارے کھانے پینے کا انتظام مجھے خود ہی کرنا ہوگا...... اس لیے تم بیٹھو میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ لاتا ہوں......''

''ارے نہیں، نہیں...... تم کام کرتے کیا اچھے لگو گے...... تم بیٹھو میں خود کچھ لے آؤں گی تم بس مجھے کچن کا بتادو......'' اس کا انداز بیویوں والا ہو رہا تھا۔ جسے محسوس کرکے رمیز پھر سے ہنسا تھا۔

''اچھا...... وہ دائیں طرف جا کر آخر میں کچن ہے...... اچھی سی چائے بنا کر لانا......''

''ہاں بس ابھی لائی......'' وہ کہتی سائڈ ٹیبل پر اپنا بیگ رکھتی کمرے سے نکل گئی۔ پھر کچھ دیر بعد گرما گرم چائے کے ساتھ اسنیکس لیے اس نے کمرے میں قدم رکھا تو وہاں رمیز اکیلا نہیں تھا...... اس کے ساتھ ایک اور لڑکا بھی موجود تھا جسے دیکھ کر وہ دروازے پر ہی رک گئی تھی...... اسے یوں رکتا دیکھ کر رمیز فوراً بولا تھا۔

''آؤ ثمینہ، رک کیوں گئیں......؟ اندر آجاؤ یہ میرا بیسٹ فرینڈ ہے جب میں نے اسے تمہاری آمد کی اطلاع دی تو تم سے ملنے کے شوق میں یہاں چلا آیا......'' اس کی بات سن کر وہ مطمئن سی مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ چائے کی ٹرے ان کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے اسے یاد آیا...... وہ شوگر پاٹ لانا تو بھول گئی...... اب یاد آنے پر ایکسکیوز کرتی کہنے لگی۔

''سوری...... میں شوگر پاٹ لانا بھول گئی...... ابھی لے کر آتی ہوں......'' ان سے کہتی وہ وہاں سے باہر آئی تھی۔ کچن سے شوگر پاٹ اٹھائے وہ کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی اس سے پہلے کہ وہ اندر داخل ہوتی، اس کی سماعتوں سے رمیز کے دوست کی آواز ٹکرائی تھی۔

''لڑکی تو بڑی خوب صورت ہے یار آج تو مزہ آجائے گا......'' اس کے انداز میں خباثت بھری

ہوئی تھی۔ اس کے قدم اپنی جگہ جم سے گئے۔ اسے یقین تھا رمیز اس کی اتنی گھٹیا بات سن کر ابھی اسے غصے سے کچھ کہے گا...... آخر کو وہ اس کی بیوی تھی۔ مگر اس کے یقین کی ڈور فوراً ٹوٹی تھی۔ رمیز اسی کے سے انداز میں اس سے کہہ رہا تھا۔

''میرے معیار کا تو تمہیں علم ہے۔ مجھے صرف خوب صورت اور پُرکشش لڑکیاں ہی اٹریکٹ کرتی ہیں اور یہ تو ضرورت سے زیادہ خوب صورت ہے...... اور میری محبت میں بری طرح گرفتار بھی...... پھر میں کیوں کفرانِ نعمت کرتا۔''

وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔

ثمینہ بے یقینی سے سناٹے میں گھری دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی۔

''مگر یہ تمہارے ہاتھ لگی کیسے؟'' وہ لڑکا سب جاننے کا متمنی تھا۔

''کالج میں ملی تھی یار، پہلی ہی ملاقات میں بری طرح مجھ پر عاشق ہو گئی۔ یہ تو بڑا آسان شکار ثابت ہوئی، نہ تو مجھے اس کو محبت کے جھانسے میں لینے کی ضرورت پڑی اور نہ ہی شادی کے خواب دِکھانے پڑے۔ بس میری پسندیدگی کو جان کر اسے مجھ سے محبت ہو گئی اور خود ہی اس نے شادی کی آفر کر دی......'' رمیز نے بڑی تفصیل سے جواب دیا تھا جسے سن کر اس کا دوست کہہ رہا تھا۔

''ارے واہ، یہ تو بڑی ہی بے وقوف ثابت ہوئی مگر آج یوں اس طرح تمہارے گھر کیسے آگئی یہ......؟'' ایک اور سوال ہوا تھا۔

''میری بیوی کی حیثیت سے......''

''کیا مطلب تم نے شادی کرلی اس سے؟''

اسے تو جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

''مجھے پاگل سمجھا ہے کیا جو اس جیسی سے شادی کروں گا؟''

وہ اس کے وجود کو اپنے لفظوں کے تیر سے بری

طرح زخمی کر رہا تھا جو ابھی تک وحشت ناک سناٹوں کی زد میں تھی۔

''تو پھر......؟''

''تو پھر یہ کہ میں تو ایسا کچھ نہیں چاہتا تھا مگر جب اس نے خود شادی کی بات کی تو میرا دل مچلا...... تب اس کی بے چینی دیکھ کر اس سے جھوٹا نکاح کا ڈراما رچایا...... حامد اور تنویر کو ساتھ میں گواہ لیا اور بلال کو نکاح خواں بنا دیا...... اس موقع پر وہی مولوی بڑا کام آیا...... بڑی آسانی سے یہ کام ہو گیا۔'' اس کی بات کے اختتام پر وہ دونوں ہی بڑی زور سے ہنسے تھے۔

''اور یہ لڑکی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اتنی بے وقوف ہے کہ فون پر اس طرح نکاح کر کے خود کو میری بیوی سمجھ رہی ہے جبھی تو اتنے استحقاق سے یہاں چلتی نظر آ رہی ہے۔'' رمیز کے انداز میں اس کے لیے سوائے تحقیر و ذلت کے اور کچھ نہ تھا۔ اتنا کچھ کہنے کے باوجود بھی وہ اپنے لفظوں کے مزید تیر چلاتا کہہ رہا تھا۔

''اس جیسی لڑکیوں کو اپنا شریک سفر کون بناتا ہے یار، جو خود ہی ذرا سی توجہ ملنے پر نامحرم لڑکوں کو اپنا سب کچھ سمجھ لیتی ہیں۔ ان کے ایک اشارے پر اپنا آپ دینے کو تیار ہو جاتی ہیں...... اور اس کی حالت تو ایسی تھی اگر میں اسے گھر سے بھاگنے کو بھی کہتا تو یہ فوراً راضی ہو جاتی...... مگر میں ایسا کیوں کہتا...... ہونہہ مجھے ایسی لڑکیوں پر ذرا سا بھی اعتبار نہیں جن کے ماں باپ ان پر اعتبار کر کے انہیں گھر سے پڑھنے کے لیے بھیجتے ہیں مگر یہ ان کی نظروں میں دھول جھونک کر ان کے اعتبار کا خون کر کے ان کی عزت کو پیروں تلے روندتی کسی انجانے شخص کی ذرا سی توجہ، دو میٹھے بول سن کر ہر حد پار کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں سخت نفرت ہے مجھے ایسی لڑکیوں سے......''

''تو پھر تو نے اسے کیوں بلا لیا؟''

''ارے اتنا انجان نہ بن...... میرے انداز جانتا نہیں ہے کیا؟'' دونوں مکروہ قہقہے لگا رہے تھے۔

اس سے زیادہ سننے کی تاب ثمینہ میں نہ تھی...... گو کہ رمیز کا کہا ایک، ایک لفظ کڑوی سچائی پر مبنی تھا۔ اس کا کہا ایک، ایک لفظ اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔ وہ واقعی اس دنیا کی سب سے بڑی بے وقوف ہستی تھی...... رمیز اس کے لیے جو بھی کہہ رہا تھا بالکل سچ کہہ رہا تھا...... وہ بری طرح رو رہی تھی۔ اپنے جذبوں کی پامالی سے زیادہ اس وقت اسے اپنے ماں باپ کی یاد آ رہی تھی جنہوں نے اس پر ہمیشہ اندھا اعتماد کیا تھا...... اسے صوفیہ کی وہ سب باتیں یاد آ رہی تھیں جس نے اسے ہر، ہر قدم پر سمجھانا چاہا تھا مگر وہ تھی کہ سمجھ کے ہی نہ دی۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جن کی قسمت میں ٹھوکر کھا کر سنبھلنا لکھا ہوتا ہے...... جبھی تو ساری حقیقت سامنے ہونے کے باوجود وہ اندھی اور کم عقل بن گئی تھی جس پر نہ تو کسی بات کا اثر ہوا جس نے نہ کسی بات کو سمجھا۔ اسے بری طرح ٹھوکر لگی تھی اور اس بری طرح کہ وہ منہ کے بل گری تھی۔ وہ رمیز کو کچھ بھی تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ غلطی تو خود اس کی تھی۔

وہ اس کی باتوں کا منہ توڑ جواب دینے کا کوئی حق نہیں رکھتی تھی اسی لیے خاموشی سے اس گھر سے نکل آئی جہاں اس کی بربادی کا سارا سامان تیار تھا۔

شاید اس کی قسمت میں یہ سب اسی طرح ہونا لکھا تھا...... مگر یہ سب اس کے ماں باپ اور اس کی خلوص دل سے فکر کرنے والی دوست کی دعاؤں کا اثر تھا جو خدا نے اس کے ساتھ کچھ بھی غلط ہونے سے پہلے حقیقت اس پر آشکار کر دی تھی۔ چوٹ تو یہ بھی بہت گہری لگی تھی مگر اس چوٹ کا مداوا وہ خود بھی کر سکتی تھی۔ اپنے بہتے آنسوؤں کو صاف کرتے اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا وہ وہاں سے جلد سے جلد بھاگ نکلنا چاہتی تھی اس گھر کی جانب جہاں اس کے بے لوث ماں باپ اور اس کی پیاری پُرخلوص دوست اس کی واپسی کی منتظر تھی۔

شرافت کی اساس

سلمیٰ غزل

''میں نے تم سے اجازت نہیں مانگی، تمہیں اطلاع دی ہے۔'' چوہدری الطاف نے بگڑ کر کہا۔

''مگر مجھے اتنا تو بتا دیں میری وفاؤں میں، میری خدمت گزاری میں کہاں کمی رہ گئی جو آپ نے اتنا بڑا فیصلہ...... وہ بھی اچانک سنا دیا......؟'' زرینہ نے روتے ہوئے پوچھا۔

''بس، بس مجھ سے زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ لہسن، پیاز کی بساند میں بسا



تمہارا وجود اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا...... ہونہہ اور ان لو خدمت کرنے کے لیے نوکروں کی تو کوئی کمی نہیں، بچے پیدا کرنے کے علاوہ تم نے اور کیا ہی کیا ہے......؟'' چوہدری الطاف نے منہ بنا کر کہا تو اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔

''واہ، واہ چوہدری صاحب واہ...... آپ مردوں کا نہ کوئی جواب ہے نہ حساب وہ آپ کا شہر والا دوست چوہدری اکمل جس کی بیوی ایک این جی او چلاتی ہے اس کے بارے میں کیسے منہ بھر بھر کے غیبت کرتے تھے آپ......'' ایسی بنی ٹھنی رہتی ہے جیسے کسی فیشن شو میں شریک ہونے جارہی ہو یا ماڈلنگ کا ارادہ ہو...... نوکروں پر پورا گھر چلتا ہے اور میرے دوست چوہدری اکمل کو نہ غیرت ہے نہ حمیت کہ بیوی کس طرح ہرایرے غیرے نتھو خیرے سے ہنس، ہنس کر باتیں کرتی ہے۔ بچوں کی اپنی الگ مصروفیات...... میں بھی جاؤں تو مجھے چوہدری اکمل کا گھر، گھر نہیں زیسٹ ہاؤس لگتا ہے۔ ماں باپ کی حیثیت بھی نوکروں کی سی ہے۔ بہو بیٹا تو پوچھتے ہی نہیں انہیں، بے چارے سارا دن اکیلے دیواروں کو تکتے رہتے ہیں۔'' وہ لمحہ بھر سانس لینے کو رکی۔

''اور آج جب میں اپنی جوانی کے سنہری اور قیمتی دن بچوں کی پرورش، ساس سسر کی خدمت اور آپ کی ناز برداری اور اطاعت شعاری میں زول چکی تو آپ کو مجھ سے پیاز، لہسن کی بو آتی ہے ؟ میں شمع محفل نہیں شمع خانہ ہوں، میرے پاس نہ طوائفوں کی ادائیں ہیں نہ عشوہ و غمزہ اور نہ دلربائی کے انداز تو میں بھلا اب آپ کو کیوں اچھی لگنے لگی ؟'' زرینہ کا... لہجہ خود ورجہ تلخ ہو گیا۔

''چٹاخ!'' چوہدری الطاف کے تھپڑ نے اس کی بولتی بند کردی اس کی آنکھیں صدمے سے پھٹ گئیں پہلی مرتبہ چوہدری الطاف نے اس پہ ہاتھ اٹھایا تھا تھپڑ کی تکلیف سے زیادہ احساسِ ذلت نے اسے لڑکھڑا دیا تب ہی شور کی آواز سن کر زرینہ کے ساس...... سسر اندر آگئے...... اور صورتِ حال بھانپ کر روتی ہوئی بہو کو گلے لگاتے ہوئے بیٹے کو لعنت ملامت کرنے لگے۔

''پتر تیرے کرتوتوں سے تو ہم اچھی طرح آگاہ ہیں مگر ہم یہ سب اس لیے برداشت کرتے رہے کہ تو یہ ساری عیاشیاں باہر ہی باہر کرتا تھا اور یہ گند گھر تک نہیں آئی تھی مگر اب تیری اتنی جرأت ہو گئی کہ تو باہر کی گند گھر لانے کی سوچ رہا ہے، ہماری خاندانی اور شریف بہو پر سوکن لا رہا ہے وہ بھی ایک (گالی) ....''

''ابا جی آپ بیچ میں نہ ہی بولیں تو اچھا ہے، میں مرد ہوں مجھے دوسری شادی کرنے کا حق حاصل ہے۔'' بجائے شرمندہ ہونے کے چوہدری الطاف نے ڈھٹائی سے کہا۔

''لعنت ہے تجھ پر بے غیرت، اپنے مطلب کا ہر حق اور فرمان اسلام کا تجھے یاد ہے مگر تو نے کبھی نماز پڑھی......؟ جو دین کا ستون ہے، کبھی روزہ رکھا جو نفس کو مارتا ہے اور حج اور زکوٰۃ سے تیرا کب واسطہ......؟ ارے کمبخت کیوں اسلام کی آڑ لے کر اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل کر رہا ہے۔ کیا کمی ہے زرینہ میں، نیک نہیں؟ وفادار نہیں؟ اطاعت شعار نہیں اتنا تو سوچ لے تیرے تین بچوں کی ماں ہے، کچھ تو خدا کا خوف کر......'' اماں نے بھی گھر کا...... مگر چوہدری الطاف پر عشق کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا وہ غصے میں تن فن کرتا ہوا حویلی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کنول نے اسکول کے بعد ماں کی مخالفت مول لیتے ہوئے کالج میں داخلہ تو لے لیا تھا مگر اپنی اصلیت دوستوں سے چھپانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ خود پر مغرور ہونے کا خول چڑھا لے اور اسے داخلے کی اجازت بھی اس شرط پر ملی تھی کہ جب بھی

ماں چاہے گی وہ اس کے اشاروں پر ناچے گی.... بدقسمتی سے کنول نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ ذہنی طور پر اسے قبول نہیں کرسکی تھی۔ اسے ماں کے پیار میں بناوٹ اور تشنگی محسوس ہوتی...... اگر وہاں پر موجود بابا اس کے ہمنوا ہوتے تو کب کے اس کے پیروں میں گھنگرو بندھ جاتے...... بابا یہاں کے کارندے تھے مگر اسے اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ وہ کالج کی کسی لڑکی سے بھی بے تکلف نہ تھی اور لڑکیاں منہ بنا کر اکثر کہتیں۔

''خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے۔'' کیونکہ وہ تھی ہی اتنی خوب صورت، ساڑھے پانچ فٹ سے نکلتا ہوا قد سرخ و سفید چہرے پر بھرے بھرے گال، ستواں ناک اور سیاہ کشادہ آنکھوں پر سایہ فگن دراز پلکیں...... اپنی سنجیدگی، متانت اور حد درجہ خوب صورتی کی وجہ سے وہ مرکزِ نگاہ تھی۔ کالج کی اساتذہ بھی اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتیں کیونکہ اس کا تعلیمی ریکارڈ بھی شاندار تھا اور آندھی آئے یا طوفان وہ چھٹی نہیں کرتی تھی لیکن وریشہ وہ واحد لڑکی تھی جس کے خلوص اور محبت نے اسے دوست بنانے پر مجبور کردیا...... مگر اس کے اصرار کے باوجود نہ وہ کبھی اس کے گھر گئی تھی نہ کبھی اسے اپنے گھر بلایا تھا مگر جب ایک دن اس نے دوستی ختم کرنے کی دھمکی بڑے پیار سے دی تو وہ مجبور ہو گئی۔ وہاں کا ماحول دیکھ کر اسے لگا ایسے ہی گھر کا تصور اس کے ذہن میں تھا۔ وریشہ کی امی اس کے خیالات کے عین مطابق تھیں۔ کاش اس کی ماں بھی اسی قدر مقدس اور پاکیزہ ہوتی...... اس نے دکھ سے سوچا۔ تخت پر نماز پڑھتی ہوئی وریشہ کی امی اسے کسی اور ہی جہاں کی مخلوق لگیں...... سلام پھیر کر انہوں نے اس کے سر پر بوسہ دیا پھر اس پر دم کرتے ہوئے بولیں۔

''بیٹا سر ڈھانپ کر رکھا کرو، شریف لڑکیاں سر کھلا نہیں رکھتیں......''

''شریف لڑکیاں......؟'' کنول کا دل چاہا چیخیں مار مار کر روئے پھر وریشہ کے بھائی کو دیکھ کر وہ چونک گئی۔ اس نے وریشہ کے بھائی کو اس آئس کریم پارلر پر بیٹھا دیکھا تھا جہاں سے اکثر وہ آئس کریم لینے رکتی تھی۔ اس کو دیکھ کر وہ احتراماً کھڑا ضرور ہو جایا کرتا تھا مگر اس کی نگاہیں ہمیشہ جھکی رہتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ بغیر کچھ کہے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کنول کو گھبراہٹ ہو رہی تھی کیونکہ وریشہ کی اماں ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھ رہی تھیں ان کا انداز کھویا، کھویا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ یہ نگاہیں اس کے اندر تک جھانکنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

''بیٹی اپنے گھر کا پتا بتاؤ۔ ہم تمہارے ماں باپ سے ملنا چاہتے ہیں......'' کنول کا دل چاہ رہا تھا دھاڑیں مار مار کر روئے وہ بچی نہیں تھی ماں، باپ سے ملنے کی وجہ وہ سمجھتی تھی مگر وہ اس قابل کہاں تھی۔ اس کا دل اندر ہی اندر رو رہا تھا وہ اس حیثیت میں کہاں تھی کہ اس شریف گھرانے کی بہو بنتی...... اس کی اصلیت جانتے ہی وہ اس پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی وہ واپسی کی ضد کرنے لگی۔

''وریشہ میں گھر بتا کر نہیں آئی ہوں مجھے جانے دو، شام ہو رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا تمہارے ماں، باپ پریشان ہو رہے ہوں گے تمہیں شہروز چھوڑ آئے گا۔''

''نہیں آنٹی، میں چلی جاؤں گی......'' وہ منمنائی۔

''نہیں، نہیں اتنی شام کو جوان لڑکی کا اکیلے جانا ٹھیک نہیں......'' شہروز کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کا دل رو رہا تھا۔ وریشہ آگے بیٹھی ہوئی تھی۔

''مس کنول آپ بلاوجہ پریشان اور ہراساں ہو رہی ہیں، میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں جبکہ وریشہ کا آپ کو گھر لانے کا مقصد بھی یہی تھا

کہ اماں آپ کو دیکھ لیں......'' کنول کا دل دھک سے ہو گیا...... اس کا مطلب ہے کل کالج میں ہر طرف اس کی رسوائی کے چرچے ہوں گے وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔

''میں آپ کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں اور میرے گھر والے بھی بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ آپ لائقِ تحسین ہیں کہ کوٹھوں کی دلآلی میں آپ کا دامن صاف رہا...... کنول کیچڑ میں کھل کر بھی کنول کا پھول ہی رہتا ہے، آپ پریشان نہ ہوں میری ماں اور بہن دونوں میری ہمنوا ہیں۔ ہم اس پھول کو کیچڑ میں رُلنے نہیں دیں گے۔''

کنول کو لگ رہا تھا گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔

''آپ پلیز گاڑی یہیں روک لیں، یہ جگہ آپ کے اور وریشہ کے شایانِ شان نہیں...... پلیز آپ دونوں یہاں سے جلدی چلے جائیں۔''

☆☆☆

جب سے شہروز کی ماں، بہن کو اس کی اصلیت پتا چلی تھی کنول نے تعلیم ادھوری چھوڑ کر خود کو وسیع و عریض گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں قید کر لیا تھا اور چنبیلی بائی اس کے گھر میں رہنے سے بہت خوش تھی زندگی میں پہلی بار تماشائیوں کے سامنے گاتے ہوئے وہ جھجک گئی مگر ماں کی دھمکیوں اور طعنوں نے اسے مجبور کر دیا تھا۔

آج وہ بہت اداس تھی بابا کے پوچھنے پر وہ رو پڑی۔

''بیٹا میں اس لڑکے کو دیکھ چکا ہوں بے حد شریف اور خاندانی ہے، مجھے یقین ہے وہ تمہارا ساتھ دے گا۔ میں اس معاملے میں تمہارا ہمنوا ہوں۔'' بابا نے اسے تسلی دیتے ہوئے پیار سے کہا۔

''بابا جانتے بوجھتے کون شریف آدمی مجھے اپنائے گا؟'' پہلی مرتبہ اسے وریشہ کے گھر میں سکون اور اپنائیت ملی تھی پھر اسی لمحے اس کا موبائل بج اٹھا۔

''پتا نہیں کون ہے؟'' اس نے جلدی سے فون کان سے لگا لیا۔

''کنول میں شہروز بول رہا ہوں وریشہ کا بھائی میں لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھوں گا صرف ایک سوال...... کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟'' کنول کو لگا اس نے کچھ غلط سن لیا ہے۔ اس نے بابا کو بھی سنانے کو اسپیکر آن کر دیا۔

''دیکھو میں کوئی لمبے چوڑے دعوے نہیں کروں گا صرف وہ چیز تمہیں دوں گا جو تمہارے پاس نہیں یعنی محبت، مان اور عزت اور اگر تمہارا جواب ہاں میں ہے تو کل تیار رہنا، میں شام کو تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا اور میری ماں بہن کی موجودگی میں ہمارا نکاح ہو جائے گا۔ تمہاری ماں سے اس لیے رابطہ نہیں کیا کہ وہ تمہاری قیمت لگائے گی اور میں تمہاری عزتِ نفس کو مجروح نہیں کرنا چاہتا کیونکہ تم انمول ہو بازار میں بکنے والی جنس نہیں تم اچھی طرح سوچ لو اور اسی نمبر پر مجھے جواب دینا۔ تمہارا ہر فیصلہ مجھے منظور ہوگا۔'' کنول کے کان سائیں، سائیں کر رہے تھے اور دل تھا کہ قابو میں نہیں آ رہا تھا وہ جواب کیا دیتی بابا نے جھپٹ کر موبائل ہاتھ سے لے لیا۔

''بیٹا میں اس کا بابا بول رہا ہوں، مجھے تم پر بھروسا ہے اور پورا یقین ہے اور ہماری طرف سے ہاں سمجھو جب لینے آؤ تو میسج کر دینا۔ ہم باہر آ جائیں گے۔ میرے ساتھ جانے پر اس کی ماں منع نہیں کرے گی۔'' بابا نے محبت سے کنول کو لپٹا لیا اور رونے لگے۔ کنول کو سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔

''بیٹا میں تجھے آج بتا رہا ہوں تیری رگوں میں شریف ماں باپ کا خون ہے تجھے چار سال کی عمر میں چنبیلی بائی نے اغوا کیا تھا مگر میں تیری بھولی بھالی معصوم شکل پر ایسا فدا ہوا کہ بیٹی بنا کر تیری ڈھال بن گیا۔ اب تک میں نے تجھے ہر آفت و بلا سے بچایا ہے، تیری عزت و عصمت کی حفاظت کی ہے لیکن آخر کب تک......؟ بیٹا میری ان بوڑھی ہڈیوں میں اب

اتنا دم نہیں کہ ساری زندگی تیری حفاظت کر سکیں۔ بیٹا اس موقع کو مت گنوانا ورنہ ساری عمر پچھتاؤ گی مجھے یقین ہے کہ شہروز اپنے قول پر پورا اترے گا۔''

کنول کو لگ رہا تھا وہ جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ اس وقت چنبیلی بائی کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے آگے عروسی جوڑا اور زیورات رکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں گویا ہوئی۔

''کل مغرب کے بعد چوہدری الطاف تجھے لینے آئیں گے تیار رہنا۔ شکر کر کہ وہ تجھے رکھیل نہیں بنا رہے باقاعدہ نکاح کر رہے ہیں، میں انکار سننے کی عادی نہیں ہوں بہت تیرے چونچلے اٹھا لیے اور ناز برداری کر لی۔ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلا تو میں انگلیاں ٹیڑھی کرنا بھی جانتی ہوں۔ مار مار کے چمڑی اُدھیڑ دوں گی تیری۔'' پھر وہ نخوت سے بابا سے مخاطب ہوئی۔

''یہ تو کس خوشی میں بیٹھا ہے، چل اٹھ کر اپنے سازندوں کو دیکھ آج کنول نہیں شبانہ گائے گی۔ آخر کسی کو تو اس کی جگہ لینی ہے کیونکہ اس کی قیمت لگ چکی ہے۔'' وہ لہراتی بل کھاتی پلٹ گئی بابا نے آنکھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے پیچھے، پیچھے نکل گئے۔

☆☆☆

کنول خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی بابا نے جو اس کے کانوں میں امرت ٹپکایا تھا اس نے اسے اوجِ ثریا پر پہنچا دیا تھا وہ گمنام نہیں تھی اس کی ایک پہچان تھی۔ وہ طوائف زادی نہیں شریف زادی تھی۔ اپنی ماں کی ہم شکل اور وریشہ کی سگی خالہ زاد بہن۔ خالہ، خالو کا بیٹی کی جدائی میں کچھ بعد دیگرے انتقال ہو چکا تھا اور وریشہ کی ماں نے کنول کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ اس کی گم شدہ بھانجی ہی ہے اور بابا نے بھی تصدیق کر دی تھی۔ یہ بات جب بابا نے اُسے بتائی تو وہ بے اختیار روتے ہوئے ان سے لپٹ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ نیک نام ہے،

کہ اماں آپ کو دیکھ لیں......‘‘ کنول کا دل دھک سے ہوگیا...... اس کا مطلب ہے کل کالج میں ہر طرف اس کی رسوائی کے چرچے ہوں گے وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔

’’میں آپ کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں اور میرے گھر والے بھی بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ آپ لائقِ تحسین ہیں کہ کوٹھوں کی ولآلی میں آپ کا دامن صاف رہا...... کنول کیچڑ میں کھِل کر بھی کنول کا پھول ہی رہتا ہے، آپ پریشان نہ ہوں میری ماں اور بہن دونوں میری ہمنوا ہیں۔ ہم اس پھول کو کیچڑ میں رُلنے نہیں دیں گے۔‘‘

کنول کو لگ رہا تھا گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔

’’آپ پلیز گاڑی یہیں روک لیں، یہ جگہ آپ کے اور وریشہ کے شایانِ شان نہیں...... پلیز آپ دونوں یہاں سے جلدی چلے جائیں۔‘‘

☆☆☆

جب سے شہروز کی ماں، بہن کو اس کی اصلیت پتا چلی تھی کنول نے تعلیم ادھوری چھوڑ کر خود کو وسیع و عریض گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں قید کرلیا تھا اور چنبیلی بائی اس کے گھر میں رہنے سے بہت خوش تھی زندگی میں پہلی بار تماشائیوں کے سامنے گاتے ہوئے وہ جھجک گئی مگر ماں کی دھمکیوں اور طعنوں نے اسے مجبور کردیا تھا۔

آج وہ بہت اداس تھی بابا کے پوچھنے پر وہ رو پڑی۔

’’بیٹا میں اس لڑکے کو دیکھ چکا ہوں بے حد شریف اور خاندانی ہے، مجھے یقین ہے وہ تمہارا ساتھ دے گا۔ میں اس معاملے میں تمہارا ہمنوا ہوں۔‘‘ بابا نے اسے تسلی دیتے ہوئے پیار سے کہا۔

’’بابا جانتے بوجھتے کون شریف آدمی مجھے اپنائے گا؟‘‘ پہلی مرتبہ اسے وریشہ کے گھر میں سکون اور اپنائیت ملی تھی پھر اسی لمحے اس کا موبائل بج اٹھا۔

’’پتا نہیں کون ہے؟‘‘ اس نے جلدی سے فون کان سے لگالیا۔

’’کنول میں شہروز بول رہا ہوں وریشہ کا بھائی میں لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھوں گا صرف ایک سوال ...... کیا تم مجھ سے شادی کروگی؟‘‘ کنول کو لگا اس نے کچھ غلط سن لیا ہے۔ اس نے بابا کو بھی سنانے کو اسپیکر آن کردیا۔

’’دیکھو میں کوئی لمبے چوڑے دعوے نہیں کروں گا صرف وہ چیز تمہیں دوں گا جو تمہارے پاس نہیں یعنی محبت، مان اور عزت اور اگر تمہارا جواب ہاں میں ہے تو کل تیار رہنا، میں شام کو تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا اور میری ماں بہن کی موجودگی میں ہمارا نکاح ہوجائے گا۔ تمہاری ماں سے اس لیے رابطہ نہیں کیا کہ وہ تمہاری قیمت لگائے گی اور میں تمہاری عزتِ نفس کو مجروح نہیں کرنا چاہتا کیونکہ تم انمول ہو بازار میں بکنے والی جنس نہیں، تم اچھی طرح سوچ لو اور اسی نمبر پر مجھے جواب دینا۔ تمہارا ہر فیصلہ مجھے منظور ہوگا۔‘‘ کنول کے کان سائیں، سائیں کررہے تھے اور دل تھا کہ قابو میں نہیں آرہا تھا وہ جواب کیا دیتی بابا نے جھپٹ کر موبائل ہاتھ سے لے لیا۔

’’بیٹا میں اس کا بابا بول رہا ہوں، مجھے تم پر بھروسا ہے اور پورا یقین ہے اور ہماری طرف سے ہاں سمجھو جب لینے آؤ تو میسج کردینا۔ ہم باہر آجائیں گے۔ میرے ساتھ جانے پر اس کی ماں منع نہیں کرے گی۔‘‘ بابا نے محبت سے کنول کو لپٹا لیا اور رونے لگے۔ کنول کو سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔

’’بیٹا میں تجھے آج بتارہا ہوں تیری رگوں میں شریف ماں باپ کا خون ہے تجھے چار سال کی عمر میں چنبیلی بائی نے اغوا کیا تھا مگر میں تیری بھولی بھالی معصوم شکل پر ایسا فدا ہوا کہ بیٹی بنا کر تیری ڈھال بن گیا۔ اب تک میں نے تجھے ہر آفت و بلا سے بچایا ہے، تیری عزت و عصمت کی حفاظت کی ہے لیکن آخر کب تک......؟ بیٹا میری ان بوڑھی ہڈیوں میں اب اتنا دم نہیں کہ ساری زندگی تیری حفاظت کرسکیں۔ بیٹا اس موقع کو مت گنوانا ورنہ ساری عمر پچھتاؤ گی مجھے یقین ہے کہ شہروز اپنے قول پر پورا اترے گا۔‘‘

کنول کو لگ رہا تھا وہ جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ اس وقت چنبیلی بائی کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے آگے عروسی جوڑا اور زیورات رکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں گویا ہوئی۔

’’کل مغرب کے بعد چوہدری الطاف تجھے لینے آئیں گے تیار رہنا۔ شکر کر کہ وہ تجھے رکھیل نہیں بنا رہے باقاعدہ نکاح کررہے ہیں، میں انکار سننے کی عادی نہیں ہوں بہت تیرے چونچلے اٹھالیے اور ناز برداری کرلی۔ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلا تو میں انگلیاں ٹیڑھی کرنا بھی جانتی ہوں۔ مار مار کے چمڑی اُدھیڑ دوں گی تیری۔‘‘ پھر وہ نخوت سے بابا سے مخاطب ہوئی۔

’’یہ تو کس خوشی میں بیٹھا ہے، چل اٹھ کر اپنے سازندوں کو دیکھ آج کنول نہیں شبانہ گائے گی۔ آخر کسی کو تو اس کی جگہ لینی ہے کیونکہ اس کی قیمت لگ چکی ہے۔‘‘ وہ لہراتی بل کھاتی پلٹ گئی بابا نے آنکھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے پیچھے، پیچھے نکل گئے۔

☆☆☆

کنول خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کررہی تھی بابا نے جو اس کے کانوں میں امرت ٹپکایا تھا اس نے اسے اوجِ ثریا پر پہنچادیا تھا وہ گمنام نہیں تھی اس کی ایک پہچان تھی۔ وہ طوائف زادی نہیں شریف زادی تھی۔ اپنی ماں کی ہم شکل اور وریشہ کی سگی خالہ زاد بہن۔ خالہ، خالو کا بیٹی کی جدائی میں یکے بعد دیگرے انتقال ہوچکا تھا اور وریشہ کی ماں نے کنول کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ اس کی گم شدہ بھانجی ہی ہے اور بابا نے بھی تصدیق کردی تھی۔ یہ بات جب بابا نے اُسے بتائی تو وہ بے اختیار روتے ہوئے ان سے لپٹ گئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ نیک نام ہے،

عزت دار ہے، بابا نے سختی سے منع کیا تھا کہ یہ بات کسی کو کانوں کان معلوم نہیں ہونی چاہیے ورنہ چنبیلی بائی کچھ بھی کر سکتی ہے اور کنول کے لیے گھڑیاں کتنی مشکل ہو گئی تھیں۔ اس کا بس نہیں تھا کہ اڑ کر جائے اور اپنی خالہ کی بانہوں میں سما جائے۔

"کیا معجزے ایسے بھی ہوتے ہیں؟" اس نے حیرت سے سوچا اور بارگاہِ الٰہی میں سر جھکا دیا۔

☆☆☆

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے کسی فیصلے پر سر اٹھانے اور احتجاج کرنے کی اپنی اوقات میں رہو......" وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح دہاڑا......

"وہ مظلوم ہے آج تک اس نے جسم فروشی نہیں کی نہ کسی کے سامنے ناچی۔ صرف گانا گاتی ہے وہ اس ماحول سے فرار چاہتی ہے اور اس لیے میری بیوی بننا چاہتی ہے رکھیل نہیں اور یہی اس کی شرافت کی دلیل ہے۔" چوہدری الطاف کے پاس بیوی کے ہر سوال کا جواب موجود تھا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو مظلوموں کی حمایت میں پیچھے نہیں ہٹنا نہ یہی میری عظمت اور شرافت کی دلیل ہے۔"

"واہ، واہ چوہدری صاحب لگتا ہے آپ تو عظمت اور شرافت کے ٹھیکیدار ہیں۔" زرینہ طنزیہ ہنسی اور چوہدری کے پاؤں سے سر تک آگ سی لگ گئی۔

"اپنا بوتھا بند رکھو ورنہ طلاق دینے میں دیر نہیں کروں گا۔" کھسیانی بلی کی طرح اس نے زرینہ کو دھکا دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

یہ کنول کی بدقسمتی تھی کہ گاؤں کے کسی مُجرے میں گانے کے لیے چنبیلی زبردستی کنول کو بھی ساتھ لے گئی۔ کنول کی مدھر تانوں اور سُریلی آواز نے چوہدری الطاف کے جذبات میں آگ لگا دی، آواز کے ساتھ اس کے ارمان بھی بہنے لگے، وہ پوری رات گاتی رہی اور چوہدری الطاف اپنے ہی خیالوں میں گم نشۂ عشق میں مبتلا اسے حاصل کرنے کی جستجو کرنے لگا اور پھر کس طرح اس نے چنبیلی بائی کو شیشے میں اتارا یہ اس کا دل ہی جانتا تھا ورنہ وہ کنول جیسی ہیرا کو ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے کسی کو سونپ دے ناممکن تھا۔ ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتی تھی اور آج وہ بیس لاکھ کا نذرانہ دے کر اسے حاصل کرنے جا رہا تھا جو وہ ایڈوانس میں دے چکا تھا۔ چنبیلی بائی سونے کا انڈا دینے والی مرغی ایسے ہی تو ذبح نہیں کر رہی تھی اس نے راستے سے ڈھیر سارے پھل لیے، پھول اور مٹھائی بھی آخر سسرال خالی ہاتھ کیسے جاتا......؟

☆☆☆

چوہدری الطاف کے قدم واپسی میں لڑکھڑا رہے تھے لگتا تھا قدموں میں جان ہی نہیں لگا ہی بھی زمیں بوس تھیں اور کنول کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی جب اس نے راستے میں کنول کو دیکھ کر شادی کی گھگھیاتے ہوئے اس سے درخواست کی تو اس نے حقارت سے جواب دیا تھا۔

"معاف کیجیے گا، شادی تو میں ضرور کروں گی لیکن اس سے جو مجھے وہ دے سکتا ہے جو آپ کے پاس نہیں؟"

"میں دنیا کی قیمتی سے قیمتی چیز تمہیں دوں گا تم ایک بار حامی تو بھرو۔" وہ بے تابی سے بولا۔

"آپ مجھے وہ چیز کیسے دے سکتے ہیں جو خود آپ کے پاس بھی نہیں اور جو خریدی بھی نہیں جا سکتی۔ طوائف کے کوٹھے پر آنے والا عزت دار ہوتا ہے نہ شریف اور...... میں شادی کسی عزت دار سے کروں گی۔" یہ کہہ کر کنول نے اس معمولی سے آدمی کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گئی اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس طمانچے کی گونج کہاں تک جائے گی اور وہ اپنا بدنما چہرہ کیسے بیوی کے سامنے لے کر جائے گا۔

◆●◆

"آپی...... آپی...... سن رہی ہیں کیا؟"

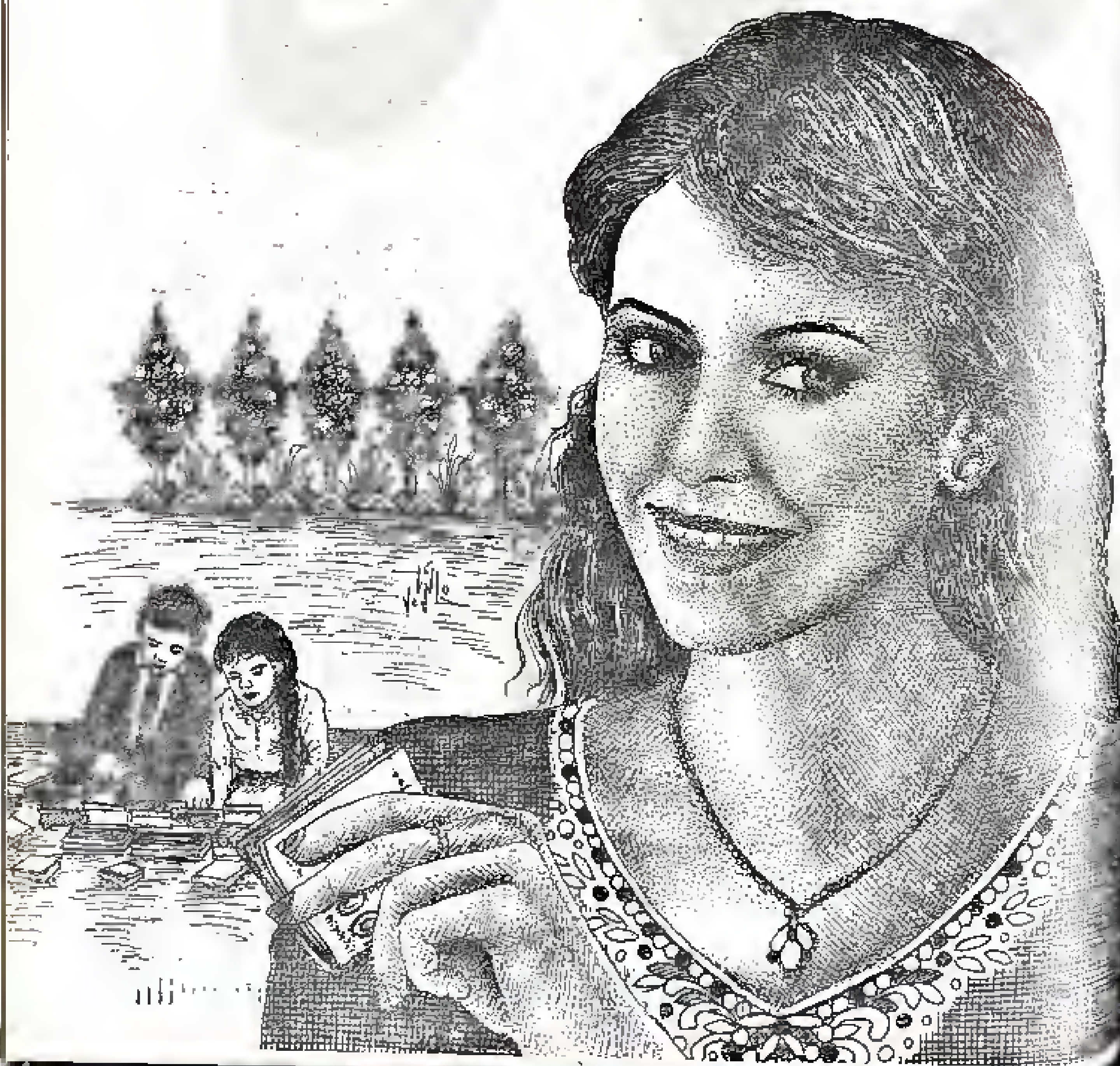
"ہاں، بولو کیا بات ہے...... دیکھ نہیں رہے قرآن پاک پڑھ رہی ہوں۔"

"مگر...... آپی آپ کو اس بات کا علم بھی ہے کہ......"

احمد یقیناً کوئی بہت خاص خبر لے کر آیا تھا تبھی تو مجھے قرآن پاک پڑھتا دیکھ کر بھی نہیں رکا...... میں نے پڑھنے والے صفحے پر نشانی رکھی...... بڑی تعظیم

پہلی تاریخ اور بہار

غزالہ فرخ



سے قرآن پاک بند کیا اور رحل میں رکھا اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آپی...... ایمان دی ابھی تک نہیں لوٹیں، دیکھیں شام ہونے کو آئی۔"

"اوہ...... ایمان ابھی تک گھر نہیں آئی اور امی کدھر ہیں احمد؟"

"ساتھ والی خالہ کی طرف گئی ہوئی ہیں، انہیں تو پتا ہی نہیں کہ ایمان دی ابھی تک گھر نہیں آئیں۔"

"اوہ...... آج تو بہت دیر ہو گئی۔" مجھے تشویش ہونے لگی۔

"میں گلی کے نکڑ پر کھڑا ہو جاؤں جا کر؟"

"اس سے کیا ہوگا بھئی۔"

"بس ایمن آپی، آپ دعا کریں کہ جلد ہی ایمان دی گھر آ جائیں۔"

تھوڑا ہی وقت گزرا تھا...... لیکن مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ جانے کتنے گھنٹے بیت گئے ہیں، میں بظاہر کچن میں کام میں مصروف تھی مگر دماغ صرف اور صرف ایمان کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا اور پھر امی کے آنے سے پہلے ہی ایمان گھر میں داخل ہو گئی۔ اندر گھستے ہی اسکارف سر سے اتار پھینکا اور صحن میں بچھے ہوئے تخت پر ہی ڈھیر ہو گئی۔

"بہت تھک گئی ہوں، ایمن پانی پلا دو پہلے اور پھر چائے۔" ایمان کو دیکھ کر اگرچہ دل کو قرار آ گیا تھا مگر آتے ہی اس کا انداز اور پھر یہ حکم نامہ مجھے غصہ دلا گیا۔

"ہل چلا کر آئی ہو کیا......؟ میں کام کر رہی ہوں خود بنا لو چائے۔" جواب میں مکمل خاموشی رہی تو میں خود ہی تھوڑی دیر انتظار کر کے صحن میں واپس آ گئی۔ باہر کا نظارہ عجیب سا تھا۔ ایمان اسی عبائے میں تخت پر آڑھی ترچھی لیٹی سو گئی تھی۔ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور واپس کچن میں چلی آئی۔

☆☆☆

ایمان مجھ سے بڑی تو تھی مگر ستم ظریفی دیکھیں کہ پورے پندرہ منٹ اس لیے میں تو آپی...... دی کے چکر میں نہ پڑی...... وہ کئی دفعہ مجھے گھرکتی "میں بڑی ہوں تم سے۔" تو میں ہنسی میں اڑا دیتی بلکہ سائنس کی تحقیق سے آگاہ کرتی کہ جڑواں پیدا ہونے والے بچوں میں پہلے پیدا ہونے والا بچہ چھوٹا ہوتا ہے۔ میری ہر بات میں لاجک ہوتی تبھی وہ چپ ہو جاتی ...... مگر پھر بھی اکثر و بیشتر اپنے بڑے ہونے کا رعب ڈالنے سے باز نہیں آتی۔

☆☆☆

ہمارا یہ ننھا سا گھر اتا بھی بڑا ہی خوش حال اور مسرت کدہ ہوا کرتا تھا مگر ہمارے ابا اس دنیا سے ایسے گئے کہ ساری خوشیاں اور سکون ساتھ ہی لے گئے۔ ابا کے بعد ہم لوگ جیسے ہنسنے مسکرانے سے خوف زدہ سے ہو گئے تھے۔ ابا کے بھائیوں نے یقیناً سوچا ہوگا کہ اب بیوہ، بھاوج اور یتیم بچوں کا بوجھ اٹھانا پڑے گا تبھی تو جس مکان میں ہم رہائش پذیر تھے اسی کو بہانہ بنایا...... اب بھلا امی اپنے نام کے مکان کو ان کے حوالے کیسے کر دیتیں بس اسی بات کو عذر بنایا اور کنارہ کر لیا...... اور میری ننھیال ان کا تو پوچھیں ہی مت...... امی کے دو بھائی تھے ان سے عمر میں بڑے...... ہم جب رونے لگتے تو ہمارے سروں پر پیار سے ہاتھ رکھتے...... ہمیں خوش رکھنے کا دعویٰ بھی کرتے...... اپنے بچوں کے ساتھ کچھ وقت بھی گزارتے مگر جب وہ اپنے گھر واپس جاتے تو ہمارا بجٹ بالکل آؤٹ ہو جاتا۔

ایک ہفتے کا آٹا، چاول تین روز میں ختم ہو جاتا اور فریج میں انڈے، مکھن، جام ندارد...... ہمیں وقت نے عمر سے پہلے ہی بڑا ہوشیار بنا دیا تھا۔ ماموں ہمارا حال پوچھنے آتے تو ہم اب خود کو اتنا مطمئن ثابت کرتے کہ وہ رہنے کا پروگرام بنا کر بھی آئے ہوں تو بس ایک وقت کی چائے پی کر

"پی لو اب تو بن گئی۔"

"نہیں۔" مجھے جانے کیوں لگا کہ اس کی آواز بھیگ سی گئی حالانکہ اس کا چہرہ نارمل تھا اور آنکھیں خشک......

آج مہینے کا پہلا دن تھا اور ہمارے کرائے داروں کی یہ خوبی تھی کہ وہ کرائے میں کبھی دیر نہ کرتے، آج پہلی تاریخ تھی اور عشرت باجی کرایہ لے کر آ گئی تھیں۔ میں نے شربت بنا کر ان کے ہاتھ میں دیا وہ نہ، نہ کرتے بھی تھوڑی دیر بیٹھ گئیں۔ عشرت باجی اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ اس گھر میں شفٹ ہوئی تھیں۔ نفیس اور ذوق دار طبیعت کی مالک تھیں اپنے گھر آنگن اور اپنے دونوں پھولوں کے علاوہ صحن کے اطراف میں بنی کیاریوں کو بھی بڑے پیار سے سینچتیں...... انہیں یہاں آئے اب نو برس ہو گئے تھے۔ علینہ تین سالہ پیاری سی گڑیا تھی اور علی تو صرف ایک برس کا تھا۔ علینہ اب بڑی ہو گئی تھی وہ درمیانے نقوش مگر سرخ و سفید رنگت والی پیاری سی بچی تھی۔ عشرت باجی نے کوئی ملازمہ نہیں رکھی تھی۔ وہ بڑے پیار اور دلچسپی سے اپنا گھر بار سنبھالے تھیں۔ ایمان تو بہت مصروف رہتی، میں ہی کسی وقت اوپر گیلری میں کھڑے ہو کر ان کے صحن میں تکا کرتی۔

بہار کی آمد کی خبر تو تب ہی مجھے ہوتی جب عشرت باجی کی محبت سے سینچے پودوں میں خوب صورت گلاب نکل آتے، دروازے کے بالکل قریب کے حصے میں رات کی رانی کا پودا لگا تھا۔ اس پودے کی مہک ہمیں داخلی دروازے سے اندر آتے سیڑھیاں چڑھنے تک آتی۔ اتنی مصروف زندگی میں ان سب کے لیے وقت نکال لینا واقعی عشرت باجی کا ہی کمال تھا۔ امین بھائی اپنی زندگی سے مطمئن تھے۔ واقعی نیک اور اچھی بیوی خدا کی دی ہوئی نعمت ہوتی

چل دیتے۔

ہم دونوں بہنوں کے بعد ہمارا بھائی احمد تھا۔ امی...... ابا کا لاڈلا اور گھر بھر کا ہیرو...... ابا کی وفات کے بعد اس کی شان میں کمی نہیں آئی تھی کیونکہ ہم تینوں اسے یہ یقین دلانے پر تلی تھیں کہ وہی اس گھر کی بہار اور ٹھنڈی چھاؤں ہے۔

ہم دونوں میٹرک میں تھیں اور احمد مڈل میں...... ابا مختصر سی علالت کے بعد ہمیں تنہا چھوڑ گئے...... امی یک دم گڑبڑا سی گئی تھیں، کتنی ہی دیر مختل سے حواس لیے گھوما کرتیں مگر پھر انہیں احساس ہوا کہ اب انہیں ابا کی جگہ اس گھر کو چلانا ہے، شکر اس بات کا تھا کہ ہمارا مکان ذاتی تھا اور ابا نے اسے امی کے نام کیا تھا۔ سب سے پہلے ہم خود اوپر والے پورشن میں شفٹ ہوئے اور نیچے والے حصے میں ہی کرایہ دار رکھے گئے۔

ابا سرکاری ملازم تھے تبھی تو ان کی پنشن بھی آتی اور امی چھوٹے بچوں کو قرآن پاک کا سبق دینے لگی تھیں۔ بس گزارہ ہو رہا تھا۔ ہم نے اپنی خواہشات بھی محدود کر لی تھیں مگر احمد کے معاملے میں کوئی بھی کسی طرح کی کمی کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ہم دونوں بہنوں نے انٹر پرائیویٹ کیا تھا مگر احمد کو اچھے کالج میں داخل کرایا گیا تھا۔ میری پڑھائی میں اتنی دلچسپی نہ تھی انٹر کے بعد گھر میں محدود ہو گئی مگر ایمان نے بی اے کیا اور اب وہ ایک آفس میں جاب کر رہی تھی ...... آج کل بلکہ تقریباً ایک ہفتے سے کافی دیر سے واپس آنے لگی تھی...... بس یہی پوائنٹ تھا جس پر ہم الجھ کر رہ گئے تھے۔

امی گھر واپس آئیں تو ایمان نیند سے جاگ کر اندر کمرے میں تھی کچھ فریش بھی لگ رہی تھی۔ میں نے چائے کا مگ بنا کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"رہنے دو ایمن، اب تو کھانے کا وقت ہو گیا۔"

ہے۔ ان کے بچے ہم سے اتنے مانوس نہ تھے۔ وہ اپنے گھر آنگن میں مست رہتے اور ہم اپنے جھمے میں مگن...... وقت کا پہیا مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا مگر اس سست روی سے گزرتی زندگی میں اس روز یک دم سے عجیب تبدیلی آئی...... میں کپڑے دھونے کے بعد چھت پر پھیلانے گئی تو یک دم کاغذ میں لپٹا ایک ننھا سا پتھر میرے قدم چوم گیا۔ میں نے غیر شعوری طور پر یک دم ادھر اُدھر دیکھا، ساتھ والی چھت پر رزاق کھڑا تھا، نوشی کا بھائی...... ہمارے گھر یوں سر سے سر ملائے جڑے ہوئے کھڑے تھے۔ نوشی میری دوست تھی اور رزاق کے ساتھ بھی بچپن تو اکٹھے کھیلتے گزرا۔ اب تو کچھ تکلف ہو گیا تھا مگر اتنی بھی کیا دوری تھی کہ اس طرح پیغام رسانی کی جائے۔ مجھے ذرا محو اور تھوڑا حیران سا دیکھا تو ہولے سے ہاتھ ہلایا اور نیچے اتر گیا۔

مجھے اب اس چٹھی کو پڑھنا تھا جو یوں میرے قدموں میں پڑی تھی اسے اٹھاتے وقت تو میں بااعتماد تھی دل میں چور نہ ہو تو ڈر کس بات کا مگر اس میں لکھا ہوا مضمون تو مجھے پل بھر کے لیے تھرا سا گیا۔

''بہن کی کچھ خبر ہے؟'' پڑھنے میں تو یہ سادہ سے پانچ الفاظ تھے مگر ان میں جانے کیا حکایت تھی کہ میں پل بھر کے لیے اپنے قدموں پر کھڑی نہیں رہ سکی۔ ذرا ڈول سی گئی مگر خود کو مضبوط کیا...... کاغذ کے پرزے کو پھاڑ کر ہوا میں اڑا دیا مگر مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اس کی تحریر کو دل و دماغ سے صاف نہیں کر پائی۔

☆☆☆

آج اتوار کا دن تھا اور چھٹی کا روز ایمان تقریباً سو کر ہی گزارتی تھی۔ پورے ہفتے کی تھکن شاید ایک روز میں کم کرنے کی کوشش کرتی مگر میں نے غور کیا کہ آج وہ صبح جلدی ہی اٹھ گئی۔ اس نے اپنے پیارے، پیارے ریشمی بالوں میں تیل لگایا...... دودھ پیالی میں لے کر اس میں لیموں نچوڑ کر ہاتھ پاؤں پر مسلا...... عام حالات میں کسی نوجوان لڑکی کے لیے یہ سب حرکات کوئی خاص اہمیت کی حامل نہیں ہوتیں مگر اس پرزے کی تحریر...... میں کسی اور نہج پر سوچنے لگی تھی۔ ابھی میں گومگو کی حالت میں تھی کہ ایمان نے پکارا۔

''ایمن واشنگ مشین لگاؤ گی تو میرے کپڑے دھو دینا۔''

''اچھا......''

''دھونے کے بعد مجھے آواز دے دینا، کلف دوں گی میں کپڑوں کو۔''

''اچھا......'' اسے اثبات میں جواب دے کر میں نے سوچا کہ ایمان نے کبھی کپڑوں کے لیے اتنا تردد نہیں کیا وہ مکمل عبایا پہنتی تھی تو اس حالت میں کلف......؟ میں مزید الجھ گئی۔

مہینے کا شروع تھا۔ نیچے سے کرایہ بھی آیا تھا اور ابا کی پنشن بھی اور اب تو ایمان کی تنخواہ بھی آ چکی تھی۔ تبھی تو اس روز ہم خود کو بہت امیر، امیر محسوس کر رہے تھے۔

''آج تو عیش ہو جائیں گے آپی......''

''چلو ٹھیک ہے، سب مل کر پیسے ڈالو، آج کھانا بازار سے منگواتے ہیں۔'' میں بھی خوش ہو گئی۔

''رہنے دو بچوں بازار کے کھانے میں کیا پڑا ہے نری معدے کی جلن۔'' امی شاید خرچے سے گھبرا گئیں۔

''ارے نہیں امی...... آج بچوں کو کچھ کھلا دیں۔''

''اچھی اماں جی......'' میں ہنس دی۔

''چلو جاؤ میرے بیگ سے کچھ پیسے لے لو اور امی پلیز کچھ کرائے میں سے۔'' ایمان بولی۔

''اچھا چلو ٹھیک ہے۔'' امی بے چاری بھی مان رہی تھیں۔ تبھی میں تیزی سے بھاگی کہ کہیں ارادہ

بدل ہی نہ جائے۔ ایمان کا بیگ کھولا جو خالی تھا، باہر والے خانے کی زپ کھولی پہلے ایک ٹشو پیپر ہاتھ میں آیا، یونہی غیر ارادی طور پر نظر دوڑائی...... نظر تو سرسری ہی تھی مگر ٹشو عام ٹشو پیپر نہیں تھا بلکہ کسی ریسٹورنٹ کا نام اس پر تھا میں نے دیکھا تو جم سی گئی، میں گھر سے باہر کم ہی جاتی مگر ٹی وی اور میگزین تو تھے ناں باہر کی دنیا سے کافی واقف تھی۔ یہ ریسٹورنٹ چائنیز کھانوں کے لیے مشہور تھا اور اس کا بل...... کم از کم ہماری کلاس کے لوگوں کی پہنچ سے بہت دور تھا۔ ہمیں تو نان کباب کھانے کے لیے اپنا بجٹ از سر نو بنانا پڑتا، ہاتھ لرز گیا، احمد کی آواز قریب سے ہی آتی محسوس ہوئی تو جلدی سے ٹشو بیگ میں واپس ٹھونسا اور نوٹ ٹٹولنے لگی۔

ایمان صبح گھر سے گئی تو میں سو رہی تھی۔ میں ہمیشہ ہی سے بڑی سحر خیز واقع ہوئی ہوں، آج یوں دیر تک سونے کی وجہ یہ تھی کہ میں رات بھر بہت بے چین رہی تھی، نیند کی مہربان دیوی مجھ سے کوسوں دور تھی۔ بستر میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے جس طرف پہلو بدلتی نئی تکلیف اور بے آرامی...... مگر پتا نہیں کس وقت آنکھ لگی کہ صبح دیر تک سوتی رہ گئی۔ امی نے مجھے نہیں جگایا دیر سے جاگی تو نقصان یہ ہوا کہ فریج میں انڈے ملے نہ بریڈ......

''امی رات تو اس میں دو انڈے تھے، ایمان تو ناشتا کرتی ہی نہیں اور آپ بھی صرف چائے پیتی ہیں۔''

''احمد کو میٹھے سلائس بنا دیے تھے اسے پسند ہیں ناں......''

''امی اسے ایک انڈے کے بنا دیتیں۔''

''نرم نہیں بنتے ویسے تمہیں احمد کا نخرہ تو پتا ہے ناں...... ویسے بھی بھائی ہے وہ......''

''اوہ امی......!''

''پراٹھا بنا دوں کیا؟''

''نہیں......؟''

رات کا کھانا تو بازار سے آیا تھا مگر اس سے پہلے ہونے والے واقعے نے میری بھوک اڑا دی تھی اور اب کھانے کو دل چاہا تو احمد میاں......

ایمان واپس آ گئی تھی آج بہت زیادہ لیٹ نہ تھی مگر میرا دل جیسے دیوار پر لگے کلاک کی سوئی کے ساتھ ہی ٹک، ٹک کرتا گردش کرتا رہا۔

''ایمان تم آ گئیں......؟''

''نہیں، میں تو ابھی آفس میں ہوں...... پگلی تمہارے سامنے نہیں ہوں کیا......؟'' میں اس کے مذاق پر ہنس بھی نہ سکی تھی۔ رات جب سب سونے کے لیے لیٹے تو میں ایمان کے پاس سرک آئی۔

''ایمان......'' میری سرگوشی پر وہ حیران ہوئی۔

''کیا ہے ایمن؟''

''ایک بات کا جواب دو گی؟''

اس نے بڑے ہی عام سے لہجے میں جواب دیا مگر یک دم جیسے چادر میں سے ہلکی سی آواز آئی اور حرکت بھی محسوس ہوئی، وہ یقیناً کسی موبائل پر آنے والا میسج تھا۔ مجھ سے زیادہ تو تیزی سے ایمان چونکی تھی۔

''ایمان...... یہ کیا؟ موبائل ہے تمہارے پاس......'' اگر یہ عام سی بات ہوتی تو یقیناً مذاق سمجھتی۔ ''نہیں یہ تو والٹ ہے...... پگلی تمہارے سامنے تو ہے......'' مگر یہ عام سی بات نہ تھی۔

''تمہارے پاس کیسے آیا یہ......؟'' میں ہراساں تھی۔

''موبائل ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ایمن، یہ تو عام سی شے ہے، آج کل بچوں کے پاس بھی ہوتی ہے۔'' وہ سنبھل گئی۔

''مگر تمہارے پاس یہ کہاں سے آیا؟'' میں نے حتی الوسع تمہارے اور کہاں پر خوب زور دیا تھا۔

''کسی کا گفٹ ہے یہ۔'' اس نے یہ بات اتنی

آسانی سے کہہ دی مگر بدن یک دم کپکپی کا شکار ہو گیا۔

"کس راہ پر چل رہی ہو ایمان؟"

"صحیح راہ پر...... میں اس بات کو جان پائی ہوں ایمن کہ ہمیں اپنی راہ خود ہی متعین کرنی ہوگی اور منزل بھی۔"

"ہم...... ہم کیوں ایمان؟"

"اس لیے کہ ہم دونوں لڑکیاں ہیں اور ہم عمر بھی...... اور ہم دونوں ہی اس گھر کی...... مکین ہیں کہ جہاں ہمارے بارے میں کچھ بھی سوچا نہیں جارہا...... حالانکہ ہم عمر کے اس دور سے گزر رہی ہیں۔ جب ایک شریکِ حیات کی ضرورت...... مطلب اس کی کمی محسوس ہوتی ہے اور......"

"ایمان......!" میں ششدر سی رہ گئی۔

"تم کیا سوچ رہی ہو؟"

"کیوں تم ایسا نہیں سوچتیں کیا؟"

میں فوراً ہی "نہ" میں جواب دینا چاہتی تھی مگر...... یک دم کسی کی جھپاک سے میرے ذہن میں آمد نے...... دل کے نرم سے گوشے کو چھونے کی کوشش نے...... میرے خفتہ جذبات کو ہلکے سے لمس سے آشنا کرنے نے مجھے خاموش کر دیا۔ میں خاموش ہوگئی...... بالکل چپ بلکہ پہلو موڑا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

رزاق میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ ہمارا بچپن بھی ہر دم ایک دوسرے کی سنگت میں گزرا اور لڑکپن بھی۔ رزاق کی اماں کو میں خالہ کہتی اور وہ بھی مجھے چاہتی تھیں...... میری پسند ناپسند سے واقف تھیں کوئی میری پسند کی شے پکاتیں تو نوشی کے ہاتھ مجھے بھجوا دیتیں۔ جب میرے کپڑوں کے ساتھ بننے والا چھوٹا سا دوپٹا چادر میں بدلا اور پھر عبایا میں تو جیسے میں اسی لباس اور اسی گھر میں مقید ہوگئی۔ کبھی خالہ کے گھر آتے جاتے نوشی کے ساتھ پروگرام بناتے رزاق سے سامنا ہو جاتا تو نظر چرا جاتی...... رزاق بہانے سے اِدھر اُدھر چکر لگاتا اور اپنی طرف متوجہ کرتا، بس یہی مکمل حکایت تھی ہم دونوں کی نہ کوئی محبت بھری بات نہ کوئی وعدہ وعید...... مگر جب ایمان نے میرے سوال کے جواب میں سوال ہی داغا تو جیسے کسی نے میرے دل کے کواڑ پر ہلکی سی دستک دے دی...... مگر دروازہ کھولنے سے پہلے ہی میں جان پائی کہ وہ...... وہ رزاق ہی تھا۔

☆☆☆

"آج ہم لارنس گارڈن گئے تھے تھوڑی دیر کے لیے......"

"ایمان تمہیں ڈر نہیں لگتا کیا؟"

"پگلی تو نے دیکھا نہیں وہ پارک بڑی اچھی جگہ ہے، خوب ڈھیروں درخت اور سایہ دار گوشے۔"

"اور...... اور تمہیں آفاق بھائی سے خوف نہیں آتا...... اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر چل دیتی ہو۔"

"نہیں، مجھے آفاق سے بالکل ڈر نہیں لگتا، ہم دونوں نے ایک کمٹ منٹ کی ہے اور ہم اس پر قائم رہیں گے۔"

"شادی کریں گے وہ تم سے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں...... ضرور......" وہ یقین سے بولی۔

"تم اتنی پُریقین کیسے ہو ایمان، ایسے مرد وقت گزاری کے لیے بھی تو......"

"نہیں ایمن ایسا نہیں ہوگا شادی ظاہر ہے اسے بھی کرنی ہے اور مجھ سے بہتر بیوی کہاں ملے گی اسے...... یہاں بھی میں کماؤ پوت ہوں اور آفاق کے ساتھ بھی مل کر ہم دونوں نے ہی زندگی کی گاڑی چلانی ہے۔"

ایمان اب مکمل طور پر کھل ہی گئی تھی۔ ہر بات میرے ساتھ شیئر کرتی...... ایمان سے باتیں کرنے کے بعد میں زندگی کو ذرا مختلف طریقے سے دیکھنے لگی تھی۔ واقعی امی نے روایتی ماؤں کی طرح ہم دونوں

بہنوں کے لیے بر ڈھونڈنے اور فرائض ادا کرنے کی کوشش تک نہیں کی تھی۔ کبھی محلے کی کوئی بزرگ عورت یا کوئی بھی بات کرتا تو امی مسکرا کر کہتیں۔

"بچیاں ہیں ابھی...... سکون سے رہ رہی ہیں اس گھر میں، جانے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑے۔"

ہاں البتہ احمد کے مستقبل کے لیے بہت پریشان رہتیں...... احمد ہمارے گھر کا ننھا سا راجا تھا۔ سربراہ مانتے تھے ہم سب اسے۔ اب اس کے شایانِ شان جاب بھی ملتی ناں...... بلکہ امی تو پچھلے دنوں اسے امریکا بھجوانے کا بھی شوق ظاہر کر رہی تھیں۔ امی کے مستقبل کے منصوبوں اور خوابوں میں ہم دونوں کہیں بھی نہیں تھیں۔

☆☆☆

آج پہلی تاریخ تھی عشرت باجی ہمارے پاس موجود تھیں۔ کچھ کمزور اور مضمحل سی لگ رہی تھیں۔

"کیا ہوا عشرت بہت نڈھال لگ رہی ہو؟"

"بس خالہ جان طبیعت خراب رہنے لگی ہے بہت۔"

"بھلا کام کم کرتی ہیں عشرت باجی......! اپنی ہڈیاں پیس ڈالی ہیں آپ نے......" میں نے ذرا شاکی انداز میں کہا تو وہ ہنس دیں۔

"امین کی طرف سے مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے ایمن، میں تو اپنے شوق سے ان کے لیے ہر وقت اپنے فرائض نبھاتی ہوں۔"

بچے، دونوں اسکول گئے ہوئے تھے۔ عشرت باجی کو ان کی پسند کا کھانا بنانا تھا۔ امین بھائی بھی دوپہر کو کھانا کھانے گھر آتے، امی انہیں چائے پلا کر بھیجنا چاہ رہی تھیں مگر...... ہمیشہ کی طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار تھوڑی ہی دیر میں یہ جا وہ جا...... چھوٹے سے صحن کے ساتھ ننھی کیاری بھی عشرت باجی کی توجہ کی مرکز تھی ہر دم وہاں خوب صورت پھول کھلے رہتے۔

ایمان اپنے دل کی بات مجھ سے کر چکی تھی۔ تبھی بہادر ہوگئی تھی۔ تبھی تو امی تک اپنا مدعا بیان کرنا اسے مشکل نہیں لگا۔ ایمان نے میرا سہارا نہیں لیا مگر ایک روز خود ہی امی کے سامنے آن بیٹھی۔

"امی...... آفاق کی والدہ اور بہن آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"کون آفاق...... اور اس کی ماں اور بہن مجھ سے کیوں ملیں گی بھلا......؟" امی تو گنگ سی ہوگئی تھیں۔

"اس لیے امی...... کہ اس مارچ میں، میں ستائیس برس کی ہو جاؤں گی اور...... میں اب شادی کرنا چاہتی ہوں۔" امی کے چہرے پر یک دم تاریک سا سایہ لہرایا جانے انہیں ایمان کی بے باکی بری لگی تھی یا پھر اپنے اس فرض سے لاتعلق ہونا دکھی کر گیا تھا۔

آفاق کی والدہ اور بہنیں آئیں، میں اور ایمان پُرجوش تھیں مگر امی کچھ بجھی سی تھیں۔

"امی کیسے لگے آپ کو یہ لوگ......؟" وہ لوگ چلے گئے تو میں نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے ایمن، ایسا رشتہ تو کسی بھی وقت ہو سکتا تھا ایمان کچھ عرصہ انتظار کر لیتی احمد کسی اچھی جاب پر لگ جاتا اب تو امریکا جانے کا بھی چانس بن رہا تھا......" میں تو صرف سانس بھر کر رہ گئی۔

شادی کی تیاری ہونے لگی۔ امی تو صاف لگ رہا تھا کہ مارے باندھے سب کچھ کرنے پر مجبور ہو رہی تھیں مہنگائی کا دور تھا بہت ضروری چیزوں کے بارے میں سوچا گیا تھا۔ امی کے پاس کچھ زیور تو تھا مگر پہلے ہی روز انہوں نے واضح کر دیا کہ اس زیور کے تین حصے ہوں گے، لڑکے کا حصہ شرعاً اور قانوناً دوگنا ہوتا ہے اس لیے زیور کو چار حصوں میں بانٹا گیا۔ بڑا سیٹ اور امی کی بری کی چوڑیاں احمد کی ٹھہریں۔ ایمان کے حصے میں لاکٹ سیٹ آیا اور

میرے حصے میں جڑاؤ کنگن...... ایمان ایک لفظ نہیں بولی اور نہ ہی میں نے لب کشائی کی ہاں البتہ اس فیصلے کے بعد بھی امی کچھ بے چین تھیں۔

''کیا ہوا امی؟'' میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

''اصل میں ایمن یہ کنگن مجھے میری ساس نے دیا تھا اصولاً مجھے بھی اپنی بہو کو یہی دینا چاہیے تھا۔'' امی نے آہ بھری اور ذرا کن انکھیوں سے مجھے تکا اگر میں ایمان کی رازدار نہ ہوتی تو فوراً ہی جذباتی ہو کر اس کنگن سے دستبردار ہو جاتی مگر میں نے رخ بدل لیا۔

''میں اور آفاق تقریباً ایک جیسے گھرانے اور یکساں ماحول کی پیداوار ہیں...... ایمن! ہم نے ایک دوسرے کو سبز باغ نہیں دکھائے، نہ ہی ہماری محبت آسمان سے چاند، تارے توڑ کر لانے والی قسموں سے عبارت ہے۔ ہم دونوں عملی زندگی میں جیتے ہیں اور ہماری محبت بھی اس تمام تر جذباتیت سے مبرا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ شادی کے بعد ہمیں مخملیں بستر نہیں کانٹوں کی رہ گزر سے گزرنا ہے مگر ہم مل کر یہ راستہ پاٹنا چاہتے ہیں۔''

ایمان گلابی لباس میں بالکل کھلا ہوا گلاب لگ رہی تھی۔ شادی کے دن قریب آرہے تھے اور اس کے حسن میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ آج وہ آفاق کے ساتھ کچھ وقت گزار کر آئی تھی اور بڑی ہی جذباتی ہو رہی تھی۔

''سنو ایمان اب تم دونوں کی شادی ہونے والی ہے اب ایسی ملاقاتیں؟''

''اصل میں ایمن یہ ملاقاتیں، یہ ننھی منی عیاشیاں بھی ہمارے مستقبل کے پروگرام کا ہی ایک حصہ ہیں، ہم دونوں جانتے ہیں کہ مکمل کمبائنڈ فیملی میں رہ کر دن بھر دفتروں میں سر کھپا کر شاید ہم یہ ننھی خوشیاں حاصل نہ کر پائیں تو ہم ان لمحات کو امر کریں گے اپنے دل میں، اپنے دماغ میں اور پھر اس وقت کو سوچ کر خوش ہو جائیں گے کہ ہم نے زندگی اپنے ڈھنگ سے جی تھی۔''

ایمان کو جانے اتنی سمجھ کہاں سے آگئی تھی۔ وہ تو سارا دن جاب پر رہتی، گھر آکر تھک ہار کر پڑ رہتی...... میں فارغ تھی کبھی کبھار نوشی کی طرف چکر لگاتا، میگزین بھی پڑھتی، ٹی وی پر ڈرامے بھی دیکھتی تھی مگر پھر بھی میرے خیالات میں اتنی پختگی اور تنوع نہ تھا، میرے ذہن میں بھی، کسی مرد کا خاکہ ابھرا تو وہ رزاق ہی تھا۔ میرے بچپن کا ساتھی، اب ہم دونوں بڑے ہو گئے تھے۔ اس کے انداز میں شوق اور جذبہ ہوتا اور میرے انداز میں کتراہٹ اور بس......

☆☆☆

آج پہلی تاریخ نہیں تھی مگر پھر بھی عشرت باجی ہمارے پورشن میں تھیں، علینہ اور علی ساتھ تھے۔ عشرت باجی بیمار تھیں اور امین بھائی کے ساتھ قریبی اسپتال جارہی تھیں۔ امی تو گھر میں نہ تھیں انہوں نے بچوں کو میرے حوالے کیا۔

''ایمن میرا بچوں کو چھوڑنے کا حوصلہ تو نہیں پڑتا مگر اسپتال جانا ضروری ہے۔ کافی زیادہ ٹیسٹ ہوں گے اور ایکسرے بھی۔'' وہ پھر ذرا رک کر بولیں۔

''ایمن سنو، یہ علینہ اور علی تمہارے حوالے کررہی ہوں۔''

''ارے عشرت باجی آپ تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے کسی لمبے سفر پر جارہی ہیں۔'' میں نے قہقہہ مار کر کہا۔ وہ بولیں کچھ نہیں، بس ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ جانے اس ایک نظر میں کیا تھا۔ کوئی حسرت...... کوئی محرومی یا پھر یاس اور جدائی کے سارے ہی رنگ... میں انہیں تک نہیں پائی۔ دروازے تک جا کر وہ پھر واپس پلٹیں۔

''اور ایمن پلیز...... پودوں کو پانی ضرور دے دینا اگر مجھے دیر ہو گئی تو۔''

''ایمن بس آج کے لیے......'' وہ شرمندہ سی ہو رہی تھیں۔ میں نے اقرار کیا اور بچوں کو لے کر کمرے میں آگئی۔

☆☆☆

احمد کو بالآخر جاب مل گئی تھی بینک کی جاب تھی مگر مستقل نہیں تھی ملازمت مستقل ہونے کے لیے ضروری تھا کہ کثیر رقم کا اکاؤنٹ یا پھر کوئی پراپرٹی احمد کے نام ہوتی...... احمد الجھ سا گیا تھا۔ ہم دونوں بہنیں بھی اس کے لیے پریشان ہوتی تھیں مگر امی کی دنیا ویران ہو رہی تھی۔ ایمان اپنے پی کے سنگ رخصت ہونے والی تھی عزت دار گھرانے کی بہو بننے والی تھی مگر امی نارمل سی تھیں نہ اس کے رخصت ہونے پر دکھی اور نہ ہی فرض ادا کرنے پر شاد...... ایمان لاکھ پریکٹیکل بنتی امی کے اس رویے پر دکھی ہو جاتی۔

''ایمن امی بڑی پیاری ہیں، ابا کے بغیر کیسے اپنی زندگی محرومی میں گزاری، وہ ہم سے بھی بہت پیار کرتی ہیں بس......'' اس کی آواز رندھ گئی تھی......

''بس ایمن ہم ان کی پہلی ترجیحات میں نہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ احمد کی زندگی کو مکمل کرنے کے بعد وہ ہمارے بارے میں سوچیں گی...... پلیز ایمن اپنے بارے میں تم خود ہی سوچ لینا۔'' یہ وہ پیغام تھا جو رخصتی سے پہلے ایمان مجھے نم آنکھوں اور مضبوط لہجے کے ساتھ دے گئی تھی۔

ایمان کی شادی کے بعد بڑا اور قابلِ ذکر واقعہ یہ ہوا کہ امی نے ہمارا مکان احمد کے نام پر منتقل کر دیا...... مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ میں خوش ہوں یا ناخوش اصل میں میرا ذہن اتنے دوررس خیالات نہ لاتا، ایمان ہوتی تو اپنے دماغ کے کمپیوٹر کو آن کر کے مجھے اس عمل کے فوائد اور نقصانات سے آگاہ کرتی...... ایمان آئی بھی تو میں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور مجھے یقین تھا کہ امی اور احمد نے تو اسے اس امر کی ہوا تک نہیں لگنے دی ہوگی۔

عشرت باجی پہلی تاریخ کو کرایہ لے کر آئیں تو سیڑھیاں چڑھنے کی وجہ سے ہانپ رہی تھیں۔ رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ ان کی اس حالت سے امی گھبرا گئیں پانی لے کر آئیں اور میں نے انہیں کرسی پر سہارا دے کر بٹھایا۔

''کیا حال ہو گیا...... آپ کا عشرت باجی؟''

''بس ایمن بیماری ہی بڑی موذی ہے، یہ تو جان لے کر ہی رہے گی۔''

''توبہ کیسے بدفال نکال رہی ہو منہ سے۔'' امی نے پیار سے ڈانٹا۔

''بس خالہ جان شادی سے پہلے بھی پھیپھڑوں میں ہلکا سا داغ تھا، علاج سے بہتر ہو گیا...... امین بہت عظیم ہیں سب کچھ جانتے ہوئے بھی میرا ہاتھ تھاما، ان کے پیار اور خیال سے مرض دب گیا تھا مگر اب......'' وہ تھک گئی تھیں کچھ دیر ذرا لمبی، لمبی سانسیں لیں، امی انہیں روکنا چاہ رہی تھیں اور میں بھی چاہتی تھی کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جائیں مگر وہ اٹھ بیٹھیں۔

''بچے، آفس سے آنے والے ہیں اور امین بھی بازار سے کھانا لے کر آئیں گے، میرے لیے تو دلیا بنا گئے تھے۔''

دھیمی سی چال سے وہ اٹھیں اور نیچے چل دیں۔ نیچے اترنے کے بعد کھانسی کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

ایمان پہلی دفعہ رات رہنے کے لیے آئی، آسمانی رنگ کا سوٹ تھا جس پر سلور کام کیا ہوا تھا۔ آفاق بھائی تو اسے چھوڑ کر چل دیے، اگلے روز اتوار تھا اور آفس سے چھٹی بھی...... اور یہ چھٹی وہ ہمارے ساتھ بتانا چاہتی تھی۔ احمد رات ایمان دی کو دیکھ کر خوش ہوا، ان کی پسندیدہ آئس کریم بھی لے کر آیا۔ رات دیر تک ہم بہنوں سے باتیں کرتا رہا۔ امی سو گئی تھیں۔ احمد بھی جب اپنے کمرے میں چل دیا تو

ایمان میرے پاس سرک آئی۔
"یہ مکان اب احمد کے نام ہے ناں ایمن؟"
"ہاں! وہ اصل میں ... اس جاب کی مجبوری تھی اور......"
"پلیز ایمن مجھے اپنی طرح احمق مت سمجھو، ایک بیٹی کی شادی کی تو امی کو خیال ہوا کہ جانے داماد کیسے ہوں، گھر میں ملکیت ہی نہ جتا بیٹھیں......"
"چلو کوئی بات نہیں اللہ نے ہمیں بھائی دیا ہے ناں...... یہ ہے تو اسی کا، ہم کیوں مالک بنیں گی، تم اپنی سناؤ آفاق بھائی کیسے ہیں قدر کرتے ہیں تمہاری اور گھر والے...... ان کا رویہ کیسا ہے؟"
آفاق بھائی کا ذکر آتے ہی ... ایمان کی آنکھوں میں چمک سی آگئی تھی۔ چہرے کا رنگ کھل اٹھا تھا۔ میں خوش ہوگئی۔ اللہ ایمان کو اپنے گھر میں خوش آباد رکھے، ہمیں بھلا احمد کے گھر سے کیا لینا دینا۔ اس لمحے ہی میرے ذہن کے جھروکے پر رزاق کی شبیہہ کیسے ابھر آئی۔
اور پھر واقعی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے کہ اگلی صبح ہی جب میں نوشی کے ساتھ اس کے کچن میں ایک ریسیپی پر تجربہ کر رہی تھی کہ رزاق چلا آیا۔
"ارے بھائی آپ کیسے اس وقت......؟"
نوشی حیران ہوئی۔
"بس یونہی، آج جی ماندہ سا تھا، کام سے چھٹی لے کر چلا آیا۔"
نوشی بھائی کے لیے پانی لینے چل دی تو وہ میرے قریب چلا آیا۔ اس کی قربت کے سحر نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ وہ میرے بالکل قریب تھا کہ میں اسے محسوس کر سکتی تھی اور یہی نہیں وہ مجھے چھو سکتا تھا۔ میرا دل ایک دم تیزی سے دھڑکا اور ہاتھ لرز اٹھے۔ کوئی پیار بھری سرگوشی اور یا پھر کوئی محبت بھرا ننھا سا فقرہ...... میرا جسم مکمل سماعت بن گیا تھا۔ آج پہلی بار میں نے شدت سے یہ خواہش کی تھی کہ وہ مجھے پا لینے کی تمنا ظاہر کر دے اور وہ کچھ کہہ رہا تھا میں نے دھک دھک کرتے من کو ذرا خاموش ہو جانے کی سرزنش کی اور سنا...... مگر وہ...... وہ تو کہہ رہا تھا۔
"میں نے تمہیں تمہاری بہن کے کرتوت سے آگاہ کر دیا تھا ناں...... دیکھا کیسے چکر چلا کر ایک لڑکے کو پھنسا ہی لیا اس نے۔" اتنی عامیانہ سی گفتگو...... اس قدر گندے الفاظ...... یہ سب اس کی ذہنیت کو ظاہر کر رہے تھے اور وہ بات بھی کس کی کر رہا تھا، میری بہن، میری ایمان کی۔
میرا جسم یک دم ٹھنڈا سا پڑ گیا تھا اور جذبات پر جیسے یک دم کسی نے برف کی سل رکھ دی ہو۔ نوشی اندر آگئی تھی بھائی کے لیے پانی اور دوا لے کر مجھے نہیں یاد کہ میں چند منٹ وہاں کیسے رکی...... نظروں کے آگے اندھیرا سا آرہا تھا۔ میں نے اپنے گھر جانے میں ہی عافیت جانی۔
اس کے بعد اتفاق ہی سے میری ملاقات رزاق سے پھر ہوئی، ہمارا پورشن اوپر والی منزل پر تھا۔ اوپر تو کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی ہاں البتہ کال بیل بج اٹھی تو میں نیچے چلی آئی۔ ہلکا سا دروازہ کھولا سامنے رزاق کھڑا تھا۔ ہاتھ میں ایک پلیٹ تھامے میں خاموش رہی۔
"تمہارے گھر آیا ہوں سلام نہ کرو گی؟" وہ بولا۔
میں پھر بھی خاموش رہی تو ہنس دیا۔
"مجھے لگتا ہے کہ میری کل کی بات کا برا مان گئیں؟"
"ہاں......" میں ذرا بلند آواز میں بولی تو ہنس دیا۔
"لو یہ نوشی نے بھیجا ہے کل مل کر جو ڈش تیار کر رہی تھیں اور جسے ادھورا چھوڑ کر بھاگ گئی تھیں وہ... آج نوشی نے مکمل کی اور مجھے کہا کہ تمہیں چکھا آؤں۔"

میں نے ہاتھ بڑھایا کہ پلیٹ پکڑ لوں مگر اس نے دوسرا ہاتھ آگے بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ لاشعوری طور پر ہی میں نے یک دم چاروں طرف تکا...... وہاں کوئی نہیں تھا۔
"چھوڑو میرا ہاتھ......"
"اگر نہ چھوڑوں تو...... وہی بچپن کی عادت ہے تمہاری، بات بے بات منہ سجا لیتی ہو تم...... تمہیں تو پتا ہی ہے کہ میں تو ایسا ہی ہوں۔"
"چلو چھوڑو میرا ہاتھ، پلیز رزاق......" اب میری آواز رندھ گئی تھی۔
"کل میرے گھر جو پکوان تیار کر رہی تھیں تو میں نے سوچا کہ شاید آج معدے کے راستے دل میں اتر جانے کا پروگرام بنا رہی ہو" وہ بولا تو میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی، جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور اوپر جانے لگی تو قہقہہ لگا دیا۔
"یہی تو دیکھنا تھا کہ یوں سنوجی چھولی بلی بن کر کیسی لگ رہی ہو۔" وہ ہنستا ہوا واپس چل دیا۔
احمد کو پہلی تنخواہ ملی تو وہ آتے ہوئے اپنے لیے اچھا سا موبائل لے آیا۔ امی تو خوش تھیں مگر میرے دل میں ملال سا آیا۔ امی نے اپنی تمام تر توجہ...... پیار اور حیثیت اسی کے لیے وقف کر دی تھی مگر وہ ان کے لیے اپنی پہلی کمائی سے ایک معمولی سا تحفہ بھی نہ لے کر آیا...... جبکہ امی کی آنکھوں کی چمک دو چند ہوگئی تھی۔
"شکر ہے خدا کا کہ احمد نے بھی موبائل لے لیا۔ آج کل تو بچے، بچے کی جیب میں ہے یہ، میں سوچتی تھی کہ میرا احمد جانے کب......"
"واہ ری ماں......!" میرے دل سے یک دم نکلا اور واقعی اللہ نے ماں کی شخصیت کو عجب سی مٹی سے بنایا ہے۔ اس کی ہر تمنا ہر آرزو بچے کی خوشی پر قربان ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

موبائل سے میرا دل دُکھا تھا مگر مجھے ہی اس سے کافی آرام ملا گھر میں فون کی سہولت تو نہ تھی اب کبھی جی چاہتا تو احمد سے لے کر ایمان سے بات کرلیتی۔

''ایمان آجاؤ ناں، میں بہت اداس ہوں۔''

''کل میں نے سوچا تھا ایمن مگر آفاق نہیں مانے...... کہنے لگے کہ اماں اسکول گئی ہیں اور ناصرہ شاید آجائے، تم کھانا بنا کر آفس جانا اور سیدھی گھر آنا۔''

''اچھا تمہاری نند آئی یا نہیں؟''

''نہیں...... اور میں یہ جانتی تھی کہ آفاق مجھے میکے نہ بھیجنے کے بہانے بنا رہے ہیں۔'' اس کی آواز ذرا بھیگ گئی۔

''آفاق بھائی بھی اپنے ہی ہیں کیا، وہ تو پڑھے لکھے اور بڑے ہی ویل مینرڈ سے بندے لگتے ہیں۔''

''مرد تو ہیں ناں......'' ایمان بولی اور موبائل آف کر دیا۔ اس فون کال کے تین دن بعد ہی ایمان آگئی۔ چہچہاتی ہوئی چڑیا کی طرح۔

''آفس سے سیدھی آرہی ہوں، رات اِدھر رکوں گی اور اِدھر ہی سے آفس جاؤں گی۔ کل آفاق مجھے آفس سے پک کرلیں گے اور ہم لنچ باہر ہی کریں گے۔''

میں تین دن سے ایمان کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی اور وہاں تو گزری کسی تلخ بات کی پرچھائیں بھی نہیں تھی۔ میں ایمان سے کم سمجھدار سہی مگر اب اتنی بھی نادان نہیں تھی کہ جان نہ پاتی یہ شادی شدہ زندگی تو بس دھوپ چھاؤں ہی ہے۔ کبھی کوئی بات کوئی عمل دل کو رنجیدہ کر گیا تو کبھی پیار بھرا ایک فقرہ سب تلخیوں کو یوں چٹکیوں میں اُڑا لے گیا گویا وہ ہوئی نہ ہو......

امی نے ایمان کی پسند کا کھانا بنایا تھا۔ ایمان کو خوش اور مطمئن دیکھ کر وہ بھی نہال ہو رہی تھیں۔

''ایمان ایسے اچھا نہیں لگتا کہ آفاق بھائی خالی تمہیں لینے آئیں، بھئی کھانا کھائیں ہمارے ساتھ۔'' میں نے کہا تو وہ ہنس دی۔

''کسی دن آجائیں گے ایسے ہی چوبلے میں گھسنے کو دل کر رہا ہے ناں تمہارا۔'' میں نے امی کی طرف دیکھا کہ شاید ایمان کو مجبور کریں گی کہ آفاق اپنی سسرال میں کھانا کھائے مگر وہ محض مسکرادیں۔ ہاں البتہ آنکھوں میں ہلکی سی چمک آئی اور چہرے کی رنگت میں یک دم نکھار آگیا۔ اب وہ ایمان کے بالکل قریب آگئیں۔

''ہاں ایمان، ایک دو دن اور رک جاؤ، میں نے احمد کے لیے ایک لڑکی پسند کی ہے، منگل کے روز مسز راحت کے گھر درس پر آتی ہے، منگل کو تمہیں ساتھ لے جاتی اور بہانے سے دِکھا دیتی۔'' بیٹے کے سر پر سہرا سجا دیکھنا ہر ماں کی ایک تمنا ہوتی ہے مگر جس ماں کی بیٹی اپنی عمر کی اٹھائیسویں بہار دیکھ رہی ہو اور بھائی عمر میں چھوٹا ہو تو اس وقت بیٹے کی شادی کا چاؤ...... ایمان کے چہرے پر بھی ہلکا سا تاریک سایہ لہرایا۔ میں بھی چپ سی ہو گئی۔ میری پیاری امی نے ہم دونوں کی سرد مہری دیکھی تو وہاں سے ہٹ گئیں۔

''سنو ایمن! تمہیں کوئی پسند ہے؟''

''پتا نہیں ایمان......''

''یہ کیا بات ہوئی...... اگر کوئی تمہاری زندگی میں تمہارے خیالوں میں اب تک نہیں آیا تو اپنی سسرال میں یا...... آفس میں دیکھوں کوئی......؟''

''نہیں اماں جی......! میری اتنی فکر نہیں کرو، تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' رزاق کی شبیہہ ذہن پر ابھری مگر خاک کہ ذرا ماند جا بن رہا تھا۔ رزاق کا رویہ اس کی ذہنی روش میں چاہنے کے باوجود رزاق کا نام زبان پر نہیں لاسکی۔

ایمان صبح آفس چل دی۔ صبح احمد کے پراٹھے کے ساتھ امی نے ایمان کو بھی پراٹھا بنا کر دیا اور انڈے کا آملیٹ بھی...... ایمان اپنی دھنی آنکھ داب کر ذرا مسکرائی۔

''بس تم بھی اب جلد از جلد اپنی قدر کروالو......'' جاتے وقت ہلکی سی سرگوشی کر کے بیگ کاندھے پر ڈالے وہ چل دی۔

اسی دوپہر عشرت باجی کی حالت کافی بگڑ گئی تھی۔ ان کی والدہ گاؤں سے آگئی تھیں۔ امین بھائی انہیں اسپتال لے گئے تھے اور نانو نے بچوں کو سنبھال لیا تھا۔ رات امی نے ہی نیچے ان لوگوں کے لیے کھانا بھجوایا۔ بچے بہت پریشان تھے اور کھانا کھانے کو تیار نہیں تھے۔ عشرت باجی کی اماں سادہ سی خاتون تھیں اور بیٹی کی بیماری سے بہت دل گرفتہ بھی...... عشرت باجی بہت بیمار تھیں شاید اسپتال میں کافی دن لگ جاتے مگر یہ خیال خام ہی ثابت ہوا۔ عشرت باجی اگلے ہی روز واپس آگئیں مگر جیتے جاگتے وجود کی شکل میں نہیں بلکہ سرد اور ساکت جسم کے ساتھ۔

کچھ ہفتے یونہی دبے پاؤں گزر گئے۔ موت نیچے والے پورشن میں ہوئی تھی مگر سارے گھر میں اداسی اور ماتم کی سی فضا تھی۔ امین بھائی پژمردہ اور کمزور سے ہو گئے تھے۔ بچے کبھی رونے لگتے اور کبھی اپنی نانو کی وجہ سے بہل جاتے۔

انہی دنوں ایمان کی کال، احمد کے موبائل پر آئی۔

''پلیز ایمن اپنے بارے میں سوچو، امی بہو لانے پر تلی ہیں، بھابی کے گھر آنے کے بعد حالات مختلف ہو جائیں گے اور......''

''میں کیا کروں ایمان، مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ......'' بس اس روز بڑے ہی محتاط الفاظ میں رزاق کا ذکر کر بیٹھی۔ ایمن خوش ہوئی۔

''ارے لڑکا بغل میں ڈھنڈورا شہر میں......

بھلا میں نے یہ کیوں نہ سوچا......'' رزاق کے ذکر کے ساتھ میرے دل میں جو غبار تھا وہ بھی میں نکال پائی تو ایمن ہنس دی۔

''اری پگلی سب مردوں کی ذہنیت ایسی ہی ہوتی ہے، ہر لڑکی کو پیار اور ایثار کے ساتھ اپنی گھر گرہستی آباد کرنا ہوتی ہے اور واقعی رزاق نے مجھے آفاق کے ساتھ ایک پارک میں دیکھا تھا۔ یہ بات اخلاقی طور پر غلط تو تھی ناں، میں نے سوچا تھا کہ رزاق جانے اس کا کیا ایکشن لے مگر اس نے اس بات کو نہیں اچھالا...... بس تم اس کی طرف سے دل صاف کرلو اور نوشی کو یا براہِ راست رزاق کو بولو کہ وہ تمہارے لیے رشتہ لے کر آئے۔'' ایمان نے ننھا سا لیکچر دے ڈالا اور حکمیہ انداز میں رائے دی اور فون بند کر دیا۔

اگلے ہی روز میں نوشی کی طرف جانے کو تیار ہوگئی۔ ایمان کے فون سے جو میرے اور رزاق کے درمیان ایک دھند سی حائل ہوئی تھی وہ جیسے کم ہوگئی تھی۔

''امی میں نوشی کی طرف ہو آؤں؟'' دل میں چور تھا اتنی سی بات کرتے گھبرا گئی۔

''چلی جاؤ، ایمن مگر واپسی پر نیچے بچوں کے پاس سے ہو کر آنا، کل ان کی نانو واپس چلی گئی ہیں۔ بچوں کے نانا بیمار تھے، تبھی انہیں جانا پڑا۔''

''جی امی، میں علینہ اور علی سے مل کر آؤں گی۔''

میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ رزاق اور میرے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی کوئی محبت و عشق کا اظہار...... بس بچپن سنگت میں گزرا تھا اور یہی ساتھ پسندیدگی کی وجہ بن گیا۔ سچ بات ہے کہ میں نے اپنے گھر سے باہر کی دنیا دیکھی ہی نہیں۔ میرے خیالات بھی محدود تھے اور تجربات بھی صفر...... ایمان نے مجھے اس بہادری پر اکسایا تھا اور آج میں نوشی سے بات کرنے والی تھی۔ نوشی بھی

میری ہی طرح چار دیواری میں دبی سادہ سی لڑکی تھی۔ وہی اس معاملے میں میری مددگار ہو سکتی تھی۔

انہی باتوں کو سوچتے میں ہولے قدموں سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ نیچے والے پورشن کا دروازہ قریب آیا تو جانے کیوں قدم رک گئے۔ یوں جیسے زمین نے میرے پاؤں تھام لیے۔ امی نے تو نوشی کے گھر سے واپسی پر بچوں کو دیکھنے کا بولا تھا مگر میں پہلے اندر جانے لگی۔ میں آج تک اس جذبے کو کوئی نام نہیں دے سکی جس کے باعث میں خود کو اندر جانے سے روک نہیں پائی۔

دروازہ مکمل بند نہیں تھا۔ بس بھڑا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ لگایا تو دروازہ کھل گیا۔ وہاں صحن کے عین درمیان علینہ کھڑی تھی ذرا دور علی بھی کھڑا تھا۔ علینہ متوحش سی تھی کسی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اور علی کی بھی گول چمکیلی آنکھیں سراسیمہ ہو رہی تھیں اور ......اور سب سے تکلیف دہ اور دلخراش منظر یہ تھا کہ ہمارا پیارا لاڈلا احمد، علینہ کے بالکل قریب تھا۔ اس کے کندھے پر اپنا بازو رکھے...... مجھے سامنے پا کر اس کا چہرہ یک دم سفید پڑ گیا تھا۔

''وہ اصل میں...... امی نے...... امی نے بولا تھا کہ بچوں کو......'' تاثرات اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ میں نے کچھ بھی نہیں کہا میں تو خود یک دم زلزلے کی زد میں تھی۔ میری نگاہوں کے قہر اور غضب کو برداشت نہ کرتے ہوئے وہ جیسے زمین میں گڑ گیا تھا پھر ہلا اور تیزی سے صحن سے باہر نکل گیا۔

دونوں بچے میرے سامنے تھے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی سڈول سی علینہ اور ننھا سا علی...... یونہی نگاہ غیر ارادی طور پر عشرت باجی کے ننھے سے باغیچے پر بھی پڑی۔ اوائلِ بہار تھی مگر وہاں کوئی گلاب مہک نہیں رہا تھا۔ دروازے کے بالکل قریب اگا رات کی رانی کا پودا بھی جل گیا تھا۔ ماحول کو معطر کرنے والی خوشبو مکمل طور پر ندارد تھی۔ بچوں کے کملائے چہرے اور اجڑا ہوا وہ باغیچہ......

کئی دفعہ فیصلہ کرنے کو ایک مدت درکار ہوتی ہے اور کسی وقت ایک لمحہ ہی ساری زندگی کا احاطہ کر لیتا ہے۔ سارے جیون کا عنوان بدل دیتا ہے۔

میرے کان صرف یہ آواز سن رہے تھے۔

''ایمن سنو...... یہ علی اور علینہ...... اور ایمن پلیز میرے پودوں کو......'' بس یہی الفاظ تھے اور ان کی بازگشت کہ جس نے میرے ذہن کو کسی اور نہج پر سوچنے کے لیے شل سا کر دیا تھا۔ میں آگے بڑھی بازو پھیلائے اور دونوں بچے لرزتے وجود کے ساتھ میری بانہوں میں سما گئے۔

☆☆☆

آج پہلی تاریخ ہے اور میں اوپر امی کو کرایہ دینے کے لیے آئی ہوں۔ امی مجھے سامنے پا کر خوش ہیں اور ناراض بھی......

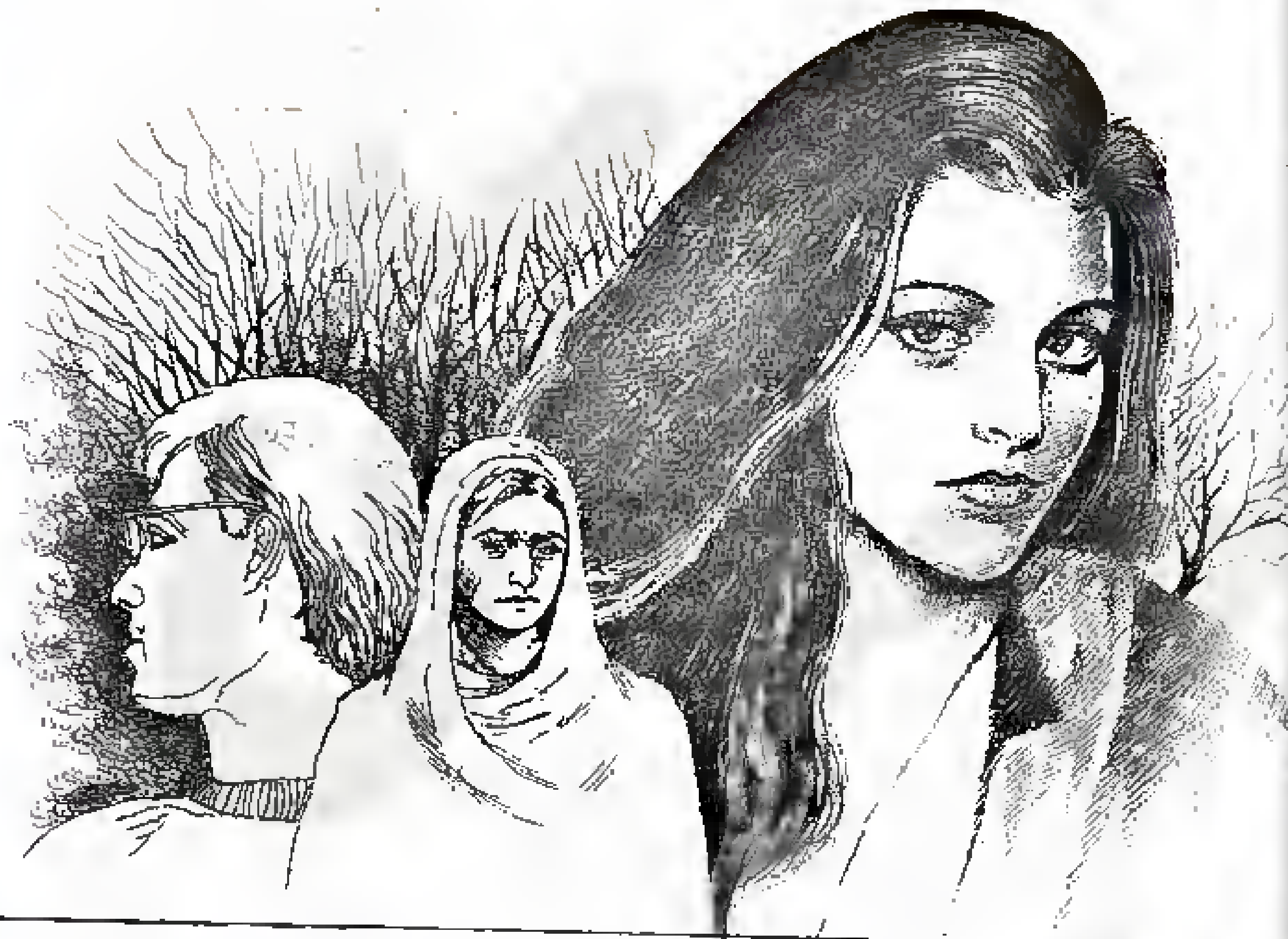
''کہاں ہوتی ہو، اتنی قریب ہو کر بھی دور ہو گئی۔ پہلی تاریخ کو آتی ہو اور وہ بھی ہوا کے گھوڑے پر سوار...... دعا کرو بھائی کا گھر بس جائے۔''

''جی امی اب میں چلوں......''

''رک تو سہی!''

''ارے نہیں امی، وقت نہیں ہے جب ایمان آئے گی تو چکر لگاؤں گی۔'' میں وہاں سے ہٹ آئی نیچے میرے گھر میں بڑے کام پڑے تھے۔ اکمل دوپہر کا کھانا گھر کھاتے، ان کے لیے کھانے کی تیاری کرنی تھی اور بچوں کی پسند کا برگر بھی تیار کرنا تھا اور...... اور بدلتی رُت تھی، اپنے باغیچے کو بھی تو دیکھنا تھا کہ بچوں کے شاداب چہرے اور کیاری میں کھلے گلاب ہی تو عشرت باجی کا مقصد تھا...... اور اب میرا مشن بھی......





کیسے کیسے لوگ

خورشید اختر

باہر گلی میں زور، زور سے بولنے اور لڑنے جھگڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے تھوڑی سی کرید ہوئی نہ جانے کس کی لڑائی ہو رہی ہے۔

''احمد بیٹا ذرا باہر دیکھنا کس کی لڑائی ہو رہی ہے۔''

''چھوڑیں امی جی، ہمیں کیا غرض۔ ویسے بھی لڑائی کی آواز عورتوں کی ہے۔'' احمد نے بدستور کمپیوٹر پر نگاہیں جمائے' جمائے کہا۔ میں نے

دعا

یہ ایک بالکل سچا واقعہ ہے جو آپ سے شیئر کر رہی ہوں۔ آج سے سات سال قبل کی بات ہے میرے میاں جو بھیرہ میں گورنمنٹ ملازم تھے کا اچانک تبادلہ ملتان ہو گیا اور انہیں فوراً جانا پڑ گیا سو وہ چلے گئے۔ گھر میں، میں اور میرا دو سالہ بیٹا عبداللہ رہ گئے۔ سسرال والے لاہور میں ہوتے ہیں، میری شادی سرگودھا سے بھیرہ ہوئی تھی۔ اس لیے میں یہاں اکیلی تھی اور بہت پریشان کہ میں علی کے بغیر کیسے رہوں گی۔ اسی ٹینشن میں وہ رات گزر گئی۔ صبح اسکول جانا تھا کیونکہ میں خود ایک گورنمنٹ اسکول ٹیچر ہوں۔ اسکول زیادہ دور نہیں تھا۔ اس لیے پیدل ہی چلی جاتی تھی۔ اس دن بھی میں اسکول کے لیے نکلی ابھی میں پہلی گلی میں ہی تھی تو سامنے سے ایک بزرگ جنہوں نے سبز لمبا سا چولا پہن رکھا تھا بالکل سفید داڑھی اور ہاتھ میں تسبیح تھی۔ ان کے چہرے پر اتنا نور تھا کہ بتا نہیں سکتی۔ جب پاس سے گزرنے لگی انہوں نے مجھے روکا پر میں رکی نہیں۔ جب میں نے دوسری گلی کراس کی تو وہی بزرگ پھر میرے سامنے تھے۔ میں حیران تو ہوئی کہ یہ یہاں کیسے......؟ خیر میں نے زیادہ نوٹس نہیں لیا۔ میری عادت ہے کہ میں سر جھکا کر چلتی ہوں کون آرہا ہے، کون جا رہا ہے۔ زیادہ غور نہیں کرتی...... اس لیے ان بزرگ پر بھی زیادہ توجہ نہیں دی۔ بس پاس سے گزر گئی۔ جب اسکول کا موڑ آیا تو وہی بزرگ پھر کھڑے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے پھر پکارا اور کہا۔

”بیٹا میری بات سنو اور دعا لے لو۔“ اس وقت میں نے اتنا کہا۔ ”بابا جی آپ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں۔“ وہ ہنسے اور کہا ”جاؤ۔“ میں جب اسکول آئی تو آفس کی کرسی پر وہی بزرگ بیٹھے تھے میں شدید حیرانی اور پریشانی کے عالم میں انہیں دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی یا خدایا یہ کیا ماجرا ہے۔ وہ بولے۔

”کوئی ماجرا نہیں جو آپ سوچ رہی ہیں۔“ میں واقعی ڈر گئی۔

بولے۔ ”ڈرنے کی ضرورت نہیں...... میں صرف تمہیں دعا دینے آیا ہوں۔ تم جو پریشان ہو اس کا حل بتانے آیا ہوں۔ تمہاری ساری پریشانی ختم ہو جائے گی۔“

بزرگ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔

”بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خدا نے تمہیں بہت خوشیاں دینی ہیں، تمہارے چار بیٹے ہونے ہیں اور تم حج کرو گی۔ بس پابندی سے نماز پڑھا کرو۔ صدقہ دیا کرو اور درود شریف کثرت سے پڑھو۔“ یہ کہہ کر وہ میری آنکھوں کے سامنے غائب ہو گئے۔ یہ بات سارے اسکول پھر سارے شہر میں پھیل گئی مس کے پاس کوئی کرنی والا آیا تھا جو دعا دے گیا ہے۔

جب گھر واپس آئی تو بہت ڈر لگا اور شدید بخار ہو گیا۔ میرے دور کے ماموں لگتے تھے وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ انہوں نے مجھ پر دم کروایا۔ جس مولوی صاحب نے دم کیا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ... ایسے کرماں والے بہت کم ہوتے ہیں اور یہ تو بہت خوش قسمت ہے جو اتنی اچھی دعا دے گئے۔

قارئین! میری شادی کو اب 14 سال ہو گئے ہیں، میرے چار بیٹے ہیں، نماز پہلے کبھی، کبھی پڑھتی تھی۔ اب باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ درود شریف کا ورد ہر وقت میری زبان پر رہتا ہے۔ مجھے خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت بھی نصیب ہوئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے کوئی پریشانی نہیں۔ میں اور میرے شوہر ہم سب بہت خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔

قارئین! آپ سب بھی نماز باقاعدگی سے پڑھا کریں، کیونکہ نماز سے ہی تمام پریشانیاں دور ہوتی ہیں۔ یہ میرا ایمان ہے۔

تحریر...... جبیں ہاشمی، بھیرہ

ڈرائنگ روم کے پردے کو ذرا سا ہٹا کر باہر جھانکا گلی کے نکڑ پر آخری گھر والی زبیدہ اپنی کام والی ماسی سے جھگڑ رہی تھی۔

”یہ زبیدہ بھی عجیب عورت ہے۔ بھلا کوئی کام والی سے بھی اس طرح جھگڑتا ہے اور اگر جھگڑتا ہی ہے تو گھر میں لڑو بھئی۔ یوں سارے زمانے کو دکھا کر کیا ملے گا۔“ میں بڑبڑاتی ہوئی صحن میں آ گئی۔ آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ بات اب گالم گلوچ تک پہنچ گئی تھی۔ یہ شاید زبیدہ نے کوئی نئی ماسی رکھی تھی۔ پہلے تو دل میں آیا کہ جا کر تفصیل پوچھوں مگر ہمارے محلے میں آج کل کی طرح کوئی بھی ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ میری اپنی کام والی ماسی بشیراں آج بھی غائب تھی۔ مجھے اب اس پر غصہ آرہا تھا۔

”کم بخت ہفتے میں اتوار کے علاوہ ایک بار تو لازمی چھٹی کر جاتی ہے۔ بارہا اسے دھمکیاں بھی دے ڈالیں۔ اب کہ تیری پکی چھٹی کر دوں گی مگر وہ بھی بڑی ڈھیٹ ہے۔ ہر بار ہنس کر معافی مانگ لیتی ہے اور میں بھی درگزر کر دیتی ہوں اس کی بھی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو وہ کام ستھرا کرتی ہے دوسرا چوری نہیں کرتی تیسرا فائدہ مجھے اس سے یہ بھی ہے کہ میں اپنے گھر کی کوئی بھی پرانی چیز اسے اسی پر احسان جتا کر بڑے آرام سے بیچ دیتی ہوں۔ اس طرح وہ میرے ساتھ بندھی رہتی ہے اور پیسے اس کی تنخواہ سے کاٹتی رہتی ہوں اور مجھے اپنی پرانی چیزیں بیچنے کے لیے کسی کو کہنا بھی نہیں پڑتا۔ اب بشیراں کے گھر پر آسائش کی ہر چیز میرے ہی گھر سے گئی ہے۔ اب بھی کئی دنوں سے سوچ رہی ہوں کہ فریج کچھ پرانا ہو رہا ہے۔ اس کی کارکردگی بھی کچھ متاثر ہو رہی ہے۔ سوا سے بھی بشیراں کو سونپ کر ایک تو اس پر احسان بھی دھر دوں گی اس کے علاوہ میرے پاس جمع شدہ دس ہزار روپے ہیں وہ ایڈوانس دے کر قسطوں پر نیا فریج لے لوں گی اور قسطیں بشیراں کی تنخواہ کاٹ کر ادا کر دیا کروں گی مگر آج پھر نامراد چھٹی مار گئی ہے۔“ میں بیٹھی جل بھن رہی تھی کہ گھنٹی کی آواز آئی۔

حمیرا میری بیٹی نے دروازہ کھولا تو بشیراں کے بجائے وہی کام والی ماسی تھی جس کا ابھی زبیدہ سے جھگڑا ہو رہا تھا۔

”باجی تھوڑا سا پانی مل جائے گا پینے کو؟“ وہ انتہائی لجاجت سے پانی مانگ رہی تھی۔

”آجاؤ، اندر آجاؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔“ میں نے اسے اندر آنے کو کہا پھر اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئی۔

”حمیرا اس کو پانی لا کر دو۔“

اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا شاید مار کٹائی بھی ہوئی تھی۔ اس نے غٹاغٹ پانی پی لیا۔ میں نے پوچھنا تو نہیں تھا مگر نہ جانے کیوں پوچھ بیٹھی۔

”کیا ہوا تھا؟ کیوں لڑائی ہو رہی تھی تمہاری

زبیدہ سے؟'' وہ روتے ہوئے بتانے لگی۔

''باجی دیکھو ہم غریب لوگ پورا مہینہ محنت کرتے ہیں کس لیے......؟ پیسے کے لیے ناں پھر بھی اگر ہمیں ہماری محنت کے پیسے نہ ملیں تو لڑائی جھگڑا کرنا تو ہمارا حق بنتا ہے ناں۔'' اس نے مجھ سے انصاف طلب کرتے ہوئے پوچھا۔ میں نے تائید میں گردن ہلادی۔ وہ شاید مزید تفصیل بتانا چاہ رہی تھی مگر میں زبیدہ کے شدید خلاف ہونے کے باوجود کسی کام والی سے اس کی کوئی برائی نہیں سننا چاہتی تھی سواسے ٹالتے ہوئے بولی۔

''بس اب تم نے پانی پی لیا ہے ناں، چلو اب جاؤ۔''

''آپ کی کام والی نہیں آئی آج؟'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ کم بخت نے میری دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ہاں نہیں آئی، وہ دس بجے تک آجاتی ہے آج بارہ بج گئے ہیں ابھی تک نہیں آئی۔'' میں نے... بہ مشکل ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''باجی اگر برا نہ مانو تو میں آج آپ کا کام کردوں؟'' لو اندھا کیا چاہے دو آنکھیں میں نے فوراً اجازت دے دی۔ ایک گھنٹے سے بھی کم میں اس نے سارا گھر لشکا دیا اور کام بھی اتنا صاف ستھرا کیا کہ میں کوئی نقص نہ نکال سکی۔ میں نے اسے پچاس روپے تھمانا چاہے مگر وہ بولی۔

''کوئی بات نہیں باجی، اگر کل بھی آپ کی کام والی نہیں آئی تو کل اکٹھے لے لوں گی۔'' اگلے دن بشیراں کی طرف سے پیغام آیا کہ اسے بخار ہے، آٹھ دن وہ نہیں آئی اور ان آٹھ دنوں میں شمیم نے میرے گھر کا کام کرکے میرا دل جیت لیا۔

میں نے اسے باقاعدہ کام پر رکھ لیا۔ آٹھ دن بعد بشیراں آئی تو میں نے اسے جواب دے دیا۔ پورا ماہ گزرنے میں ابھی ایک ہفتہ تھا جب ایک دن میں نے شمیم سے پوچھا۔

''شمیم، تیرے گھر فریج ہے؟''

''نہ باجی، ہم غریب لوگ ہمارے پاس ایسی چیزیں کہاں۔ ہمارے پاس تو کبھی اتنے پیسے بھی جمع نہیں ہوتے کہ قسطوں پر ہی کوئی چیز لے لیں۔'' وہ بولی۔

''اچھا اگر میں تجھے یہ فریج قسطوں پر دے دوں اور تیری تنخواہ سے پیسے کاٹتی رہوں تو ٹھیک ہے۔''

''ہائے باجی تم کتنی اچھی ہو۔ غریبوں کا کتنا خیال رکھتی ہو۔'' اس نے میرے پاؤں دبانے شروع کردیے۔

''میری پہلی کام والی بشیراں کے گھر ہر چیز میری ہی دی ہوئی ہے۔'' میں نے فخر سے گردن اکڑا کر کہا۔ وہ بڑی خوش ہوئی اور مزید دل جمعی سے کام کرنے لگی۔ میرے میاں ایک گورنمنٹ کے محکمے میں افسر ہیں۔ انہیں آفس کی طرف سے آفس کے ہی کام کے لیے ایک پک اپ ملی ہوئی ہے مگر ہم نے ڈرائیور کو اپنے بچوں کو اسکول سے لانے اور لے جانے کی ڈیوٹی بھی دی ہوئی تھی۔ دوپہر کو جب ڈرائیور بچے لے کر آیا تو شمیم کہنے لگی۔

''باجی، اللہ تمہارا بھلا کرے تم بہت اچھی ہو۔ اپنے ڈرائیور کو کہنا کہ یہ فریج میرے گھر اتار دے۔ میرا کرایہ بچ جائے گا۔''

''بیٹا باہر گاڑی میں ڈرائیور بیٹھا ہے اسے کہو کہ آکر یہ فریج اس کے ساتھ پک اپ میں رکھوا دے اور یہ جہاں کہے اسے وہاں اتار آنا۔'' میں نے بیٹی سے کہا۔ شمیم دعائیں دیتی ہوئی فریج اٹھوا کر لے گئی اور اگلے دن اپنے وقت پر کام کرنے آگئی۔ میں نے شام سے پہلے ہی نیا فریج لے لیا۔ مہینہ گزرنے پر اس نے مجھ سے تنخواہ طلب کی۔

''باجی مہینہ پورا ہوگیا ہے میری تنخواہ تو دے دو۔''

''تنخواہ، کون سی تنخواہ تم نے ہی تو کہا تھا کہ فریج کے پیسے کٹواؤں گی۔''

''ارے باجی، کون سا فریج مجھے کب دیا تم نے کوئی فریج......؟'' وہ آنکھیں نکال کر بولی مجھے سخت غصہ آیا بھر کر میں نے کہا۔

''زیادہ بکواس نہ کرو میرا دماغ خراب نہ کرو، ابھی دس دن پہلے ہی تو...... میرے گھر سے فریج لے کر گئی ہو تم۔'' وہ مکرتی گئی اور چیخ، چیخ کر محلے داروں کو اکٹھا کرلیا۔ ہمارے سامنے ایک بہت ہی معزز حاجی صاحب رہتے ہیں وہ کہنے لگے کہ چلو اس کے گھر چل کر دیکھ لو ہم لوگ بھاگم بھاگ اس کے گھر گئے تو جا کر دیکھا کہ وہاں فریج تو دور کی بات ہے کسی بھی سامان کا نام ونشان نہ تھا۔ کچا صحن، کچا کمرا، دو چارپائیاں، دو صندوق اور بس۔

''اری کم بخت ماری میرا فریج کہاں کیا تو نے؟'' میں نے اپنے گھر واپس آکر اس سے کہا۔ اس نے زور، زور سے رونا شروع کردیا۔

''ہائے، ہائے اللہ غارت کرے ان امیر لوگوں کو۔ میرے پورے مہینے کی محنت کی تنخواہ مار گئے۔ سارا مہینہ کام کیا، محنت کی، ظالم لوگ۔'' اتنے میں ڈرائیور بچوں کو لے کر آگیا۔ میں نے اس سے گواہی دلوانی چاہی۔

''حمید تم ابھی آٹھ دن پہلے اس کے گھر فریج چھوڑ کر آئے تھے ناں؟''

''ہاں باجی فریج تو یہ لے گئی تھی مگر گھر پر نہیں۔''

''ارے تو پھر کہاں لے گئی؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''باجی، آپ ہی نے تو کہا تھا کہ جہاں یہ کہے وہاں چھوڑ آؤ۔ تو میں تو جی اسے اڈے پر چھوڑ کر آیا تھا یہ فیصل آباد جارہی تھی فریج لے کر۔''

''ہیں...... اری نامراد تو میرا فریج فیصل آباد چھوڑ آئی۔'' میں نے اسے دوہتڑ مارتے ہوئے کہا۔ وہ اور زیادہ زور سے چیخنے لگی۔ ساتھ ہی گالیوں کی بوچھاڑ بھی کردی۔

''چلو، چلو ابھی تھانے چلو۔ رپٹ لکھواؤ یہ تو آپ ہی کا بندہ ہے کوئی اور گواہ ہے؟'' میں نے حمید سے پوچھا کہ کیا تھانے میں گواہی دے سکتا ہے۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔

''باجی یہ سرکاری گاڑی ہے، میں تو بچے ہی لاتا ہوں تو یہ قانون کی نظر میں چوری اور جرم کرتا ہوں۔ نہ بابا نہ میں تھانے میں ایسی کوئی گواہی نہیں دے سکتا۔ میں تو جارہا ہوں پہلے ہی دفتر سے دیر ہوگئی۔'' وہ تو چلا گیا میں نے آفس فون کرکے میاں جی کو ساری بات بتائی تو وہ کہنے لگے۔

''اب صبر کرو میں اپنے دفتر کے ڈرائیور کی ایسے کسی کام میں انوالومنٹ نہیں کرواسکتا۔ آفس میں میری بہت بے عزتی ہوگی اور میں کسی کو بتانا نہیں چاہتا کہ میرے بچے یہ ڈرائیور لاتا اور لے جاتا ہے۔''

میری اور شمیم کی تو تکار اس وقت محلے دار سن رہے ہیں۔ وہ لڑتے، لڑتے گیٹ سے باہر نکل گئی ہے۔ اس نے چیخ، چیخ کر محلہ اکٹھا کرلیا ہے۔ اپنا آپ پیٹ، پیٹ کر اس نے اپنا چہرہ لال کرلیا ہے۔ میں پہلے تو اس سے زوردار بحث کرتی رہی۔

مگر نہ بھائی پڑھے لکھے بندے سے لڑنا آسان ہے اس جاہل کے منہ لگ کے کون اس کا مقابلہ کرے۔ وہ تو مغلظات بکنے لگی تھی اب میں نے گیٹ بند کرلیا اور ڈرائنگ روم کا پردہ اٹھا کر ذرا سا باہر جھانکا سارے محلے والے اپنے، اپنے گھروں سے جھانک کر اس کی صلواتیں سن رہے تھے کوئی بھی اس کے قریب آکر اس کی کہانی سننے کی کوشش نہیں کررہا تھا۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ سب کی نظروں میں قصوروار تو میں ہی تھی ناں۔

ناولٹ

ساحل ساحل زنجیر ہوئے

فرحانہ ناز ملک

دوسرا اور آخری حصہ



پہلے ان دونوں کا کلاس روم پھر پرنسپل کا آفس کسی میدانِ کارزار سے کم کا منظر پیش نہیں کر رہا تھا۔ کلاس ٹیچر کے بعد اب پرنسپل کی شامت آئی ہوئی تھی۔ خان زادوں کی بہو نہ ہوتی تو پرنسپل نے کہاں برداشت کرنی تھی یہ بے عزتی۔

''میں پوچھتی ہوں میرے بیٹے کی دوسری پوزیشن کیسے آئی؟'' شجاع کا رزلٹ کارڈ لہراتی زرنگار آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ ''ہمیشہ وہ پہلی

پوزیشن لیتا تھا۔ اس دفعہ دوسرے نمبر پر کیسے آگیا؟''

''ایسے کہ اس بار شجاع کو شہباز سے الگ بٹھایا گیا۔'' پرنسپل کا تحمل قابلِ رشک تھا۔

''کیا......؟'' زرنگار کو مزید پتنگے لگ گئے۔ ''آپ کا مطلب ہے میرا بیٹا نقل کر کے فرسٹ آتا رہا ہے' وہ بھی شہباز کی؟''

''جی۔''

''اس کا میرے بیٹے سے کوئی مقابلہ نہیں۔''

''وہ آپ کے گھر کا بچہ ہے، آپ کو خوش ہونا چاہیے اس کی قابلیت پر۔''

''میں تم سب کو دیکھ لوں گی۔ میں یہ اسکول بند کروا دوں گی۔'' میز بجا بجا کر زرنگار نے خوف ناک عزم کا اظہار کیا۔ پرنسپل عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی۔

''دو ٹکے کی عورت کے بیٹے کو فرسٹ کر دیا، کوئی اندھیر ہے۔''

''آپ بات کو سمجھیں، دوسری پوزیشن پر آنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آپ کا بچہ نالائق ہے۔ یقین جانیں شجاع بہت ذہین بچہ ہے۔ بس شہباز چند نمبروں کے فرق سے آگے نکل گیا۔''

''میں کسی کو نہیں بخشوں گی۔ شہباز...... شہباز...... شہباز میرے لیے تو عذاب ہو گیا۔'' زرنگار نے شجاع کا رزلٹ کارڈ پرنسپل کی ٹیبل پر پھینک دیا۔ ''نتیجہ بدل کر میرے گھر پہنچا دینا۔'' تن فن کرتی وہ اپنی قیمتی گاڑی میں جا بیٹھی۔

شہباز اور شجاع دونوں گاؤں سے یہاں پڑھنے آتے تھے۔ ٹھیک ٹھاک ساکھ کا حامل اسکول تھا۔ جہاں آج زرنگار نے آفت برپا کر دی تھی۔

''اسے کہتے ہیں شکل مومناں کرتوت کافراں والی۔'' پرنسپل اور شجاع کی ٹیچر کانوں کو ہاتھ لگاتے نہ تھکیں۔ ذرا سی دیر میں اسکول کی بنیادیں تک ہل گئی تھیں۔ وہ عورت جس کی خوب صورتی کا اسکول میں ہر کوئی شیدائی تھا۔ وہ آج سب کو بدوضع اور کریہہ لگی۔ سب کو اندازہ ہو رہا تھا اچھی شکل اخلاق و کردار کی ضامن نہیں ہوتی۔

☆☆☆

اور چچی نے ایک اسی پر بس نہیں کیا گھر آ کر تھپڑوں سے میرا منہ لال کر دیا۔

''بتا مجھے...... ایسی کون سی گیدڑ سنگھی ہے تیرے پاس جو تو سنگھاتا ہے اور سب تیرے گن گانے لگتے ہیں۔ یہ جو......'' دو چار جھانپڑ میرے ساتھ کھڑے شجاع کو بھی پڑ گئے تھے۔

''ہر وقت تیری دُم بنا تیرے پیچھے ہوتا ہے۔ اس کو بھی دے دے۔'' میں ڈرا سہما، تھپڑوں کی تکلیف پر آواز بھی نہ نکال سکا کہ انہوں نے میری گدی پکڑ لی۔

''خبردار سانس نہیں نکالنا میں کہہ رہی ہوں سانس نہیں نکالنا۔'' اور میں نے ہر آواز دبائی بعد میں وہ مجھے کان سے پکڑے دادی کے پاس لے گئیں۔

''بہت ہو گیا...... سن لیں یہ اب میرے بیٹے کے اسکول نہیں جائے گا۔ کہیں بھی اس کا بندوبست کریں مگر میرے بیٹے کے ساتھ نہیں جائے گا۔ بہت برداشت کر لیا میں نے۔ ماں بیٹا اللہ کا عذاب بن کر پیچھے پڑ گئے ہیں۔ نہ گھر میں سکون نہ باہر سکون۔ جدھر جاؤ شہباز، شہباز۔'' دادی صحن میں کرسی رکھے بیٹھی تھیں۔ قریب میری اماں، ملازماؤں سے گندم صاف کروا رہی تھیں۔ زرنگار چچی کے شور سے یکسر بے نیاز جیسے میری اماں کے مطلب کی باتیں ہی نہ ہوں جیسے وہ کسی اور کے بچے کے بارے میں زہر اگل رہی ہوں۔

''ایک گھر کے بچے الگ، الگ اسکول جاتے اچھے لگیں گے؟'' دادی نے کمزوری توجیہہ بتائی۔

''نہ لگیں پر میرے بچے کے ساتھ یہ نظر نہ آئے۔'' دادی بے بسی سے مجھے دیکھنے لگیں۔

''ہونہہ...... پاگلوں کی اولاد پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھنے لگی۔ اللہ کی شان۔'' چچی نے جاتے' جاتے پھلجھڑیاں چھوڑیں۔ دادی مجھے پچکارنے کے لیے میرے پاس آ گئیں۔ میں ان کے ہاتھ جھٹکتا بھاگ گیا۔ مجھے رونا آ رہا تھا اور کام والیوں کے سامنے میری پہلے ہی بہت بے عزتی ہو چکی تھی رو کر مزید کیوں کرواتا۔

☆☆☆

میں اوپر چھت پر آ گیا تھا۔ چارپائی پر اوندھا لیٹا میں یہیں رات بھی کر دیتا اگر شجاع نہ آ جاتا۔

''شبی...... بات سن...... شبی۔'' میں جوں کا توں لیٹا رہا۔ چچی جب، جب ہاتھ اٹھاتیں میرا مر جانے کو دل کرتا۔

''اِدھر دیکھ...... میں کیا لایا ہوں؟'' تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں اٹھ بیٹھا۔ شجاع کے ہاتھ میں ایک جیسی کھلونا کاریں تھیں۔

''ابا لائے تھے، مجھے رات کو دی تھیں' انہیں پتا تھا ہم پوزیشن لیں گے۔ یہ ہمارا انعام ہے۔'' اس نے ایک کار مجھے دی میرے ذہن سے تھپڑ محو ہونے لگے۔

''ابا کہہ رہے تھے چھپا دینا۔ اماں کی نظر نہ پڑے ورنہ کسی کی خیر نہیں۔'' شجاع نہ بھی کہتا تو بھی میں نے ہمیشہ کی طرح یہ انعام بھی چھپا دینا تھا۔ ہر سال میں اور شجاع اول آتے۔ ہر سال مجھے چچا انعام دیتے۔ چچی سے چھپا کر رکھنے کی تاکید کے ساتھ۔ اپنے یہ کھلونے میں رات میں کھیل کر شوق پورا کر لیا کرتا۔ جب چچی کا سایہ نظر آنے کی بھی امید نہ ہوتی۔

''اچھا ہے ناں۔'' شجاع کے پوچھنے پر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب درد تو نہیں ہو رہا؟'' میں جانتا تھا وہ یہ ضرور پوچھے گا۔ میری ہر تکلیف پر درد محسوس کرنے والا میرا درد کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ تبھی اماں اوپر آ گئیں۔ ہاتھ میں ثابت لال مرچوں کا بڑا تھال لیے جنہیں وہ سکھانے کے لیے رکھنے آئی تھیں۔ تھال رکھ لینے کے بعد... خواہ مخواہ اِدھر اُدھر ہمسایوں کے گھر جھانکا اور بالآخر میرے پاس آئیں میرے دونوں گالوں پر ان کے سخت کھردرے ہاتھوں کا لمس آ ٹھہرا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بے بسی تھی، بے چارگی تھی اور بہت ساری اداسی بھی۔

''تیری دادی نے کہا ہے تو اسی اسکول میں رہے گا۔ کوئی نہیں نکالے گا تجھے۔'' میرے گالوں کو سہلاتی وہ بہ مشکل بول پائیں کیونکہ وہ رونا نہیں چاہتی تھیں پھر میرا ماتھا چومتی نیچے چلی گئیں میں جانتا تھا مجھ پر پڑنے والے ہر تھپڑ نے انہیں تکلیف پہنچائی تھی اور وہ سب کے بیچ نہ سہی بعد میں میری دلجوئی ضرور کریں گی اور انہوں نے کی۔

☆☆☆

شیطان کا ایک راستہ بند کرو وہ سو راستے اور ڈھونڈ نکالتا ہے۔ زرنگار چچی کی طرح... مجھے اسکول سے نکالنے میں ناکام ہونے کے بعد انہوں نے نئے حربے آزمانا شروع کر دیے۔ گھر میں ملازموں کی فوج ہوتے ہوئے ہمہ وقت میرے نام کی پکاریں پڑنے لگیں۔

''شہباز...... ڈیرے سے برتن اٹھا لاؤ۔ شہباز' زرجبیں کی جوتی موچی کو دے آؤ۔ شہباز میرے میکے سے راشدہ بھابی کا ہرا موتیوں والا دوپٹا لیتے آنا۔'' اور میں گھن چکر بن گیا۔

پہلے سمیعہ، سمیعہ ہوتی تھی اب سمعیہ کے ساتھ شہباز کا لاحقہ بھی جڑ گیا۔ نتیجتاً دن کے وقت میرا پڑھائی کرنا مشکل ہو گیا مگر میں ہمت اور حوصلے میں اپنی ماں پر گیا تھا۔ تھکا ہارا ہونے کے باوجود بھی

رات کو کتابیں کھول کر بیٹھ جاتا۔ اماں جنہیں سارا دن اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی تھی میں جب رات میں پڑھتا تو وہ اپنا تھکن زدہ وجود لیے میرے ساتھ بلاوجہ بیٹھی رہتیں۔

"اماں سو جاؤ۔" میں انہیں بار بار کہتا۔ وہ سوتی ہوں کہہ کر میرے پاس سے اٹھنے کا نام نہ لیتیں۔ میرے لیے ان کی محبت و توجہ کا یہی انعام بہت تھا۔

پھر ایک رات میں جب کتابوں میں منہ دیے بیٹھا تھا زرنگار چچی آ پہنچیں۔

"مسمعیہ۔" حسبِ معمول ان کی زبان سے نکلا تھا اور وہ اتنی اقتادے آئیں کہ مجھے اپنا بستہ سمیٹنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں کیا خوف زدہ ہوتا جتنی میری اماں ہو گئیں۔ زرنگار چچی کی ایک ایک فطرت پہچانتی تھیں وہ۔ مجھے پڑھتا دیکھ کر چچی کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔ انہوں نے اس وقت کچھ نہیں کہا مگر آنے والی ہر رات وہ مجھے مصروف کرنے لگیں۔ ایسے، ایسے کام ڈھونڈ کر بتانے لگیں کہ جنہیں کرنے کے بعد میرے ننھے وجود میں پڑھنے کی سکت باقی نہ رہتی۔ جیسے ایک رات وہ اپنے، بلال چچا، زرجبین اور شجاع کے پالش ہونے والے تمام جوتے پالش کرنے کا حکم دے کو خود سونے چلی گئیں اور میں بزدلی کی حد تک ایسا شریف کہ جاں دادہ وار کر کام کرتا گیا۔

اس رات مجھے ہر صورت ٹیسٹ یاد کرنا تھا۔ گزشتہ کئی دنوں سے میرے ٹیسٹ اچھے نہیں ہو رہے تھے۔ میری بے سکونی کی کوئی حد نہیں تھی مگر جوتوں کی دکان نہ جانے کب پالش ہونی تھی مجھ سے حالانکہ اماں نے زبردستی برش کھینچ کر خود یہ کام کرنے کی کوشش بھی کی لیکن مجھے ان کو کم از کم اس وقت آرام دینا تھا اور ابھی میں تیسرے جوتے تک ہی پہنچ پایا تھا کہ کسی نے میرے ہاتھ سے برش اچک لیا۔ یہ شجاع تھا۔

"تو ٹیسٹ یاد کر۔" وہ مزے سے پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔

"ہوش میں ہے تو۔" میں گھبرا ہی تو گیا۔

"اماں کو نہیں پتا اور نہ لگنے دوں گا۔ شاباش کتاب کھول اپنی۔" اور مجھے واقعی پڑھائی کرنی تھی۔ تشکر و محبت سے لبریز جذبات لیے میں اسے تا دیر دیکھے گیا۔

"جا یار..... نہیں تو میرے نمبر زیادہ آجائیں گے۔" میرے اندر پھریری سی دوڑ گئی۔ میں اس کے قریب ہی کتابیں لیے بیٹھ گیا۔ جب تک اس نے جوتے پالش کیے میرا ٹیسٹ یاد ہو گیا پھر گویا معمول بن گیا۔ وہ اپنی پڑھائی دن میں کرتا اور رات میں مجھے تفویض کردہ کام مگر ایسا کب تک ہوتا۔

ایک رات شجاع کو اپنے کمرے میں نہ پا کر چچی میرے کمرے میں آ گئیں اور یہاں شجاع کو ساری حویلی کی الماریوں کے لیے تن دہی سے پلاسٹک شیٹ کاٹتے دیکھ کر حق دق رہ گئیں۔

"شجاع!" وہ حلق کے بل چیخی تھیں۔ اس رات میرے ساتھ ساتھ شجاع بھی برابر کا پٹا۔ میں مار کھا کھا کر عادی نہیں ہو پایا تھا ہر نئی مار مجھے پہلی سے زیادہ اذیت بھری لگتی اور کبھی کبھی اکا دکا جھانپڑ کھانے والا شجاع ڈھٹائی سے مار کھاتا رہا بعد کے نتائج حسبِ توقع نکلے۔ میں نو ماہی امتحان کا ایک پرچہ خالی چھوڑ آیا۔

"سارا پرچہ بھول گیا جیسے میں نے کبھی پڑھا ہی نہ ہو۔ کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔" وہ خاموشی سے مجھے روتا دیکھتا رہا پھر جب نتیجہ نکلا۔ میں اس پرچے میں فیل تھا اور شجاع اس سے اگلے میں حالانکہ وہ اس کا پسندیدہ مضمون تھا۔ زرنگار چچی پاگلوں کی طرح چلاتی رہیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ فیل کیوں ہو گیا؟"

میرے سامنے تو پڑھتا رہا تھا۔ ضرور پرنسپل نے..... "چچی دائیں ٹانگ چھوڑتیں بائیں پکڑ لیتے کے مصداق اب بھی پرنسپل کے پیچھے پڑیں مجھے یقین تھا اور میرے یقین پر رات کے وقت میرے کمرے میں آ کر شجاع نے مہر بھی لگا دی۔

"چل آ..... سیلی بریٹ کرتے ہیں۔" اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر چچی ایسے کئی ڈبے رزلٹ سے پہلے لے کر رکھ دیا کرتی تھیں۔

"کھا ناں..... قسم سے مزے کی ہے۔" اس نے زبردستی گلاب جامن میرے منہ میں ڈال دیا۔

"تو جان بوجھ کر فیل ہوا؟" میں نے گلاب جامن نگل کر سوال کیا۔ شجاع نے ہونٹ سکیڑ لیے۔

"میں نے میتھ کا پیپر بلینک چھوڑ دیا تھا۔" اس نے بے نیازی سے بتایا۔

"کیوں؟" میں چیخ ہی تو پڑا۔

"کیونکہ مجھے تیرے رزلٹ کا اندازہ ہو گیا تھا تو میں نے سوچا جدھر یار کی سواری اُدھر میری۔ جدھر تو سر مارے گا اُدھر میں ماروں گا۔ جو تو کرے گا وہ میں کروں گا، ٹھیک کہا ناں تائی۔" وہ اماں سے تائید چاہ رہا تھا اور میں رونے لگا۔

"یار کیا عورتوں کی طرح رونے بیٹھ گئے ہو۔" وہ جھنجلا رہا تھا۔ میں نے دیکھا میری اماں مسکرا رہی تھی۔ میرے آنسو تھم گئے۔

"چچی کو پتا لگ گیا پھر؟"

"کبھی خود کو اس ڈر، خوف سے آزاد بھی کر لیا کر۔ بزدل....." پھر وہ ماں سے مخاطب ہوا۔

"تائی اس کا نام شہباز کیا سوچ کر رکھا تھا؟"

☆☆☆

بابا زمینوں سے دو ہفتوں کے بعد لوٹے۔ ٹی وی لاؤنج میں محفل جمی تھی۔ بلا ارادہ وہیں بیٹھ گئے حالانکہ یوں سب کے بیچ بیٹھنا ان کی عادت نہیں تھی۔ دادی اور پھپو نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ خوشی کے آنے سے پہلے بھی وہ ان سب سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوتے تھے... مگر اب تو جیسے لاتعلق ہو گئے ہوں۔ بابا موبائل پر ایس ایم ایس ٹائپ کر رہے تھے۔ ٹائپ کر چکے تو دادی کچھ کہنے کو بے تاب ہوئیں۔ جیسے ہی منہ کھولا لاؤنج کی طرف آتی خوشی کو دیکھ کر دوبارہ سے بند کر لیا۔ خوشی کو دیکھ کر اشتعال کی شدید لہر نے سر اٹھایا تھا۔ وہ ابھی بابا کے بھیجے ایس ایم ایس کی وجہ سے آنے پر مجبور ہوئی تھی۔

"خوشی لاؤنج میں آؤ، میں آیا ہوا ہوں۔" وہ عام دنوں میں سب کا سامنا کرنے سے کتراتی تھی لیکن اب جانے پر معترض نہ ہوئی کہ ایک تو بابا اتنے دن لگا کر آئے تھے۔ اس کا دل بے حد اداس تھا پھر وہ بابا کا حکم کیسے ٹال دیتی۔

"وعلیکم السلام، جیتی رہو۔" اس کے سلام کا جواب صرف بابا نے دیا۔ باقی سب کا دل بابا کی مسکراہٹ دیکھ کر راکھ ہو گیا۔ یہ مسکراہٹ آج کل صرف خوشی کے لیے مخصوص تھی۔ نوریا اتنی دل برداشتہ ہوئی کہ پاؤں پٹختی اٹھ بھاگی۔ سب کی موجودگی اور وہ بھی اتنی نخوت بھری۔ خوشی ایک کے بعد دوسری بات نہ کر سکی بابا سے۔

"طبیعت؟" بابا اس کے ہاتھ میں موبائل دیکھ چکے تھے جسے وہ جلدی میں اور شاید انجانے میں ساتھ لیتی آئی۔ بابا نے مسکراتے ہوئے میسج بھیجا اس کے موبائل کی رنگ ٹون سائلنٹ تھی۔ روشن اسکرین سے اندازہ ہوا میسج تھا۔

"آپ کو بتاؤں..... آپ کا بیٹا آیا ہوا ہے۔" اس نے حسبِ عادت سوال نظرانداز کر کے اپنی ہانکی۔ بابا خوب محظوظ ہوئے۔

"ارے..... کب؟"

"ابھی، آپ کے آنے سے گھنٹا پہلے۔" اس

نے ٹائپ کیا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا؟"

"میں سامنے والے لان میں تھی۔"

"اور اب تم یہاں ہو؟" ساتھ ہی ناراضی بھرا smiley face۔

"آپ نے ہی تو کہا یہاں آکر بیٹھو۔" وہ حیرانی سے آنکھیں سکوڑے ٹائپ کرنے لگی۔

"تم جاؤ۔"

"کہاں؟" وہ ہونق ہی تو ہوگئی۔ بابا کو ہنسی آنے لگی۔ وہ جس قسم کا میسج ٹائپ کرتی شکل پر بھی ویسے ہی تاثرات ابھر آتے اور اُدھر بابر اسے مسلسل موبائل پر مصروف دیکھ کر پہلو پہ پہلو بدل رہا تھا۔

"شاہجہاں کے پاس۔"

"آپ مذاق کر رہے ہیں؟"

"جاؤ چائے پانی کا پوچھو۔"

"میں نہیں جا رہی۔" اس کے چہرے پہ ہوائیاں تھیں۔

"تم نہیں جاؤ گی تو میں سب کے بیچ میں منہ سے بول کے یہی حکم دوں گا۔" خطرناک دھمکی۔

"مت کریں بابا، آپ برے لگ رہے ہیں۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"جاؤ شاباش۔"

"سب کیا کہیں گے؟" وہ جھینپی تھی۔

"تم بیوی ہو، شوہر کی خدمت فرض ہے۔ سب کا دماغ خراب ہے اگر کہیں گے۔"

"میں نہیں جا رہی۔"

"میں بہ آواز بلند کہہ رہا ہوں۔" اور اِدھر بابا نے منہ کھولا اُدھر وہ کھڑی ہوگئی۔ بابا کو چھوڑ کر باقی جملہ حاضرین اس کے یوں ہوشیار باش ہونے پر تحیر میں گھر گئے۔ کھڑے ہونے کے بعد اس نے انگلیاں مسلیں۔ بابا کو ملتجیانہ دیکھا۔ وہ ہنوز سختی سے گھورتے رہے۔ انہیں مُتَقِم نظروں سے دیکھتی مرے مرے قدم اٹھانے لگی۔

"یہ کہاں جا رہی ہے؟" اس کا رخ سیڑھیوں کی طرف تھا۔ پہلے بابر کے کان کھڑے ہوئے پھر وہ خود کیونکہ وہ شاہجہاں کے کمرے میں گھس گئی تھی اور بابر سے یہ دیکھنا محال ہوگیا تھا۔

☆☆☆

انتہائی مہذب ملک میں پیدا ہونے والی کا ایسا غیر مہذب انداز نہ دستک نہ اجازت، منہ اٹھائے جب کمرے میں آگئی تب احساس ہوا غلط کر آئی۔ کچھ ایسے ہی تاثرات شاہجہاں کے چہرے پر بھی تھے مگر اب کیا، کیا جاسکتا تھا۔ سوائے سننے اور صرف سننے کے مگر شاہجہاں شاید سنانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ تین منٹ اس نے اس کی ڈانٹ کا انتظار کیا پھر سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"وہ......میں......" شاہجہاں کی زبان بند پر آنکھیں دفع ہوجاؤ کا حکم سنا رہی تھیں۔ "مجھے ......ایکچولی......" اس نے ہمت کرکے کہنا شروع کیا۔ "بابا نے بھیجا ہے۔ آپ سے چائے پانی کا پوچھنے کے لیے۔" عموماً وہ جھوٹ جو بچے گیٹ پر جاکر فاش کرتے ہیں کہ ابو کہہ رہے ہیں کہ وہ گھر پر نہیں ہیں کچھ ایسی ہی بچکانہ حرکت اس سے سرزد ہوئی تھی۔

"باہر جاؤ۔" شاہجہاں کی آنکھوں میں شدید ناگواری تھی۔

"جی......؟" خوشی کو قیامت قریب نظر آئی۔

"میں نے کہا باہر جاؤ۔" اس کی آنکھیں پھیل گئیں شاہجہاں کے تیز لہجے پر۔ "تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا......آئی سیڈ گیٹ آؤٹ۔" اور اب واقعی سمجھ میں آگیا تھا۔ وہ اڑتی ہوئی کمرے سے باہر آئی تھی۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر جانے کا کیا فائدہ ہوا۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ بابا سے آج کے دن ناراضی رکھنی ہے۔

☆☆☆

اور یہاں نوریا کے کمرے میں الگ بحث چھڑی تھی۔

"تم تو اسے دوست کی بہن بنانے پر تُلے تھے۔" نوریا نے بھڑک کر کہا۔

"جھوٹ بولا تھا، غلط کہا تھا اچھی لگی تھی مجھے، چاہتا تھا تم بات بڑھاؤ۔" چند لمحوں کے لیے سب کو چپ لگ گئی۔ بابر کا یہ اعترافِ محبت کوئی ایسا خوش کن نہیں تھا۔

"اور وہ بن گئی بھابی۔" نوریا نے تمسخر اڑایا، بابر کے ہونٹ بھنچ گئے۔

"قسمت تو دیکھو، شاہجہاں بن مانگے مل گیا اور میرا بیٹا ایک نظر میں لٹو ہوگیا چنڈال پر۔" پھپھو کے دکھڑوں میں ایک اور کا اضافہ ہوگیا۔

"کاش تم مجھے تب سچ بتا دیتے، میں کچھ نہ کچھ کرلیتی۔" نوریا کا بس نہیں چلا وقت پیچھے لے جائے۔

"تمہاری تو شکل پر نفرت لکھی تھی پتا نہیں سب اچھی شکلوں سے تمہیں حسد کیوں ہوجاتا ہے؟"

"تمیز سے بات کرو۔"

"چپ کرو......دونوں بدتمیز۔" بالآخر دادی کو چیخ کر کہنا پڑا۔ دونوں ناراض تاثرات سجائے چپ ہوگئے۔

"خیر......" پھر کافی دیر بعد بابر نارمل ہوا تو جیسے نئے عزم سے بولا۔ "ہار ماننے والا تو میں بھی نہیں، مسز شاہجہاں۔" اس نے بہ آواز بلند کہا تھا۔ "اتنا تو تُو جانتا ہوگا کہ بابر...... شاہجہاں کے باپ کا بھی باپ تھا۔" بڑی ذومعنی بات کی تھی اس نے۔ خواتین سمجھیں کہ نہیں مطمئن ضرور ہوگئیں۔ بابر کی صلاحیتوں سے کس کو انکار تھا۔

☆☆☆

ٹشو کا ڈبا خالی ہونے کو تھا اور آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اسے چپ کروانے کی بابا کی ہر کوشش ناکام ہوگئی۔ اب محسوس ہو رہا تھا اس کی تحقیر ہوئی ہے۔ شاہجہاں کا دفع ہوجاؤ کہنا اسے یاد آتا تو جیسے آنسو پھر سے بہہ نکلنے کو بے تاب ہوجاتے۔ بھلے دس بار کمرے سے باہر نکالتا مگر تھوڑی نرمی کے ساتھ اور اس کے روتے ہوئے چہرے کو بے بسی سے دیکھتے بابا کو کوئی اور شدت سے یاد آیا تھا۔

☆☆☆

زرنگار چچی چولھے کے قریب چوکی پر بیٹھی تھیں۔ میں، شجاع اور زرجبیں قریب بچھی چٹائی پر بیٹھے تھے۔ یہ ناشتے کا وقت تھا۔ آج کنیزاں کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے چچی کو خود روٹی پکانی پڑ رہی تھی۔ زرجبیں اور شجاع اپنی، اپنی روٹی پر مکھن کے بڑے بڑے پیڑے رکھے نوالے اس میں لگا لگا کر کھا رہے تھے۔ چچی نے میری روٹی پر انگلی کی مدد سے تھوڑا سا مکھن ڈالا جو گرم روٹی پر پگھلتا گیا مگر وہ اتنا کم تھا کہ روٹی کے صرف اسی حصے پر پگھلا جس پر رکھا گیا تھا، باقی روٹی خشک تھی۔ میری بھوک مکھن دیکھ کر چمک اٹھی تھی مگر چچی کی اس فیاضی نے میری بھوک مار دی۔ وہ میری روٹی کو ہاتھ میں لیے بیٹھی تھیں۔ پھر دونوں ہاتھوں سے روٹی کو دُہرا کرکے رگڑنے ...۔ ذرا سے مکھن کو پوری روٹی پر پھیلا دینا صرف زرنگار چچی کا ہی کمال تھا اور وہ روز ایسا کرتی تھیں اور میں روز ہی اچاٹ دل کے ساتھ ناشتا کیا کرتا۔

"اماں......بھیّا کو ملائی دے دیں۔" چچی میرے سامنے چائے کا کپ رکھ رہی تھیں جب شجاع نے کہا۔ آنکھیں نکال کر شجاع کو دیکھا۔ جس کی ڈھٹائی اس کی دلیری بن چکی تھی۔ مکھن کو چچی نے آنا فانا گھی بنانے کے لیے چولھے پر چڑھا دیا تھا۔ مجھ سے روکھی روٹی نہیں چبائی جا رہی تھی۔ چچی کی نظر بچا کر میں نے اسے باسی روٹیوں میں رکھ دیا۔ شجاع ناشتا ختم کرکے میرے لیے بیٹھا رہا تھا۔ میں کھڑا ہوا تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''شجاع۔'' اور جب وہ میرے پیچھے لپک رہا تھا۔ چچی نے چنگھاڑ کر پکارا۔ چچی، شجاع کے چور دروازے تاڑ چکی تھیں۔ جہاں سے وہ میری دل جوئی کرنے پہنچ جاتا تھا مگر اب اس کی قربانیاں چچی کے کنٹرول میں چلی گئی تھیں۔

میں حویلی کے پچھلے باغ میں مخصوص جگہ بیٹھا حسبِ عادت رونے لگا۔ پہلے اماں اور پھر دادی دونوں میرے اسکول کے زمانے میں ہی فوت ہوگئیں۔ اب میں اکیلا تھا اور زرنگار چچی کی حاکمانہ فطرتِ دادی کے زمانے کے عیش میرے لیے ماضی ہوگئے تھے۔ میری حیثیت ملازم سے زیادہ کی نہیں رہی تھی۔ بلال چچا، چچی کی حاکمانہ فطرت کے آگے بھلے نہ دبنے کے دعوے کرتے ہوں مگر وہ چچی سے ڈرتے ضرور تھے۔ اکثر باتوں پر چچا کو مجبوراً خاموشی اختیار کرنا پڑ جاتی۔ آج اسکول سے بھی چھٹی تھی۔ میں بڑی فرصت کے ساتھ رو سکتا تھا۔ تاوقتیکہ چچی آواز نہ دے لیتیں مگر ان کی آواز سے پہلے ایک اور آواز کہیں قریب سے سنائی دی۔ میں نے دیکھا۔ دھند کے اس پار نظر آتے چہرے پر تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔ ناجیہ......

''شرم کرو...... مرد ہوکر روتے ہو۔'' میں نے آنکھیں اور چہرہ رگڑنے میں دیر نہیں کی۔

''میں مرد نہیں ہوں۔'' بھولپن میں، میں نے جو کہنا تھا اسے غلط بول گیا۔ وہ اس زور سے ہنسی کہ میں شرمندہ ہوگیا۔

''بدتمیز۔'' بہت بری لگتی تھی یہ مجھے۔ منہ پر اچھا برا سب بول دینے والی، میں بدکتا تھا اس سے۔

''عورت ہو؟'' تھوڑا سا گیپ ہنسی میں آیا مگر یہ کہہ کر پھر وہی جان جلاتی قل قل۔

''میرا مطلب ہے میں بچہ ہوں۔'' میں منہ پھلا کر وضاحت دینے لگا۔

''اتنے بھی بچے نہیں ہو...... نویں میں پڑھتے ہو اور روتے ہو عورتوں کی طرح۔''

''تو تمہیں کیا؟''

''ہاں مجھے کیا...... میں تو ایسے ہی یہ اٹھائے چلی آئی۔'' وہ ہاتھ میں پکڑا ڈبا دکھانے لگی۔

''اس میں کیا ہے؟''

''دیسی گھی۔'' اس نے ڈبا کھول کر عین میری ناک کے سامنے کیا۔ ''سونگھو...... اصلی...... سچا گھر کا گھی۔''

''تم نے چوری کی؟...... گناہ؟'' اس کے ہاتھ پیر پھر سے پھول گئے۔

''نہ......ں ں ں۔'' اس نے لمبی نہ کی۔

''چوری نہیں، حق لیا۔ جو حق نہ دے اس سے ایسے لے لو...... اب دیکھو۔'' وہ میرے قریب ہوئی۔ ''اُدھر چچی نے رخ پھیرا اِدھر میں نے حق وصولا۔''

''یہ چوری ہے۔'' میں اس کی منطق سے ذرا متاثر نہ ہوا۔

''اس کا مطلب میں واپس لے جاؤں؟'' وہ ڈبا بند کرتی جانے بھی لگی۔

''نہیں، نہیں رکو سنو۔'' میں بہ سرعت اس کے سامنے آیا۔ وہ ہونٹ بگاڑتی مجھے دیکھنے لگی۔

''مگر......'' میں جھجک رہا تھا۔ ''کھائیں گے کیسے؟''

''پکڑو۔'' ڈبا میرے ہاتھوں میں دیتی وہ یہ جا وہ جا پھر چند لمحوں میں وہ دو روٹیوں کے ساتھ سامنے تھی۔

''چوری نہ کہنا۔'' آتے ہی وارننگ دی۔

''جانتے ہو ناں اپنی چچی کے شاہانہ مزاج کو۔ روٹیاں کتنی ضائع کرتی ہیں۔ یہ مجھے دی ہیں کہ میں مال مویشی کی سوکھی روٹیوں میں رکھ آؤں۔ میں نے چھپالیں۔'' بولتے بولتے اس نے دونوں روٹیاں گھی میں تر کرلی تھیں۔

''لو عذرا بانو...... خوش ہوجاؤ۔'' ایک روٹی میرے حوالے کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''عذرا بانو؟'' میں بالکل نہ سمجھا کہ اس نے کسے کہا۔ ''کون عذرا بانو؟''

''تم۔'' مجھے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''میں نہیں کھا رہا۔'' میں نے بے حد ناراضی سے روٹی واپس کرنی چاہی۔

''اوئے اوئے...... پتا ہے سرداروں کا خون ہو پر یہ نخرے چچی کو دکھانا مجھے نہیں۔ کھاؤ...... خون پسینہ لگا ہے اسے یہاں تک لانے میں۔'' میں منہ پھلائے کھانے لگا جبکہ اس نے ختم بھی کرلی تھی۔

''اوئے جلدی ختم کرو، کوئی آگیا تو میری روزی پر پانی پھر جائے گا۔'' میں نے بڑے بڑے نوالے لے کر روٹی ختم کی اور آخری نوالہ منہ میں تھا جب شجاع وہاں آیا۔ ناجیہ نے فوراً چوری کا مال چھپایا تھا۔ شجاع کے ہاتھ میں پلیٹ تھی۔ جس میں دیسی گھی سے چپڑی روٹی رکھی تھی۔

''یہ لو......'' آتے ہی اس نے پلیٹ میرے حوالے کی۔ ''جلدی سے ختم کرو...... بھوا اڑا کر لایا ہوں۔''

''لیکن میں......'' اس کے بعد بولنے کی نوبت نہیں آئی۔ ناجیہ کی کہنی میری پسلی میں آگ لگا گئی تھی۔

''اس کا مطلب یہ ناشتا کر آیا ہے۔'' استادوں کی استاد ناجیہ بات سنبھالنے میں ماہر تھی۔

''کوئی نہیں کیا، میرے سامنے تو بیٹھا تھا، لے ناں کھا...... اماں آجائیں گی۔'' اور مجھے کھانی پڑی۔ آج کی یہ دو مہربانیاں کافی مہنگی پڑی تھیں۔

☆☆☆

بڑی دھندلی سی جھلک تھی میرے ذہن میں۔ دادا جب میری اور شجاع کی ہم عمر ایک بچی کو گھر میں لائے تھے۔ دو چوٹیوں میں کسے ہوئے بال اور بڑی، بڑی آنکھوں والی ناجیہ میں مجھے یا گھر کے کسی بچے کو کوئی اپنائیت یا دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کے تیور بڑے ہی بے نیاز قسم کے تھے۔

''عبدالواحد کی نواسی ہے۔ بے چاری کا کوئی آسرا نہیں رہا۔ نانا کی فوتگی کے بعد سب نے آنکھیں پھیر لیں۔'' دادا نے اپنے کسی دور پار کے دوست کا نام لیا تھا۔ بنا تفصیل میں گئے دادی نے فوراً اس کے لیے باہیں وا کردیں۔

''سسر صاحب کے کسی گناہ کا پھل ہوگا۔ آج سے پہلے تو کسی نے عبدالواحد کا نام نہیں سنا۔'' زرنگار چچی عادتاً کلستی رہیں اور وہی ناجیہ ان کے کام آنے لگی۔ زرجبیں کو سنبھالنے سے لے کر چچی کی ٹانگیں دبانے تک۔ انہیں ایک کل وقتی ملازمہ مل گئی تھی۔

☆☆☆

''سنو۔'' اس دن زرنگار چچی کہیں گئی ہوئی تھیں۔ شجاع میرے کمرے میں تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہوم ورک کر رہے تھے جب کھڑکی سے اس نے جھانکا۔

''یہ پھر آگئی۔'' شجاع اس سے بلاوجہ چڑنے لگا تھا۔

''تم مجھے پڑھاؤ گے؟'' میں نے حیرت و بے یقینی سے یہاں وہاں اور پھر مسکراہٹ دبائے بیٹھے شجاع کو دیکھا۔

''مجھے نہیں، تمہیں کہہ رہی ہے۔'' اس نے جیسے مجھے سمجھانا چاہا۔

''میں......؟'' میں نے ناجیہ سے یقین دہانی چاہی۔

''ہاں تم۔''

''پڑھائے گا، کیوں نہیں پڑھائے گا۔ یہی کام تو کرتا ہے یہ۔'' میں منہ کھولے دیکھتا رہ گیا اور شجاع نے مسئلہ حل بھی کردیا۔ ''جاؤ کتابیں لے آؤ۔''

''عذرا بانو بھی تو کہے؟'' اس نے بھولپن سے کہا تھا۔ جہاں میرا رنگ اڑا وہیں شجاع اس کے پیچھے پڑ گیا۔

''کون، کون...... پھر سے کہو؟''

''یہ عذرا بانو۔'' اور شجاع پیٹ پکڑ پکڑ کر دُہرا ہوگیا۔ میں نے بڑی شاکی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''میں نہیں پڑھاتا۔'' وہ کان پکڑ کر گویا معافی مانگنے لگی۔

''مان جا یار...... دیکھ کان پکڑ کے معافی مانگ

رہی ہے۔“

”دوبارہ نہیں کہوں گی؟“ مگر میں نے ایک کے بعد دوسری نظر نہ ڈالی۔ وہ اتری شکل کے ساتھ جانے لگی۔ مجھے لگا میرا دل گھٹتا جا رہا ہے۔

”سنو۔“ بے اختیاری کیفیت تھی۔ میں نے اسے پکار لیا۔ وہ واپس پلٹی۔

”ٹھیک ہے، میں پڑھاؤں گا۔“ اس کی گندمی رنگت سے ستھری شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

”ہاں یہ ڈپٹی نذیر احمد......“ شجاع کی جھنجلاہٹ دیکھنے لائق تھی۔

”ویسے میں پانچویں پاس ہوں۔“ اس نے فخریہ بتایا۔

”میں تمہیں آٹھویں کا کورس پڑھاؤں گا، میرے پاس ہے۔“

”اس خوشی میں لڈو کھاتے ہیں، میں ابھی لائی۔“ وہ بھاگ گئی تھی۔ میں شجاع سے نظریں چرائے کتاب کھولنے لگا۔

”لڈو۔“ جبکہ شجاع کے کان کھڑے ہوگئے تھے۔ یہ لڈو اس کی ماسی کے گھر سے آئے تھے یقیناً ناجیہ اپنا حق وصول کر چکی تھی۔

”ایک نمبر کی چورنی ہے، دیکھنا تمہیں خراب کردے گی۔ اسلم پرویز کی طرح۔“ وہ چڑ رہا تھا۔

”اسلم پرویز۔“ ہمارے دور کا دبنگ ولن میں نے زیرلب دُہرایا۔

”شجاع نے کیا ٹھیک نام دیا ہے۔“ میرے ہاتھ ناجیہ کی چڑ آگئی تھی۔

☆☆☆

اب شجاع اور میری جوڑی تکون ہوگئی۔ وہ ہم میں شامل ہوگئی۔ شجاع چچی سے بچ نکلنے کا موقع کبھی کبھی ڈھونڈ پاتا اور وہ روزانہ ایسا کرتی۔

میں شجاع کی غیر موجودگی میں بھی شرمایا گھبرایا رہتا۔ سوچ سوچ کر پڑھاتا، کانپ کانپ کر کہتا۔ شجاع ہوتا تو پھر حالت مزید غیر ہوجاتی۔ مجھے ناجیہ سے خوف آتا تھا۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والی۔ میں اسے پڑھاتے وقت نظریں نیچی کیے رکھتا اور ان تیکھی نظروں کے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہوجاتا کہ وہ مجھے گھور رہی ہے۔ میں اس تپش سے گھبرا کر اسے دیکھتا۔ وہ بجائے شرمندہ ہونے کے بڑی ڈھٹائی و شوخی سے بھویں اچکا اچکا کر میرا خون خشک کردیتی۔ شجاع کے سامنے بھی اس کے یہی کرتوت ہوتے۔

”دو نمبر ہے۔“ وہ کہتا۔

”ایسے مت بولو۔“ میں فوراً ٹوک دیتا۔

”دیکھنا ہماری لٹیا ڈبودے گی۔“ میں کان لپیٹ لیتا۔ مجھے اس کا گلہ بھی منظور نہیں تھا۔ یوں میرے وہ دن جو گزرنے میں نہیں آتے تھے اب ان کو پر لگ گئے۔ شجاع کہتا تھا۔

”یہ لڑکی کتابیں تو نہیں پڑھتی، تمہیں پڑھتی رہتی ہے۔“ مگر وہ بہت ذہین تھی۔ وہ اتنی قابل تھی کہ میرا شدت سے دل چاہنے لگا کہ وہ پرائیویٹ میٹرک کا امتحان دے۔ میں آٹھویں اور نویں کے لیے بھی اسے راضی کرتا رہا تھا۔

”تم اسکول داخل ہو جاؤ، ریگولر پڑھو۔“

”کیوں میرن جان کے دشمن ہو رہے ہو۔“

”تمہارا فائدہ ہے اس میں۔“

”تم اگر نہیں پڑھانا چاہتے تو سیدھی طرح بتادو۔ گول مول کیوں کرتے ہو۔“ اور میں کہہ کر پچھتایا۔

میں اپنے امتحانات کے تمام کوئسچن پیپرز سنبھال لیتا تھا پھر سالانہ امتحانات کے دنوں میں، میں انہی کی مدد سے اس سے پیپر لیتا۔ دسویں کے امتحان نزدیک آئے تو میں نے اپنا پرانا مشورہ پھر سے دُہرایا۔

”تم کیوں چاہتے ہو؟“ وہ الٹا مجھ سے پوچھنے لگی۔

”...ٹیفکیٹ مل جائے گا۔“

”وہ کیا دے گا مجھے؟“ اس نے جرح کی تھی۔

”ضرورت کے وقت کام آتا ہے۔“

”میری ضرورت اور چاہ یہ نہیں۔“ اس نے لہجہ ڈرامائی بنا لیا تھا۔ میں بغلیں جھانکنے لگا۔

”کیوں، اس کے پاؤں اکھیڑتے ہو۔ یہ امتحان دینے کی فرمائش کرے گی اور اماں اس کی شادی کردیں گی کہ یہ خراب ہو رہی ہے۔“ شجاع واقعی مجھ سے دور اندیش تھا۔ اس کے بعد میں نے اس معاملے پر چپ سادھ لی۔

☆☆☆

یہ جاتی شام کا منظر تھا۔ میں نے محسوس کیا وہ چپ، چپ سی تھی۔ ڈھلتے سورج کا عکس اس کی گندمی رنگت کو روشن کر رہا تھا۔ وہ بڑی منہمک سی لکھنے میں مصروف تھی اور میں بے اختیار ہوا اسے دیکھنے میں۔ اس کی گھنی پلکوں کا سایہ اس کے صبیح عارضوں پر کانپ رہا تھا پھر اچانک ہی اس نے قلم بند کردیا اور ہاتھ پر اپنا چہرہ ٹکا کر کہنی فائل پر رکھتی، خاصی شریر نظروں کے ساتھ مجھے دیکھنے لگی۔ میں خفت سے یہاں وہاں دیکھنے لگا۔

”اب بتاؤ؟“ وہ بھویں اچکا کر پتا نہیں کیا پوچھنا چاہ رہی تھی۔ میں مصنوعی ناسمجھ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

”میں کیسی لگی؟“ اور جو اس نے پوچھا اس نے مجھے عرق، عرق کردیا۔

”اسلم پرویز۔“ تھوک نگل کر میں نے ترنت کہا۔

”وہ تو میں ہوں، یہ بتاؤ اسلم پرویز کی شکل کیسی لگی؟“

”بکواس نہیں کرو، میں تمہیں نہیں دیکھ رہا تھا۔“

”تم بہت عجیب ہو شہباز شمشیر خان۔“ اس نے حسرت و تاسف کے ساتھ کہنا جاری رکھا۔ ”تم کہتے ہو تم بدنصیب ہو۔ اصل میں تم بزدل ہو۔“ اس نے جیسے تھپڑ کھینچ مارا مجھے۔ میں کچھ کہہ بھی نہیں سکا۔

”تم نہیں بتانا چاہ رہے نہ سہی، میں تمہیں بتاتی ہوں تم مجھے کیسے لگتے ہو۔“ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا لیکن اب اسے روکنا محال تھا۔

”میری زبان سے سنو تم مجھے کیسے لگتے ہو بزدل انسان......! جیسے تپتے صحرا میں بادل کا ٹکڑا...... جیسے بھیڑ میں گم ہوئے کسی ننھے بچے کو اچانک مل جانے والے اس کے کسی بہت اپنے کا ساتھ...... جیسے زندگی کی طرف لے جاتی کوئی واحد امید جیسے......“ وہ بڑے جذب سے کہتی رہی اور میں خود فراموش ہوا سنتا رہا۔ آخر میں اس نے منہ بسور کر کہا تھا۔ ”اب مجھے بے شرم نہ کہنا شجاع کی طرح...... میں جانتی ہوں تم مجھ سے کبھی اقرار نہیں کرو گے...... اس لیے۔ ”میں“ کہہ رہی ہوں۔“ وہ لفظ میں پر زور دے کر بولی تھی۔

”ہاں میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ چار سالوں سے کر رہی ہوں اور مرتے دم تک کروں گی۔“ میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ کان سائیں، سائیں کرنے لگے۔ کیا کہہ رہی تھی وہ؟ اور کتنی بہادری سے کہہ رہی تھی۔ تف ہے مجھ پر اگر اب بھی میں آگے سے کچھ نہ کہہ پاتا۔

”میں بھی......“ اور میں نے کہہ بھی دیا۔

”میں بھی۔“ بجائے خوش ہونے کے اس نے منہ بگاڑ کر میری نقل اتاری۔ ”کتنی جلدی جان چھڑالی تم نے، ساری مشکل عبارتیں تو میں نے پڑھیں۔“

”تم اسلم پرویز جو ہو۔“ میں اب اسے بے خوفی سے دیکھ رہا تھا اور بڑے دل سے بھی۔

”جی نہیں۔“ اور نظروں کی تبدیلی نے یہ اثر کیا کہ وہ جھینپ گئی۔ ”میں عذرا بانو تم اسلم پرویز۔“

”نہیں۔“ میں اسے نظروں میں رکھے، رکھے مسکرایا۔ ”میں شہباز شمشیر اور تم ناجیہ۔“

”اچھا جی...... تم بولتے بھی ہو۔“ اس نے کتابیں سمیٹنی شروع کیں حالانکہ ابھی ہم نے کچھ

پڑھا بھی نہیں تھا۔

''بات سنو۔'' میں نے بے ساختہ پکارا۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہوئی۔

''میں نہیں، تم سنو۔'' وہ میرے سامنے آگئی۔ اپنا چہرہ بالکل میرے قریب لاتے ہوئے بولی۔ ''اتنی غور سے مجھے دیکھ رہے تھے تم، یہ چار انگلیاں نہیں نظر آئی تمہیں؟'' میرا منہ کھل گیا۔ واقعی اس کے گال پر سرخ نشان تھے۔

''انہیں پتا لگ گیا ہے کہ میں پڑھ رہی ہوں۔ اب وہ بوسونگھتی پھر رہی ہیں کہ میں کس کی مہربانی سے پڑھ رہی ہوں۔ اس لیے آئندہ میں کم، کم آؤں گی۔'' وہ بھاگ گئی تھی میری محبت کی پہلی خوشی پر پانی پھیرتی۔ اب میں اس کے اقرارِ محبت کو سوچتا یا اس کے گال پر چھپی چار انگلیوں کو۔

☆☆☆

اور میں ابھی دنیا کے اس انوکھے اظہارِ محبت پر جی بھر کر سرشار بھی نہیں ہو پایا تھا کہ ایک نیا معجزہ ہوگیا۔ زرنگار چچی مجھ پر مہربان ہونے لگیں۔ یہ وہ دن تھے جب میں اور شجاع بی کام کر رہے تھے۔ پہلے تو میں جی بھر کر حیران ہو، جب مجھے شجاع کے عالیشان کمرے میں منتقل کیا گیا۔

''مل کر پڑھائی کرو گے تو زیادہ اچھی ہوگی۔'' میری نظروں کے سوالات سے نظریں چراتی انہوں نے لولی لنگڑی وضاحت دی۔

''میری اماں بنا وجہ کے اپنا بخار کسی کو نہیں دیتیں اور مجھے تمہیں سونپ دیا۔ میری چھٹی حس کوئی سگنل دے رہی ہے۔'' شجاع بہت منہ پھٹ تھا اور سگنل تو میری چھٹی حس بھی دے رہی تھی۔

''یہ طوفان آنے سے پہلے کے آثار ہیں۔'' بظاہر اس نے مذاق میں کہا تھا لیکن میں خوف زدہ ہوگیا پھر انہی دنوں زرجبیں اپنی کتابوں سمیت میرے حوالے کر دی گئی۔

''اسے پڑھاؤ، بند دماغ کی...... سارا دن کپڑوں اور ٹی وی کے علاوہ کچھ نہیں سوچتی۔'' میں انکار کر بھی کیسے سکتا تھا اور زرجبیں میرے اور ناجیہ کے بیچ دیوار بن گئی۔ ناجیہ مجھ سے چھپ، چھپ کر پڑھتی اور زرجبیں بانگِ دہل۔ وہ مجھے پکڑ کر صحن میں، برآمدے میں کہیں بھی کتابیں لے کر بیٹھ جاتی۔ آس پاس ناجیہ بھی ہوتی۔ مبہم مسکراہٹ سجائے، ملازموں کے ساتھ کبھی گندم دھلواتی، کبھی تندور میں روٹیاں لگواتی، کبھی مویشیوں کی جگہ سے گوبر اور بھوسا صاف کرواتی۔ تو کبھی میرے ہی سامنے بیٹھ کر چچی کے سر میں تیل ڈالتی۔ میں اس کی نظروں کی تپش خود پر محسوس کرتا اور کند دماغ زرجبیں کو پڑھاتے ہوئے بھی بشاش رہتا کہ مجھے ان نظروں کا حصار اچھا لگ رہا ہوتا...... .... جو جھنجلاہٹ اکیلے کمرے میں زرجبیں کو پڑھاتے ہوئے مجھ پر سوار ہوتی وہ ناجیہ کی موجودگی سے غائب ہو جاتی۔ بھلے اردگرد کتنا ہی جمگھٹا ہوتا۔

☆☆☆

اس رات میں اور شجاع تقریباً ایک بجے سوئے کہ وی سی آر پر فلمیں دیکھتے رہے تھے۔ جب مجھے عجیب سی آواز نے جگا دیا۔ کھڑکی کے شیشے پر ٹھک ٹھک ہو رہی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا یہاں وہاں گردن گھماتا۔

''اوئے عذرا بانو...... اِدھر، اُدھر۔'' سرگوشیانہ آواز ناجیہ کی تھی مگر کہاں سے۔

''الو کے...... کھڑکی پر دیکھ۔'' شجاع کی نیند تباہ ہو رہی تھی۔ اس نے بھنّا کر میری مشکل آسان کی۔ میں نے کھڑکی کھولی۔ وہ بارش کی کن من میں بھیگ رہی تھی۔

''باہر آؤ، دیکھو بارش ہو رہی ہے۔'' میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''تم نیند میں چل کے آئی ہو؟'' مجھے پورا یقین تھا۔

''تم میرے ساتھ بارش دیکھو ناں۔'' وہ پوری پاگل ہو رہی تھی اور مجھے بھی کر دینے پر تلی تھی۔

''تم مجھے بخشو اور سونے جاؤ۔''

''بالکل نہیں...... میں سب کے سونے کا انتظار کر رہی تھی۔ ایسے ہی محنت ضائع کر دوں۔''

''شیں...... باہر جاتا ہے یا میں خود تجھے پھینک آؤں؟'' شجاع نے ایسا کر بھی دینا تھا۔ میں منہ لٹکائے باہر آگیا۔

سردیوں کے دن تھے، بارش میں کیسے مزے...... میں بغلوں میں ہاتھ دیے اس کے پیچھے حویلی کی پچھلی طرف آگیا۔

''شہباز۔'' میں کچھ دیر تک نہیں بولا تو اسے مخاطب کرنا پڑا۔

''یہ قطرے ہیروں جیسے لگ رہے ہیں ناں۔'' شیڈ پر جلتے بلب کی روشنی میں بارش کے قطرے ایسے ہی چمک رہے تھے۔

''ہاں پتا نہیں۔'' نیند اب بھی مجھ پر حاوی تھی۔ اس نے بڑی غصیلی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''ہاں ناں...... لگ رہے ہیں۔'' میں نے فوراً تائید کی۔ وہ پھر بھی گھورتی رہی۔ جب تھک گئی تب پلٹ کر جانے لگی۔

''تم جا رہی ہو؟''

''تمہارا قصور نہیں، اب تمہیں زرجبیں کے آگے میں کیوں نظر آؤں گی۔'' وہ پہلی بار اصلی کی ناراض لگی۔

''ارے، ارے......'' میں حیران کم پریشان زیادہ ہوا۔ ''زرجبیں کہاں سے آگئی؟''

''پڑھائی کے بہانے سارا وقت تمہیں دیکھتی رہتی ہے۔'' وہ پتا نہیں کب کی اکٹھا کی گئی شکایتیں اگل رہی تھی۔

''یہ تو تم بھی کرتی تھیں۔'' میں بے ساختہ مسکرایا۔

''اس کے آگے میری کیا اہمیت...... کہاں اس کی کرنجی آنکھوں کا جادو، کہاں میں......؟'' وہ حقیقت میں آزردہ ہوئی تھی۔

''تمہیں کیا پتا تم کیا ہو...... میں تمہاری ان جھیل جیسی آنکھوں کا اسیر پہلے ہوا ہوں۔ کرنجی آنکھوں کی کیا مجال مجھ پر جادو کریں۔ تم نے زنجیر کر دیا ہے مجھے۔'' شاید رات کی تنہائی کا اثر تھا۔ بارش کا فسوں یا اس محبت کی طاقت جو مجھے اس سے تھی۔ میں مزاج کے خلاف بولتا گیا۔ ''محبت چہروں سے کب ہوتی ہے...... ہوتی تو میں تمہیں روزِ اول سے دیکھتا مگر یقین کرو میں نے تو تمہیں دیکھا بھی اس دن جب تم ہیروئنی مجھ سے اظہارِ محبت کر رہی تھیں۔''

''اس پانی میں ڈوب مرو...... لڑکی کے اظہارِ محبت پر خوش ہو رہے ہو۔'' شرم کا تاثر چھپانے کی خاطر اس نے مجھے بظاہر لتاڑنا چاہا۔

''وہ تو میں ساری زندگی ہوتا رہوں گا۔'' اس کے سرخ چہرے کو نظروں میں سموتا میں پورے دل سے بولا تھا۔ اس بار اس نے چہرہ موڑ لیا۔ میرے دل میں بڑی خطرناک جسارتیں کرنے کی خواہش ابھری تھی۔

''چلو بارش میں۔'' اور میں شاید عمل پیرا بھی ہو جاتا اگر وہ مجھے دھکا نہ دے دیتی۔

''ارے......'' ٹھنڈی یخ بوچھاڑ نے رومینس کا سارا نشہ ہرن کر دیا تھا مگر وہ خود بھی بھیگ رہی تھی۔

''تمہارا دماغ خراب ہے، بیمار پڑ جائیں گے۔'' مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی۔

''توبہ ہے شہباز شمشیر خان، ایک تو تم نازک بہت ہو۔ کاش میں محبوب ہوتی اور تم میری محبوبہ۔'' وہ مزے سے بارش میں بھیگتی رہی۔ چچی کی پھٹکار نے اسے اچھا خاصا سخت جان بنا دیا تھا مگر میں کیا کرتا میری تو جان نکل رہی تھی۔

''کوئی دیکھ لے گا۔'' میں نے طریقہ نمبر دو استعمال کیا۔ بارش ہلکی رم جھم میں بدل چکی تھی۔

''دیکھ لے...... پیار کیا تو ڈرنا کیا۔'' میں چکرا کر رہ گیا۔ بعد کے کئی منٹ ہمارے وہاں گزرے۔ قیمتی بھرپور اور یادگار مگر اگلی صبح میں تھا اور چھینکیں تھیں اور ایک سو دو بخار۔

''کوئی بات نہیں، بخار تو ہوتا رہتا ہے تم شوق سے زیبا، وحید مراد بنو۔'' شجاع کے طنز ختم نہیں ہو رہے تھے۔

☆☆☆

جیسے شکل صورت اور مرض موروثی ہوتے ہیں بالکل ایسے اکثر عادات و مزاج بھی نسل در نسل چلتے ہیں۔ بابر کے جینز میں بھی بدنظری ماں باپ کے طفیل آئی۔ اس کے ڈیڈی گھر داماد تھے۔ عاشقانہ مزاج اور زن پرست۔ ان کی نظروں کی شیطانیت عام بندہ بھی محسوس کر سکتا تھا۔

شاہجہاں کی مما اس شیطان نما انسان کی وجہ سے کس ناقابلِ برداشت عذاب میں مبتلا رہیں یہ صرف وہی جانتی تھیں۔ شوہر کی لاتعلقی، ساس، نندوں کی دشمنوں والی بے رخی اور اس پر اس شیطان کی یہاں موجودگی...... ان کی زندگی کو گھٹن زدہ بنانے میں بابر کے ڈیڈی پیش، پیش رہے تھے۔ غلیظ نظروں سے سرتاپا سراہ، سراہ کر دیکھنا۔ بہانے سے کبھی کہاں کبھی کہاں چھو لینا گویا مما کو زندہ درگور کر دیتا۔ اب بابر جانشینی کے فرائض فرمانبردار بیٹے کے طور پر نبھا رہا تھا۔ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آنے کے مصداق اسکول کے زمانے سے ہی بابر نے جوہر دکھانے شروع کر دیے۔ لڑکیوں کو حریصانہ، شہوت آمیز نظروں سے دیکھنا اور اوچھی باتیں کرنا بابر کا من پسند مشغلہ تھا۔ بڑھتی عمر نے اس مشغلے کو مزید ہوا دی اور اب اس کی بدنیتی کا شکار وہ بے خبر ہونے جا رہی تھی۔

☆☆☆

کالج کے باہر وہ اس کا منتظر تھا۔ آج نوریا نہیں آئی تھی عموماً جب نوریا چھٹی کرتی تو وہ بھی کالج نہ آتی۔ آج اسائنمنٹ کے لیے نوٹس درکار تھے۔ اسے ضروری آنا پڑا۔ یوں تو خیرو مقرر تھا اسے اور نوریا تو کالج لانے، لے جانے کے لیے مگر بابر پھر بھی یہ ڈیوٹی نبھانے حاضر ہو جایا کرتا آج ہی کی طرح مگر آج نوریا کے بغیر بابر کی ہمراہی میں سفر کرنا پریشان کر رہا تھا۔

''بابر بھائی کہاں؟'' بابر کی پجارو گاؤں کے بجائے دوسرے راستے کی طرف مڑی تھی وہ حیران ہوئی۔

''تمہیں کھانا کھلاتا ہوں۔''

''نہیں پلیز۔'' وہ گھبراہٹ کا شکار ہوئی۔ ''میں بہت تھکی ہوئی ہوں، میں گھر جاؤں گی۔'' بابر نے عجیب ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''شاہجہاں کہتا تو تم مان لیتیں؟'' خوشی زبان دانتوں تلے دبا کر رہ گئی۔ وہ کس لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ''اس لیے کہ وہ تمہارا شوہر نامدار اور میں بے چارہ......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے، میری آج طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ کالج بھی مجبوری کی وجہ سے آئی، آپ مائنڈ مت کریں۔'' وہ عادتاً پریشان ہو گئی تھی۔ بابر نے کوئی اثر نہیں لیا۔ گاڑی گاؤں کے راستے پر رواں تھی۔ بابر کے چہرے کی سنجیدگی خوشی کو دہلا رہی تھی۔ تیز ڈرائیونگ کی وجہ سے وہ شہر کی حدود پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اب سڑک کے دونوں اطراف چٹیل صحرائی میدان تھے۔ یہ راستہ سنسان اور خطرناک مشہور تھا۔ ڈاکوؤں اور راہزنوں کی کئی کہانیاں خوشی نے خیرو کی زبانی سن رکھی تھیں سو ابھی جب بابر نے عین اس روڈ سے اتار کر پجارو ایک پارک میں روکی تو وہ ہراساں ہو گئی۔

''تم شاہجہاں کو اس لیے چھوٹ دو گی کیونکہ وہ

تمہارا شوہر ہے، ہے ناں؟'' اس کے کچھ کہنے سے پہلے وہ اسے دیکھ کر بولا تو خوشی ہکا بکا رہ گئی۔

''بتاؤ ناں؟'' ایسی ضدی تکرار...... خوشی کو لگا وہ رو دے گی۔

''بابر بھائی۔''

''تم مانتی ہو اسے شوہر؟ بتاؤ تم اسے شوہر مانتی ہو؟''

''جی۔'' محض بابر کی نظروں سے خوف کھا کر اس نے تھوک نگل کر کہا۔ بابر نے بے اختیار اپنے ہاتھ اسٹیئرنگ پر دے مارے۔

''کیا تم جانتی ہو میاں بیوی کا رشتہ کیسا ہوتا ہے...... کم از کم ایسا نہیں ہوتا جیسا تم دونوں کا ہے۔ وہ تمہارا شوہر ہے لیکن تمہارا شوہر نہیں ہے۔'' یا تو وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی یا وہ صحیح سمجھا نہیں پا رہا تھا۔

''ابھی میں تمہیں کسی مفتی کے پاس لے جاؤں، ابھی وہ تمہیں کہہ دے گا کہ تمہیں تو طلاق لینے کی بھی ضرورت نہیں۔ تمہارا نکاح تو آٹومیٹکلی ختم۔'' اپنے ناپاک ارادوں کے ڈانڈے وہ کہاں سے کہاں جا کر ملا رہا تھا۔ خوشی کانپ کر رہ گئی۔ ''تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں کہ اتنے مہینوں تک شوہر اپنی بیوی کو بیوی نہ سمجھے، اس سے بات تک کرنا گوارا نہ کرے تو نکاح فاسخ ہو جاتا ہے۔ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔'' وہ تیز لہجے میں بول رہا تھا۔ خوشی کو تو لفظ فاسخ کے مطلب بھی نہیں معلوم تھے۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ وہ کیوں یہ سب کہہ رہا تھا۔ کیا بتانا چاہ رہا تھا اور کیا چاہتا تھا...... وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی اور جانتا تو شاید بابر بھی نہیں تھا یا وہ پی کر بیٹھا تھا۔

''تمہیں تو کوئی دوسرا نکاح کرنے سے بھی نہیں روک سکتا...... بلیوی۔'' اب کے وہ وحشت زدہ ہو گئی۔

''پلیز بابر بھائی۔'' وہ رونے لگی تھی۔

''میں جانتا ہوں، تمہیں یقین نہیں آ رہا۔'' بابر نے دانت پیس ڈالے۔ ''مگر وقت آنے پر آ ہی جائے

اللہ کا مقربِ خاص کیسے بنتے ہیں؟

ایک مرتبہ ایک شخص حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور اپنا تزکیہ نفس کرنے کی غرض سے آپؐ رسالت مآبؐ سے چند سوالات کیے جس کے آپؐ نے سیر حاصل جوابات عطا کیے۔

☆ وہ شخص بولا ''میں اللہ کے غضب سے بچنا چاہتا ہوں؟'' ★ آپؐ نے فرمایا۔ ''کسی پر بے جا غصہ نہ کر، اللہ کے غضب سے محفوظ رہے گا۔'' ☆ ''میں اللہ کے دربار میں مستجاب الدعوات بننا چاہتا ہوں؟'' ★ آپؐ نے فرمایا۔ ''تو حرام چیزوں اور حرام باتوں سے اپنے آپ کو بچا، مستجاب الدعوات بن جائے گا۔ ☆ ''میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو قیامت کے دن سب کے سامنے رسوا نہ کرے؟'' ★ آپؐ نے فرمایا۔ ''اپنی پاکدامنی کا خیال رکھ اللہ تعالیٰ تجھ کو رسوا نہیں کرے گا۔'' ☆ ''میں چاہتا ہوں کہ اللہ میرے عیب چھپائے؟'' ★ آپؐ نے فرمایا۔ ''تو اپنے بھائیوں کے عیب چھپا، اللہ تیرے عیوب کی پردہ پوشی کرے گا۔'' ☆ ''میری غلطیاں کیسے معاف ہوں گی؟'' ★ آپؐ نے فرمایا۔ ''خوفِ خدا سے تضرع و گریہ سے، عاجزی و انکساری کرنے سے اور بیماریوں کی تکالیف پر صبر کرنے سے۔''

پروردگار سے دعا ہے ہم سب کو اپنا، اپنا تزکیہ نفس کرنے کی توفیق اور مہلت عطا ہو۔

مرسلہ: بختاور بلوچ، لوہی بلوچستان

گا اور وہ وقت آنے سے پہلے اتنا سن لو...... میں تمہارے ساتھ ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' خوشی نے بے ساختہ کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ بابر واقعی پاگل ہو چکا تھا۔

''ایک ایسا شخص جو تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا، تمہیں وہ منظور ہے یا میں جسے تمہارے علاوہ کسی اور کی رتی برابر پروا نہیں۔'' کہتے ہی بابر نے اس کے ہاتھ میں دبے موبائل کو جھپٹا۔ وہ مزید سراسیمہ ہوئی۔ ''یہ لو۔'' بابر نے جلدی، جلدی کچھ فیڈ کر کے موبائل واپس اسے تھما دیا۔ ''میں نے اپنا نمبر اس میں فیڈ کر دیا ہے۔ بالکل غیر جانب دار ہو کر صرف اپنے لیے سوچنا۔ اپنا فائدہ سوچنا۔ بابر یا شاہجہاں؟'' بابر نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ اس کی ہچکیاں گونجتی رہیں۔

☆☆☆

وہ اس وقت تھانے میں تھا جب میسج ٹون بجی۔

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے، آپ گھر کب آ رہے ہیں؟'' جو نمبر اسکرین پر تھا وہ اسے رٹ چکا تھا۔ شروع، شروع میں جب وہ میسج بھیجنے لگی تھی۔ شاہجہاں نے تب ہی اس کا نمبر مٹا دیا تھا۔ اس کے ہر پیغام میں ملتان بلا لینے پر اصرار ہوتا۔

''بات سنیں...... مجھے ملتان آنا ہے آپ کے پاس۔ صرف اپنی اسٹڈیز کی وجہ سے۔ پلیز ہیلپ۔'' یقیناً بابا کی کارستانی تھی کہ خوشی کا نمبر اس کے سیل میں بھی فیڈ تھا اور اس نے میسج ملنے کے فوراً بعد ڈیلیٹ بھی کر دیا نمبر لیکن پیغامات کا سلسلہ نہ روک سکا۔

''عجیب ہے کوئی۔'' وہ لفٹ نہیں کرواتا اور وہ میسج بھیجتے تھکتی نہیں تھی۔ روزانہ اس کے کئی، کئی پیغامات موصول ہوتے۔ درحقیقت صرف اسی کے ہی موصول ہوتے۔ ابتدا میں ہر پیغام التجائیہ ہوتا۔

''پلیز مجھے ملتان بلوا لیں...... بابا کہتے ہیں میں آپ کی بیوی ہوں اور میاں بیوی کو ساتھ ساتھ رہنا چاہیے۔''

''یا وحشت۔'' شاہجہاں کے آگے دنیا گھوم جاتی۔ بابا اس سے کیسی باتیں کرتے تھے؟ بعد ازاں ضدی پیغامات۔

''مجھے ملتان ہر صورت آنا ہے۔ اپنی اسٹڈیز کے لیے آنا ہے۔ آپ نہیں بلائیں گے میں تب بھی آؤں گی۔'' شاہجہاں کے سامنے ہوتی تو وہ پتا نہیں کیا کر ڈالتا اور وہ اتنی دلیر بھی اس لیے ہو رہی تھی کہ وہ گھر گیا نہیں تھا اور نہ ہی جانے کا ارادہ رکھتا تھا یعنی خود ساختہ ناراضی اور بعد میں تو الگ ہی نوعیت کے پیغامات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

''میں نے آج بابا کو پاستا بنا دیا۔'' پہلے پہل وہ پڑھتے ہی ڈیلیٹ کر دیتا۔

''آپ میرے ہاتھ کی چائے پئیں گے تو ساری عمر یاد کریں گے۔ میرے جیسی چائے کوئی نہیں بناتا۔'' آہستہ، آہستہ وہ عادی ہوتا گیا۔

''آج میں نے ریڈ کلر کا سوٹ پہنا ہے۔ میرا فیورٹ کلر ہے۔'' اسے حیرت انگیز طور پر یہ پیغامات ازبر رہنے لگے۔

''بابا کہہ رہے تھے وہ ہم دونوں کے لیے سوئٹزرلینڈ کے ٹکٹ کروائیں گے۔'' اور کیوں کروائیں گے یہ بھی لکھ دیتی مگر شاید عقل جاگ گئی تھی۔

''آج میں بہت اداس ہوں۔''

''بات سنیں...... میں رو رہی ہوں۔''

''بابا زمینوں پر...... آئی ایم بورنگ۔''

''آج میں سوچ رہی تھی دادی جوانی میں بہت حسین ہوں گی۔'' لاتعداد پیغامات روزانہ۔ اب تو یہ حال تھا ٹون بجتے ہی اندازہ ہو جاتا کہ کس کا میسج ہے مگر جو میسج اب موصول ہو رہے تھے ان میں التجا اور اصرار کی شدت نئی تھی۔

''پلیز آپ جلدی آئیں، آپ کل آ جایئے۔ مجھے آپ سے ارجنٹ بات کرنی ہے۔'' اور شاہجہاں

نے سیل ہی آف کر دیا کہ وہ بہت مصروف تھا۔

☆☆☆

شام کی چائے کی ذمے داری اسے سونپ دی گئی۔ نوریا سے اس کا یوں مہارانیوں کی طرح کام نہ کرنا برداشت نہیں ہوا تھا۔ جس وقت وہ لاؤنج میں چائے لے آئی۔ بابر بھی اسی لمحے کف لنکس بند کرتا وہاں آ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے کانپ گئی۔

''میرا کپ بھی۔'' اسے بولتی، تادیبی نظروں میں تو لتا حکم جاری کیا تو وہ چپ چاپ کچن میں آ گئی۔

اس دن کے بعد سے اس کی کوشش رہتی تھی کہ بابر سے سامنا نہ ہو مگر بابر کے پاس اس کا نمبر تھا گھر میں ہوتے ہوئے بھی وہ دن میں کئی، کئی کالز ملاتا۔ وہ نہ اٹینڈ کرتی تو ٹیکسٹ۔ اس کی حالت ڈیڈی کی فوتگی سے زیادہ بدحال ہو گئی۔

''اور بتانی پڑ گئی تھی کیا؟'' چائے کا کپ پکڑتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ بابر کی نظریں اس پر اور ہاتھ چائے کے کپ کی طرف۔ کپ پہلے ہی اس کے ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ بابر کا ہاتھ کیا مس ہوا کپ قالین پر اور چائے بابر کے کپڑوں اور خوشی کے پیروں پر گر گئی۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ابلتی چیخوں کا گلا گھونٹا۔ اتنی جلن اور تکلیف تھی کہ آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

''دو کام کیا کرنے پڑے جان نکل گئی۔'' پھپھو کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔

''لڑکی ابھی فوراً بابر کے کپڑے دھو۔ میں کہتی ہوں ابھی نہیں دھوئے تو داغ رہ جائیں گے۔'' ملازمہ کی موجودگی کے باوجود دادی کا حکم نامہ اس کے لیے تھا۔ وہ پاؤں کی جلن اور درد سے بے حال اور سب کو پروا تھی تو بابر کے کپڑوں کی۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے بابر کو دیکھتی بہ مشکل بولی۔

''کپڑے؟''

''ہاں اچھا۔'' خواہ مخواہ کپڑوں کے داغوں پر عرق ریزی کرتا بابر چونکا جیسے مخاطب کوئی اور ہو۔ ''میرے کمرے سے لے جاؤ۔'' خوشی ٹھنڈی پڑ گئی۔

''یا اللہ پاک میری مدد کر۔'' بابا شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ پوری طرح ان کے رحم و کرم پر تھی۔

''اب جاؤ بھی بت بنی کھڑی ہو گئی ہو۔'' پھپھو کی چنگھاڑ پر وہ بڑے بھاری دل کے ساتھ بابر کے کمرے کی طرف جانے لگی۔

☆☆☆

بابر کے کپڑے گول مول ہوئے بیڈ پر پڑے تھے اور وہ خود دراز میں سے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ خوشی دبے قدموں کے ساتھ آئی کپڑے اٹھا کر پلٹنے ہی لگی تھی کہ بابر نے کلائی پکڑ لی۔

''بیٹھو۔'' بابر کا اشارہ بیڈ کی طرف تھا۔

''بابر بھائی۔'' اس کی سسکی نکل گئی۔

''سنا نہیں...... بیٹھو۔'' وہ بیٹھ گئی۔ بابر کے ہاتھ میں کوئی مرہم تھا۔ اس نے اس کا پاؤں اپنے زانو پر رکھ لیا تھا۔ خوشی ہونٹ بھینچے بے بسی سے اسے مرہم لگاتا دیکھتی رہی۔

''پھر تم نے کیا سوچا؟'' مرہم لگاتے، لگاتے گمبھیر آواز میں پوچھا۔ خوشی کی حسیات جواب دینے لگیں۔

''میں تمہیں ایک اور بات بتاؤں...... یہ دونوں باپ، بیٹا تمہیں سوچی سمجھی اسکیم کے تحت رکھنے پر مجبور ہیں۔ تم اس گھر کا، اس خاندان کا حصہ ہو۔ جائداد کی حق دار اور تم نہیں جانتیں ماموں اتنی بڑی جائداد پر سانپ کی طرح بیٹھے ہیں۔ خود مر گئے تو بیٹے کو دے جائیں گے اور پھر تم آ گئیں۔ آدھی سے زیادہ تمہاری جائداد ہے۔ خود سوچو اس گھر سے کہیں باہر نکلو گی تو جائداد ساتھ لے کر اور یہ میرے سوئٹ ماموں کو کہاں گوارا ہے۔ بیٹا جتنی تم سے نفرت کرتا ہے۔ باپ اتنا ہی مہربان ہے اور یہ کوئی بھی جان سکتا ہے وہ کیوں مہربان ہے۔'' مرہم لگ

چکا تھا اور بابر کی تقریر بھی ختم ہو چکی تھی۔

''مجھے جانے دیں۔'' بابر نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ کسی طور بھی ہاتھ نہیں آرہی تھی۔ بابر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ لیے۔ خوشی کے سارے وجود میں کانٹے گھس گئے۔

''خوشی سمجھو...... یہ لوگ ایسے تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ تم میری بات ماننے پر کیوں معترض ہو۔ تمہیں تو سوچنا بھی نہیں چاہیے سیدھے سیدھے......''

''مجھے جانے دیں۔'' بابر کی بات کاٹ کر اس نے سرگوشی میں منت کی۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں، شدید محبت...... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یقین کرو میں تمہیں......'' خوشی کے کندھوں پر اس کے ہاتھوں کا دباؤ بڑھنے لگا تھا۔ خوشی ذہنی تکلیف میں مبتلا ہوئی۔

''مجھ سے وعدہ کرو، تم سوچو گی ناں، سوچو گی ناں؟'' وہ شاید دماغی توازن کھو بیٹھا اور خوشی کے لیے فی الحال ضروری تھا بابر کے سائے سے بھی دور جانا۔ اس نے جلدی سے اثبات میں سر لایا۔ بابر نے کندھوں پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ بھاگتے ہوئے اس کی پہنچ سے دور گئی۔

☆☆☆

گہرے سبز رنگ کی ڈائری خوشی کے ہاتھ میں تھی۔ حویلی میں جب بابا موجود نہ ہوتے تو وہ اسی ڈائری کو ساتھی بنا لیا کرتی۔ جسے وہ اتنی بار پڑھ چکی تھی کہ اس کا لفظ، لفظ حفظ ہو چکا تھا۔ جس میں جھروکے تھے ماضی کے، داستان تھی کسی کی محبت کی، کسی کے ایثار کی اور کسی کی آہوں کی۔

☆☆☆

''تم جا کیوں رہے ہو؟'' میں نے اسے روتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر وہ آج رو رہی تھی۔

''پڑھنے یار۔'' میں نے نظریں چرالیں۔ ہمیشہ مجھے بزدلی کے طعنے دینے والی آج خود ہمت ہار رہی تھی۔

''یہاں کیا کر رہے تھے؟''

''یہاں بھی پڑھ رہا تھا مگر زندگی میں ہر موقع کو جگہ دینی چاہیے۔''

''مت جاؤ۔'' وہ پلکیں جھپک، جھپک کر آنسو روکنے میں لگی تھی۔ لہجے میں درد اور آس ایسی کہ میرا دل بے ایمان ہونے لگا۔

''صرف دو سال کی تو بات ہے، گزرتے پتا بھی نہیں لگیں گے۔''

''تمہارے گزر جائیں، میرے لیے ایک، ایک پل بھاری ہو جائے گا۔'' اس کے آنسو، اس کی سسکیاں، نامعلوم وہ کیوں اتنی کمزور پڑ رہی تھی۔ کیوں ضدی ہو رہی تھی۔

''شجاع بہت چالاک ہے، ہمیشہ اپنا فائدہ سوچتا ہے۔ تمہیں لے جا رہا ہے تاکہ تم اس کے کام کرو اور وہ پڑھے۔'' وہ وہی جملے غصے میں دہرا رہی تھی جو شجاع نے چچی کو منانے کے لیے کہے تھے۔ وہ میرے لیے لندن جانے کے حق میں نہیں تھیں۔

''اچھا اب بس کرو، جانے والوں کو رو کر رخصت نہیں کیا کرتے۔ بدشگونی ہوتی ہے سفر برا گزرتا ہے۔'' اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ میرے سفر پر اثر انداز نہیں ہونا چاہتی تھی۔

''پیار سے، محبت سے، دعائیں دے کر پیاری، پیاری مسکراہٹ دکھا کر رخصت کرو۔ میرا سفر بھی اچھا گزرے اور پردیس میں زندگی بھی۔'' اس نے خود کو سنبھالنے میں کچھ وقت لیا پھر بھویں چڑھا کر بولی۔

''اب تم تو کہو گے نہیں، مجھے ہی کہنا پڑے گا۔ مجھے بھولنا نہیں، گوری کالی کسی میم کی طرف دیکھنا بھی نہیں اور جیسے ہو ایسے ہی رہنا۔ خود کو بدلنا مت، مجھے خط ضرور لکھنا اور میری فکر مت کرنا۔ بس...... تم اپنا

خیال رکھنا۔'' دھیمے سُروں میں ہدایات جاری کرتی آخری جملے پر وہ پھر سے آزردہ ہو گئی۔ میں نے اسے سنا کم دیکھا زیادہ کہ اس چہرے کو آنکھوں میں محفوظ کر کے جانا تھا۔ دل میں اتار کر ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

اور اس نے جیسا کہا تھا ویسا کر دکھایا۔ اس کے لمبے لمبے، ورق ورق جڑے خطوط مجھے بڑی باقاعدگی سے ملنے لگے جنہیں دیکھ کر شجاع کانوں کو ہاتھ لگا لیتا۔

''عاشقوں کی زندگی بھی کتنی مشکل ہوتی ہے۔ اس بے چاری نے لکھ، لکھ کر اور تم اب پڑھ کر اپنی آنکھیں پھوڑو گے۔'' تاجیہ کے ہر خط میں دنیا جہان کی باتیں ہوتیں۔ حویلی کی مرغیوں، بھینسوں، بھیڑوں تک کی مگر کبھی کسی خط میں اس نے چچی یا زرجبیں کی کسی بدسلوکی کا تذکرہ نہیں کیا۔ وہ مجھے حویلی میں مذاق، مذاق میں ضرور بتا دیا کرتی لیکن یہاں لندن میں ملنے والے اس کے کسی خط میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ جس سے میں دکھی ہو جاتا اور میں جانتا تھا وہ جان بوجھ کر ایسا کرتی تھی۔ وہ مجھے پردیس میں اداس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''ترس آتا ہے یار تجھ پر۔ ننھی سی عمر میں روگ لگا بیٹھے۔ لندن آ کر بھی محروم رہے۔''

''تم کیا جانو عشق کا لطف۔'' شجاع کے مذاق پر میں بھی جملہ داغتا۔

''مجھے بخشو۔'' وہ ہاتھ جوڑ لیتا۔ ''کھیلنے کی عمر ہے، اسے میں بے وقوفی کی نذر نہیں کر سکتا اور مجھے تیری طرح نیک پروین نہیں قبول۔ میں پڑھی لکھی اپ ٹو ڈیٹ لڑکی سے محبت کروں گا۔''

''محبت پوچھ کر ہوتی ہے اور نہ سوچ کر۔ یہ بس ہو جاتی ہے بالکل اچانک، عمر دیکھتی ہے نہ وقت اور نہ یہ دیکھتی ہے کہ لڑکی سنجیدہ مزاج ہے یا تاجیہ جیسی۔''

''بس، بس...... بس میرے بھائی، میں ہار گیا تو جیت گیا۔ تیرا کہا قبول۔'' وہ مصنوعی تنگ آنے کی ایکٹنگ کرتا۔

پھر یوں ہوا جب ہم دونوں کے جانے میں کچھ ہی عرصہ رہ گیا۔ تاجیہ کے خطوط نئے متن کے ساتھ ملنے لگے۔

''کب واپس آؤ گے؟'' خط بھی لمبے، لمبے وقفے سے موصول ہونے لگے۔

''تم آ بھی جاؤ۔'' میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ مسلسل پوچھا بھی مگر وہ جواب نہ دیتی۔ ہاں واپسی کا اصرار ہنوز قائم تھا۔ کبھی، کبھی اس کے خطوط کی تحریر بہت بے ربط محسوس ہونے لگتی۔ وہ جیسے لکھنا کچھ چاہ رہی ہوتی لکھ کچھ دیتی اور اکثر محسوس ہونے لگا جیسے وہ رو رو کر خط لکھتی ہو۔ خط کے الفاظ پر سیاہی پھیلی، پھیلی ہوئی تھی۔ میری بے چینی تب تک برقرار رہی جب تک ہماری واپسی کا دن نہیں آ گیا۔

☆☆☆

ہمیں اپنی پاکستان آمد کی رات ہی ایک تماشا منتظر ملا۔ تاجیہ پورا دن میرے سامنے نہیں آئی تھی حالانکہ مجھے یقین تھا۔ جان پر کھیل کر ہی سہی وہ مجھے خوش آمدید کہنے ضرور آئے گی لیکن وہ نہیں آئی۔ حویلی کے اس پورشن کی طرف جہاں اس کا کمرا تھا۔ میں نے بے شمار چکر لگائے مگر وہ پتا نہیں کہاں جا چھپی تھی۔

رات میں جب میں اور شجاع بڑے ہال کمرے میں داخل ہوئے، وہ نظر آ گئی۔ اس حالت میں کہ چچی نے اس کے بال دبوچے ہوئے تھے۔ میں اور شجاع وہیں ساکت ہو گئے۔

وہ بے حد دبلی ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے اور گالوں پر تھپڑوں کے نشانات تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی بے رونق آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری تھی اور پھر وہ مجھ پر نظر جمائے انتہائی ٹھوس لہجے میں بولنے لگی۔

''میں قدیر سے شادی نہیں کروں گی۔'' چچی

نے اس کے بالوں کواتنی زور سے جھٹکا دیا جیسے جڑ سے اکھاڑ دیں گی۔ میرے قدم ڈگمگائے تو شجاع نے میرا بازو پکڑ کر سہارا دیا۔ ناجیہ کے ساتھ چچی کیسا سلوک روا رکھتی تھیں سننے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا فرق سمجھ میں آگیا۔ دیکھنا بہت اذیت ناک تھا۔

''میں پوچھتی ہوں کس شہ پر قدیر کے لیے انکار کر رہی ہے۔ ایسی جرأت اور بے حیائی سے ... جو نے گا تھوکے گا کہ یہ انعام دے رہی ہے نمک خواری کا۔ بدذات، بے حیا۔'' اور پھر تابڑ توڑ تھپڑ، گھونسے شجاع میرا بازو چھوڑ کر چچی کے سر پر جا پہنچا تھا۔

''کیا کر رہی ہیں، جان نکالنی ہے اس کی؟''

اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ہاں، میں کروں گی ایسا...... میں جان نکال دوں گی اس کی۔ خاندان میں کسی لڑکی نے ایسی بے حیائی نہیں دکھائی جیسی یہ دکھا رہی ہے۔'' ناجیہ کانپ رہی تھی لیکن اب اس کے چہرے پر سکون تھا۔ ''میں نے زبان دے دی قدیر کے ماں باپ کو۔''

''آپ اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتیں۔'' شجاع بپھرا ہوا تھا۔

''میں اس کی مرضی پر چلوں گی اب؟'' چچی تمسخرانہ بولی تھیں۔

''کم از کم اس کم ذات سے میں اس کی شادی نہیں ہونے دوں گا۔'' جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا۔ جو مجھے بولنا چاہیے تھا، وہ شجاع کر رہا تھا۔

''کم ذات یا بلند ذات...... اس کی نظر میں کوئی نہیں جچنے والا۔ یہ پسند کر چکی اپنی مرضی کا...... اس کے تیور بتا نہیں رہے تمہیں۔'' نہ بیٹے کے آنے کی خوشی، نہ اس کے چاؤ اٹھانے کی فکر۔ چچی نے شجاع اور میرا انوکھا استقبال کیا تھا۔

☆☆☆

اب چونکہ ہماری تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ چچی نے ایک اور دھماکا کر دیا۔ شجاع ابھی شادی کے موڈ میں نہیں تھا اور نہ ہی اس کے لیے چچی کو جلدی تھی مگر میرے لیے پھندا تیار تھا زرجبیں نام کا۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

''پاگلوں کی اولاد...... کمی عورت کا بیٹا۔'' برسہا برس مجھے ان طعنوں کی مار مارنے والی آج مجھ پر کیوں مہربان ہو گئی تھی۔ میں جانتا تھا، زرجبیں مجھے پسند کرتی تھی۔ بلال چچا بھی مطمئن تھے۔ میری دنیا اندھیر ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اسی رات جبکہ پہرے کڑے تھے اور نگرانی سخت وہ نہ جانے کیسے میرے کمرے میں آگئی۔ شجاع اس کے آتے ہی کمرے سے چلا گیا تھا۔

''جیا۔'' میں پریشان ہو گیا۔ وہ خطرہ مول لے کر مجھ سے ملنے آئی تھی۔ مجھے خود سے زیادہ اس کی فکر ہونے لگی۔ وہ بن کہے اپنی ویرانی کی داستان سنا رہی تھی۔ اداس، مغموم مگر بے حد باغی دِکھتی۔

''تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' چچی کتون کی طرح اس لڑکے کی بو سونگھ رہی تھیں جس نے ناجیہ کو شہ دی تھی اور آج وہ کچھ دیکھ لیتیں تو قیامت آجاتی۔

''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟'' وہ ایک دم بپھری۔ ''انتظار یا پھر خاموشی...... تو کئی مہینوں سے وہی تو کر رہی ہوں۔ اب تو میرا ساتھ دو، میرا حوصلہ بنو اب تو بہادری دکھاؤ۔'' وہ رونے لگی۔

''جیا......'' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا میں کیسے اسے حالات کی سنگینی کا اندازہ کرواؤں۔ میں کیسے اسے ابھی کے لیے پُرسکون کروں۔

''جیا......'' اس کے آنسو مجھ سے وہی کروانے پر تلے تھے جو وہ چاہتی تھی لیکن دماغ کی تاویلیں اور تھیں۔ ''جیا...... تم ابھی جاؤ۔''

''کیوں؟'' وہ بے بسی سے چیخی تھی۔

''کوئی آجائے گا، اچھا نہیں ہوگا۔''

''تم ڈرتے ہو؟'' اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔

''نہیں...... مجھے تمہاری عزت کی فکر ہے۔''

''وہ تمہاری چچی کے ہاتھوں دو کوڑی کی ہو گئی۔ مجھے پروا نہیں ہے شہباز۔'' اس نے میرا بازو پکڑ لیا تھا۔ ''بھاگ چلتے ہیں، ہم نکاح کر لیتے ہیں۔''

''ناجیہ!'' میں فق چہرے کے ساتھ اسے دیکھے گیا۔

''دیکھو...... یہاں ہمارا کوئی ہمدرد نہیں۔ سب ہمیں غلام سمجھتے ہیں اور زرجبیں کے آگے میری دال نہیں گلنی...... میں تمہیں کھونے سے ڈرتی ہوں۔ میری زندگی میں معجزہ نہیں ہونا۔ مجھے خود کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی اس لیے کہ''..

''ایسا نہیں ہوگا۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''میرا یقین کرو۔'' میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر یقین سے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا، مجھے یقین ہے۔'' وہ خود پر اختیار کھوئے تڑپ، تڑپ کر رو دی۔ میں اس کے آنسو پونچھنے والا تھا۔ میں اسے سینے سے لگا کر دلاسے دینے والا تھا مگر بھاگتے قدموں کی آواز پاس آگئی تھی۔ زرنگار چچی اور بلال چچا میرے کمرے میں آگئے تھے۔

کچھ احساسات دائمی ہوتے ہیں۔ دماغ میں سرایت کر جائیں تو پھر تاعمر نہیں جاتے۔ خوف و دہشت میری ذات میں حلول کر گئی تھی۔ وہ میرے سامنے ناجیہ کو گھسیٹتی ہوئی لے گئیں۔ میں بت بنا کھڑا رہا۔ شجاع مجھے زبردستی ان کے پیچھے لے گیا۔ خیال یہی تھا کہ ہم دونوں ناجیہ کو بچائیں گے مگر......

''کہتی تھی ناں میں، ایسے ہی یہ شیرنی نہیں بنتی کوئی ہے اس کے ساتھ اور میں معصوم......'' چچی نے سینے پر دو ہتھڑ مارے تھے۔ ''میری تو نیکی کو بھی مار ہے۔ جس کے ساتھ اچھی بنوں وہی گردن پکڑ لیتا ہے۔ یہ نمک حرام، اسے پالا پوسا، کھلایا پلایا آج کے دن کے لیے۔'' چچی ان پر قہر بنی ہوئی تھیں۔

''اور تو......'' پھر وہ میری طرف پلٹیں۔

''آستین کا سانپ، جس میں کھایا اسی میں تھوکا۔'' بنا میری عمر اور قد کا لحاظ کیے سب کے بیچ انہوں نے میری دھنائی کر دی۔

''جیسا باپ ویسا بیٹا، خون کی تاثیر بھی کبھی بدلی ہے۔ ذلیل خون، کمی عورت کا بیٹا۔''

''اماں آگے نہیں بولیں گی آپ۔'' شجاع نے پوری طاقت کے ساتھ چیخ کر کہا۔ میں ایک آج کے دن سے ڈرتا تھا۔ میں ان لفظوں سے ڈرتا تھا۔ میں خود کا پیچھا کرتے ان طعنوں سے ڈرتا تھا مگر میرا ڈر کسی کام نہیں آیا۔

اس کی نظریں صرف مجھ پر مرکوز تھیں۔ وہ مجھ سے محبت کا یقین چاہ رہی تھی مگر میں سر جھکائے سینے پر بوجھ سا لیے کھڑا رہا۔ میری زبان کائی زدہ ہو گئی تھی، ایک دم گونگی۔

☆☆☆

اگلی صبح حویلی میں دو نکاح ہونے تھے۔ میرا زرجبیں کے ساتھ اور ناجیہ کا قدیر کے ساتھ...... مجھ پر گھٹن طاری تھی۔ میرے سامنے قدیر اور مولوی آئے۔ چند لمحوں کی دیر تھی پھر ناجیہ اور میرا تعلق بے معنی ہو جانا تھا۔ یہ میرے لیے کڑا امتحان تھا۔

تب میں نے تیسری راہ نکالی۔ ٹھیک ہے ناجیہ میری نہیں ہو سکتی تھی تو کیا ضروری تھا میں زرجبیں سے نکاح کرتا۔ نہیں...... میں حویلی سے، حویلی کے مکینوں سے، ناجیہ سے دور چلا گیا۔ میں بھاگ گیا۔ میں اس شہر، اس ملک سے بھاگ گیا جو پیچھے چھوڑا وہ میرا ماضی بن گیا۔ اذیت بھرا ماضی۔

☆☆☆

ڈائری کی بند جلد پر سر رکھے وہ بے آواز رو رہی تھی۔

''ڈیڈی آپ نے غلط سمجھا۔ دیکھیں آپ کا ماضی میرا حال بن گیا ہے۔ میں آپ کے ماضی میں لوٹ آئی ہوں۔'' اس کی خود کلامی میں کرب تھا۔ ''اور

ناجیہ ٹھیک کہتی تھیں۔ آپ بدنصیب نہیں، آپ بزدل تھے اور بزدلوں کے نصیب میں محبت نہیں ہوتی۔ آپ کو بھی محبت کی راہ پر نہیں چلنا چاہیے تھا۔ آپ کی بزدلی، آپ کی محبت سے جیت گئی۔ یوں بھاگ کر آپ نے وفا کی کون سی داستان رقم کرنا چاہی؟ یہ کہ آپ ناجیہ کے نہیں تو زرجبیں کے بھی نہیں در حقیقت تو آپ نے آسان رستے چن لیے۔ اپنی زندگی بھی آسان کرلی۔ کاش آپ جان پاتے آپ نے دو زندگیوں کا خون کیا۔ بابا کو آپ کی بزدلی کا تاوان بھرنا پڑا۔ انہوں نے آپ کی ناجیہ کو سہارا دیا، اسے اپنا نام دے کر مرتبہ دیا۔ کاش آپ جان پاتے...... بابا کتنے بہادر ہیں، کتنے عظیم ہیں انہوں نے اپنے دل کی سب خواہشوں کو دفن کردیا صرف آپ کی ناجیہ کا مستقبل بن گئے۔'' وہ سسکیوں کے بیچ بولتی جارہی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے ڈیڈی آس پاس ہوں۔

''اور آپ غلط بھی نہیں تھے، آپ واقعی بدنصیب تھے۔ آپ کی بدنصیبی میرے پیچھے، پیچھے تک آگئی ہے۔ بابر نام کی سیاہی میری منتظر ہے۔ دنیا میرے لیے ویسی ثابت ہونے جارہی ہے جیسی آپ کی ناجیہ کے لیے بن گئی تھی۔ میں تماشا بننے جارہی ہوں۔''

☆☆☆

شجاع کو انتہائی فیصلہ کرنا تھا۔ ناجیہ زندہ لاش کی صورت نکاح خواں کے سامنے تھی۔ شہباز کے بھاگ جانے کے بعد اس کے لیے زندگی و موت برابر ہوگئی تھی۔ اب قدیر تو کیا کوئی بھی مقدر بنتا اسے فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی پڑا۔ شہباز کے بھاگ جانے میں بھی چچی قصوروار تھیں اور اب ناجیہ کی قدیر سے شادی بھی انہیں جیت کے میڈل پہنائی۔ شجاع نے ماں سے انتقام لینے کی ابتدا پہلے فیصلے سے کی۔ اس نے ناجیہ سے نکاح کرلیا۔ چچی کے سب واویلے، سب بین بے سود گئے۔ شجاع نے ناجیہ کو اپنا کردم لیا۔ شہباز کی محبت اس کا نصیب بن گئی۔ وہ جو اپنے

لیے بڑے، بڑے دعوے کرتا تھا۔ ناجیہ میں سو، سو کیڑے نکالتا تھا۔ اپنی زندگی کا ساتھی کسی تعلیم یافتہ، قدم سے قدم ملا کر چلنے والی کو بنانا چاہتا تھا اور سب سے بڑھ کر شادی ہی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر زندگی میں سب کچھ ویسا کب ہوا ہے جیسا سوچا جائے۔ وہ دونوں ایک ساتھ چلنے والے دو کنارے تھے۔ ساتھ، ساتھ اور الگ، الگ۔ ان کی نئی زندگی کا عنوان شاہجہاں ضرور بنا مگر وہ ایک بھی نہ ہوسکے۔

☆☆☆

بابا زمینوں سے آگئے تھے، گویا بابر نام کی پریشانی کا خاتمہ ہوا تھا۔

''تمہیں بخار ہوا ہے؟'' وہ اسے دیکھ کر بے حد تشویش میں مبتلا ہوئے۔

''نہیں تو۔''

''کیا نہیں تو، اتنی کمزور ہورہی ہو۔ بالکل بیمار لگ رہی ہو۔ حلقے دیکھو اپنی آنکھوں کے۔''

''آپ اتنے ہفتے مت لگایا کریں ناں۔'' وہ ان کے آنے پر خوش تھی۔ بابا فی الحال کے لیے خاموش ہوگئے لیکن ان کی سوچ دور تک کا سفر کررہی تھی۔ کم از کم اب وہ شاہجہاں کو ڈھیل دینے کے حق میں نہیں تھے۔

☆☆☆

شام سے پہلے شام کا منظر تھا، بادلوں کی مہربانی سے۔ ہر طرف گھن گرج اور تاریکی سی ہونے لگی۔ اس نے کھڑکی سے پردے ہٹائے، باہر بجلی چمکی تھی۔ وہ پردے چھوڑتی بیڈ پر جا بیٹھی۔ گرج چمک اور یہ بارش...... انتہائی ناپسندیدہ اور خوف ناک موسم تھا اس کے لیے۔ چمکتی بجلی اور غراتے بادل اس کے رونگٹے کھڑے کردیتے تھے اور یہی خوف اب بھی سوار تھا۔

''بابا آپ اسٹڈی میں ہیں؟'' بابا عشا پڑھ آئے تھے اور اس وقت عموماً اپنی اسٹڈی میں ہوتے

تھے۔ میسج بھیج کر تصدیق بھی اس لیے کرنی چاہی کہ وہ اس خراب موسم میں باہر جانے کا رسک لے ہی نہیں سکتی تھی۔ خصوصاً تب جب بابا کی اسٹڈی بھی پہنچ کے آخری سرے پر ہو۔ اس کے سیل کی میسج ٹون فوراً گنگنائی تھی۔ وہاں بابر کا میسج تھا۔ جو سوال اس نے بابا سے پوچھا وہی اس کو لوٹایا گیا مگر بابر کے نمبر سے۔

''تم اپنے کمرے میں ہو؟'' اس کا ہاتھ بے جان سا ہوگیا۔ سیل بھی چھوٹ گیا۔ وہ وحشت بھری آنکھوں سے دروازے کو تکنے لگی۔ جیسے ابھی بابر آ بھی جائے گا۔ کچھ لمحے یونہی سرک گئے۔ بابر جواب سے مایوس ہوا بار بار کال کیے جارہا تھا۔ اس کی کال بند ہوئی تو خوشی بابا کو کال ملانے لگی مگر ان کا نمبر بند تھا۔ خوشی کو یاد آیا بابا ہر نماز کے وقت سیل آف کرجایا کرتے تھے اور اکثر آن کرنا بھول بھی جاتے۔ وہ عجیب مصیبت میں پھنس گئی، بابر کے پیغامات ایک کے بعد ایک آرہے تھے۔ اس نے ایک دم شاہجہاں کو ٹیکسٹ کیا تھا۔

''پلیز جلدی آئیں، مجھے آپ کی ضرورت ہے۔'' اور پھر اسے لگاتار کالیں کرنے لگی۔ ایک کال ناٹ رسپانڈنگ جاتی وہ دوسری ملالیتی۔ ری ڈائل کرتے، کرتے ہاتھ تھک گئے مگر کال پک نہ ہوئی۔

''پک مائی کال۔'' کا میسج بھی چھوڑا مگر کال پھر بھی ریسیو نہیں ہوئی۔ وہ رو دینے کو تھی، باہر بارش کا شور بتارہا تھا کہ جوبن پر ہے ایسے میں گھر کے سبھی نفوس اپنے، اپنے کمروں میں بند تھے۔ گاؤں میں ایسا موسم اپنے ساتھ کئی مصیبتیں ساتھ لے آتا۔ سب سے بڑی مصیبت بجلی کی ہوتی۔ فوراً لائٹ چلی جاتی۔ اب بھی یہی ہوا تھا اور جنریٹر خراب۔ خوشی کے تمام خوف ایک ساتھ سر بلند ہوئے، جن پر لعنت بھیجتی وہ گیس لیمپ جلانے کا تردد کیے بغیر دروازے کی طرف بھاگی تھی۔

سب کمرے بند ہوئے پڑے تھے۔ کاریڈور کا گیس لیمپ جلانے کے لیے شاید ہی کوئی اٹھتا۔

وہ اندازے سے قدم اٹھانے لگی جب کسی نے اس کے منہ پر اس زور سے ہاتھ رکھا کہ اس کے حلق سے نکلتی سب آوازیں گھٹ گئیں۔ وہ اسے یونہی جکڑے نہ جانے کس سمت گھسیٹنے لگا۔

☆☆☆

''تم میرا جواب نہیں دے رہی تھیں۔'' تھر تھر کانپتی خوشی کو جو پہلا احساس ہوا وہ یہ کہ بابر نے پی رکھی تھی۔

''میرا سیل سائلنٹ پر تھا۔'' وہ حتی المقدور نارمل نظر آنے کی کوشش میں تھی۔ ورنہ اعصاب ایسے ہورہے تھے کہ اسے یہ تک نہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ ہے کہاں۔

''تم نے سوچا تھا میرے پروپوزل کے بارے میں؟'' اسے خود پر حقیقتاً ترس آیا۔

''بابر بھائی، آپ جانتے ہیں میں بیمار پڑ گئی تھی۔''

''بکواس نہیں کرو۔'' بابر کی دہاڑ پر وہ مزید کچھ کہتی فوراً چپ ہوئی تھی۔ ''تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو؟''

''آ...... آپ پلیز کچھ غلط مت سمجھیں۔ میں نے واقعی......''

''ہو گیا تم...... دو ٹکے کی...... میں تمیز سے پیش آرہا ہوں، تم سر چڑھتی جاتی ہو۔'' خوشی کے پاس رونے کے علاوہ کوئی ہتھیار نہیں تھا مگر بابر اس کے رونے سے کیونکر متاثر ہوسکتا تھا۔

''تمہیں پیار کی زبان سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ تم کو صرف شاہجہاں کے کرخت لہجے کی ہی سمجھ آتی ہے...... میں تم سے پیار کرتا ہوں، تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، تم......''

''بابر بھائی آپ کیوں نہیں سمجھتے میں شادی شدہ ہوں۔'' رونے سے اس کی آواز بھی بھاری ہورہی تھی۔

"میں نے بکواس کی تھی ناں، تمہاری شادی کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ ٹوٹ چکی ہے۔"

"میں نہیں مانتی۔" اب جب اتنا سب کچھ ہوگیا تھا۔ ایک لحاظ سے وہ اغوا ہو آئی تھی۔ اس سے زیادہ برا اب اور کیا ہوتا تھا کہ وہ خوف کھاتی اور بے خوفی سے کہے اس جملے کا خمیازہ اسے... فی الفور بھگتنا پڑا۔ کسی جانور کی طرح اس نے اس کے گال پر تھپڑ مارا تھا۔ وہ پیچھے جا گری۔ وہ اس پر جھپٹ کر غرایا تھا۔

"بکواس کرتی ہو، مجھے آنکھیں دکھاتی ہو۔" اس کی آنکھوں کی شیطانیت پورے ماحول پر حاوی ہونے لگی تھی۔ "یہ جان لو، میں تمہیں مولوی کے پاس لے جا رہا ہوں۔ وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیسی زندگی گزار رہی ہو اور ہم نکاح کرلیں گے۔ سن رہی ہو ناں...... ابھی ہاں ابھی۔" وہ خوشی کے بہت قریب تھا۔ اتنا قریب کہ اس کی منہ کی کراہت بھری بُو خوشی کے اعصاب جھنجھنانے لگی۔ اس نے نہایت حقارت و کراہیت سے اس کے منہ پر تھوکا تھا۔ بابر پر جنون سوار ہوگیا۔ اس نے کسی درندے کی طرح خوشی کو پیٹنا شروع کر دیا۔ رات کی سیاہی، اس کے مقدر کی سیاہی بننے جا رہی تھی۔

☆☆☆

حویلی کے گیٹ پر بارش نے اس کا استقبال کیا۔ گیٹ خود ہی کھولنے کے بعد اس نے اپنی پولیس موبائل اندر کھڑی کی۔ برستی بارش کے شور میں اس کی گاڑی کی آواز شاید ہی بند کمروں تک پہنچ پائی تھی۔ گاڑی لاک کرکے وہ بھاگ کر رہائشی حصے میں آیا۔ بابا اپنی اسٹڈی میں ایزی چیئر پر آنکھیں موندے ملے۔ اس نے دیکھا ان کا موبائل بک ریک پر آف پڑا تھا۔ اس نے ان کے ہاتھ پر آہستگی سے ہاتھ رکھا تھا۔ بابا کی نیند ٹوٹ گئی۔ شاجہاں کو رات کے اس وقت اور یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ ایک پل کو تو حیران رہ گئے۔ وہ انہیں شاکی اور فہمائشی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"آپ دوسروں کا مشکل میں ساتھ دے کر بعد میں ان سے بے پروا کیوں ہو جاتے ہیں؟" وہ ایک، ایک لفظ پر زور دے کر کہہ رہا تھا۔ بابا کچھ بھی نہ سمجھے۔ "پہلے میری ماں......" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ "اور اب خوشی۔" بابا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"خوشی......؟"

"ہاں خوشی۔" وہ الٹے قدموں اسٹڈی سے نکلا۔ اس بار بابا پیچھے تھے۔ خوشی کے کمرے میں جھانکا اس کا موبائل فرش پر گرا پڑا تھا۔ شاجہاں نے بعجلت دیکھا۔ اس کی اپنی مسڈ کالز جو شاجہاں آنے سے پہلے کرتا رہا تھا اور جو اگر خوشی دیکھ لیتی تو بے ہوش ہی ہو جاتی اور بابر کے بے شمار میسجز۔ اس کے دماغ میں بھونچال آگیا۔ وہ آندھی و طوفان بنا حویلی کے پرانے کمروں کی طرف بھاگا تھا۔

☆☆☆

اسے الہام نہیں ہوتے تھے۔ نہ وہ وجدان کی زد میں آتا تھا اور نہ ہی خوش بخت کی محبت اس کو مجبور کر گئی تھی کہ وہ یوں دوڑا چلا آیا۔ بس کچھ تو ہوا تھا کہ جس نے اس سے رات کے اس پل اتنی دور تک کا سفر کروایا۔

خوشی کی کالز یوں تو گزشتہ کئی دنوں سے آرہی تھیں۔ آج بھی وہ شہر سے باہر کسی کیس کے سلسلے میں گیا ہوا تھا جب خوشی کی کالز ایک کے بعد ایک آتی گئیں۔ اس نے سیل سائلنٹ پر کر دیا تھا۔ واپسی پر جب سیل دیکھا تو لاتعداد میسجز اور مسڈ کالز موجود تھیں۔ اسے لگا خوشی کسی پریشانی میں گرفتار ہے۔ یہ میسجز اور کالز محض تنگ کرنے یا تفریح کے لیے نہیں تھے۔ شاجہاں نے بالکل غیر ارادی طور پر اسے کال بیک کی تھی مگر بیل جاتے، جاتے خاموش ہو جاتی۔ تب وہ مزید الجھا...... کہیں کوئی گڑبڑ تھی۔ کہاں تو وہ اس شدت کے ساتھ اسے کال پر کال کرتے نہیں تھک رہی تھی، کہاں اب اس کی کال کا جواب ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ دن رات ایک کیس پر کام کرنے کی وجہ سے اعصاب شل ہو رہے تھے مگر اس نے فوراً گاؤں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اتنے مہینوں کے بعد بالکل اچانک اور بنا کسی خواہش کے محض کسی کی خاطر اور بس۔

"مجھے بارش بالکل پسند نہیں۔ مجھے بجلی کے چمکنے سے بہت خوف آتا ہے۔" گھر کے اندر اس کے دماغ میں خوشی کے میسج اچھل کود مچا رہے تھے۔

اسے یہ بھی خیال آیا کہ شاید بارش سے خوف زدہ ہو کر وہ اسے کال کرتی رہی ہو مگر یہاں سامنے گھناؤنی کہانی منتظر تھی۔

☆☆☆

دادی اور پھپھو ہائے، ہائے کرتی اس کمرے میں داخل ہوئی تھیں جہاں زمانے بھر کا کاٹھ کباڑ پڑا تھا اور جہاں اس وقت بابر شاجہاں کے رحم و کرم پر تھا۔

"اگر مزید کچھ دیر اور ہو جاتی اور اگر وہ نہ آتا......" اسی طرح کے کئی اور اگر ذہن میں کلبلاتے تو وہ بابر پر مکوں کی مزید بوچھاڑ کر دیتا۔ بابر کی دست درازی نے بابا کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ وہ نیم جان ہوئی خوشی کو سنبھالے خود بھی رونے لگے تھے۔ اگر شاجہاں نہ آتا تو وہ شہباز کو روزِ آخرت منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔

"ارے نامراد، خود چال باز ہے، بے حیا ہے۔ تم سے مایوس ہوئی تو بابر کو پھنسا لیا۔"

"بس، چپ......" وہ اس قدر زور سے گرجا کہ پھپھو (زرجبیں) کی سٹی گم ہوگئی۔ "آگے ایک لفظ بھی نہیں۔" اس نے زہر خند نظروں سے پھپھو کو دیکھا تھا۔ یہ وہ خاندان تھا جو شروع سے اسے ڈستا آیا تھا۔ پہلے پھپھو کے شوہر کی وجہ سے اس کی ماں اور اب بابر کی وجہ سے...... وہ خوشی کی طرف دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ نامعلوم وہ کتنے دنوں سے عذاب سہہ رہی تھی، اذیت میں تھی۔

"کاش میں سمجھ پاتا۔ سانپ، سانپ ہی پیدا کرتے ہیں۔" شاجہاں کی آنکھوں میں نفرت اور لفظوں میں زہر تھا پھر بابر کی گرفتاری کے لیے علاقے کی پولیس کو سب کے سامنے بلانے کا فون کیا۔

"ارے پولیس کو کیوں بلا رہے ہو؟ کیا، کیا ہے میرے بیٹے نے؟ کون سا قتل کر دیا ہے، کون سا جائداد لوٹ لی ہے؟" پھپھو اور دادی کی ہائے وائے نے کمرا سر پر اٹھا لیا۔ پھپھو بابا کو جھنجوڑنے لگیں۔ انہوں نے رخ موڑ لیا۔ آج جو ہوا تھا یہ بہت ہوا تھا۔ وہ اس سب کے لیے معاف کرنے کے روادار نہیں تھے۔

"کوئی بھی کیس بنا لوں گا اس پر، چھوڑوں گا نہیں۔" شاجہاں نے بے لچک لہجے میں کہا اس کے لہجے میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پھپھو دہاڑیں مارنے لگیں۔ بابر کو جب پولیس لے گئی تب اس نے واپسی کا پروگرام بنایا۔

"میں اسے ساتھ لے جا رہا ہوں۔" بنا خوشی یا بابا کی طرف دیکھے اس نے کہا تھا۔ بابا پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"ابھی؟" انہیں یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"جی ابھی۔" وہ اب بھی نظریں چرا رہا تھا۔ صورتِ حال ٹھیک ٹھاک سنگین تھی مگر بابا کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"اور جب یہ لوگ حویلی سے دفع ہو جائیں۔ ہم تب اس گھر میں آئیں گے ورنہ نہیں۔" اس نے دادی اور پھپھو کو مزید چابک مارے۔ بابا کہنا چاہتے تھے میری ماں کو بخش دو۔ بابر کی فیملی کو وہ ان کے ذاتی گھر پہنچا دیں گے مگر ابھی وہ پٹڑی پر آیا تھا اور وہ ابھی سے بگاڑ دیتے، سو......

''ٹھیک ہے، جیسا تم کہو۔'' کہنے پر اکتفا کیا۔ ان کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ خوشی کو اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔

☆☆☆

''سوری۔'' وہ اس کا سر اپنے کندھے سے لگائے کہنے لگا۔ خوشی فوراً سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ کم از کم ابھی کے لیے شاہجہاں فرشتہ ثابت ہوا تھا اور ابھی کے لیے سوری اس کے کھاتے میں نہیں جاتا تھا۔

''کس لیے؟'' شاہجہاں نے اس کے لال سرخ نشانات سے سجے چہرے کو بغور دیکھا۔

''اس سب کے لیے۔'' پھر اس نے چہرے کے زخم اور تھپڑوں کے نشانات پر نرمی سے انگلی پھیرتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

''لیکن یہ آپ نے تو نہیں کیا۔'' اب پتا نہیں وہ اس پر الزام کیوں نہیں آنے دے رہی تھی۔ شاید محبت کرنے لگی ہو یا شاید اس سے متاثر ہو یا پھر اس کی مما کے جیسی پتی ورتا ہو۔ بابا سے محبت نہ ہوتے ہوئے بھی وہ بابا کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ یہ الگ بات تھی کہ بابا ان سے کتراتے تھے۔

''میری وجہ سے تو ہوا۔'' خیالات بھٹکنے لگے تو اس نے واپس خوشی کی الجھتی ہوئی آنکھوں کی طرف دھیان لگایا۔

''آپ کی وجہ سے کیوں؟'' وہ آنکھیں پٹپٹاتی مزید حیران ہوئی۔ گاڑی چلانے کو تیار شاہجہاں نے بے ساختہ گہری سانس لی۔ اس پر آشکار ہو رہا تھا وہ جتنے میسج بھیجتی تھی، اس سے زیادہ بولتی تھی۔

''کیونکہ میں تمہیں اگنور کرتا تھا۔ تمہیں ملنے بھی نہیں آتا تھا۔ تم سے دور بھاگتا تھا۔''

''تو یہ تو آپ نے کرنا تھا...... آپ کی شادی آپ کی مرضی کے خلاف جو ہوئی......'' شاہجہاں کے دل میں پہلی بار جلترنگ سی بجی۔ وہ لڑکی ایسی ہرگز نہیں تھی جس سے دور بھاگا جاتا۔

''اور میں نے تو آپ سے کبھی کوئی کمپلینٹ نہیں کی۔''

''ضروری ہے تم شکایت کرو اور میں تب ہی سوری بولوں؟''

''ظاہر ہے۔'' اور شاہجہاں کو اس پر پیار آنے لگا۔ وہ اس کے دل میں اترنے لگی تھی، دھڑلے سے۔

''بارش رک گئی ہے...... چلیں؟'' اپنے احساسات سے خود ہی گھبراہٹ کا شکار ہوا وہ پوچھ رہا تھا۔ خوشی نے تابعداری سے سر ہلا دیا مگر ابھی پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ وہ منہ بسور کر بولی۔

''سوری۔''

''وہ کس لیے؟'' شاہجہاں کو حیرانی ہوئی۔ سوری خوشی کی طرف سے بھی نہیں بنتا تھا۔

''میں نے......'' وہ منمنا کر جیسے اپنا قصور گنوانے لگی۔ ''آپ کو بہت ٹیکسٹ کیے، آپ کو بہت تنگ کیا۔'' مسکراہٹ چھپانے کے لیے اسے مخالف رخ دیکھنا پڑا۔

''ہاں...... یہ سوری قبول۔'' خلافِ عادت وہ شوخ ہوا تھا حالانکہ وہ ان پیغامات کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ ان کے انتظار میں رہتا۔

پانچ منٹ مزید سرکے وہ اب بابا نامہ سنا رہی تھی۔ بابا یہ...... بابا وہ...... اور ہمیشہ اکیلا سفر کرنے والا شاہجہاں اس بالکل الگ قسم کی کمپنی سے حیرت انگیز حد تک محظوظ ہوتا رہا۔ اسے لگ رہا تھا اس سادہ دل لڑکی کے ساتھ زندگی خوشگوار اور سہل ہو جاتی ہے۔ خود سے جُڑے دو قیمتی رشتے اسے اب ایمانداری کے ساتھ نبھانے تھے...... کیونکہ زندگی اب تقاضا کر رہی تھی اور اسے یہ تقاضا بوجھ نہیں خوشگوار لگ رہا تھا۔

(ختم شد)

آپ ہمارا فخر ہیں

انجم انصار



اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی خوبی ہر ایک کو عطا کرتا ہے...... کوئی اچھا لکھنا جانتا ہے تو کوئی اچھا پڑھنا...... بعض لوگ اچھے ہوتے ہیں اور بعض اچھے دکھتے ہیں۔ کوئی ظاہر داری میں اچھا ہوتا ہے تو کوئی پس پردہ...... مگر کچھ لوگ خوبیوں کا مجموعہ ہوتے ہیں...... وہ اچھے ہوتے بھی ہیں اور اچھے نظر آتے بھی ہیں...... اور اگر وہ دنیا سے چلے بھی جائیں ...... تب بھی وہ لوگوں کے دلوں میں رہتے ہیں...... ان میں ایک نام جناب قمر علی عباسی کا ہے...... جو اپنی کتابوں کی صورت میں تو ہمیشہ یاد رکھے ہی جائیں گے...... مگر...... وہ اپنے اخلاق سے مزین عادتوں، باتوں اور رویوں کی بنا پر بھی بھلائے نہیں جاسکتے...... وہ جب بھی پاکستان آتے تھے...... ادارہ پاکیزہ کی جانب سے ایک مخصوص تقریب ان کے حوالے سے ضرور ہوا کرتی تھی...... جس میں مصنفات کے ہجوم میں...... وہ اپنی شیریں بیانی سے ایک سماں باندھ دیا کرتے تھے...... اور سب محو ہو کر ان کی باتیں سنا کرتے تھے۔

تاریخ سے انہیں گہری دلچسپی تھی...... ہر ملک کے حالات...... ماضی کے حوالے سے اتنے شُستہ انداز میں بیان کیا کرتے تھے...... کہ میں سوچا کرتی تھی...... ان کو تو کسی یونیورسٹی میں لیکچر دینے چاہئیں...... مگر ایک سفر نامہ نگار...... ایسا ہی ہونا چاہیے...... جسے تاریخ پر پورا عبور حاصل ہو۔

اور اب قمر علی عباسی ہم میں موجود نہیں ہیں...... اس دفعہ نیلوفر عباسی پاکستان آئیں...... تو وہ تنہا تھیں...... اور ایک افسردگی ان کے چہرے پر رچی ہوئی تھی...... ان کی ہر بات کا سرا قمر علی عباسی سے شروع ہوتا تھا اور ان پر ہی ختم ہو رہا تھا۔ ان کے پاکستان آتے ہی ان کے اعزاز میں تقاریب شروع ہوگئیں...... آرٹس کونسل میں جہاں ان کی نئی کتاب کہی ان کہی کے حوالے سے تقریب ہوئی وہاں انہیں اعترافِ کمال کا ایوارڈ بھی دیا گیا...... یہ تقریب بہت بڑی تقریب تھی...... بقول محترمہ عذرا رسول...... کہ ادب کے حوالے سے انہوں نے اتنی بڑی تقریب اور اتنے زیادہ اسپیکرز کو اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا جو سب قمر علی عباسی کو بھی یاد کر رہے تھے...... اور نیلوفر کے طرزِ تحریر کی خوبیاں بھی گنوا



عذرا رسول، نیلوفر عباسی اور انجم انصار

رہے تھے۔ اس تقریب میں محترمہ عذرا رسول نے بھی نیلوفر کی کتاب کے بارے میں اپنی گرانقدر رائے دیتے ہوئے کہا...... کہ یہ کتاب ہماری فرمائش پر ہی پاکیزہ میں شروع کی گئی تھی...... اس سے قبل...... محفلِ طنز و مزاح...... جو مسز نزہت اشفاق (پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار) نے ارینج کی تھی...... اس میں ہم نے اپنا مضمون پڑھنے کے بعد قمر علی عباسی اور نیلوفر عباسی کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا کہ وہ دونوں ہی ادب کا وہ چاند ہیں...... جن کی روشنی دنیائے ادب کی محفلوں میں ہمیشہ روشن رہے گی...... زندگی میں سیکھنے کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور اچھی کتابوں، اچھی باتوں اور اچھے لوگوں سے بہت کچھ سیکھا جاتا ہے۔

اس مرتبہ نیلوفر عباسی بہت کم دنوں کے لیے پاکستان آئی تھیں...... اللہ کا کرم تھا کہ ان دنوں کراچی کے حالات بہت بہتر تھے...... اور نیلوفر کے اعزاز میں ہر روز ہی کہیں نہ کہیں کوئی تقریب ہو رہی تھی...... اور پھر ادارہ پاکیزہ کی جانب سے سن سیٹ کلب ڈی ایچ اے میں ایک ادبی نشست رکھ لی گئی...... جس میں نیلوفر نے تمام مہمانوں کو اپنی نئی کتاب کہی ان کہی کے بارے میں بتلایا جو پاکیزہ میں یادوں کی مالا کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔

ہم نے قمر علی عباسی کے سفر نامے میں سے ایک اقتباس پڑھا...... اس کے بعد شریکِ محفل قمر علی عباسی کی تحریروں کے حوالے سے باتیں کرتے رہے...... اس محفل میں کئی بہنیں نیلوفر سے پہلی بار ملی تھیں اور ان کی شخصیت اور گفتگو سے بہت متاثر ہو رہی تھیں...... اور یہ حقیقت ہے کہ نیلوفر عباسی...... مایہ ناز مصنفہ ہونے کے ساتھ ساتھ معروف و مقبول براڈ کاسٹر اور اداکارہ بھی ہیں...... مگر ان کی شخصیت میں ایک تہذیبی رچاؤ کچھ اس قسم کا ہے کہ جب وہ کسی سے بھی بات کرتی ہیں...... تو ان کے لہجے میں شائستگی جھلکتی ہے اور وہ تکبر اور چھچھورپن سے بہت دور ہیں...... یہی وجہ ہے کہ ان کی سادگی اور دھیما لہجہ سب کو ہی پسند آتا ہے۔ اس ادبی نشست میں ہماری مصنفات اور محترمہ عذرا رسول نے جناب قمر علی عباسی اور نیلوفر عباسی کو ان کی تحریروں کے حوالے سے زبردست خراجِ تحسین پیش کیا اور کیوں نہ کیا جاتا کہ ان جیسے لوگ تو ہمارا فخر ہیں۔

☆☆☆

اللہ کی خوشنودی کے لیے ماہِ صیام میں آپ کا ایک عمل

شائستہ زریں

حدیث قدسی ہے... اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

”انسان کا ہر عمل اس کا ہوتا ہے مگر روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔“

بے شک ارکانِ اسلام میں شامل ہر عبادت کا ثواب بارگاہِ الٰہی سے ملے گا لیکن روزہ ایک ایسی عبادت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی کا مؤثر ذریعہ بنا دیا۔ حدیث پاک ہے کہ

”جب تو روزہ رکھے تو لازم ہے کہ تو اپنے کانوں، اپنی آنکھوں، اپنی زبان، اپنے ہاتھ اور سارے اعضائے جسم کو خدا کی ناپسندیدہ باتوں سے روک کر رکھے۔“

سو اللہ کی رضا کے لیے ہم روزہ رکھتے ہیں تو روزے سے متعلق احکامات پر عمل کر کے ہی صحیح معنوں میں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ روزے کی برکتوں کے طفیل نہ صرف ہم میں بہت سے اخلاقی فضائل آ جاتے ہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی ہم چاق و چوبند رہتے ہیں۔ اللہ کو راضی رکھنے کا ہر انسان کا اپنا طرزِ عمل اور طریقہ کار ہوتا ہے۔ ہم مسلمان عمر بھر اپنے رب کی رضا کے لیے کوششیں کرتے ہیں۔ یہ بجا کہ عمر بھر ہمارا ہر پل اللہ اور اللہ کے حبیب سرکار ﷺ کی خوشنودی میں بسر ہو تو گویا ہماری زندگی کا مقصد ہی پورا ہو جائے۔ رمضان میں چونکہ عبادت و ریاضت کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے اور یہ موقع تمام روزے داروں کو روز و شب ملتا ہے اگرچہ وہ اس سے فیض اٹھانا چاہیں۔ رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، سو اسی مناسبت سے سروے کے لیے اپنے سوال کو ہم نے محض رمضان تک محدود کر دیا جو بہت فضیلتوں اور برکتوں والا مہینہ ہے اور معزز و معتبر خواتین و حضرات سے معلوم کیا کہ ”ماہِ صیام میں کیا جانے والا آپ کا وہ ایک عمل کون سا ہے جو آپ خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے کرتے / کرتی ہیں؟“

ہمارے سوال کے جواب میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ نیکی بتا کر کیا اپنی نیکی ضائع کر دیں؟ سوال بجا سہی اور بحیثیت مسلمان اس حدیثِ پاک سے ہم سب ہی واقف ہیں کہ ”اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے“ سو اس حدیثِ مبارکہ کے مصداق ہم نے بھی نیک نیتی سے یہ کارِ خیر کر ڈالا، اس سروے کا بنیادی مقصد نیک اعمال کی تشہیر نہیں بلکہ ان کی توسیع کی خواہش ہے۔ بے شک اللہ کی رضا کے لیے کیے جانے والے اعمال بتانے یا جتانے کے نہیں ہوتے لیکن اگر انہیں ظاہر کر دینے سے کسی کو روشنی کی محض ایک کرن نظر آ جائے، کسی بھٹکے ہوئے کو راہِ ہدایت مل جائے تو کیا یہ بہتر عمل نہیں ہے؟ یوں بھی نیکیاں عام کرنے کا عمل اسلامی تعلیمات کا ایک حصہ بھی تو ہے بے شک دیے سے دیا جلتا ہے اور اگر کسی کے بتائے ہوئے ایک نیک عمل سے اعمالِ حسنہ کی روشنی پھیل رہی ہے تو یہ کتنی خوشی کی بات ہے۔

صفدر ہمدانی

(سینئر براڈکاسٹر، شاعر)

رمضان تو سارے کا سارا ہی اللہ کی رضا کے لیے ہے، کسی ایک فعل پر کیا منحصر ہے؟ اگر رمضان کو


صفدر ہمدانی


ڈاکٹر شائستہ آفندی


راجو جمیل

اس کی روح کے مطابق راسخ کرلیا جائے تو اس ایک مہینے کے ثمرات...... حیات پر محیط ہو جاتے ہیں لیکن ہمارے معاشرے کا مسئلہ دکھاوے کا ہے، عباوات بھی دکھاوا بن چکی ہیں۔ ماہِ صیام میں روزہ رکھیں نہ رکھیں افطار کا اہتمام خوب ہوگا۔ رمضان کا ایک، ایک لمحہ اگر اللہ کی رضا کے لیے نہیں ہے تو تمام عباوات و اعمال فقط ورزش ہی ہیں۔

ڈاکٹر شائستہ آفندی

بہت سے ایسے کام ہیں جو میں نے رمضان میں کرنے سیکھے لیکن انہیں رمضان تک محدود نہیں رکھا بلکہ انہیں اپنی روزمرہ زندگی کا حصہ بنالیا مثلاً صدقہ میں سارا سال دیتی ہوں لیکن اللہ کی رضا کے لیے رمضان میں زکوٰۃ ضرور نکالتی ہوں۔

راجو جمیل
(سینئر ٹی وی آرٹسٹ)

کسی کو بھی بھولے سے بھی میری ذات سے کوئی تکلیف نہ پہنچے اس کے علاوہ حاجت مندوں کو افطار کرانا اور کسی بھی قسم کے امتیاز کے بغیر خود بھی ان کے ساتھ شریک ہونا۔

عفیفہ صوفیہ الحسینی
(پروگرام منیجر پی ٹی وی نیشنل، کراچی مرکز)

رمضان کا مہینہ اللہ نے بندوں سے اپنا تعلق مضبوط رکھنے کے لیے بنایا ہے۔ اور دیگر اسلامی مہینوں کی بہ نسبت ماہِ رمضان میں اللہ اپنے بندوں کے نیک اعمال پر انعام و اکرام کی بارشیں ایسے کرتا ہے جیسے دنیا میں بمپر پرائز والی اسکیمیں ہوتی ہیں۔ بحیثیت مسلمان اللہ کی رضا کے لیے عبادت تو میں کرتی ہی ہوں لیکن ساتھ میں بطورِ خاص رمضان کی اصل روح یعنی دوسروں کی بھوک، پیاس کا احساس کرتی ہوں۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے اب یہ عالم ہوگیا ہے کہ کتنے ہی گھرانے ایسے ہیں جہاں تنگدستی کے باعث صبح اور رات کا کھانا تو کھایا جاتا ہے لیکن دانستہ دوپہر کا کھانا ترک کردیتے ہیں۔ ایسے میں رمضان میں اللہ جو بھی مجھے توفیق دیتا ہے اس کے مطابق ایسے سفید پوش لوگوں کے ساتھ تعاون کرنے کی کوشش کرتی ہوں جو اپنی


نیلوفر عباسی


شہاب الدین شہاب


راحیلہ فردوس

عزتِ نفس کی خاطر کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کرتے اور اس کے لیے میں اپنی بہت سی ضروریات کو بھی روک لیتی ہوں۔

نیلوفر عباسی
(براڈکاسٹر، آرٹسٹ)

ہر پل ہمارا عمل اللہ کی رضا کے لیے ہونا چاہیے۔ خاص طور پر رمضان میں روزہ رکھ کر اکثر لوگ بہت بدمزاجی کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ عمل اوروں کی دل آزاری کا باعث بنتا ہے۔ جب اللہ کی رضا کے لیے ہم روزہ رکھتے ہیں تو اللہ کے فرمان کے مطابق اوروں کی دل آزاری کا گناہ بھی نہیں کرنا چاہیے اور جہاں تک ممکن ہو اللہ کو راضی کرنے کے لیے رمضان میں اپنی گزشتہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی ضرور مانگنی چاہیے۔ اور میں ایسا ہی کرتی ہوں۔

شہاب الدین شہاب
(صحافی، شاعر)

رمضان کے مہینے میں اللہ کی رضا کے لیے روزہ اور زکوٰۃ کی ادائیگی اخلاصِ نیت کے ساتھ کرتا ہوں کہ رمضان میں آدمی کو تقویٰ کی جس منزل کا تجربہ ہوتا ہے اس میں زکوٰۃ کی ادائیگی ایک الگ روحانی تسکین کا باعث ہوتی ہے۔ ایک ایسی طمانیت جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔

راحیلہ فردوس
(نعت خواں)

میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ رمضان پورے اہتمام اور اپنے گھر والوں کے ساتھ گزاروں۔ یہاں تو افطار پارٹیاں ایک سال پہلے ہی سے بک کر لی جاتی ہیں اور اس میں بھی تفریح زیادہ ہوتی ہے بس اسی ایک چیز سے میں بچتی ہوں کم از کم ایک ماہ تو سچائی سے اللہ کی رضا کے لیے گزارا جاسکتا ہے، ورنہ رمضان کے مہینے کی ایمان کی تازگی کا مقصد کیسے پورا ہوگا؟ اگر ہم فضولیات سے دور رہیں تو ایک نہیں کئی ایک عمل خود بخود اچھے ہوجاتے ہیں۔

ایاز خان
(کامیڈین)

روزہ رکھنا اور اس سے جڑا ہر وہ عمل جو میرے

ایمان کو اور بھی مضبوط کر دے اور خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے ایسا کرنے سے میری رمضان کی عبادت کا لطف بڑھ جاتا ہے۔

ڈاکٹر صفی رئیس علوی

(اسسٹنٹ پروفیسر ڈاؤ میڈیکل یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز)

رمضان کے روزے رکھنے کا عمل خالصتاً اللہ کے لیے ہے اور اگر رمضان کے اس سب سے بڑے عمل میں صبر اور تقویٰ بھی شامل ہو جائے تو اللہ کی رضا کے لیے اس سے خالص اور بڑا عمل اور کیا ہوگا؟

رعنا کہکشاں

(مصنفہ)

روزانہ ایک مسکین کو افطار کروانے کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی صحیح ادائیگی کرنا جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم بھی دیا ہے۔

غزالہ

(ملازمت پیشہ خاتون)

اللہ کی رضا کے لیے ایسے روزے رکھنا جس میں نمود و نمائش کا عنصر نہ ہو۔ رمضان میں جسمانی عبادت کے ساتھ ساتھ مالی عبادت پر بھی خصوصی توجہ دیتی ہوں۔ زکوٰۃ خالصتاً حقوق العباد سے متعلق ہے سو حقوق العباد کا پہلا فرض سمجھ کر زکوٰۃ کی ادائیگی احسن طریقے سے کرتی ہوں۔

کرن خان

(اینکر پرسن)

سچ تو یہ کہ صرف رمضان ہی میں نہیں ہر لمحہ میں



ایاز خان



ڈاکٹر صفی رئیس علوی



کرن خان

ایسا کام کرنا چاہتی ہوں جو اللہ کو مجھ سے راضی اور خوش رکھے، ہاں رمضان میں روزے میں کھانے پینے سے پرہیز ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے کہہ سکتی ہوں کہ صرف رمضان ہی میں کرتی ہوں۔

تسلیم فاطمہ

(معلّمہ)

سحری و افطار میں کم کھاتی ہوں تاکہ عبادت کا لطف اٹھا سکوں، یہ میرا تجربہ بھی ہے کہ کم افطاری کھانے کے بعد نہ صرف تراویح بلکہ تہجد بھی آرام سے پڑھی جاتی ہے۔ طبیعت خوش خوراکی کے مظاہرے

کے بعد بوجھل ہو جائے تو عبادت کا لطف بھی نہیں آتا اور رمضان کی ایک ماہ کی عبادت کا اپنا مزہ ہے۔ اس کے علاوہ رمضان بھر غیر ضروری تفریحات سے گریز کر کے اپنے لیے کم اور دوسروں کے لیے زیادہ سے زیادہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں اس طرح بہت آسانی سے میں اپنے رب کو راضی کر سکتی ہوں۔

عذرا صدیقی

(معلمہ)

اللہ نے حقوق العباد کا خاص طور پر حکم دیا ہے۔ میں اس پر عمل کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتی ہوں لیکن رمضان المبارک میں دو باتوں کا خصوصی خیال رکھتی ہوں ایک تو یہ کہ مجھ سے حقوق العباد کی ادائیگی میں ادنیٰ درجے کی بھی کوتاہی نہ ہو اور دوسرے یہ کہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اوروں کی ضرورتوں کو نہ صرف محسوس کرنا بلکہ حسبِ توفیق ان کے ساتھ تعاون کرنا اور رمضان میں پیدا ہونے والا یہ احساس سارا سال مجھے اس ضمن میں متحرک رکھتا ہے۔

زارا

(طالبہ)

عبادت تو کرتی ہی ہوں لیکن خاص طور پر رمضان میں قضائے عمری کی نمازیں ادا کرتی ہوں۔ اللہ میری اس عبادت کو قبول کرے اور مجھ سے راضی رہے، آمین

ممتاز خانم

(گھریلو خاتون)

ایسا کام جو اللہ کے بندوں کے لیے مسرت اور تسکین کا باعث بنے اس لیے اللہ کی رضا کے لیے میں محتاج، محروم، کمزور اور ناتواں جن کا ہم پہ حق ہے حسبِ استطاعت ان کے لیے کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کرتی ہوں کہ وہ بھی رمضان کی بہاروں کا لطف اٹھا سکیں اور چونکہ ایسا میں اللہ کی رضا کے لیے کرتی ہوں اس لیے اولیت قرابت داروں کو دیتی ہوں اور یہ میرے رب کا احسان ہے کہ اس نے مجھ ناچیز کو اس قابل سمجھا۔

نسرین بیگم

(طالبہ)

عام دنوں کے مقابلے میں عبادت زیادہ کرتی ہوں، اس کے ساتھ ساتھ خود بخود دل میں اچھے، اچھے کام کرنے کی خواہش ہوتی ہے دل چاہتا ہے جہاں تک ممکن ہو سکے ہر وہ کام کروں جس سے اللہ مجھ سے خوش ہو اور مجھے روزہ رکھنے کا ثواب بھی ملے۔

شفا پیرزادہ

(طالبہ)

رمضان کے بابرکت مہینے کو اگر نیکیوں کا موسم بہار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اور اللہ کی رضا کے لیے جہاں میں روزہ رکھ کر اللہ کی عبادت کرتی ہوں وہاں میری کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کر سکوں اور اللہ کی رضا کی خاطر ایسا



شفا پیرزادہ

کرنے بہت سکون ملتا ہے۔ اور یوں بھی میں سمجھتی ہوں کہ

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

ثنا

(طالبہ، ملازمت پیشہ)

رمضان کے مہینے میں کثرت سے اللہ کی عبادت کرتی ہوں، خاص طور پر قرآن حکیم کی تلاوت۔ ملازمت اور تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے سارا سال اس طرح قرآن حکیم کی تلاوت نہیں کر پاتی جس طرح رمضان میں کرتی ہوں اور رمضان میں اس عبادت کا لطف ہی اور ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میری پوری پوری کوشش یہی ہوتی ہے کہ جھوٹ اور غیبت اور دیگر برائیوں سے بچوں، خاص طور پر غصے پر قابو پاتی ہوں کہ اس کی وجہ سے کسی کی دل آزاری نہ ہو کہ یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔

☆☆☆

قارئین کرام:

بجا کہ عمر بھر ہمارا رہبر بس اللہ اور اللہ کے حبیب سرکار ﷺ کی خوشنودی میں بسر ہو تو گویا ہماری زندگی کا مقصد ہی پورا ہو جائے۔ سردار الانبیا حضور انور ﷺ نے رمضان المبارک کو تمام مہینوں کا سردار قرار دیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے۔

''اے ایمان والوں! تم پر روزے فرض کر دیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلی امتوں پر فرض کیے گئے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔''

گویا روزے کی اصل روح ''تقویٰ'' ہے جو تمام اعمالِ حسنہ کی اساس ہی نہیں عملی تفسیر بھی ہے۔ یہ کتنی خوش آئند بات ہے کہ سروے کے شرکا میں سے بیشتر نے حقوق العباد اور زکوٰۃ کی ادائیگی پر زور دیا ہے۔ قرآن حکیم میں بھی کئی مقامات پر نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی کی تاکید کی گئی ہے۔ شرعی اعتبار سے زکوٰۃ مالی عبادت ہے جس کے مطابق ہر صاحبِ نصاب مسلمان اپنے مال کا چالیسواں حصہ سالانہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی سے ہم ان اخلاقی ذمے داریوں کی تکمیل بہ آسانی کر لیتے ہیں جن کی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ خاص تاکید فرمائی یعنی دردمندی، سخاوت، ضرورت مندوں کی مدد، انسانیت، رحم دلی، عدل، انصاف وغیرہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ

''تین کام ایسے ہیں کہ جو شخص ان کو کرے گا وہ ایمان کا ذائقہ چکھے گا، صرف اللہ کی عبادت کرے اور یہ عقیدہ رکھے کہ سوائے اللہ کے کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اپنے مال کی زکوٰۃ ہر سال اس طرح دے کہ اس کا نفس اس پر آمادہ کرتا ہو یعنی اس کو روکتا نہ ہو۔''

رمضان کو دیگر مہینوں پر یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ اس ماہِ مبارک میں قرآن حکیم نازل ہوا تھا۔ یہی وہ مبارک مہینہ ہے جس کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں لیلۃ القدر بھی آتی ہے۔ ماہِ صیام کے تینوں عشرے اعمال و عبادات کے اعتبار سے بندوں کے لیے قربِ الٰہی کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رمضان کا پہلا عشرہ رحمت، دوسرا مغفرت اور تیسرا آتشِ جہنم سے نجات کے لیے مختص کر دیا ہے۔ ایسے میں اللہ کی رضا کے لیے ہماری بے ریا عبادتیں اور اعمال صالح ہی ہیں جنہیں اختیار کر لیں تو نہ صرف اللہ کی رحمتیں ہم پر سایہ فگن ہوں گی بلکہ توبہ اور مغفرت کے دروازے بھی ہمارے لیے کھول دیے جائیں گے اور جہنم کی آگ سے نجات کی امید بھی ہو گی۔ سو کیا ہی اچھا ہو کہ ماہِ صیام کے روزے رکھنے کے ساتھ ساتھ خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے ضبطِ نفس کا مظاہرہ کرتے ہوئے حسب توفیق کوئی ایک نہ سہی محض ایک عمل ہی ایسا کر لیں کہ جس کے صلے میں ماہِ صیام کے تینوں عشروں کی فیوض و برکات سمیٹ کر ہم اپنی دنیا ہی نہیں عاقبت بھی سنوار لیں، آمین!

☆☆☆

وہ آئے بزم میں......

نزہت اصغر



غزالہ نگار اورکزئی سے پرلطف بات چیت

قارئینِ پاکیزہ السلام علیکم! آج ہم اپنی اور آپ کی ایک اور پسندیدہ رائٹر کے ساتھ اس بزم میں حاضر ہیں۔ ان رائٹر کو اگر گم شدہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ عرصۂ دراز تک قارئین کے دلوں پر راج کرنے والی یہ ہستی آج کل امریکا میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ ہم نے بھلا ہو اس کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا کہ جس کے ذریعے ان سے رابطہ کر ہی لیا اور اب ان سے تفصیلی گفتگو حاضر

خدمت ہے۔ سوالات پوچھنے سے پہلے اتنا بتادیں کہ ان کے افسانوں کی رنگینی، دلنشینی دلکش منظر نگاری اور پُراثر مکالمے آج بھی نظروں کے سامنے ہیں۔ ہم تشکر کے طور پر ان کی کاوشیں بھی قارئین کی نذر ضرور کریں گے اور آپ سب کی فرمائشوں کے پیشِ نظر ان سے یہ فرمائش بھی کرتے رہیں گے کہ غزالہ صاحبہ پاکیزہ قارئین کے لیے دوبارہ سے لکھنے کی جانب جلد از جلد راغب ہوں۔

آیئے قارئین! اپنے وقت کی مایہ ناز، طرح دار اور کہنہ مشق لکھاری محترمہ غزالہ نگار اورکزئی سے دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ اس طویل غیر حاضری کے متعلق بھی ذرا گفتگو ہوجائے۔

غزالہ نگار اورکزئی ✧......سوالات کے جوابات دینے سے قبل کچھ عرض کرتی چلوں کہ سب سے پہلے تو نزہت تمہارا شکریہ کہ تم نے اتنے سالوں بعد ایک بھولی بسری لکھاری کو پکار کے ان معصوم بچیوں کو پریشان کردیا ہے پھر شکریہ میری پیاری انجم کا کہ انہوں نے اتنے سال گزرنے کے باوجود ہر ہر موقع پر بہت محبت سے یاد کیا ہے۔ بہنوں کی محفل میں ذکر کرتی رہی ہیں چونکہ پاکیزہ پڑھنے کا سلسلہ ٹوٹا ہی نہیں۔ اس لیے پتا چلتا رہتا ہے کس نے یاد کیا؟ کون کن حالوں میں ہے، کبھی دیر سویر ہوجاتی ہے کبھی رسالہ بہت دیر سے ملتا ہے کبھی نہیں بھی ملتا لیکن میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ پڑھنے میں ناغہ نہ ہونے پائے۔ چلا چل لفافے کبوتر کی چال...... سو اب ہمارا تعلق انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی بدولت زیادہ باقاعدگی سے استوار ہوگیا ہے۔ نزہت اصغر آپ سے تعارف بھی اسی حوالے سے ہوا اور اسی توسط سے میری یہ تحریر میرے قارئین تک پہنچے گی۔ جزاک اللہ خیر۔ عزیز قارئین یہ بھی بتاتی چلوں کہ نزہت نے بہت محبت سے ایک طویل اور پُرمغز سوال نامہ ترتیب دیا ہے بہت خوب صورت تعارفی کلمات کے ساتھ جن کے لیے میں بے حد مشکور ہوں اب یہ قارئین، آپ کی قوتِ برداشت پر منحصر ہے کہ کتنی دلچسپی سے اس گفتگو کو پڑھتی ہیں۔ (سوال نامہ اس سے بھی طویل ہوسکتا تھا غزالہ آپی مگر آپ کی مصروفیات کو پیشِ نظر رکھا گیا اور ہم سب میں بہت قوتِ برداشت ہے' الحمدُللہ)

پاکیزہ ✧......سب سے پہلے تو آپ کو اپنی اس بزم میں ہم خوش آمدید کہیں گے اور ادارے کی جانب سے آپ کا شکریہ بھی ادا کریں گے کہ بالآخر اپنی گوناگوں مصروفیات سے آپ نے ہمارے لیے وقت نکال ہی لیا۔ اس ری یونین پر آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......دوبارہ رابطہ بحال ہونے پر تاثرات...... اپنی انجم کے ایک ناول میں ایک نانی ہوتی تھیں جو جھولے پر بیٹھ کے ایک گانا گایا کرتی تھیں۔ میرا بھی اسی نانی کے اسٹائل میں "میں اُڈی اُڈی جاواں ہوا دے نال" گانے کو جی چاہ رہا ہے دراصل جب میں نے پاکیزہ میں لکھنا شروع کیا تو تحریر میں تھوڑی پختگی آچکی تھی۔ اس لیے میری قدرے ڈھنگ کی تحریریں انجم انصاری ہی نے شائع کی تھیں پھر اتنا پیار کا تعلق برقرار رکھا، تو بھئی "گھر" آکر کس کو خوشی نہیں ہوتی۔

پاکیزہ ✧......لکھنے لکھانے کا سلسلہ کیوں موقوف کردیا؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......لکھنے کا سلسلہ پاکستان ہی میں سست پڑ گیا تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ لکھاری کو اپنے تجربے اور مقبولیت کے باوجود اپنے وقت کا مناسب معاوضہ نہیں ملتا۔ اس موضوع پر دوستوں سے اکثر بات ہوتی رہتی تھی۔ بلاشبہ بیشتر لکھاری معاوضے کے لیے نہیں لکھتے۔ خود مجھے پوری ایک دہائی لگ گئی...... منہ پھاڑ کے مطالبہ کرنے میں اور پھر بھی اونٹ کے منہ میں زیرہ تک نہ آیا۔ مجھے یہ



بائیں سے غزالہ نگار اورکزئی اپنے دو کولیگز کے ساتھ

بات سمجھ آگئی کہ معاوضے کی اہمیت کیا ہے اور خصوصاً شوقیہ لکھنے والے کس طرح سے ان لوگوں کو نادانستہ نقصان پہنچانے لگتے ہیں۔ جن کی زندگیوں کا دارومدار ہی قلم پر ہے۔ بہرحال کچھ میری دیگر پیشہ ورانہ مصروفیات اور کچھ اس دل شکنی کے باعث لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ ہاں یہ ہے کہ ہیرا پھیری تو ہوتی رہتی تھی۔ پی ٹی وی کے لیے میں نے 1982-83ء میں لکھنا شروع کیا تھا اور امریکا آنے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ وقت ملے تو کچھ نہ کچھ لکھ ہی لیتی ہوں لیکن وہ مکمل نہیں ہو پاتا۔ اس انٹرویو کے جواب لکھنے میں ہی چھ ماہ لگ گئے اور اس کی وجہ میری عملی زندگی کی مصروفیات ہیں۔

پاکیزہ ✧......اپنی موجودہ مصروفیات کے بارے میں تفصیلاً بتایئے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......موجودہ مصروفیات میں سرِفہرست درس و تدریس ہے پاکستان میں بھی پڑھاتی تھی۔ نیویارک میں بھی پڑھاتی ہی ہوں۔ دیگر انتظامی امور کی ذمے داریاں بھی ہیں۔ اسی میں صبح سے رات ہوجاتی ہے۔ سردیوں میں ایک آدھ بار تو فجر کی نماز بھی کالج آکر پڑھی ہے اگر سویرے کلاس ہو تو۔ عشا کی نماز پڑھ کر ہی عموماً کالج سے نکلنا ہوتا ہے۔ یہاں کا سسٹم پاکستان کے عمومی سسٹم سے خاصا مختلف ہے۔ چنانچہ سمسٹر کا دورانیہ اساتذہ اور طلبا سبھی کے لیے بہت مصروف ہوا کرتا ہے پھر یہاں کالج، یونیورسٹی میں سردی، گرمی کی چھٹیوں کا بھی رواج نہیں۔ ایک آدھ ہفتے کے وقفے سے اگلا سمسٹر شروع ہوجاتا ہے۔ اس لیے جب تک خود سے چھٹی لینے کا خیال نہ آجائے چھٹی ملتی نہیں ہے۔

پاکیزہ ✧......آپ کو اپنا دیس یاد نہیں آتا یا وہ زمانہ جب آپ قارئین کے لیے ایک کے بعد ایک کہانیاں دیتی جارہی تھیں؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......اپنا دیس کب کوئی

بھول سکتا ہے۔ نہ ہی بے فکری کا وہ زمانہ جب قلم اٹھایا اور کہانی تیار لیکن اپنے، اپنے حالات اور مقام انسان کو زنجیر کر دیتے ہیں۔ میں جو ہنستا بستا دیس چھوڑ کے آئی تھی وہ تو اب رہا ہی نہیں۔ اب جو پاکستان دنیا کو نظر آتا ہے اس پر مہیب عفریت مسلط ہیں جو اس کی جان چھوڑنے کو آمادہ نہیں۔ پاکستان میں رہنے والوں کو شاید حالات ایسے گمبھیر نہ دکھائی دیتے ہوں لیکن پردیسیوں کی ہر، ہر سانس اپنے پیاروں میں اٹکی رہتی ہے۔ جب تک ہر صبح اپنے پیاروں کی، اپنے شہروں کی سلامتی کی خبر نہیں ملتی۔ سانس سینے میں اٹکی رہتی ہے۔

پاکیزہ ✧......چلیں بات آپ کے ابتدائی کیریئر سے شروع کرتے ہیں۔ رائٹر بننے کا سبب کیا تھا کس سے متاثر ہو کر اس فیلڈ میں آئیں؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......میرا ابتدائی کیریئر تو تیسری جماعت ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ جو پہلی کہانی لکھی وہ خالہ دادی نے سنائی تھی۔ پڑھنے، پڑھانے کے شوق نے درس وتدریس کے راستے پر ڈال دیا اور اب اس کو بھی لگ بھگ 34 سال ہو چکے ہیں۔ میرے لکھنے کی اولین وجہ میری چھوٹی پھوپی سائرہ کا مختصر سا ادبی کیریئر تھا۔ وہ شادی سے پہلے باقاعدہ کہانیاں لکھا کرتی تھیں جو اپنے وقت کے مشہور اخباروں شہباز، انجام اور مشرق وغیرہ میں چھپا کرتی تھیں۔ میرے ہاتھ بچپن ہی میں وہ مطبوعہ کہانیاں لگ گئیں جو بعد میں خدا جانے کہاں گئیں لیکن مجھے ایک نیا راستہ دکھا گئیں۔ دوسرے ہمارے گھر میں زیادہ تر لوگ پڑھنے کے شوقین تھے اس لیے گھر میں بہت رسالے آیا کرتے تھے۔ تیسرے بزرگوں میں خصوصاً ہماری دادی مرحومہ کو بھی شوق تھا۔ بٹھا کر قصے کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ بس کچھ ایسی ہی تربیت نے اس سمت کا تعین کر دیا۔ اب میں اپنی کم سن بھتیجیوں میں بھی اس نوعیت کے شوق دیکھتی ہوں۔ میری بھانجیوں کے برعکس دونوں بھتیجیاں ابھی سے کہانیاں لکھنے کی مشق کرتی رہتی ہیں اور میں سمجھتی ہوں یہ ایک بہت مفید شوق ہے کیونکہ اب ٹیکسٹ میسجز نے ایک بہت بڑی اکثریت سے باقاعدہ اور بامعنی لکھنے کی صلاحیت چھین ہی لی ہے۔

پاکیزہ ✧......آپ کی ہم عصر مصنفات کون، کون سی تھیں یا ہیں؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......میری ہم عصر مصنفات میں نویدہ تارڑ، لیلیٰ عروج مرحومہ، ساجدہ حبیب، شوکت رانا، (گل) اقبال بانو، رفعت ناہید سجاد، ہما کوکب بخاری، عنیزہ سید میرے ذاتی دوستوں میں شامل تھیں۔ کچھ لوگ وقت کے ساتھ اِدھر اُدھر ہو گئے۔ کچھ سے آج تک تعلق برقرار ہے۔ ساجدہ کی جو کتاب چھپی ہے۔ اس نے باہتمام مجھے امریکا بھجوائی ہے۔ افسر سلطانہ سے بہت اچھی دوستی ہے۔ امریکا آنے تک خط کتابت رہی پھر جانے میری افسر شاہانہ کہاں گئی۔ وہ پڑھے تو انجم کے ذریعے رابطہ ضرور کرے۔ میری دیگر ہم عصر مصنفات میں آسیہ رزاقی اور رفعت سراج تب بھی سپر اسٹارز تھیں سو آج بھی ہیں۔ دیگر مقبول لکھاریوں میں فریدہ اشفاق، شہناز مرتضیٰ مرحومہ، خالدہ اسد مرحومہ، عظمت عزیٰ مرحومہ، نور بانو مجوب مرحومہ، وحیدہ نسیم مرحومہ، رضیہ فصیح احمد، شمیمہ نقوی مرحومہ، نبیہ نقوی مرحومہ، رضیہ بٹ مرحومہ، نگہت سیما، آسیہ مرزا، رخ اور ناہید چوہدری، زونین آرزو اور لیلیٰ غزل کے نام خود بخود ذہن میں چلے آ رہے ہیں اور بھی لوگ تھے جن کے نام اس وقت ذہن میں نہیں آ رہے۔ جانے والوں کو اللہ غریق رحمت کرے باقی سب کو صحت تندرستی، سکھ اور سکون عطا کرے، آمین۔

پاکیزہ ✧......رائٹر بننے کے لیے کن ابتدائی صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے؟



غزالہ نگار اورکزئی... نیویارک کے ہجوم میں بھی انفرادیت لیے ہوئے

غزالہ نگار اورکزئی ✧......رائٹر بننے کے لیے سب سے ضروری چیز متحرک اور متنوع تخیل ہے۔ تخیل تحریک پکڑتا ہے تو کہانی بلکہ کہانیاں بنتی چلی جاتی ہیں۔ قوتِ پرواز کمزور پڑتی ہے تو کہانی بھی وہیں چکرا کے بے ہوش ہو جاتی ہے بلکہ کبھی کبھار تو ایسا انتقال فرماتی ہے کہ لکھنے والے کو اسے ٹانگ سے گھسیٹ کر ٹھکانے لگانا پڑتا ہے۔ دوسری ضروری بات جس زبان میں کہانی لکھی جائے اس میں ممکنہ حد تک عبور لازمی ہے۔ عبور نہ ہونے کا مطلب ہے خیال پوری طرح تجسیم نہیں ہو پائے گا یا پھر دوسری زبانوں پہ انحصار کرنا پڑے گا۔ یہ کبھی کبھار اگر موقع کی مناسبت سے ہو......تو نہ صرف چلتا ہے بلکہ موقع محل ہو تو بہت خوب صورت بھی لگتا ہے لیکن یہ کہ پورا، پورا پیراگراف، اردو کے چند ٹانکوں کے علاوہ انگریزی میں لکھا جا رہا ہے۔ یہ نہیں چلتا۔ الٹا قاری کو ناراض کر دیتا ہے۔ تیسری بات، جس ملک، جس ماحول، جس زمانے، جن لوگوں کی کہانی لکھی جا رہی ہو، ان سے بھی کماحقہ واقفیت بے حد ضروری ہے۔ آج کل ایسی کہانیاں لکھنے کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے جہاں لکھاری کو بالکل سرسری سی معلومات ہوتی ہیں یا انٹرنیٹ پر ریسرچ تو اب بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ وکی پیڈیا زندہ باد...... لیکن کسی بھی زمانے اور معاشرت کے اتنے رنگ ہوتے ہیں کہ آسانی سے گرفت میں نہیں آتے۔ احتیاط اور باریک بینی سے کام نہ لیا جائے تو اچھی کہانی ہی بے وزن اور بدوضع ہو کر رہ جاتی ہے۔ جو لڑکیاں بالیاں تو ہنستے کھیلتے پڑھ لیں لیکن سنجیدہ قاری اور مجھ جیسے کائیاں قاری سر ہلاتے بلکہ سر کھجاتے رہ جاتے ہیں۔ اپنے ماحول اور اپنے زمانے پر بھی ایک اچھی کہانی لکھنا کسی کوہ گراں سے کم نہیں۔ پرائی معاشرت اور ماحول پر لکھنا ہو تو قلمکار کو یہ ضرور معلوم ہو کہ کہاں کہاں دامن بچا کر چلنا ہے۔ آج کی پڑھنے والی بچیاں بے حد باں کی

کھال نکالنے والی ہیں۔ بڑی آسانی سے کہانی کے جھول پکڑ لیتی ہیں اور یہ سراسر قلمکار کی نالائقی ہے کہ اپنی کمزوریاں سرِ عام رکھ دے۔ (ہماری نئی اور نو آموز رائٹرز پیاری غزالہ کی ان باتوں کو گرہ سے باندھ لیں کہ اتنی باریک بینی اور درست رہنمائی بھلا اور کہاں سے ملے گی)

پاکیزہ ✧......جب آپ نے لکھنا شروع کیا تو کون سے موضوعات خواتین رائٹرز کے پسندیدہ تھے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......موضوعات نہ آج نئے ہیں نہ کل نئے تھے، وہی رومانوی، معاشرتی اور گھریلو موضوعات۔ ہاں اب خواتین کی کہانیوں میں مذہبی اور جاسوسی رنگ زیادہ نظر آنے لگا ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی سیاست بھی شامل ہوگئی ہے جو پہلے کم ہی نظر آتی تھی۔ میں نے 1974ء میں پہلی کہانی لکھی تھی، اس زمانے میں مصنفات کے ذہنوں پر زیادہ تر محبت کا بھوت سوار رہتا تھا۔ اس کے علاوہ عمومی گھریلو سیاست، زندگی کی اونچ نیچ اور کبھی کبھار مذہبی موضوعات دکھائی دے جاتے تھے۔ اب 98% کہانیوں میں مذہب اور روحانیت کا کردار اتنا اہم ہوچکا ہے کہ آج کی بچیاں شاید اندازہ نہ کرسکیں کہ نگہت سیما 70ء کی دہائی میں خالصتاً نفسیاتی کہانیاں لکھا کرتی تھیں اور نفسیات سے ہٹ کر کچھ نہ لکھتی تھیں۔

پاکیزہ ✧......مردوزن کے مسائل یقیناً جداگانہ ہوتے ہیں اور مرد ہو یا عورت دونوں الگ، الگ نقطۂ نگاہ سے انہیں دیکھتے ہیں آپ کی نظر میں خواتین رائٹرز عورتوں کے مسائل بہتر طریقے سے اجاگر کرتی ہیں یا مرد رائٹرز؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......بھئی میرا تو خیال ہے کہ ہر صنف اپنی ہی صنف کو بہتر سمجھ سکتی ہے۔ ایک دوسرے کے دل کا حال جان سکتی ہے لیکن یہ بہرحال ایک عمومی بات ہے ہر صنف میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے مخالف صنف کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ یوں بھی کامیاب قلمکار تو وہی ہوتا ہے جو ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہوکر صرف انسان کی کہانی لکھ سکتا ہو۔ (کچھ نے تو حیوانات کی بھی کامیاب کہانیاں لکھیں)

پاکیزہ ✧......کیا آپ آج بھی مختلف رسائل کا مطالعہ کرتی ہیں؟ اگر کرتی ہیں تو آج کے لکھاری اور آپ کے دور کے لکھاری کی تحریروں میں کیا فرق نظر آتا ہے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......میں بے حد متنوع موضوعات پہ کتب و جرائد پڑھتی ہوں۔ اپنی رائے یہاں خصوصیت سے صرف خواتین کے پاکستانی رسائل تک محدود رکھتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ 1985ء سے بلکہ 1990ء سے پہلے کی خاتون لکھاریوں کے موضوعات ایک طرف تو گنے چنے ہوتے تھے لیکن دوسری طرف انہی کہانیوں میں ایک آفاقی عنصر بھی ہوا کرتا تھا۔ وہ اس طرح کہ ان کے کردار اور ان کے حالات، ان کی سوچ، مزاج اور رویے بڑی آسانی سے کسی بھی سماج اور زمانے میں بسائے جاسکتے تھے۔ یوں جیسے شیکسپیئر کی کہانیاں آج بھی معمولی ردّوبدل سے کہیں بھی اپنائی جاسکتی ہیں لیکن آج کی بیشتر کہانیاں کچھ اس طرح سے لکھی جارہی ہیں کہ اپنے ماحول سے نکل کر اپنے معنی کھودیں گی۔ بہت کم کہانیوں میں آفاقیت نظر آتی ہے جو پہلے کبھی نظر آیا کرتی تھی۔

پاکیزہ ✧......آپ نے یقیناً عالمی ادب بھی پڑھا ہوگا آج وہاں کیا موضوعات لیے جارہے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ ہمارا آج کا ادب کیا وہاں کے ادب سے پیچھے ہے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......اس سے پیوستہ سوال کے جواب میں یہ سمجھ لیجیے کہ عالمی ادب ایک

لامحدود اصطلاح ہے۔ ادب ہمیشہ دو طرح کا ہوا کرتا ہے۔ ایک وہ جس کی جڑیں صرف اپنے زمانے اور اپنی ہی معاشرت میں پیوست ہوتی ہیں۔ ایسا ادب اپنے ہی عہد میں تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے لیکن آہستہ، آہستہ اپنی خوبیوں کے باوجود بوڑھا ہوجاتا ہے اور گمنامی کے پردے میں چلا جاتا ہے۔ دوسرا ادب ہر زمانے، ہر عہد، ہر قوم کے لیے بامعنی اور اہم ہوتا ہے۔ ماہ و سال کی گردش اور زمان و مکاں کے جادے سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس وقت ہر طرف لوگ جن گرما گرم موضوعات پر لکھ رہے ہیں ان میں سرفہرست تو ہے دہشت گردی، اسلامی دنیا کا روز افزوں انتشار اور اس کے نتائج، ٹیکنالوجی کے اثرات اور اس کا مستقبل، دوسروں کی جاسوسی، بدلتے وقت کے ساتھ بدلتے رشتے جو بھی ان موضوعات پر طبع آزمائی کرتا ہے اپنے مخصوص نقطۂ نظر اور اپنے مخصوص تعصبات کے ساتھ کرتا ہے۔ چاہے وہ امریکی ہو، فرانسیسی ہو یا پاکستانی۔ بہت کم لکھنے والے ہیں جو اپنے ذاتی نظریات کو بالائے طاق رکھ کر انسان اور ان کے بنیادی مسائل کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ ایسی ہی تحریریں بقا پائیں گی، زندہ رہیں گی۔

پاکیزہ ✧......میرا مطلب موضوعات سے تھا۔ ہمارا کلاسیکی ادب کا سرمایہ تو بلاشبہ ناقابلِ شکست ہے مگر کیا آج کا رائٹر اپنی کاوشوں کی وجہ سے پچیس سے تیس سال بعد یاد رکھا جائے گا؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......نہ ہمارا ادب آگے ہے نہ کسی اور کا پیچھے سب اپنی ہی چال سے اپنا ہی سفر طے کررہے ہیں جہاں تک یاد رکھنے کی بات ہے تو جان لیں کہ نصف صدی کے بعد صرف وہی تحریر زندہ ہوگی جس میں سچا شعور، سچا فہم اور بدلتے وقت کا ادراک ہوگا اور جسے غیر جانب داری اور دل سوزی سے لکھا گیا ہوگا۔

پاکیزہ ✧......کسی بالغ انسان کی زندگی میں مطالعے کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......ارے بھئی ایک بالغ انسان کے لیے مطالعہ، آکسیجن، پانی، خوراک اور نیند کے بعد سب سے ضروری چیز ہے۔ ورنہ لوگ بالغ تو کیا بوڑھے ہوجاتے ہیں لیکن رہتے بالک کے بالک ہی ہیں۔ مطالعے کی نوعیت کا بھی تعین کرلیں صرف اچھی کتابیں چاٹنا کافی نہیں۔ مطالعہ تو ماحول کا، حالات کا، سب سے بڑھ کر انسانوں کا بھی بے حد ضروری ہے۔ ورنہ رہیں گے وہی کنویں کے مینڈک۔ آنکھوں سے تعصبات کی پٹی ہرگز نہیں اترے گی۔ زندگی تو گزر جائے گی لیکن رہٹ کے بیل کی طرح۔

پاکیزہ ✧......مطالعے کا شوق بچپن سے پروان چڑھتا ہے یا کسی بھی عمر میں انسان اس جانب راغب ہوسکتا ہے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......یوں تو مطالعے کی عادت صحیح تربیت اور ماحول کی مرہونِ منت ہوا کرتی ہے لیکن کچھ لوگوں کا ذاتی شوق بھی اس کی تہذیب و تربیت کردیتا ہے شروع سالوں میں خصوصاً اس ٹیکنالوجی کے زمانے میں کتب بینی ایک نایاب عادت بن جائے گی۔

پاکیزہ ✧......اسکول، کالج کا زمانہ کیسا تھا، کیا سوچتی تھیں؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......میرے اسکول، کالج کا زمانہ بہت اچھا، بہت خوب صورت وقت تھا چونکہ دنیا بے حد محدود تھی......نظر صرف اپنی ناک کی حد تک جاسکتی تھی۔ ہم مزاج دوست تھے اور ان میں، میں خود کانی رانی۔ تب مجھے بڑا شوق تھا کہ کب تیس سال کی پوری ہوں گی اور اب تیس سال کی پوری ہوئے بھی تیس سال ہونے کو ہیں تو اب تک کوئی تیر نہیں مارا۔

پاکیزہ ✧......آپ نے زندگی دو مختلف ماحول اور حالات میں گزاری اس سے آپ نے کیا سیکھا؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......دو مختلف معاشروں میں آدھی، آدھی زندگی گزارنا خود ایک سبق ہے۔ ایک نئے ملک کو اپنا وطن کیسے بنایا جائے؟ غریب الوطنی سے کیسے نبٹا جائے؟ سب سے بڑی بات حلال و حرام کا فرق اور حرام سے بچ کر حلال راہ پر کیسے چلا جائے۔ سیکھا یہ کہ ہمت کی جائے اور اللہ مددگار ہو تو ہر مسئلے سے بخیر و بخوبی نبٹا جا سکتا ہے بس اس میں وقت لگتا ہے۔ پتا پانی ہو جاتا ہے پھر بھی اپنے قدموں پر کھڑا ہونا ناممکن نہیں ہے اور خوش رہنا بھی ممکن ہے۔

پاکیزہ ✧......یا یوں سمجھ لیجیے کہ آپ کو اپنی مٹی اور غیر ملک کی مٹی میں کیا فرق محسوس ہوا؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......سب سے بڑا فرق تو حلال و حرام ہی کا ہے۔ مجھے جن پابندیوں سے اپنے ملک میں نفرت تھی مکمل آزادی ملی تو وہی خود پر لاگو کر لیں۔ اسے کہتے ہیں طرفہ تماشا۔

پاکیزہ ✧......آپ نے بحیثیت ایک مسلمان اور پھر ایک پاکستانی...... کس حد تک اپنی انفرادیت گوروں کے ملک میں برقرار رکھی ہوئی ہے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......پتا نہیں، انفرادیت کہتے کس بلا کو ہے۔ ویسے تو یہ ہے ہی مرد کا معاشرہ لیکن مجھے خود کو مرکزِ نگاہ بنائے رکھنا کبھی پسند نہیں تھا۔ مشغلے کچھ ایسے تھے کہ خود بخود سامنے لے آتے تھے ورنہ میں تو بلا ضرورت گھر سے بھی باہر نہیں نکلتی آج تک۔ میری انفرادیت اس ملک میں یہ ہے کہ میں پاکستانی، مسلمان استاد ہوں اور اس حساب سے اپنا علم اس قوم تک پہنچاتی رہتی ہوں جن کو مسلمانوں سے بے شمار خدشات لاحق رہتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......امریکا کی نوجوان نسل پاکستانیوں کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......نوجوان امریکن نسل تو کیا عموماً بڈھے پھونس بھی سرے سے پاکستان کو نہیں جانتے۔ بہت سوں کا خیال ہے پاکستان مڈل ایسٹ میں ہے اور کچھ کو گمان ہے کہ پاکستان، انڈیا میں ہے۔ جو جانتے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ پاکستان دنیا کا خطرناک ترین اور بے مہار ملک ہے۔ یوں عام رائے بے حد منفی ہے۔ ہاں کچھ پڑھے لکھے لوگ ہیں جو ان تمام حالات میں اپنے بزرگوں کا ہاتھ دیکھ سکتے ہیں۔ اپنے اسٹوڈنٹس کو میں یوٹیوب پر ایوب خان مرحوم کی امریکا اور نیو یارک میں بے حد شاندار استقبال کی ویڈیوز، ملکہ برطانیہ اور جیکولین کینیڈی کی پاکستان آمد کی ویڈیوز ضرور دکھاتی ہوں۔ انہی موضوعات پر اسباق تیار کرتی ہوں جو ایک دوسرے پاکستان کی تصویر دکھا سکتے ہیں لیکن بہرحال ایسا ہر کلاس میں نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ہر کلاس میں ایسے مواقع نکل سکتے ہیں۔ آج کے عام امریکی طلبا کو علم حاصل کرنے سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ پاکستان میں نہ جانے کیا حال ہے لیکن میں نے تو بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ یعنی ماسٹرز کی ڈگری رکھنے والوں سے بھی سنا ہے کہ انہوں نے کبھی کوئی نصابی کتاب بھی پوری تو کیا آدھی بھی نہیں پڑھی۔ فیس بک پر بہت سے لوگ نظر آئیں گے جنہوں نے مختلف جرائد کے پیج بنا رکھے ہیں لیکن جو خود کوئی رسالہ، کوئی اخبار نہیں پڑھتے تو پھر علم کی روشنی پھیلے تو کس طرح؟ پڑھانے والے کا سبق تو صرف رستے کی سمت دکھاتا ہے۔ راستے پر چلنا اور منزل تک پہنچنا تو خود مسافر کا کام ہے۔

پاکیزہ ✧......آپ کا ملنا جلنا زیادہ تر کن کمیونٹیز سے ہے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......میرا سماجی ملنا جلنا نہ ہونے کے برابر ہے۔ سرِفہرست تو اپنی اساتذہ برادری ہے اس کے علاوہ دو چار پرانے دوست

ہیں پاکستان سے۔ لانگ آئی لینڈ میں میری بہن کے احباب ہیں۔ ان سب کا تیں پینتیس سال پرانا تعلق ہے۔ پاکستانی، ہندوستانی اور بنگلا دیشی، انہوں نے اپنے بچے بھی اکٹھے پالے ہیں۔ بس انہی اچھے لوگوں کے ہاں کچھ تقریبات میں آنا جانا رہتا ہے۔

پاکیزہ ✧......اب ذرا پاکیزہ سے اپنی وابستگی کی مختصر داستان بتائیے اور یہ بھی کہ آپ کو یہ سفر کیسا لگا؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......پاکیزہ سے میرا ناتا 1988ء یا 1989ء میں جڑا۔ انجم انصار نے بہت محبت سے خط لکھا۔ لکھنے کی فرمائش کی۔ ادھر سے سرِ تسلیم خم ہوا کچھ عرصہ باقاعدگی سے لکھا۔ پاکستان میں میرے آخری موسم گرما میں انجم، اپنی بیٹی عظمیٰ اور ساجدہ حبیب کے ساتھ مجھ سے ملنے پشاور آئیں۔ وہ ایک یادگار ملاقات تھی۔ اس کے بعد ہمیشہ پیار سے ذکر کرتی ہیں، یاد رکھتی ہیں تو میں سمجھتی ہوں میرا رشتہ ابھی پاکیزہ سے برقرار ہے۔

پاکیزہ ✧......آج آپ پاکیزہ میں کیا دیکھنا چاہتی ہیں جو اب تک اس میں نہیں؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......یوں تو پاکیزہ سب موضوعات کا احاطہ کر لیتا ہے لیکن اگر اس میں صحت اور گھریلو ٹوٹکوں کے صفحے بھی شروع ہو جائیں تو کیا کہنے۔ میں خود ٹوٹکوں کی بے حد شوقین ہوں۔ (ارے واہ یہ شوق تو ہم میں بھی ہے آئندہ پاکیزہ کے مضامین ترتیب دینے میں ان باتوں کا ضرور خیال رکھا جائے گا، شکریہ رہنمائی کا)

پاکیزہ ✧......ہم پاکیزہ ڈائجسٹ کے ذریعے بہت سے بچھڑوں کا ملاپ کرواتے رہتے ہیں جبھی آپ بھی ہمارے پرانے قارئین سے دوبارہ مل رہی ہیں، اس موقع پر اپنے دلی تاثرات بتائیے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......بچھڑوں کا ملنا تو بڑی خوشی کی بات ہے بھئی۔ یہاں جو بچیاں بہنوں کی محفل میں باقاعدگی سے شریک ہوتی ہیں یا افسانے لکھتی ہیں۔ میں سبھی کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......اسی لیے تو ہمیں دنیا بھر سے خطوط، ای میلز اور فون کالز موصول ہوتی ہیں کہ پاکیزہ ڈائجسٹ ہمارا پسندیدہ رسالہ ہے۔ ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے اس رسالے سے۔ آپ کے خیال میں آج کی نوجوان نسل کو ڈائجسٹ اور رسالوں سے کس حد تک دلچسپی ہے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......ہر جگہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو پڑھتے ہیں تو ایک ہفتے میں ہر ڈائجسٹ، ہر رسالہ چاٹ کے پھر پرانے شماروں کا رخ کرتے ہیں۔ دوسری وہ قسم جو کچھ نہیں پڑھتے۔ انہیں نہ فکر نہ فاقہ، افاقہ ہی افاقہ۔ ہاں کچھ حیرت مجھے اس بات پر ضرور ہوتی ہے کہ پڑھنے والوں میں اب لڑکوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو بڑی سنجیدگی اور شوق سے نہ صرف یہ ڈائجسٹ پڑھتے ہیں بلکہ بڑے زور شور سے ان پر بحث بھی کرتے ہیں۔ کم از کم ہمارے لکھنے کے زمانے میں یہ صورتِ حال نہیں تھی بلکہ تب لڑکوں کا خواتین کے رسالے پڑھنا نہ صرف غیر مردانہ بلکہ معیوب سمجھا جاتا تھا۔ دوسری بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ ہماری ذہین فلمکاروں نے اب الیکٹرانک میڈیا پر بھی اپنی دھاک بٹھا دی ہے۔ کہاں پہلے ایک بجیا دوسری حسینہ معین ہوا کرتی تھیں اب تو ساری ہی خواتین رائٹرز کا کام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

پاکیزہ ✧......افسانے یا ناولز اپنے، اپنے دور کے عکاس بھی ہوتے ہیں۔ آپ کیا سمجھتی ہیں آج کے رائٹرز یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......یوں تو ہماری رائٹرز اپنے دور کی خوب عکاسی کر رہی ہیں لیکن بہت سے

لوگ اس کوشش میں اپنی غیر جانب داری کو بالائے طاق رکھ دیتی ہیں۔ اس بات کا خیال رکھا جائے تو معیار مزید اعلیٰ ہو جائے۔

پاکیزہ ✧...... چلیں کچھ اپنی ذاتی پسند و ناپسند کے بارے میں بھی بتا دیں۔ آپ کو کیسے لوگ پسند ہیں جن سے مل کر ایک دم خوشگواریت کا احساس ہو؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧...... بھئی مجھے ذہین اور خوش طبع لوگوں سے مل کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔ ذہین لوگ، چاہے جتنے کم عمر ہوں کچھ نہ کچھ ضرور سکھا دیتے ہیں۔ خوش مزاج لوگ خوشگوار یادیں دے جاتے ہیں۔ ذہین لوگ سوچ کے نئے انداز دے جاتے ہیں۔ (بالکل جی)

پاکیزہ ✧...... کہتے ہیں جیسا دیس ویسا بھیس آپ نے کس حد تک اس مقولے پر عمل کیا؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧...... بھیس تو میرا بچپن سے ہی پاکستان سے ہی بدیس تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ ہم نے خاصے لبرل زمانوں میں بیل باٹم اور فلیپر ز کے زمانے میں ہوش سنبھالا تھا۔ تب بھی حرام و حلال کی قیود تھیں۔ اب بھی وہی قیود ہیں۔ اسکرٹس پہنے تو صرف عرب خواتین کی طرح لانگ اسکرٹس۔ بلاؤز کی آستینیں لازم، سلیولیس اچھا تو لگتا تھا لیکن پہننے کی جرأت اکیلے میں بھی نہیں کی۔ سلیکس پہنتی ہوں لیکن اس کے ساتھ ایسے بلاؤز جو تشریف کو بھی ڈھانک لیں یعنی مشرق و مغرب دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آج کل تو یہاں بیٹھ کر بھی کانٹی نینٹل کھانوں کے ذائقے چکھے جا سکتے ہیں۔ آپ کی پسندیدہ ڈش کیا ہے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧...... یار مجھے بدیسی کھانوں میں صرف میڈی ٹیرین کھانے، (ہاہاہا آیا مزہ کانٹی نینٹل کے باوا کا نام پڑھ کر؟) پسند ہیں۔ (بہت خوب) عرفِ عام میں وہ کھانے جو بحرِ اوقیانوس ہو نہ ہو یہی اس کا ترجمہ ہے کے ساحلوں پر واقع ممالک میں بنتے ہیں۔ اس میں اٹلی، مراکش، یونان سبھی شامل ہیں ورنہ مجھے دہی، بھنڈی گوشت اور گوبھی گوشت، دال چاول پسند ہیں۔ میں صرف حلال گوشت کھاتی ہوں یا مچھلی ورنہ صرف سبزیاں۔

پاکیزہ ✧...... زندگی میں کس چیز کی کمی شدت سے محسوس ہوئی یا ہوتی ہے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧...... زندگی میں صرف اور صرف وقت کی کمی محسوس ہوتی ہے اور اب جب عدم کا راستہ بھی سامنے دکھائی دے رہا ہے۔ یہی سوچتی ہوں کہ بہت سے کام رہ گئے۔ جو میں اب بوجوہ نہیں کر پاؤں گی مثلاً جو کوہ پیمائی کے منصوبے تھے، جو اسکیٹنگ کے ارادے تھے جو پورا پاکستان اور پوری دنیا دیکھنے کا خواب تھا اور ہر شہر کے ہر گلی محلے میں گھومنے کا شوق تھا۔ سائیکل چلانے کا شوق تھا جو میں نے نہ سیکھی وغیرہ، وغیرہ اب ان میں سے کچھ شوق تو شاید پورے ہو جائیں یعنی سیاحت کے لیکن اس کے لیے بھی اب وقت کی اور طاقت کی کمی ہے۔ میری جسمانی طاقت یعنی اسٹیمنا ہمیشہ سے کم رہا ہے حالانکہ کھیلتی ہاکی تھی اور پھر میں نے توانائی بڑھانے کی کوئی خاص کوشش بھی نہیں کی اور اب تو میں مصدقہ کاؤچ پوٹیٹو بن چکی ہوں تو اب کوئی خاص امید بھی نہیں کہ سلاجیت کھا کر ڈنڈ پیل کر طاقت ور ہوا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ مجھے سر توڑ یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ چونکہ میں نے شادی نہیں کی حالانکہ کہنا یہ چاہیے کہ شادی نہیں ہوئی تو اس سے بڑی محرومی کوئی ہے ہی نہیں۔ میرے نزدیک اس سے بڑی خرافات اور کوئی نہیں۔ شادی بہت اچھی چیز ہے اللہ، رسول کا حکم بھی ہے۔ معاشرے اور خاندان کے لیے بھی ایک لازمی ادارہ ہے لیکن اگر واقعی کچھ لوگوں کے

ضمن میں اللہ کا حکم نہیں ہے تو لوگوں کو باز آ جانا چاہیے۔ غیر شادی شدہ لوگوں کی جان ضیق کرنے سے...... میری اس عمر میں، میں یہ بات کھل کر کہہ سکتی ہوں کہ اگر آپ تھوڑے سے بھی پڑھے لکھے ہیں اپنا ذاتی ذریعۂ آمدنی رکھتے ہیں جو سلائی کڑھائی بھی ہو سکتا ہے اور اچھے تعمیری مشغلے رکھتے ہیں تو زندگی میں کبھی کسی قسم کی محرومی محسوس نہیں ہوگی۔ وقت بھی اچھا بلکہ بہت اچھا گزرے گا اور آپ اپنے لیے، اپنے خاندان کے لیے اور دوسروں کے لیے بہت کچھ کر سکیں گی۔ میری دعا ہے کہ پاکیزہ پڑھنے والی ساری بہنوں کو یعنی میری ہم عمر ''لڑکیوں'' کو بھی اور بچیوں کو بہت اچھے اور قابل ساتھی ملیں اور ساری دنیا کے سہرے کے پھول کھل جائیں لیکن اگر وہ پودا ہی نہیں اگا جس پر آپ کے سہرے کے پھول کھلنے تھے تو آپ اپنی زندگی کو کشتِ ویراں ہرگز نہ سمجھیں بلکہ کوئی دوسری دنیا تعمیر کرنے کی منصوبہ بندی کریں۔ (بہت خوب) مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں لیکن میں اسے بھی محرومی نہیں سمجھتی۔ اللہ نے مجھے درس و تدریس کا راستہ دکھا کر مجھ پر بہت رحم کیا کہ مجھے ہزاروں بچے عطا کر دیے اور کچھ بچے تو ایسے ہیں جو مجھ سے چار ایک سال ہی چھوٹے ہیں۔ اپنے بیشتر طلبا سے میرا رابطہ فیس بک کے ذریعے برقرار رہتا ہے اور اکثر ملاقات بھی رہتی ہے چاہے وہ نیویارک میں ہوں، پشاور میں یا اسلام آباد میں...... یعنی زندگی بالعموم اپنی شرائط پر، اپنی خواہش کے مطابق ہی گزاری ہے اور کسی ناخوشگوار شے، واقعہ یا انسان کو خود پر سوار نہیں ہونے دیا اور میرا خیال ہے تھوڑی بہت محنت سے اور کوشش سے سبھی ایسی زندگی گزار سکتے ہیں اور بہت خوش رہ سکتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... کچھ اپنی فیملی کے بارے میں

میں اور میرا پیارا شہر

میرا پیارا شہر شکار پور سندھ کے بڑے شہروں میں سے ایک بہت ہی پیارا اور خوب صورت شہر ہے۔ جہاں میں پیدا ہوئی بڑکپن گزرا...... اور جہاں میں علم کی منزلیں طے کر رہی ہوں۔ اس شہر کی بنیاد داؤد پوتا خاندان کے حاکم امیر بہادر خان نے 1418ء میں رکھی اور اس کا نام شکار پور رکھا۔ سکھر کا آزائیں ائر پورٹ شکار پور سے صرف 18 کلو میٹر دور ہے۔ یہاں سے کنڈ کوٹ، کشمور، لاڑکانہ، دادو، سیوہٹ اور ڈیرا غازی خان کے لیے بھی شاہراہ نکلتی ہے۔

یہاں ایک گرلز کالج ہے جہاں ماسٹرز تک تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک ہائر سیکنڈری گرلز کالج ہے اس کے علاوہ یہاں شاہ لطیف، خیر پور یونیورسٹی کا کیمپس بھی شروع ہوا۔ شکار پور کا اچار اور مٹھائی بہت مشہور ہیں جو سوکڑی کے طور پروئے جاتے ہیں۔ شکار پور دیوان ٹھاکر واس کی قلفی پورے سندھ میں مشہور ہے اور آپ جانتے ہیں کہ میں قلفی کھائے بغیر تو رہ ہی نہیں سکتی۔ چاہے گرمیاں ہوں یا سردیاں، قلفی مجھے ہر روز لازمی کھانی ہے۔ مشہور شاعر شیخ ایاز اور ساری شکار پور میں ہی پیدا ہوئے اور بڑے ہوئے...... ماضی میں شکار پور کو سندھ کا پیرس کہا جاتا تھا۔ یہاں بہت ساری قدیم اور جدید عمارتیں ہیں...... میمن بلڈنگ سے تو پورے شکار پور کو دیکھا جاتا ہے۔ یہاں ہر سال بڈل فقیر کا میلا لگتا ہے جسے یہاں کے رہنے والے بہت پسند کرتے ہیں۔

ڈھک بازار یہاں کا مشہور بازار ہے جس کی چھت ساگوان کاٹھی کی بنی ہوئی ہے۔ گرمیوں میں یہ بازار ٹھنڈا رہتا ہے۔ میرا یہ شہر ایک... کاروباری، علمی، ادبی، سیاسی لحاظ سے ایک بہت بڑا اور اہمیت رکھنے والا شہر ہے اور اس لحاظ سے یہاں کے رہنے والے بھی...... اور میں بھی......

تحریر...... نور افشاں شیخ، شکار پور

بتائیے۔ کتنے افراد ہیں، کیا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......میری فیملی ماشاءاللہ سے پہلے بھی بڑی تھی سب اکٹھے رہتے تھے۔ نانا، دادا دونوں بھائی، آپس میں شادیاں وغیرہ......اب مزید پھیل رہی ہے کس، کس کا ذکر کروں۔ میرے والدین نے عدم کی راہ لی۔ ماموؤں، خالاؤں اور پھوپی کو اللہ سلامت رکھے۔ چار بہن، بھائی امریکا میں ہیں لیکن سب دور دور۔ ہاں ہر عید تہوار، گرمی، سردی کی چھٹیاں ہم اکٹھے ہی گزارتے ہیں اور خصوصاً چھوٹے بچوں کے ساتھ بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......شاعری سے کس حد تک دلچسپی ہے کبھی شعر گوئی کی طرف دھیان گیا؟ پسندیدہ شاعر اور شعر؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......لو نزہت، تمہیں پتا ہی نہیں۔ میں نے بہت شاعری کی۔ بہت چھپیں بھی لیکن اب تو لکھی ہوئی شاعری بھی کہیں بھیجنے کا دھیان نہیں آتا۔ (اس لاعلمی کو میری نالائقی ہی سمجھیں آپی) پسندیدہ شعرا کی فہرست بڑی طویل ہوگی۔ یہ سمجھ لو جس کا خیال اعلیٰ اور بیان اچھوتا ہوتا ہے اسے بار بار پڑھنے میں ہر بار نیا لطف آتا ہے۔ غالب، اقبال، حافظ، فیض، شیکسپیئر بلاشبہ بہت اعلیٰ۔

پاکیزہ ✧......آپ نے ابتدائی عمر میں کبھی سوچا تھا کہ امریکا میں گوروں کو انگریزی پڑھائیں گی؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......امریکا میں گوروں کو انگریزی پڑھانا تو دور کی بات ہے، میں نے تو ویزا، پاسپورٹ ہاتھ میں آنے تک ٹکٹ کٹوانے تک امریکا آنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے یہ فیصلہ ہوا اور پھر اور کیا آتا تھا جو گوروں کو انگریزی نہ پڑھاتی بس رب کی منشا پوری ہو کے رہتی ہے۔ اس نے میرا رزق روزگار یہیں لکھا ہوا تھا۔

پاکیزہ ✧......پاکستان کا چکر کب لگتا ہے؟ امریکا سے کیا سوغات لانا پسند کرتی ہیں؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧...... بدقسمتی سے میرا پاکستان آنا بہت ہی کم ہوا ان پچھلے سولہ سالوں میں پردیس کو دیس بنانے میں وقت اُڑتے، اڑتے کہاں سے کہاں تک نکل گیا۔ پہلی مرتبہ نو سال بعد آنا ہوا پھر چھ سال بعد اب امید ہے کہ زیادہ باقاعدگی آجائے (انشاءاللہ) امریکا سے تو سب کچھ اٹھا لانے کو جی چاہتا لیکن صرف دو سوٹ کیس (46 کلو) لانے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس لیے میں صرف وہی لاتی ہوں جو ابھی تک پاکستان میں نہیں ملتا یا اچھی کوالٹی کا نہیں ملتا۔ زیادہ تر جوتے، ہینڈ بیگ، سوئٹر اور یہاں یعنی پاکستان سے میں زیادہ تر کھانے پینے کی چیزیں خصوصاً چارسدہ کا گڑ، میوہ جات اور مرچ مسالے لے جانا پسند کرتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......دیگر ممالک کے سفر کرنے کے بعد اپنے ملک کے بارے میں کیا، کیا خیالات آتے ہیں؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧...... بیرونِ وطن رہتے ہوئے رہ، رہ کر صرف یہی ملال ہوتا ہے کہ کاش پاکستان کے عاقبت نااندیش حکمرانوں نے ستر کی دہائی میں وہ غلط فیصلے نہ کیے ہوتے جنہوں نے صرف پاکستان اور افغانستان کو ہی نہیں ساری دنیائے اسلام کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کردیا ہے۔ مشرق سے کوئی اچھی خبر نہیں آتی۔ ہمارے نوجوانوں کی ذہانت، لیاقت، صلاحیتیں اور مستقبل سب اندھے کنویں میں جھونک دیے گئے اور اس کنویں سے نکلنے میں ایک دو نسلیں تو ضرور رزقِ خاک ہوجائیں گی۔ تباہی صرف ایک بادِ صرصر چلنے کا نام ہے جو ایک دن میں سب کچھ غارت کرسکتی ہے۔ تعمیر و ترقی کے لیے کئی دہائیوں یا صدیوں کا زمانہ لگ جاتا ہے۔ اللہ پاکستان کو قائدین نیک بخت نصیب کرے جو اس ملک کی تقدیر بدل ڈالیں اور جو ساری دنیائے اسلام کے لیے پھر سے امن، سکون اور ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوں، آمین۔

پاکیزہ ✧......دیارِ غیر میں بیٹھ کر اپنوں کو کس حد تک اور کیسے یاد رکھتی ہیں؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......اپنوں کو یاد کرنے کی اب نوبت ہی نہیں آتی نزہت۔ ماشاءاللہ سب ہی فیس بک پر براجمان ہیں۔ روز کے روز اطلاع مل جاتی ہے۔ آج کس نے کیا پکایا، کیا پہنا، کس نے کس کو کیا کہا۔ کون کہاں گیا وغیرہ وغیرہ۔ اب تو تیس چالیس سال کے بچھڑے دوست بھی آن ملے ہیں۔ پہلے تو پورے محلے میں فقط ایک ٹیلی فون ہوتا تھا۔ کہاں اب بچے، بچے کے ہاتھ میں فون ہے تو اپنے ہر وقت آس پاس ہی رہتے ہیں بلکہ حواسوں پر سوار رہتے ہیں۔ (واہ)

پاکیزہ ✧......اچھا یہ بتائیں کہ اپنے افسانوں اور ناولوں کو کتابی صورت میں لانے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......ناول تو کوئی لکھا نہیں، افسانوں کو کتابی شکل میں لانے کا خیال تو ہے لیکن اس کے لیے جو وقت اور یکسوئی درکار ہے، وہ فی الحال مجھے میسر نہیں جونہی وقت ملے گا ایسا کر ڈالوں گی۔ (ضرور، ہم منتظر ہیں)

پاکیزہ ✧......نیویارک میں بیٹھ کر ٹی وی یا ریڈیو کیوں نہیں جوائن کیا؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......ٹی وی اور ریڈیو پر امریکا میں مخصوص لوگوں کی اجارہ داری ہے۔ میں نے ایک دو ٹاک شوز تو کیے لیکن پھر اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات میں سے وقت نکالنا ممکن ہی نہیں ہوا۔ ادبی محفلوں میں میرا کبھی کہیں جانے کا موقع نہیں بنا۔ ادبی محافل والے نہ مجھے جانتے ہیں نہ میں ان کو جانتی ہوں لیکن ہاں اپنے کالج یونیورسٹی میں مجھے کئی نوبل انعام یافتہ، پلیٹزز اور پرائز یافتہ دانشوروں کو سننے اور ملنے کا موقع ملا۔ صرف ایک پسندیدہ دانشور مجھ سے قضا ہوگئے اور وہ ایڈورڈ سعید مرحوم تھے جو اَب جا بھی چکے اور اس کا افسوس مجھے باقی ساری عمر رہے گا۔ ایک منحوس ترین صورت جس کے لیے لوگوں نے دروازے توڑ ڈالے۔ سلمان رشدی تھا اس دن میں نے اس بد ذات کو سننے کے بجائے اپنے دفتر میں بیٹھے رہنے کو ترجیح دی اللہ کی شان کہ ربِ پاک اسی منحوس کو اس ایسکیلیٹرز پر میرے بالمقابل لے آیا۔ میں نے بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قول کے مطابق اللہ کو اپنے ارادے کی شکست سے پہچانا۔

پاکیزہ ✧......وہاں کی ادبی محافل میں شریک ہوتی ہیں؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......صرف اپنے کالج، یونیورسٹی کی ادبی محفلوں میں شریک ہو پاتی ہوں۔ ویسی ادبی محفلوں والے مجھے نہیں جانتے نہ میں ان کو جانتی ہوں۔ ہاں ڈاکٹر سید امجد حسین کہ بسیار نویس پاکستانی ادیب ہیں۔ ان صاحب سے دعا سلام رہتی ہے، تعلق بھی ان کا پشاور کے حلقۂ احباب سے اور پھر میرے والد کے کلاس فیلو بھی رہے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... پاکیزہ کتنی باقاعدگی سے پڑھتی ہیں کیا آپ وقت گزاری کے لیے پڑھتی ہیں یا باخبر رہنے کے لیے؟

غزالہ نگار اورکزئی ✧......باقاعدگی سے تو نہیں پڑھ پاتی لیکن ہر ماہ کے جمع ضرور کر رکھے ہیں جب، جب وقت ملتا ہے ترتیب وار پڑھتی جاتی ہوں۔ وقت گزاری وہ کریں جن کے پاس وقت فراوان ہو یہاں الحمدللہ بقول میرے فوجی ساتھیوں کے، جنگ لگی رہتی ہے، وقت ہوتا ہی کہاں ہے اسی

لیے سفر کرتے، کھانا کھاتے جہاں کوئی دس بیس منٹ ہاتھ لگے میں کوئی نہ کوئی پسندیدہ رسالہ اٹھالیتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ میرا جواب نامہ اختتام پزیر ہو بطورِ خاص ان سب بچیوں کا بہت شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے پچھلے دس بیس سالوں میں لکھنا شروع کیا اور کمال کا لکھا۔ فرداً فرداً تو شاید سب کے نام نہ لکھ پاؤں لیکن فائزہ افتخار چندا اور صائمہ اکرم چوہدری نے پاکیزہ میں بہنوں کی محفل سے اٹھ کر افسانہ نگاری شروع کی اور کہاں سے کہاں نکل گئیں۔ خصوصاً فائزہ افتخار کی حقیقت سے قریب اندرونِ شہر کی کہانیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ اس کا مزاح بھی لاجواب اور برجستہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کنیز نبوی، ثمینہ عظمت علی، عالیہ بخاری اور سب سے زیادہ سمیرا احمد اور سائرہ رضا نے چونکایا ہے۔ انہوں نے کوئی کہانی ہلکی نہیں لکھی۔ ایک، ایک جملہ پڑھنے کے لائق ہے، ماشاء اللہ۔ اللہ ان سب کو زندگی، صحت اور ذہن رسا عطا فرمائے اور ان کی بدولت ہمارا بڑھاپا اچھا بنائے، آمین۔

پاکیزہ ◇...... ایک عرصے بعد آپ سے تفصیلی گفتگو ہوئی کیسا لگا؟

غزالہ نگار اورکزئی ◇...... اس تفصیلی گفتگو کا مزہ تو بہت آیا نزہت لیکن مجھے یہ سوال نامہ جواب نامہ بنانے میں چھ ماہ اور تین پین لگے۔ کیونکہ ہر ایک میں سیاہی کم نکلتی تھی۔ یہ ہوتا ہے قلم نہ اٹھانے کا نتیجہ۔ سیاہی ہی سوکھ جاتی ہے۔

پاکیزہ ◇...... ہمارے بلکہ آپ اپنے پاکیزہ کے لیے کیا پیغام دینا چاہیں گی؟

غزالہ نگار اورکزئی ◇...... پاکیزہ بہنوں اور بچیوں کے لیے صرف یہ تلقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کے نامۂ اعمال میں چھوٹی بڑی نیکیاں لکھی ہیں۔ ان نیکیوں کو دریافت کریں اور کچھ نہ کچھ کر کے اس دنیا سے چلیں۔ سوچتی تو میں بھی ہوں کہ میں نے اس دنیا میں کیا، کیا؟ لیکن یہ خیال بھی ہے کہ میرے طلبا ہی اس دنیا میں صدقۂ جاریہ ہوں گے، ان شاء اللہ...... جیسے میں خود اپنی پیاری اساتذہ کے لیے ہر وقت دعا گو رہتی ہوں۔

☆☆☆

جی قارئین! کیسا لگا آپ کو ہماری دیرینہ ساتھی اور دلنواز تحریروں کی ملکہ غزالہ آپی سے مل کر...... ہمیں تو بہت مزہ آیا۔ پیارے پڑھنے والوں! ہماری تو یہی کوشش ہوتی ہے کہ یہ انٹرویو روایتی یا خانہ پُری والے نہ ہوں بلکہ ہماری لکھاری بہنیں نئی آنے والیوں کے لیے رہنمائی کے در بھی ضرور وا کریں۔ باتیں کرنے کو تو بہت تھیں مگر غزالہ آپی کے پاس بھی فرصت نہیں اور یہاں صفحات کا بھی مخصوص کوٹا ہے ورنہ آپ دو افسانوں سے تو ضرور محروم ہو جاتیں...... خیر کبھی کبھی ایسا بھی ہونا چاہیے تاکہ گفتگو میں تشنگی نہ رہ جائے۔ غزالہ آپی سے خصوصی درخواست ہے کہ اس مرتبہ پاکستان آتے ہوئے کراچی میں کم از کم دو تین دن قیام ضرور کریں تاکہ ہم آپ کے ساتھ ایک نشست رکھ سکیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ...... ایک مرتبہ پھر ہم غزالہ نگار اورکزئی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ہمارے لیے اتنا وقت نکالا اور مزیدار، دلچسپ اور بامقصد گفتگو سے ہمیں اور قارئین کو محظوظ کیا۔ ان کے لیے ڈھیروں دعائیں...... اور نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت...... چھوٹی سی بات یاد رکھیں اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی ضرور کریں کہ خوش رہنا اور خوش رکھنا سیکھیں۔ اس بات چیت پر آپ کی رائے کا انتظار رہے گا...... اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

★ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

★ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

★ پیاری بہنو! توبہ استغفار کا مہینہ شروع ہونے کو ہے۔ فرشتے استجابتِ دعا کے لیے تیار کھڑے ہیں...... اہلِ خیر صدقہ و خیرات کے لیے تیار ہیں۔ ایک بار پھر ہمیں گناہوں سے توبہ کا موقع مل رہا ہے۔ اس مبارک مہینے کے شروع ہونے سے پہلے...... آپ اپنے ان تمام رشتے داروں سے معافی مانگنے میں پہل کر لیں...... جو کسی بھی وجہ سے آپ سے ناراض ہیں اور آپ سے رابطہ منقطع کیا ہوا ہے۔ یاد رکھیں...... رشتے داری ختم کرنا گناہ کے زمرے میں آتا ہے...... اور آپ کی یہ معافی، آپ کے ثواب کو بڑھا دے گی۔ اس مبارک مہینے میں جاگ کر عبادت کرنے کا بڑا ثواب ہے۔ سحری کھانے کا بڑا درجہ ہے۔ عموماً لوگ غفلت برتتے ہیں اور رات کو سحری کھا کر سو جاتے ہیں تاکہ ان کی نیند نہ خراب ہو...... پلیز...... آپ ایسا ہرگز نہ کریں...... کیونکہ لقمۂ سحر کو دنیا کی نعمتوں سے افضل کہا گیا ہے۔ ہر روز افطار کے وقت اللہ ہزاروں گناہ گاروں کی توبہ قبول فرماتا ہے مگر ہم عموماً اس وقت کھانے پر اس طرح گرتے ہیں کہ دعا مانگنے کی تو کہاں فرصت، افطار کی دعا پڑھنا بھی یاد نہیں رہتی۔

عزیز بہنو! اس متبرک مہینے کی ہر ساعت سے فائدہ اٹھائیں...... اور اپنی ذات اور اپنے مال سے لوگوں کو فائدہ پہنچائیں...... اور اپنی دعاؤں میں ہم سب کو یاد رکھیں۔

★ اور اب آئیں اپنی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے صرف ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

آیتِ کریمہ یہ ہے۔

لا الہ الا انت سبحانك انی كنت من الظالمین

ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصورواروں میں سے ہوں (نوٹ) یہ حضرت یونس کی مشہور دعا ہے کہ جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ سے کی تھی۔ یہ آیتِ کریمہ کہلاتی ہے۔ اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں اور اب آپ اپنی مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالیں کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

★ ہماری مایہ ناز مصنفہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی نئی کتاب اللہ اور اس کا نور شائع ہو گئی ہے۔ جس کا انتساب ان کی والدہ ماجدہ کے نام ہے۔ اس کتاب میں تحقیقی اور معلوماتی مضامین ہیں جنہیں پڑھ کر آپ کو طمانیت کے ساتھ، ساتھ آگاہی بھی ہوگی۔ اس خوب صورت کتاب کی قیمت صرف 150 روپے ہے اور منگوانے کا ایڈریس ہے۔ القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار...... فون نمبر 042-37652546۔

★ ہماری مایہ ناز مصنفات، شاعرہ رفاقت جاوید، اسلام آباد اور عنبرین حسیب عنبر کو پروین شاکر خوشبو ایوارڈ ملا ہے۔ (مبارکاں)

★ پاکیزہ کی مایہ ناز مصنفہ قیصرہ حیات، سیالکوٹ گزشتہ ماہ شادی کے بندھن میں بندھ گئی ہیں اور ان کے شوہر ماشاء اللہ انجینئر ہیں۔ (مبارکاں)

* سینئر رائٹر صبیحہ شاہ نے اپنی رہائش گاہ پر مصنفات کے اعزاز میں ایک پُرتکلف عشائیہ دیا، جس میں دلشاد نسیم، سعادت نسرین، شگفتہ شفیق، سائرہ غلام نبی، سیما رضا، غزالہ رشید، سیما مناف، شائستہ عزیز، فرزانہ آغا اور گلوکارہ مسرت بانو نے شرکت کی بلکہ فیض کی غزلیں سنا کر ایک سماں سا باندھ دیا اور پھر دو دن بعد سینئر مصنفہ سعادت نسرین نے اپنے ہاں ڈنر کا اہتمام کیا...... جس میں...... میں شرکت نہیں کر سکی...... صبیحہ شاہ کے ہاں سعادت نسرین اور دلشاد نسیم سے برسوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ سیما مناف دبلی لگیں اور شائستہ عزیز نے ویٹ بڑھا لیا ہے اور سائرہ غلام علی تو بے حد کیوٹ لگیں اور غزالہ رشید کو تو پہلی مرتبہ ایسے قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا۔ ارے غزالہ تم ہنستی بھی ہو......؟ ہنسا کرو بھئی بہت اچھی لگتی ہو۔
* انشاء اللہ میں اپنے شوہر کے ساتھ 16 جون کو عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب جا رہی ہوں۔ 2 جولائی کو میری واپسی ہوگی...... اور آپ سب میری دعاؤں میں شامل ہوں گی۔ آپ بھی مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ تعالیٰ ہماری خطاؤں کو معاف فرمائے اور دعاؤں کو قبول فرمائے، آمین۔
* پاکیزہ کی مصنفہ اور شاعرہ افتخار شوق، میاں چنوں عمرے کی سعادت حاصل کر کے آگئی ہیں۔ (مبارک باد)
* کراچی کے ٹینشن زدہ حالات کے باعث ہم نے اپنے اعزاز میں ہونے والی تقریب ملتوی کروائی جو 6 جون کو آرٹس کونسل میں ہونے والی تھی...... سب رائٹرز کو فون کر کے، میسج کر کے اور فیس بک کے ذریعے اطلاع دی گئی مگر اس کے باوجود بھی...... بہت ساری بہنیں...... مقررہ دن آرٹس کونسل پہنچ گئیں اور شاعرہ افتخار شوق، میاں چنوں سے کراچی آگئیں۔ (بے حد معذرت)
* پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، اداکارہ کی بھتیجی رشیا سرور کے ہاں بیٹی ہوئی ہے۔ جس کا نام عنائیہ رکھا گیا ہے۔
* پاکیزہ کی مستقل قاری فرزانہ شعیب، سوات اس سال بھی عمرے کی سعادت حاصل کر کے آگئی ہیں (ماشاء اللہ)
* پاکیزہ کی شاعرہ نگینہ ضیا بنگش، کراچی موسم گرما کی تعطیلات میں کراچی سے پشاور گئی ہوئی ہیں۔ (ماشاء اللہ)
* ماہ جولائی کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس ماہ آسمانِ ادب کے ان ستاروں نے دنیا میں قدم رکھا۔ آپ سب کو اپنی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔

اقبال بانو، وہاڑی۔ رعنا فاروقی، کراچی۔ فاطمہ زہرا جبیں، سعودی عرب۔ دلشاد نسیم، لاہور۔ مریم، دبئی۔ عطیہ زاہرہ، لاہور۔

* پاکیزہ کی شاعرہ، مستقل تبصرہ نگار سعدیہ ہما شیخ کے حوالے سے کئی نیوز ہیں۔ پہلی یہ کہ انہیں اسلام آباد میں ریشم کی جانب سے ایوارڈ ملا۔ دوسری یہ ہے کہ ان کا رضاعی بیٹا اور دونوں بیٹیاں اپنی، اپنی جماعتوں میں فرسٹ آئے اور تیسری یہ کہ ان کا دوسرا شعری مجموعہ "بالِ ہما" عنقریب شائع ہو رہا ہے۔ (مبارک باد)
* مصنفہ طلعت جبیں نیاز، کراچی کا بیٹا پڑھنے کے سلسلے میں آسٹریلیا جا رہا ہے۔ (مبارک باد)
* مسز احمد، کراچی کا ڈاکٹر بیٹا عمر 33 سال ہے، اسمارٹ ہے اس کے لیے امریکن نیشنلٹی کی حامل خوب صورت لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔ لڑکا دو سال سے امریکا میں ہے۔ لڑکی کے والدین مسز احمد سے کراچی میں رابطہ کر سکتے ہیں۔ فون نمبر یہ ہے۔ 03463273670

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

* مستقل تبصرہ نگار ڈاکٹر شہلا عامر، کراچی ان دنوں بیمار ہیں۔
* مستقل تبصرہ نگار شگفتہ ناصر، فیصل آباد ان دنوں بسترِ علالت پر ہیں۔
* مستقل تبصرہ نگار ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی ہنوز بیمار ہیں۔
* پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ امینہ عندلیب، سلانوالی کی طبیعت خراب ہے۔
* مقبول صحافی اور شاعرہ شائستہ زریں، کراچی سرجری کے بعد ہنوز بسترِ علالت پر ہیں۔
* پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور مصنفہ ریحانہ حسن ان دنوں گھٹنوں کے درد کے شدید عارضے میں مبتلا ہیں۔

* پاکیزہ کی تبصرہ نگار شیریں، لاہور کی طبیعت ناساز ہے۔
* پاکیزہ کی مستقل قاری معتلے ناہید اسلم، سیالکوٹ ان دنوں بیمار ہیں۔
* ہماری مستقل تبصرہ نگار ڈاکٹر ممتاز ضیا کی طبیعت قدرے بہتر ہے مگر وہ ابھی مکمل صحت یاب نہیں ہوئی ہیں۔
* پاکیزہ کی شاعرہ اور تبصرہ نگار فصیحہ آصف خان، ملتان ان دنوں بیمار ہیں۔
* پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا بی بی، راولپنڈی علیل ہیں۔
* پاکیزہ کی مستقل قاری شاہانہ، کراچی کی اپنے کزن ساجد خان کے ساتھ منگنی ہوگئی ہے۔ (مبارک باد)
* پاکیزہ کی نئی تبصرہ نگار شنا اجالا، بھلوال اپنے اسکول کے ٹرپ کے ساتھ لاہور گئیں۔ ان کے ساتھ ان کی ساتھی ٹیچرز کے علاوہ ان کی اسٹوڈنٹس بھی تھیں۔ (ماشاء اللہ)
* مصنفہ غزالہ جلیل راؤ، اوکاڑہ کا ناول بند دروازوں پر دستک ہمارے پاس تبصرے کے لیے آیا ہے۔ جس کو پڑھ کر میں برملا کہہ سکتی ہوں کہ غزالہ جلیل راؤ افسانے کے مقابلے میں ناول بہت زیادہ اچھے لکھ سکتی ہیں بلکہ یہ تو ہیں ہی ناول نگار...... کتنی خوب صورت منظر نگاری کی ہے کہ بے اختیار منہ سے واہ نکلتا ہے۔ اس خوب صورت ناول کو خزینہ علم و ادب نے شائع کیا ہے...... جس کی قیمت صرف 250 روپے ہے جو لاہور کے اردو بازار میں ہر جگہ دستیاب ہے یا آپ اس فون نمبر پر بھی رابطہ کر سکتی ہیں۔ (042-37314169) ہے۔
* ہماری کتاب انمول خزانے کی دعائیں اور آزمودہ ٹوٹکے اور علاج کا دوسرا ایڈیشن اضافی دعاؤں کے ساتھ رمضان المبارک میں آجائے گا۔ کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں۔ القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار، لاہور۔ فون نمبر۔ 042-37668958 -042-37652546



اقبال بانو، وہاڑی سے۔ "مئی کے پاکیزہ میں میرا انٹرویو پڑھ کر میری نئی پرانی تمام سہیلیوں نے اسے سچا اور کھرا انٹرویو قرار دیا...... بلکہ ابھی تک میرے پاس فون آ رہے ہیں۔ محترمہ عذرا رسول نے اپنے گلے کی خرابی کے باوجود مجھے فون کر کے مبارک باد دی اور پیار سے باقاعدگی سے لکھنے کو کہا۔ میں اپنی تمام مصنفات اور قارئین بہنوں کی شکر گزار ہوں جنہوں نے میرا انٹرویو پسند کیا اور بہن رفعت سراج کا خط پڑھ کر میں ایک لمحے کے لیے حیران رہ گئی...... انہوں نے 35 سالوں کا نقشہ کس آسانی سے کھینچ دیا...... رفعت آپ کی دوستی، آپ کی چاہت، آپ کی محبت پر مجھے ناز ہے اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے...... واقعی دوستی میں وقت کا پہیا کبھی حائل نہیں ہو سکتا...... پاکیزہ کے ناولوں میں مجھے نایاب جیلانی، عنیزہ سید اور رفعت سراج کی تحریریں خصوصی طور پر پسند آ رہی ہیں۔ بہنوں کی محفل تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ جلترنگ پڑھ کر انجوائے کرتی ہوں۔ عظمٰی کی شاعری بھی اچھی لگتی ہے اور اس کی پاکیزہ ڈائری بھی......" (پیاری بانو! پُرمحبت خط لکھنے کا شکریہ اور ہاں جب باقاعدگی سے لکھنے کا وعدہ کیا ہے تو پھر لکھنے میں کاہلی کیسی؟)

سمیرا امجاد، ٹنڈو آدم سے۔ "اقبال بانو کا انٹرویو بہت پسند آیا...... ان کے جوابات میں بناوٹ نہیں تھی اور اسی طرح ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا انٹرویو پسند آیا تھا۔ آپ ان کی یادوں کی مالا دوبارہ شروع کریں...... بہنوں کی محفل میں بار بار پڑھتی ہوں اور مجھے اس کو پڑھ کر اتنا ہی مزہ آتا ہے جیسے کسی ناول کو پڑھنے میں آتا ہے۔ آپ کا جلترنگ بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ میرا سب سے پسندیدہ ناول امانت ہے۔ پلیز...... اب آپ عظمٰی آفاق کی تحریر ہمیں ضرور پڑھوائیں۔ عرصہ ہو گیا ان کی تحریر پڑھے ہوئے۔" (جی بہت بہتر، آپ انشاء اللہ آئندہ ماہ عظمٰی آفاق کی تحریر ضرور پڑھیں گی)

ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ "اداریے میں اچھا پیغام ملا ہے، بڑھاپے کی تنہائی بڑی بری ہوتی ہے، بچوں کے پاس ٹائم ہی نہیں ہوتا۔ دین کی باتوں میں اختر شجاعت کی آمد بہت اچھی لگی۔ پاکیزہ سے ہم ہر وقت کچھ نہ کچھ سیکھتے رہتے ہیں۔ اب دل و دماغ اور روشن ہوگا۔ رفعت سراج نے اپنے خط میں اپنے ناول کے بارے میں خوب وضاحت کی ہے مگر اب ناول پر مکمل تبصرہ ناول ختم

ہونے کے بعد ہوگا۔ افسانے اس مرتبہ زیادہ اچھے لگے...... سعدیہ رئیس، بشریٰ گوندل کی تحریریں خصوصی طور پر پسند آئیں مگر سمیرا حمید بازی لے گئیں۔ ناولوں اور کہانیوں کے نام ملتے جلتے ہی لگے۔ عنیزہ سید کے ناول میں کیچڑ میں کنول کی تکرار تھی اور نگہت سیما کے ناولٹ کا وہی نام تھا مگر نگہت نے چونکا دینے والے انجام سے قاری کو آگاہ کیا۔ شام شہر یاراں آگے تو بڑھی ہے مگر رفتار اب بھی کم ہے۔ ترکِ وفا میں آفاق کی آمد نے دلچسپی بڑھادی ہے۔ تابندہ جبیں کا دیپ دل کے جلے کا نام تو پرانا تھا مگر کہانی اچھی تھی۔ اس دفعہ تمام کارنرز بھی بہت اچھے تھے۔ نگہت عبداللہ کی آمد کافی عرصے کے بعد ہوئی مگر ان کا ناولٹ اچھا لگا۔ ان کا آنا اچھا لگا...... بہنوں کی محفل کی آؤٹ لائن اچھی لگی...... اسلام آباد اور مری کی سیر، ماں سے ملاقات اور دعائیں...... یہ سب پڑھ کر بہت اچھا لگا...... ہاں ایک شکایت اپنی بہنوں سے ہے کہ جن کے نام سالگرہ نمبر میں شائع نہیں ہوئے وہ...... شکوہ کیوں کررہی ہیں۔ آخر ہم لوگوں کا نام جب پرچے میں کسی نہ کسی حوالے سے شائع ہوتا ہے تو ہم خود بخود پاکیزہ فیملی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ تم تو ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ چکی ہو مگر پھر بھی بہنوں کا شکوہ ختم ہونے میں نہیں آرہا۔ ذکیہ بلگرامی نے قرآن پاک کی کتابت کے لیے ابتدائی ہدایات دے دی ہیں جو بہنیں لکھنا چاہیں وہ ضرور استفادہ کریں مگر قرآن پاک کی حرمت کو سمجھتے ہوئے...... جلترنگ میں فرزانہ منزل بہت اچھا لگا آخر میں پتنگ اور ڈور کی مثال بہت اچھی تھی۔ عظمیٰ کی ڈائری روز بروز خوب ترقی کررہی ہے، اس کا کام نظر آرہا ہے۔ ڈائری میں جنریشن گیپ اور ادب کے قرینے بہت اچھے لگے۔" (تفصیلی تبصرے کا شکریہ)

مسز رضا، لاہور سے۔ "ماشاء اللہ پاکیزہ کا ہر شمارہ اتنا اچھا جارہا ہے کہ مجھے خط لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی اور اس وقت آپ سے صرف اس لیے رابطہ کیا ہے کہ ہم آپ کا کوئی سلسلے وار ناول پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ کے ناولوں کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ وہ عام فہم ہوتے ہیں اور معاشرتی رویوں کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ مئی اور جون دونوں شمارے اچھے تھے...... مگر بہنوں کی محفل سب سے اچھی تھی۔ (شکریہ، ابھی ہمارے پاس کئی ناول شائع ہونے کے لیے انتظار میں ہیں...... پہلے وہ تو لگ جائیں)

شاہانہ، کراچی سے۔ "میری یہ دلی خواہش ہے کہ پاکیزہ میں مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ کی حیثیت سے اپنا نام پیدا کروں...... (آپ ہمیں ہر ماہ تبصرہ بھیجیں اور اپنی شاعری بھی، یہ کوئی مشکل کام تو نہیں ہے) باجی میں نے اور میرے بھائی نے آپ کو فیس بک پر اتنی ساری غزلیں بھیجی ہیں مگر آپ نے ان کو پڑھ کر کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ دوسری بات آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ میں فیس بک پر کیسے مشہور ہوسکتی ہوں؟" (شاہانہ اگر کوئی مجھے فیس بک پر یا میرے موبائل پر اپنی نظمیں، غزلیں بھیجتا ہے تو میں انہیں دیکھتی بھی نہیں ہوں...... کہ میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا ہے اور یوں بھی فیس بک میں بہت کم استعمال کرتی ہوں اس لیے میں آپ کو کوئی مفید مشورے نہیں دے سکتی اور یوں بھی فیس بک کی شہزادی تو ہماری شگفتہ شفیق ہیں۔ ان کی نظمیں، غزلیں خوب صورت گرافکس کی شکل میں فیس بک پر ہر طرف نظر آتی ہیں۔ اس لیے آپ شگفتہ شفیق سے رابطہ کریں اور ان سے پوچھیں کہ وہ اتنی اچھی شاعری کیسے کرلیتی ہیں؟ اور فیس بک کے علاوہ بھی ہر جگہ کیوں اتنی مقبول ہیں؟)

مسز رضیہ زبیر، کراچی سے۔ "آپ نے میرا خط لگایا، شکریہ...... میں اپنی بہنوں سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جو لوگ دوسروں کا برا چاہتے ہیں، ان کے حق میں ہمیشہ برا ہوتا ہے۔ آپ دوسروں کی بھلائی چاہیں گی تو آپ کا اپنا خود کا بھلا ہوگا...... دوسرا یہ کہ اگر آپ کی شوہر سے ناراضی ہوجائے تو اس کا دورانیہ کبھی بڑھنے نہ دیں۔ یاد رکھیں، آپ جو بات اپنے شوہر سے کرسکتی ہیں وہ اپنی اچھی اولاد سے بھی نہیں کرسکتیں۔ اس لیے اپنے شوہر کی خامیوں کو نظر انداز کردیا کریں اور اس کا خیال رکھا کریں اور اس کی لمبی زندگی کے لیے دعا گو رہا کریں۔ پیاری بہنو! اس بات کو میرا تحفہ سمجھ کر قبول کرلیں اور بچوں کی ہمت کو ہمیشہ بڑھائیں، کامیابی ہوگی۔" (رضیہ باجی اتنی پیاری باتوں کے لیے جزاک اللہ)

سمیرا حمید فاروق، کراچی سے۔ "سب سے پہلے اداریہ پڑھا اور وقت کی پکار لگا...... اس کے بعد سمیرا حمید کا افسانہ پڑھا، پسند آیا۔ نگہت سیما کا ناولٹ ٹاپ پر رہا... رفعت سراج کے ناول کی قسط بہتر تھی۔ ان کا خط پڑھ کر ایسا لگا کہ جیسے انہیں تنقید پسند نہیں آئی تھی۔ نگہت عبداللہ کا انداز تحریر ہمیشہ ایک جیسا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس دفعہ ان کا مکمل ناول پڑھ کر بھی مجھے ایسا لگا جیسے ان کی کوئی پرانی تحریر پڑھ رہی ہوں۔ فرحانہ ناز کا ناولٹ پڑھا مجھے اس میں ربط میں کمی لگی بلکہ الجھا الجھا ہوا سا لگا جبکہ نایاب جیلانی نے بہت اچھا لکھا۔ شائستہ زریں کے سروے تو کوزے میں دریا بند ہوتے ہیں۔ سعدیہ رئیس کا افسانہ بھی بس اوسط

درجے کا رہا...... بہنوں کی محفل پڑھ کر مزہ آیا۔" (تبصرے کا شکریہ)

✉ راحیلہ مشتاق، سیالکوٹ۔ "بیٹا تم پاکیزہ کے مستقل سلسلوں میں ضرور حصہ لو...... تمہیں شرکت کرکے یقیناً لطف آئے گا۔

✉ بہن، ن، ن، پنجاب۔ میں قصداً آپ کے نام کا مخفف کرکے لکھ رہی ہوں...... آپ کے خط میں مجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جو جواب طلب ہوتی مگر جب آپ نے مجھے فون کیا تو مجھے یوں لگا کہ آپ کو اس بات کا ملال ہے کہ آپ کی کزنز کا رویہ آپ کے ساتھ طنز آمیز ہے اور وہ تم آپ کی شادی نہیں ہوئی...... اس ضمن میں، میں آپ سے یہ کہنا چاہوں گی کہ شادی ہونا کوئی بہت بڑا کارنامہ نہیں ہوا کرتا کہ جن کی شادیاں ہوجائیں تو وہ اترا جائیں اور جن کی نہ ہوں وہ احساسِ کمتری کا شکار ہوجائیں...... آپ اس ماہ شائع ہونے والے غزالہ نگار اور کزنی کا انٹرویو دو تین مرتبہ ضرور پڑھیں اور سوچیں کہ شادی کے بارے میں اور شادی نہ ہونے کے بارے میں کتنی سچی باتیں کی ہیں۔ رہی بات کزنز یا دوستوں کی دکھ دینے والی باتوں کی...... پیاری بیٹی! تم خود سوچو آج کے اس نفسانفسی کے دور میں زیادہ تر لوگوں کی کوشش ہی صرف یہ ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو اچھا، نیک، ہر ایک کے کام آنے والا، دین دار اور حاتم طائی ظاہر کریں اور دوسرے کو ہر لحاظ سے کم تر، بیچ اور کمین ثابت کریں اور ایسے میں وہ اپنی بات کو مزید وزن دار بنانے کے لیے اپنی زہریلی باتیں دوسرے کے کندھے پر رکھ کر کہا کرتے ہیں اور ایسے دوست اور کزنز ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور جنہیں سب جانتے بھی ہیں...... اس لیے آپ ہرگز، ہرگز پریشان مت ہوں...... ایسی دکھ دینے والی باتوں کا مطلب ہی صرف یہ ہے کہ وہ آپ کو تنہائی کی جیل میں قید کرنا چاہتے ہیں۔ پیاری بیٹی مت پروا کرو ایسی باتوں کی۔

ایڈووکیٹ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا سے۔ "جون کا پاکیزہ ہمارے ہاتھوں میں ہے اور ہم شدید افسوس کے عالم میں...... میری عادت ہے کہ میں سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھتی ہوں پھر باقی پاکیزہ...... یہ کیا، کیا انجم آنٹی آپ نے اسلام آباد سے خاموشی سے واپس اور میں 16 اپریل کو اسلام آباد ای، ابو کو ریسیو کرنے ائرپورٹ گئی تھی اور کیا کہوں کاش مجھے یہیں سے مخبری ہوجاتی تو بلا اجازت سارے سگنل توڑ تاڑ کر گھر والوں کو بھی بائے شائے بول بال کر کراچی والی کڑی کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوتی۔ پلیز نیکسٹ ٹائم میرے کان میں بول دیجیے گا۔ آتے ہیں شمارے کی طرف...... جون کی ٹائٹل گرل لال، لال ڈریس میں اپنے سوفٹ کول میک اپ کے ساتھ اچھی لگی۔ امانت اپنے اختتام کی طرف گامزن ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے ہمیں تو دو اقساط کے بعد ہی معلوم ہوگیا تھا۔ گل جان اور اسماعیل خان میں تعلق ہے اور ردا، رابی اسی کی بیٹیاں ہیں آخر جینیکس جو ٹھہرے۔ تانگے والا معمول سے ہٹ کر تھی اس لیے دلچسپ لگی۔ گڈ بشریٰ ویسے تانگا تو اب کوٹ مومن میں بھی نظر نہیں آتا۔ تسی کتھوں لب لیا۔ نایاب بھی ترکِ وفا کے ساتھ سرپٹ بھاگتی نظر آرہی ہیں۔ ماڈل گرل، سعدیہ دکھوا کو ماڈلنگ کے ساتھ پیچ کرکے آپ نے زیادتی کی...... یہ تو شرعی طور پر بھی جائز ہے کہ لڑکا لڑکی شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔ آتش زر سمیرا حمید نے عمدہ کوشش کی مگر کہانی میں جھول رہ گیا۔ آگ تو گناہ گاروں کے لیے ایک سزا ہے۔ جہنم کا ایندھن ہے پھر مظلوم مبشرہ کو آگ میں کیوں جھلسایا؟ کیچڑ میں کنول بھی الم ناک انجام سے دوچار ہوئی۔ شاید کبھی یہ معاشرہ تبدیل ہو اور ایسے لوگ جو چنچ ہونا چاہتے ہیں انہیں سکون کی زندگی مل جائے۔ ہم لوگ تو ابھی ذات پات کے دائرے سے ہی نہیں نکل سکے۔ نزہت جبیں کو بیٹے کی منگنی مبارک ہو۔ عمیرہ احمد کو شادی مبارک اور اقبال بانو یاد آوری کا شکریہ...... شائستہ زریں سے کہنا ہے کہ آپ اتنے زبردست سوالات کہاں سے ڈھونڈ کر لاتی ہیں۔ نزہت اصغر بھی بہت یاد آرہی ہیں۔ دلکش تو کہیں کھو ہی گیا ہے۔ جلترنگ تو خیر ہے ہی بمباسٹ۔" (نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی)

ثنا اجالا، بھلوال سے۔ "پاکیزہ، ہر لحاظ سے منفرد، انوکھا، جدا رنگ ڈھنگ سب الگ، الگ لگا اس بار...... وجہ بتائیں کیوں......؟ مطلب پاکیزہ کی سالگرہ جو تھی۔ محترمہ انجم صاحبہ، آپ کمال کرتی ہیں۔ ٹائٹل دیکھ کر سب بھول گئے۔ یقین مانیں ٹائٹل اس بار ونڈرفل...... مجھے کچھ کہنا ہے میں ادب، پیار، عشق، محبت اور پاکیزہ کی رائٹرز اور قارئین کے بارے میں درست فرمایا آپ نے آدھا چہرہ تحریر زبردست تھی لیکن اس کے یہ جملے کہانی کی جان تھے (میرے خیال میں ادھورا پن انسان کو

ہمیشہ تکلیف دیتا ہے اور ہم رویوں میں تدِ مقابل کا آدھا چہرہ دیکھتے ہیں اور آدھا پوشیدہ رہتا ہے، بہت اچھی سپر ہٹ تحریر تھی۔ نگہت سیما کو پہلی بار پڑھا۔ مکمل ناول، اس صدی کی محبت سلمان جیسے خودغرض انسان صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں، خصوصاً اولاد تو اکثر پاؤں کی زنجیر ہوتی ہے۔ ترکِ وفا ست روی سے آگے بڑھ رہا ہے لیکن تھوڑا ہوتا ہے۔ نایاب کو کئی بار پڑھ چکی ہوں۔ ان کا یہ ناولٹ بہت اچھا ہوگا۔ مالا عجیب کردار ہے اور مون مجھے پُراسرار شہزادی لگتی ہے۔ شہناز وسیم بہت آرزو گلی کی تیری۔ اچھا تھا۔ سنبل جیسی خودغرض عورتیں مجھے زہر لگتی ہیں، کیا تھا جو وہ خط اسے دکھا دیتی...... اپنے ہزبینڈ کو۔ جلترنگ زبردست رہا...... نعتیہ کلام بھی بہترین تھا۔ پاکیزہ ڈائری میں انجم جی میری شاعری کب لگائیں گی۔ میں نے اپنی نثر بھی بھیجی ہے، زندگی رہی تو دوبارہ بہنوں کی محفل میں ضرور حاضری دوں گی۔" (تبصرے کا شکریہ...... آپ کی شاعری کے بارے میں یہ کہنا چاہوں گی کہ ابھی آپ کو مطالعے کی بہت ضرورت ہے۔ ہاں آپ انتخاب بھیج سکتی ہیں یا پھر نثر میں کوشش کریں، میں آپ کی حوصلہ افزائی ضرور کروں گی)

☜ شہلا نواز، لاہور سے۔ "سرورق کچھ خاص نہیں تھا اگلا مہینہ رمضان المبارک کا ہوگا سو اسی حساب سے سرورق پر کچھ افطاری کا سامان مثلاً فروٹ چاٹ، چنا چاٹ، سموسے، شربت روح افزا اور ہاں پکوڑے بھی سجا دیجیے گا۔ اداریے میں آپ نے بہت اچھا سبق دیا دوست بنانے کے بارے میں جناب ہم تو بہت فرینڈلی نیچر کے ہیں، ہمارے حلقۂ احباب میں جوان لڑکیاں تو ہیں ہی بزرگ خواتین بھی شامل ہیں، جن سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ امانت میں اصیل خان وگل جان کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ بہت تشنگی محسوس ہوئی۔ سانجھے دکھ بہت اچھی سوچ کی حامل تھی اگر معاشرہ اسی سوچ کو اپنا لے تو لڑکیوں کی شادی ہونے میں کوئی مشکل نہیں ہو۔ کیچڑ میں کنول بہت دلگداز تحریر تھی پڑھ کر بہت دل دکھا اور عبدالرحمٰن کی بزدلی پر غصہ بھی آیا۔ سعدیہ رئیس کا اضافہ ماڈل گرل آج کل کے حالات کا بہترین عکاس تھا۔ لڑکیاں بہت تنگ آگئی ہیں اپنی فیشن پریڈ کرواتے اچھا ہو جو لڑکیاں لڑکوں کو دیکھنے ان کے گھر جائیں اور ڈرائنگ روم میں لڑکے اتراتے، اتراتے چائے کی ٹرالی لے کر آئیں۔ لڑکیوں کو پورا حق حاصل ہو کہ کبھی چندیا اور بڑھی ہوئی توند والے لڑکوں کو ریجیکٹ کردیں بلکہ دل چاہے تو ان کی چندیا پر ایک عدد کراری سی چپت لگا کر اپنا غصہ بھی نکالیں...... کیسا......؟ شائستہ زریں ہمیشہ کی طرح ان کے سروے کا موضوع بہت دلچسپ ہوتا ہے۔" (گڑیا! آپ کی تو بڑی اہمیت ہے...... اور ہمارے لیے بے حد اہم ہیں۔ اس لیے اپنے بارے میں یہ کبھی مت کہنا کہ تم غیر اہم ہو...... ٹھیک ہے ناں...... ہاں لاہور جب بھی آئی تو تم سے ملاقات ضرور ہوگی۔)

☜ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ "اس دفعہ سرورق نہایت دیدہ زیب رنگوں سے مزین تھا۔ ماڈل بھی بیوٹی فل تھی۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح پاورفل تھا۔ دین کی باتیں پڑھ کر ایمان کا ستون مضبوط سے مضبوط تر کیا...... سب سے پہلے بات ہو جائے امانت کی۔ کہانی میں اتار چڑھاؤ بہت خوب ہے۔ جابر علی جیسے لوگوں کا انجام بد سے بدترین ہونا چاہیے۔ تانگے والا اعلیٰ اوصاف کی سوچ کا عکاس تھا جو کہ اب معاشرے میں ناپید ہوتی جارہی ہے۔ ماڈل گرل، سعدیہ رئیس نے معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ لڑکیوں کے لیے دیہ والی ماڈلنگ بہت ہی اذیت ناک اور ڈی گریڈ کرنے والی ہے۔ دیپ دل کے جلے میں بالآخر فروزاں اور عبدالحئی کو ان کی نیک نیتی کا پھل ان کے ملن کی صورت ملا۔ آتشِ زر میں پچھتاوؤں نے آگ ہی آگ کردیا۔ ہم سب سے دعا کرسکتے ہیں لیکن اپنے ضمیر کی آواز کو کسی صورت نہیں دبا سکتے۔ ساحل ساحل زنجیر ہوئے کو کہانی ابھی ہوئی تھی لیکن اندازِ تحریر زبردست تھا۔ دوسرے حصے کا انتظار ہے۔ کیچڑ میں کنول میں نگہت سیما نے بہت ہی نازک موضوع پر قلم اٹھایا جس سے سوچ کے کئی در وا ہوئے اینڈ سے دل بہت ہی خراب ہوا۔ دھوپ کا سائبان میں نجو کو مصیبتیں اٹھا کر ہی سائبان ملا...... میرا نصیب میں نگہت عبداللہ کے قلم کی جولانیاں عروج پر نظر آئیں۔ شائستہ زریں کا سروے ہر گھر کی کہانی ہے، نزہت جبیں کے بیٹے کی منگنی کی تقریب کو ہم نے گھر بیٹھے بہت انجوائے کیا۔ میری طرف سے نزہت جبیں کو مبارک باد...... بہنوں کی محفل میں آپ نے بہت ہی مفید بات کی اور میری بیٹی کرن نے یہ بات سن کر عمل کرنا شروع کردیا کہ ماما انجم آنٹی نے کہا ہے تو میں اس لیے کوکنگ کر رہی ہوں ورنہ آپ جانتی ہیں آج کل کے بچوں کو راہِ راست پر لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ باجی آپ کی یادوں اور باتوں نے محفل میں آٹھ چاند لگا دیے کیونکہ چار چاند تو ہمیشہ ہی لگے ہوتے ہیں، ماشاء اللہ

سے۔ مصباح رضا سعید کے والد کو اللہ اپنے جوارِ رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے (آمین) تبسم احفاظ الرحمٰن کے لیے خصوصی دعا ہے کہ اللہ اس بچے کو ذہنی طاقت عطا فرمائے تاکہ وہ اپنے ماں، باپ کے لیے راحت و سکون کا باعث بنے۔ (آمین) امینہ عندلیب آپ تو میری دعاؤں میں ہمیشہ سرفہرست رہتی ہیں۔ آپ کا خط پڑھ کر اندازہ ہوا ہے کہ آپ کا دل شیشے سا نازک اور شفاف ہے جس میں سب کے لیے پیار اور محبت کا سمندر موجزن ہے۔ اللہ آپ کو دائمی محبت اور مسرتوں سے ہمکنار کرے۔ (آمین) پاکیزہ ڈائری عظمیٰ کی منہ بولتی محنتوں کا ثبوت ہے۔ جلترنگ ڈپریشن بھگانے کا مجرب نسخہ ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ اشعار کا معیار بھی بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔" (تفصیلی تبصرے کا بے حد شکریہ)

☜ مسز نگہت غفار، کراچی سے۔ "ماہ جون کا رسالہ موصول ہوا۔ مسکراتی دوشیزہ سرورق پر براجمان تھیں۔ اللہ رب کریم ہر لب پر اسی طرح مسکراہٹیں بکھیر دے۔ مجھے کچھ کہنا ہے۔ انجم جی آپ بھی جو کچھ کہتی ہیں، بے حد قیمتی اور مفید و بامقصد ہوتا ہے۔ بے شک انسان کو دوست بنانا چاہیے ایک تنہا انسان معاشرے میں کچھ کر بھی نہیں سکتا نہ زندگی گزار سکتا ہے نہ اپنی ضروریات پوری کرسکتا ہے اور آج کل کے اس نفسا نفسی اور بھونچال زدہ ماحول میں...... انسان کو ایک کندھا چاہیے۔ جس پر وہ اپنا سر ٹیک کر اپنی پریشانیوں اور دکھ کا اظہار تو کرسکے۔ کوئی ایسا رفیق جو اس کے دکھ، درد دور کرسکے۔ دین کی باتیں قابلِ احترام اور ذریعۂ نجات کا راستہ دکھاتی ہیں۔ بشرطیکہ پڑھنے والا سنجیدگی سے ان باتوں کو پڑھے، سمجھے اور عمل کرے۔ مسلسل کہانیوں میں سب ہی اچھی ہیں۔ تانگے والا بشریٰ کی کہانی اچھی لگی۔ سعدیہ رئیس، ماڈل گرل سبق آموز کہانی تھی۔ سانجھے دکھ اور دھوپ کا سائبان بھی پسند آئیں۔ جلترنگ ہمیشہ کی طرح پُرتکلف، پُرمزاح، دُکھے دلوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرتی تحریر صرف ملکہ مزاح ہی لکھ سکتی ہیں اور ہاں ملکۂ عالم ابھی ہمیں کوئی ایسے بادشاہ سلامت نظر نہیں آئے جنہیں آپ کے نام کے ساتھ ملا سکیں۔ نزہت نے منہاج بیٹے کی منگنی کا حال لکھا پھر سے وہ خوب صورت محفل یاد آگئی۔ بڑی ہی خوب صورت اور پُرتکلف محفل تھی۔ پاکیزہ ڈائری میں عظمیٰ بٹی جتنی بھی تحریریں لگاتی ہیں وہ سب کی سب قابلِ تعریف ہوتی ہیں۔ حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول، لاریب، عنیزہ وسیم، امِ ثمامہ، امِ ایمان، جبیں ہاشمی، یاسمین کنول، ان سب کی تحریریں اچھی لگیں۔ میں اکثر گنگناتی ہوں ارم کمال، ممتاز خانم، رابیل شاہ، زریں زبیر، نگینہ ضیا اشعار اور قطعات پسند آئے۔" (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

☜ رابعہ یاسمین بلوچ، بلوچستان سے۔ "میں نے کئی سالوں سے دوبارہ پڑھنا شروع کیا ہے مگر خط لکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ پتا نہیں آپ بھی جواب دیں گی یا نہیں...... مگر اب ہمت کرلی کیونکہ میں اور میرا بھائی اور بہنیں بہت شوق سے سسپنس اور پاکیزہ پڑھتے ہیں۔ کئی سالوں کے سسپنس میرے بھائی کے پاس موجود ہیں۔ آپ اور عذرا رسول صاحبہ اردو کی بہت خدمت کررہی ہیں۔ یہ رسالہ روز بروز بہترین ہو رہا ہے۔ تمام افسانے اور ناول بے حد اچھے ہوتے ہیں۔ شامِ شہر یاراں مجھے بے حد پسند ہے۔ عنیزہ سید سے ضرور ملاقات کرائیے گا۔ جلترنگ پڑھ کر آپ کی صلاحیتوں کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ کبھی ندا یاسر کے مارننگ شو میں آپ اور عذرا رسول صاحبہ آئیں تاکہ آپ کی مزے دار باتیں سن سکیں۔ اگر یہ خط بہنوں کی محفل میں شامل ہو تو آئندہ بھی تبصرہ کرتی رہوں گی۔" (رابعہ اس محفل میں خوش آمدید۔ اب آپ باقاعدگی سے اس محفل میں شرکت کیجیے۔ مجھے دلی خوشی ہوگی۔ ہاں ابھی آپ کا افسانہ پڑھا نہیں ہے)

☜ صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ سے۔ "جون کا شمارہ صد شکر بہت ہی جلدی ملا اسی لیے ہم نے آرام، آرام سے پڑھا، انجوائے کیا۔ نگہت سیما کا کیچڑ میں کنول سیڈ اسٹوری تھی۔ عموماً اس طرح کے کیسز میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب طوائف عزت والی زندگی گزارنا چاہتی ہیں تو زمانہ انہیں بے اعتبار کردیتا ہے، ان کے لیے مشکلات کھڑی ہوجاتی ہیں۔ سمیرا حمید کی آتشِ زر سبق آموز تحریر تھی۔ بشریٰ گوندل نے نیا موضوع لیا...... تانگے والا، تانگا تو ہر دور میں اچھا لگتا ہے۔ کتنا مزہ آتا ہے سواری کر کے، اب تو یہ چیزیں ختم ہوگئیں تو سمجھو حسن ہی ختم ہوگیا...... ہم زیادہ مادیت پرست ہوگئے ہیں۔ ہر چیز کے فطری حسن کو انجوائے کرنا چاہیے اور حدیث کا مفہوم ہے کہ گھوڑے کی پیشانی سے قیامت تک خیر باندھ دی گئی ہے۔ آپ اس کو اچھے کاموں میں استعمال کرسکتے ہیں۔ مصباح رضا سعید کے والد کی اچانک وفات کا سن کر دکھ ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اور آپ کو صبر دے۔ حج کے لیے رختِ سفر باندھا تھا تو اللہ کے مہمان تھے۔ اللہ کے راستے میں تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس جہان کی

خوشیاں دکھائے یہ دنیا تو بس فانی ہے۔ رفعت سراج کا خط متاثر کن تھا۔ کچھ قسطیں امانت کی مس ہوگئی ہیں۔ جس کی وجہ سے اب مزہ نہیں آرہا ہے۔ ساجدہ حبیب کو بہت بہت مبارکاں...... اللہ یونہی سب کو ہنستا مسکراتا شاد و آباد رکھے، آمین۔" (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

✿ سحر فیروز، سیالکوٹ سے۔ "کمال ہوگیا...... اس دفعہ پاکیزہ خلافِ معمول کچھ جلدی مل گیا۔ ٹائٹل کچھ دیکھا دیکھا سا لگا اور اس سے بڑا کمال یہ ہوا کہ اندر نگہت سیما کا ناولٹ بھی موجود تھا۔ اندازِ تحریر کچھ بدلا بدلا سا ہے لیکن پھر بھی خوب ہے۔ ماڈل گرل، سعدیہ جی سے معذرت کے ساتھ کہ سعدیہ جی جن دو ماڈل گرلز کا آپ نے تجزیہ کیا ہے ان میں بہت فرق ہے۔ ایک لڑکی جو بن ٹھن کر ساری دنیا کو اپنے جلوے دکھاتی ہے اور جسم کی نمائش کرتی ہے وہ واقعی بے ضیا ہے لیکن جو لڑکی چند لوگوں کے سامنے بن سنور کے آتی ہے وہ ماڈل گرلز کے زمرے میں نہیں آتی۔ گندے حلیے میں کوئی بھی کسی بھی لڑکی کو پسند نہیں کرے گا۔ نگہت عبداللہ کا مکمل ناول میرا نصیب بیلا کا فون پر جیبہ کو یہ کہنا کہ تائی امی مر گئیں کیا...... مزہ دے گیا۔ ویسے گھر سے اس طرح چلی جانے والی لڑکیوں کو اتنی عزت نہیں ملتی جتنی بیلا کو ملی...... میں اکثر گنگناتی ہوں میں رابیل شاہ کا شعر مزے کا تھا۔ اچھا لگا۔ امانت، میں شاہ صاحب کا گھر گیسٹ ہاؤس بنتا جارہا ہے۔" (تبصرے کا شکریہ)

✿ آفتاب کاوش، کراچی سے۔ "آپ نے میری نظم مئی کے شمارے میں لگائی۔ آپ کا بے حد شکریہ۔ مجھے بہنوں کی محفل بہت پسند ہے، میں اسے بار بار پڑھتی ہوں، مجھے آپ کا انداز اور اخلاق بے حد متاثر کرتا ہے۔ آپ جس خلوص، اپنائیت کے ساتھ محبت بھرے لہجے میں جوابات تحریر کرتی ہیں پڑھ کر دل خوش ہوجاتا ہے۔" (پسندیدگی کا شکریہ۔ ثریا آپ کی حوصلہ افزائی بھی ضرور ہوگی)

✿ آمنہ، پروا، عالیہ، جہانیاں سے۔ "پاکیزہ میں پہلی مرتبہ تشریف آوری ہورہی ہے۔ وجہ ہماری پیاری نایاب صاحبہ...... فیس بک سے خبر ہوئی آپ کا ترکِ وفا پاکیزہ میں چل رہا ہے۔ فٹافٹ پاکیزہ منگوایا...... آہ کیا شاہکار ہے...... جرمنی کی سیر ایک طرف، انتہائی شاندار اندازِ بیاں...... خوب صورت الفاظ...... مالا کی عیسیٰ سے محبت، عیسیٰ کا کیئرنگ انداز، سوزن کی اچھائی اور مون حسیب کی پُراسراریت...... ہم سمجھ گئے یہ نایاب کا ہی کمال ہے۔ انتہائی پُرتجسس تحریر...... آخر تک اسرار برقرار رہے گا...... یہ ہم جانتے ہیں کہ کیونکہ پرانے یارانے ہیں۔ اقبال بانو کا انٹرویو آؤٹ کلاس تھا...... ترکِ وفا کے بعد سارا پاکیزہ چاٹ ڈالا...... واہ یہ کیا......؟ پاکیزہ تو بہت اعلیٰ پائے کا پرچہ ہے پھر ہم کیوں بے خبر رہے؟ سکینہ فرخ کا ناول زبردست لگا...... باقی سلسلے بہت خوب...... سب سے بڑھ کر خطوط...... اور پاکیزہ میں ہر قاری اور رائٹر کے بارے میں خبر...... یہ تو سچ میں کمال کا پرچہ ہے۔ اللہ خوب ترقی دے، آمین۔" (پیاری شہزادیوں...... پاکیزہ محفل میں خوش آمدید...... اور ہاں اب ہر ماہ چاہیے تمہارا تبصرہ)

✿ ایس۔ انمول، سرگودھا سے۔ "باجی میں سرگودھا کے قریب ایک گاؤں میں رہتی ہوں۔ پاکیزہ کی بہنوں کی محفل حد سے زیادہ پسند ہے اور میں آپ کے اس ڈائجسٹ میں اپنا انٹرویو بھیجنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ اسے شائع کریں گی؟ آپ نے صرف ایک ہی بار میرا خط شائع کیا تھا۔" (ثریا آپ...... آپ کی تمام سہیلیاں اور جو بھی بہنیں پاکیزہ پڑھتی ہیں وہ تصویر کے ساتھ یا بغیر تصویر کے بھی اپنا انٹرویو ہمیں بھیج دیں...... ہم ضرور شائع کریں گے۔ انمول بیٹا آپ ہمیں خط بھیجیں گی تو ضرور لگے گا...... اگر نہیں بھیجیں گی تو کیسے لگ سکتا ہے؟ ہاں آپ یہ بھی یقین کریں ہمارے پاس آنے والا کوئی خط بھی ردی کی ٹوکری میں نہیں جاتا)

✿ ہالہ احمد، کراچی سے۔ "زندگی نے کبھی کسی اونچے مقام پر پہنچایا تو میں یہ کبھی نہیں بھولوں گی کہ میری پہلی، پہلی کوشش کی اس قدر حوصلہ افزائی اور اسی کی بنیاد پر بااثر شخصیات کی فہرست میں میری عزت افزائی کرنے والی صرف انجم آنٹی اور پاکیزہ ہیں۔ جون کا پاکیزہ ایکسپائری تاریخ کو ہی مل گیا تھا۔ نازک سی ماڈل والا ٹائٹل اچھا لگا۔ اس کے بعد اشتہارات کی ایک سیریز چلی جس کے اینڈ میں موٹاپا یقینی ختم والا اشتہار دیکھ کر بے اختیار منہ سے نکلا...... "او کون لوگ ہو تسی...... اوئے" کیونکہ ہم تو یہاں اپنی ازلی ابدی اسمارٹ نیس سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ ہاہاہا...... فہرست پر ایک سو چالیس کی رفتار سے نظر دوڑائی۔ افسانوں کی تعداد انگلی رکھ کر گنی...... ایک، دو، تین، چار اور پانچ...... پورے پانچ افسانے اور ہالہ احمد کا ایک بھی افسانہ نہیں...... منہ ایسے لٹک گیا جیسے گیس والے غبارے میں سے ہوا نکل جائے اور وہ مرجھا کر نیچے گر جائے...... بہرحال سعدیہ رئیس اور بشریٰ گوندل

کے افسانے بہت اچھے لگے۔ مختصر افسانے مجھے لکھنا بھی پسند ہیں اور پڑھنا بھی...... ناولٹ میں نگہت سیما نے بہترین لکھا...... فرحانہ ناز ملک کا ناولٹ سنجیدگی اور اداسی کے رنگوں سے مزین تھا جبکہ مجھے ان کی شوخ و شنگ تحریریں پڑھنا اچھا لگتا ہے لیکن لکھا پھر بھی بہت اچھا ہے بلاشبہ...... اور نگہت عبداللہ کا مکمل ناول تو پورے شمارے کی جان تھا...... زبردست......! نزہت جبیں ضیا کے بیٹے کی منگنی کا حال بہت اچھا لگا۔ اس سے پہلے ان کی بیٹی کی شادی کی روداد پڑھی تھی، کچھ سالوں پہلے بلکہ بار بار پڑھی تھی، مزے لے لے کر...... سروے اچھا لگا۔ سب نے ایک ہی بات کی کہ ڈیکوریشن پیسز خریدنا چاہتی ہیں مگر خرید نہیں پاتیں۔ ویسے ایک بات ہے، بہت سے ڈیکوریشن پیسز آپ خود گھر میں بھی تیار کرسکتی ہیں جو کہ بازار میں ملنے والے آئٹمز سے زیادہ منفرد اور خوب صورت ہوسکتے ہیں۔ سلمیٰ غزل کی ایک بات دل کو بہت لگی کہ امریکی اگرچہ کلمہ گو نہیں...... مگر مسلمانوں والی بھی خوبیاں اپنے اندر رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہماری تعلیمات سے بہت کچھ سیکھ لیا اور ہم نے اپنی تعلیمات اور روایات کو فراموش کردیا...... معلوم نہیں آج ہم کس موڑ پر کھڑے ہیں اور ہماری منزل آخر ہے کیا......؟ نظم، سسرال چلو بہت ہی مزے دار تھی۔ اب داخل ہوتے ہیں فرزانہ منزل میں یعنی جلترنگ...... ہمیشہ کی طرح دل خوش ہوگیا پڑھ کر...... حسبِ معمول بہت بہت اچھا لکھا۔ جسے پڑھ کر سچ میں چاروں طرف جلترنگ بج اٹھے۔" (شکریہ...... ثریا آپ کے مزید افسانے جلد ہی شائع ہوں گے)

✿ عطیہ زاہرہ، لاہور سے۔ "گرمی کے لحاظ سے ماڈل کے کپڑوں کا رنگ بہت گہرا ہے، سلسلے وار ناول اچھے جارہے ہیں، ناولٹ میں نگہت سیما، فرحانہ ناز ملک اور دیگر ناولٹ بھی بہت شاندار تھے۔ افسانے ابھی پورے نہیں پڑھے پر جتنے پڑھے اچھے لگے۔ خصوصی مضامین میں نزہت جبیں ضیا کے بیٹے کی منگنی کا پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ میری طرف سے ان کو بہت مبارک ہو۔ اس کے علاوہ دیگر سلسلے بھی اچھے تھے اور سب سے بڑھ کر میری غزل شائع کرنے پر بہت، بہت، بہت شکریہ...... آپ یقین کریں، یہ میرے لیے بہت بڑی کامیابی ہے۔ (اللہ کا شکر ہے) اس کے علاوہ آپ نے مئی کے شمارے میں ہمیز نے ایم، ایڈ ہونے کی خبر لگائی، مجھے اتنی عزت دی، میں اس کے لیے آپ کی ممنون ہوں۔ مجھے سب بہنوں کی خبریں پڑھ کر اچھا لگتا ہے۔ 16 جون کو میری امی کی برسی ہے۔ ان کی وفات کو چار سال بیت گئے۔ تمام بہنوں سے درخواست ہے۔ ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔" (جی ضرور)

✿ اُم ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے کے بعد دین سے آگے بڑھتے ہوئے امانت تک آئی۔ آج کل رفعت جی کا ناول دریا تن صحرا زیر مطالعہ تھا تو اسی سے تقابل ہی ذہن میں چلتا رہا لیکن رفعت جی کی یہ بات کہ اب میں بار بار اپنا پرانا لکھا ہی تو نہیں دہرا سکتی، دل کو لگی۔ عنیزہ سید، میری آل ٹائم فیورٹ مصنفہ ہیں۔ ان کا ناول کامیابیوں کی شاہراہ پر چلتا اختتام کی طرف گامزن ہے۔ تانگے والا، ایک اچھی تحریر لگی کہ واقعی ہم نے اپنی پرانی روایات کو اپنانا اپنی بے عزتی تصور کیا ہے۔ نایاب جیلانی، ترکِ وفا کے ساتھ فل فارم میں ہیں اور بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ سعدیہ رئیس نے ماڈل گرل میں معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا، جس سے ہم میں سے کئی بہنیں گزرتی اور گزری ہیں پر اپنے بھائی یا بیٹے کی دفعہ وہ انجانے میں وہی رویہ اپنا لیتی ہیں جس نے انہیں کبھی گھائل کیا ہوتا ہے۔ آتشِ زر میرا کے ہاتھ سے گزرا ایک عام مکافاتِ عمل کی تحریر خاص الخاص ہوگئی۔ فرحانہ ناز ملک ہمارے ہی شہر کی ایک مصنفہ جن سے آج تک ملاقات نہ جانے کیوں نہ ہوسکی ان کی تحریر پر تبصرہ محفوظ ہے۔ فرحانہ ناز، ڈی جی خان میں کہاں رہتی ہیں آپ؟ نگہت سیما جی، اچھی تحریر تھی لیکن اداسی آپ کی تحریروں کا ایک خاص حصہ بن گئی ہے۔ اس دفعہ بھی اداس کردیا آپ نے۔ نگہت عبداللہ ہمیشہ کی طرح ایک معاشرتی پہلو لے کر آئیں۔ جس سے ہم میں سے کئی لوگ نبرد آزما ہیں۔ بہنوں کی محفل اس شمارے کا ایسا حصہ جسے میں ہمیشہ تنہائی اور رات میں پڑھتی ہوں۔ پوری دلچسپی کے ساتھ...... ساری قاری و رائٹرز بہنوں کے ساتھ ملاقات مزہ ہی دے جاتی ہے۔ آپا! کبھی پنجاب کا چکر لگے تو ضرور آیئے گا ہماری طرف...... عظمیٰ جی! آپ نے ہمیشہ کی طرح پاکیزہ ڈائری پر محنت کی پر اس دفعہ مجھے شامل کرنا کیوں بھول گئیں۔ جلترنگ کے لیے آئیڈیاز پتا نہیں آپ کو کیسے آجاتے ہیں حالانکہ آئیڈیا آجانا کوئی بڑی بات نہیں۔ اسے اس انداز میں پیش کرنا بڑی بات ہے۔ جیسے آپ کرتی ہیں...... نہایت تلخ اور کڑی صورت حال کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کرنا بہت کم لوگ ایسا کرسکتے ہیں۔ روحانی مشورے پاکیزہ کا ایک خوب صورت سلسلہ...... بہت سے لوگوں کو مستفید ہوتے میں نے دیکھا ہے۔" (شکریہ)

✿ تسنیم قریشی، کوہاٹ سے۔ "جون کا پاکیزہ ٹائٹل سمیت اچھا لگا۔ مجھے کچھ کہنا ہے، آپ نے ہمیشہ کی طرح بہت اچھا

لکھا۔ علم معرفت اختر شجاعت صاحبہ کے قلم سے بہت ہی اچھا اور ایمان افروز سلسلہ ہے۔ نایاب جیلانی بہت زبردست لکھ رہی ہیں۔ فرحانہ ناز ملک کے ناولٹ کی پہلی قسط تو اچھی لگی دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ افسانے بھی اچھے تھے، تانگے والا ہلکی پھلکی تحریر تھی۔ جب سڑک پر گھوڑا چلتا ہے تو اس کے پاؤں کی ٹک ٹک اچھی لگتی ہے۔ ویسے تانگا دیکھا ہے مگر کبھی سواری نہیں کی۔ ..... باقی پاکیزہ ابھی پڑھا نہیں۔ اب آتے ہیں بہنوں کی محفل کی طرف ..... ہمیشہ کی طرح بہنوں کی محفل کچھ کھٹی میٹھی اور چٹپٹی سی ہوئی تھی۔ آپ نے اپنے اسلام آباد کے سفر کے بارے میں مختصر سا لکھا لیکن ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لکھا اور آپ کو اپنے بیٹے اور بہو کے عمرے کی مبارک باد ..... بمبئی والی بہن کی طرح ہماری شدت سے خواہش ہے کہ ہم آپ کا اور خاص کر فلمی کا عمیرہ احمد کا انٹرویو پڑھنا چاہتے ہیں۔ انٹرویو کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ اقبال بانو سے ملاقات بہت دلچسپ لگی۔ اقبال بانو ہماری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ آپ پلیز اقبال بانو سے کچھ لکھوائیے بھی ..... ایک بہن نے یہ پوچھا تھا کہ اس کی دوست کہتی ہے کہ جتنا پڑھتی ہو اتنی ہی بیمار رہتی ہو اور آپ نے بہت اچھا جواب دیا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ ذکر و اذکار، قرآن کی تلاوت اس میں تو ہر مرض کی شفا ہے تو پھر اس سے بیماری کیسے ہو سکتی ہے۔ آپ مطمئن ہو کر ذکر و اذکار جاری رکھیں یہ تو سراپا شفا ہی شفا ہے بلکہ ہر مسلمان کا دل ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد سے منور رہنا چاہیے کیونکہ معلوم نہیں کہ کس لمحے زندگی کی شام ہو جائے۔ نگہت عبداللہ کی تحریر میرا نصیب اچھی تحریر تھی۔ نگہت عبداللہ ایک بہت بڑا نام، بہت سینئر رائٹر ہیں مگر یہی تحریر پہلے ہم دوسرے ڈائجسٹ میں پڑھ چکے ہیں۔" (تبصرے کا شکریہ نگہت عبداللہ کے ناولٹ کے نام سے آپ کو یکسانیت کا شبہ ہوا ہے ..... یہ تحریر تو انہوں نے نئی لکھی ہے)

✉ سیدہ جیا عباس، مرالی تلہ گنگ سے۔ "پہلی بار شریک محفل ہوں، وجہ پاکیزہ نے رابطہ کرنے پر مجبور کر دیا تو سوچا چلو قلم و کاغذ کا سہارا لے کر اپنے جذبات سے مہکا خط لکھ ہی دیں۔ اپنا سب سے پہلی نظر ٹائٹل کے بعد آپ کے اداریے پر جاتی ہے۔ کیا خوب صورت اور شگفتہ سا انداز ہے آپ کا ..... مزہ آ جاتا ہے پڑھ کر ..... بشریٰ گوندل نے تانگے والا اسٹوری خوب لکھی۔ آج کے زمانے میں بھلا کون کس کی پروا کرتا ہے۔ ہاں مگر دکھاوا ..... اندھی تقلید اور نفسا نفسی کا زور زورہ ضرور ہے۔ سعدیہ کا افسانہ ماڈل گرل حقیقت کے قریب تر لگی مگر یہ کیا ..... ؟! اتنی مشکل سے بے چاری نے ہمت پکڑی اور اینڈ پہ آپ نے بیڑا غرق کر دیا اس کے ارمانوں کا خیر چلتا ہے۔ سا نجھے دکھ، کہانی اور افسانے کی حد تک تو ٹھیک ہے ورنہ بغیر جہیز کے بیٹی کو بیاہنا گویا اسے جہنم میں دھکیلنا ہو گیا ہے آج کے دور میں، سلسلے وار ناول بھی اچھے ہیں۔ بہنوں کی محفل میں تبصرے بڑے زبردست ہوتے ہیں۔ میں اکثر گنگناتی ہوں اور جلترنگ بھی میرے فیورٹ سلسلے ہیں۔" (پیاری جیا عباس، اس محفل میں خوش آمدید ..... تمہارا نام جتنا خوب صورت ہے اتنی ہی خوب صورت تم نے نظم بھی بھیجی ہے۔ تمہاری حوصلہ افزائی یقیناً ہوگی ..... اپنی تحریریں باقاعدگی سے بھیجو)

✉ فریدہ فری، یوسف زئی، لاہور سے۔ "جون کا پاکیزہ جلدی مل گیا جبکہ ہم ہر ماہ ایک ایک دن انتظار میں گزارتے ہیں۔ آپ کا اداریہ پڑھ کر دین کی باتیں پڑھیں بے حد سکون ملا ..... ناولٹ نایاب جیلانی کا پانچواں حصہ پڑھا۔ کمال کا ناولٹ ہے۔ تابندہ جبیں کا ناولٹ بھی لاجواب تھا۔ سمیرا حمید کا افسانہ آتش زر بالکل میری کہانی لگتی ہے، میری سہیلیاں بھی مجھ سے چیزیں لے کر واپس نہیں کرتی تھیں اسکول کے زمانے میں۔ ہم سیدھے سادے سے تھے اور وہ ہماری سادگی سے فائدہ اٹھاتی تھیں۔ گولڈن انگوٹھیاں تک دے دیتی تھی ..... سانجھے دکھ نیر شفقت نے بھی خوب لکھا۔ جہیز کے متعلق ..... کاش سب ہی ایسے ہو جائیں۔ کیچڑ میں کنول ..... ساحل سا حل زنجیر ہوئے فرحانہ ناز ملک تو لکھتی ہی بے حد اچھا ہیں۔ اس مرتبہ تو پاکیزہ ناولٹ نمبر ہوا ..... ام ایمان کی دھوپ کا سائبان پسند آیا ..... مکمل ناول نگہت عبداللہ کا پڑھ کر مزہ آ گیا۔ خوش رہو نگہت جی ..... نزہت جبیں ضیا جی بیٹے کی منگنی مبارک ہو ..... اللہ تعالیٰ آپ کو بیٹے اور بہو کی خوشیاں دکھائے۔ آمین، منگنی کا احوال پڑھ کر مزہ آیا۔ سروے بھی بہت ہی پسند آیا۔ سب کی تصاویر بھی پیاری تھیں۔ نگہت غفار جی آپ کا بے حد شکریہ ..... اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی صحت مند زندگی عطا کرے، آمین ..... آپ کا بتایا ہوا نسخہ آزمایا، بہت فرق ہوا۔ پروین افضل شاہین کے چٹ، پٹے ٹوٹکوں نے مزہ دیا۔" (پسندیدگی کا شکریہ ..... آپ کی آرا پہنچائی جا رہی ہے)

✉ شازیہ رباب، منڈی بہاؤالدین گوجرانوالہ سے۔ "کلرفل سا سرورق اچھا لگا۔ ماڈل کے دانتوں سمیت ..... اور پاکیزہ ہمیشہ اینڈ سے شروع کرتے ہیں۔ ورق گردانی کرتے ہوئے بہنوں کی محفل میں عرصے بعد اپنے آپ کو دیکھنا اچھا لگا۔ رضوانہ آفتاب

نے بہت اچھی انفارمیشن دی۔ مستقل سلسلوں میں جلترنگ اور پاکیزہ ڈائری اچھی رہی۔ سندیسوں میں امینہ عندلیب کی نظم اچھی لگی۔ کہانیوں میں مسلسل ناول، امانت میں کچھ، کچھ عیاں ہونے لگا ہے، شام شہریاراں اختتام کی جانب رواں دواں ہے۔ اینڈ اچھا ہونا چاہیے۔ سردار مہرزادو خاں کی طرف سے فکر ہے۔ دوسرے افسانوں میں صائمہ اکرم کی سادہ سی تحریر پسند آئی۔ رفاقت جاوید کی رشتہ بھروسے کا ..... سوسوری ..... عقیلہ حق کی حجاب نے خاصا چونکا دیا۔ کیا اب ایسا بھی ہونے لگا ہے ..... شاید وہ بھی ایسی ہی مجبور و بے بس ہوں گی۔ شمیم ناز صدیقی کی ماں کے بارے میں ایک اچھی کہانی تھی۔ شاید مائیں سب کی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ صبر کرنے والی اور پیار کرنے والی ..... اور ..... اب بات ہو جائے مجھے بے حد پسند آنے والی کہانی سکینہ فرخ کی ..... اس صدی کی محبت کی سکینہ فرخ کی اس کہانی نے بہت اچھا تاثر چھوڑا ..... ساجدہ حبیب کے بعد اب سکینہ فرخ نے فوجی بندوں کے بارے میں لکھا ..... اور کہانی تو اتنی پسند آئی کہ بس بتا نہیں سکتے۔ سکینہ فرخ کا انداز بیاں بہت اچھا ہوتا ہے۔ غزالہ فرخ اور سکینہ فرخ دونوں کا انداز اسلوب بہت اچھا ہوتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ان کی تحریریں بہت پسند آتی ہیں۔ سکینہ کو مبارک باد ..... رضوانہ پرنس کی اِک نئے موڑ پر ..... نئے موڑ پر ہی اختتام پزیر ہوئی۔ واقعی ایسے مرد بھی ہوتے ہیں جو دل سے فیصلے کرتے ہیں۔ دماغ شاید ان میں ہوتا ہی نہیں ..... زنیرا کے ساتھ برا ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا بھی ہو گیا ..... شاید قاران کی موت میں ہی زنیرا کی بہتری تھی۔" (تبصرے کا شکریہ)

✉ زریں ارمان، جہلم سے۔ "آپ کی حوصلہ افزائی کا بے حد شکریہ، اپنا خط پاکیزہ میں دیکھ کر میں تو خوشی سے پاگل ہو گئی تھی۔ انشاء اللہ اب حاضری لگواتی رہوں گی۔ مجھے تو ایک نئی دنیا مل گئی ہے۔ پاکیزہ کی بہنوں کی محفل کی صورت میں جلترنگ میں بالی عمریا بہت زبردست تھا۔ واقعی سچے جذبے سہولتوں اور آسائشوں سے زیادہ قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر زندگی بے رنگ ہوتی ہے۔ رفعت آپی سے کہنا ہے کہ پلیز امانت کے کرداروں کو زیادہ انتہا پسند نہ بنائیں۔ ستارہ کی شادی کے بعد مزہ آ رہا ہے۔ کہانی میں نیا موڑ آ گیا ہے۔ نمرہ آپی نے تو پارس کا اینڈ ہماری سوچ سے بالکل مختلف کیا ہے۔" (گڑیا! ہر ماہ ہمارے تمام سلسلوں میں شرکت کرو، مجھے بھی خوشی ہوگی ویسے یہ تمہارا خاصا پرانا خط شائع ہوا)

✉ نصرت بی بی، پنجاب۔ خوش آمدید، گڑیا آپ اپنے مراسلات اور شاعری میرے موبائل کے بجائے بذریعہ ڈاک ارسال کریں ..... میں بارہا یہ بات بتا چکی ہوں کہ میں روزانہ اپنا موبائل چیک بھی نہیں کرتی ہوں ..... ہاں پلیز اپنی شاعری فیس بک پر بھی نہیں بھیجیں ..... خواہ مخواہ آپ کا کلام ضائع نہ ہو جائے ..... اس لیے ڈاک سے ارسال کر دیں۔ شکریہ۔

✉ طاہرہ پروین آرائیں، فیصل آباد سے۔ "کافی عرصے کے بعد خط لکھ رہی ہوں لیکن تصور و خیال میں جب پاکیزہ ہاتھ میں ہوتا ہے تو پیاری انجم، آپ دل و دماغ میں ہوتی ہیں کیونکہ گمان میں ہوتا ہے کہ پاکیزہ آپ کی محنت و مشقت سے تخلیق کے عمل سے گزر کر میرے ہاتھ میں آیا ہے۔ پاکیزہ فیملی کی ہزاروں قارئین بہنوں کی طرح میں بھی اس کی ادنیٰ رکن ہونے کے ناتے اس کی برکتوں اور سعادتوں سے فیض یاب ہوتی ہوں۔ خط لکھنے کے لیے شاید وقت نہ نکال سکتی اگر آپ مسز تسنیم غلام علی گوندل، کوٹ مومن کی پیاری اور خوب صورت تحریر بعنوان ..... وہ ادب کی کتاب جیسا تھا ..... تازہ شمارے میں شائع نہیں کرتیں ..... اس عنوان کو دیکھتے ہی مجھے ادب کی عام فہم تعریف جسے آپ نے مجھے کچھ کہنا ہے میں شمارہ اپریل میں لکھا اور اسے میں نے اتنی بار پڑھا کہ یاد ہو گئی اور اسی کی صدائے بازگشت بہنوں کی محفل کی تمہید میں بھی پڑھی ..... اسی یادداشت کی روشنی میں، میں نے میڈم فرزانہ چوہدری کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریب کی عمدہ اور سنجیدہ روداد پڑھی ..... میرے وجود کا رواں رواں انجم انصار کا ممنون و مشکور ہوا ..... کہ جس کالج کی تقریب تھی ..... یہ کبھی پرائمری اسکول تھا اور میں نے اسی میں قرآن کے فرمان 'اقراء' کی تعمیل کی ..... اور جب یہ اسکول مڈل بنا تو میں نے اس تقریب سے خطاب کرنے والی میڈم زیتون چک شانی اور میڈم مسرت محمود رانجھا کی رفاقت میں ساتویں اور آٹھویں 1965.66ء میں پاس کی ..... وقت پیری شباب کی باتیں ..... ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں ..... پرائمری سے مڈل کا درجہ پانے پر میں اور میری پیاری سکھی زیتون دو طالبات ہی ساتویں کلاس میں تھیں کہ سرگودھا سے سراپا حسن و جمال و وقار خاتون ڈپٹی انسپکٹرس، انسپکشن کے لیے آئیں اور انہوں نے ہماری مؤدب و شائستہ اخلاق مس اصغری کو مخاطب کر کے کہا ..... مس صاحبہ دو طالبات کی کلاس کو کم از کم تین تو کریں۔ زہے نصیب کہ کوٹ مومن کے

قریب کے باسی متمول و منعم گوندل خاندان کی نورچشم ذہین و فطین اور حسین و جمیل بچی مسرت گوندل نے ساتویں میں داخل ہوکر ہماری کلاس کا بھرم رکھا اور ہم تین طالبات نے ساتویں اور آٹھویں میں مس اصغری جیسی نیک اطوار معلمہ سے پڑھا۔ گریڈ بیس میں ترقی پانے والی میڈم فرزانہ کے جن معلمانہ اخلاق و محاسن کا ذکر مسز نسیم گوندل نے کیا ہے، بالکل ایسی ہی ہماری محسنہ اور معلمہ مس اصغری تھیں..... شیریں سخن، حلیم الطبع پڑھاتی تو منہ سے پھول جھڑتے اور ان کی ہر بات قلب و روح میں اتر جاتی۔ انجم بہن میں کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ کہاں، کہاں پہنچ جاتی ہیں۔ آپ کی یہی وسعتِ نظری اور دل نوازی ہزاروں دلوں میں جگہ بناتی ہے۔ آپ کے دل کی فیاضی اور کریمانہ ذوق کی وجہ سے مجھے اپنے سچے جذبوں کے اظہار کا موقع ملا..... کاش یہ تحریر میری کلاس فیلوز مسرت گوندل اور زیتون اور معلمہ مس اصغری تک پہنچ جائے۔ جن کو میں 45 سال میں بھی نہیں بھول سکی۔'' (ضرور پہنچے گی اور آپ کے اس خط سے اور زیتون اور مس اصغری جیسی شخصیات پیدا ہوں گی۔ انشاءاللہ)

✍ روبی پیرزادہ، کریم پورہ سے۔ ''سکینہ فرخ کا زبردست ناول رہا..... امانت جاندار جا رہا ہے۔ رضوانہ پرنس متاثر نہیں کرسکیں۔ نایاب جیلانی کا ترکِ وفا بھی آؤٹ کلاس رہا..... خصوصاً بہت تجسس ہے۔ مون کیا سچ میں مالا کے اندر گھس جاتی تھی؟ پلیز ضرور بتائیں۔ رات بھر یہ قسط پڑھ کر نیند نہیں آئی۔ مون کا مالا کو فجر کے وقت بے وقوف بنانا، ڈرانا اور اپنی شخصیت کی پُراسراریت سے خوف زدہ کرنا بہت پسند آیا۔ ناول میں بہت تجسس اور اسرار بھرا ہوا ہے۔ یہ تو اگلی قسط میں کچھ کھلے گا۔ صائمہ کا افسانہ بکواس ترین رہا..... بے چاری کا بے چارہ اور بے چارہ ہی افسانہ..... پڑھتے ہوئے بے چارگی ہی محسوس ہوئی۔ کچھ خاص سبق دکھائی نہیں دیا۔ پاکیزہ کے سب سلسلے زبردست ہیں..... پلیز نایاب کا تفصیلی انٹرویو کریں..... مع تصویروں کے..... ان کی تحریر نے دل جیت لیا ہے۔'' (نایاب جیلانی شکریہ کہتی ہیں۔ ہم ان کا انٹرویو بھی ضرور شائع کریں گے)

✍ رضوانہ شکیل راؤ، لودھراں سے۔ ''18 سال پہلے جب میں اسکول کی شوخ و چنچل طالبہ تھی پہلی بار ہمت کی تھی پاکیزہ میں تبصرہ لکھ کر بھیجنے کی۔ دل کی طرح کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ مگر آج وہ کپکپاہٹ نہیں ہے وجہ.....؟ کیونکہ آج میں پانچ سالہ اسداللہ کی امی جانی اور ایک ہاؤس وائف ہوں۔ اتنے سال میں خود پاکیزہ سے غائب رہنے کا سبب نہیں جان سکی۔ اس لیے اجتناب ہی بہتر ہے۔ انسان اپنے محور اور مرکز سے ہٹ کر زیادہ دیر خوش نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے ہماری طبیعت اور فطرت نے ہمیں تبصرہ لکھنے پر مجبور کیا۔ ایک نئے جذبے، امنگ، ترنگ کے ساتھ محفل میں حاضر ہوں۔ امید ہے جگہ ملے گی بہنوں کی محفل میں سب بہنوں کے تبصرے قابلِ ستائش اور بھرپور محبت سے گندھے ہوتے ہیں۔ غائبانہ طور پر سب ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہوتی ہے اور انجم جی آپ کے خلوص اور محبت سے دیے گئے جوابات انسان کو بن مول ہی خرید لیتے ہیں۔ پاکیزہ کی اصل خوب صورتی کی وجہ محبت اور خلوص کے علاوہ آپ کی ان تھک محنت کا نتیجہ ہے کہ ہم اب پاکیزہ کو سب رسائل سے ایک الگ مقام دیتے ہیں۔ اگر آپ اداکاروں سے انٹرویو کا سلسلہ بھی شروع کردیں تو رسالے کو مزید چار چاند لگ جائیں گے۔ ٹائٹل خوب صورت لگا خاص طور پر ماڈل کے گجرے، اقبال بانو مدت بعد تفصیلی بات کرتی نظر آئیں۔ اچھا لگا ان کی باتیں ان کی طرح بہت اچھی اور پُرخلوص تھیں۔ عمیرہ احمد کو شادی کی ڈھیروں مبارک باد۔ نمرہ احمد سے کوئی اچھا سا ناول جلد لکھوائیں۔ انجم آپی آپ کے پاکیزہ کے لیے پاکیزہ کی دعائیں اگر محفل میں جگہ ملی تو ہم جیسے پرانے قارئین پھر حاضری دیں گے۔'' (رضوانہ گڑیا! دوبارہ بھرپور خوش آمدید..... تمہارے آنے سے یہ محفل مزید نکھر جائے گی بلکہ نکھر گئی ہے)

✍ طاہرہ کنول، کراچی سے۔ ''آپا! میں طاہرہ کنول..... میں نے پہلے بھی آپ کو خط لکھا تھا۔ معلوم نہیں آپ کو ملا کہ نہیں..... اس کے ساتھ میں نے کچھ غزلیں اور نظمیں بھی بھیجی تھیں..... برائے مہربانی آپا ان کی نوک پلک سنوار کر انہیں ہمارے پاکیزہ میں جگہ دے دیجیے..... پلیز۔'' (گڑیا! آپ غزلوں کے بجائے نثر میں اپنی نگارشات بھیجیں)

✍ فائزہ فاروق سحر، لاہور سے۔ ''پاکیزہ مل گیا..... بہت اچھا لگا..... اور رات گزارنے کو جب لائٹ چلی جاتی ہے تو ہم پاکیزہ پڑھتے رہے۔ بھئی اب عمر ہوگئی ہے اس طرح تو نہیں پڑھا جاتا کہ راتوں رات سب پڑھ لیا..... اب دس دن ایک رسالہ ختم کرنے میں لگ جاتے ہیں اس لیے کہ آنکھیں دکھنا شروع ہوجاتی ہیں۔ بند کرنا پڑتا ہے چاہے ناول ہو یا افسانہ..... بہت سے دن گزر گئے بہار کی مستیوں میں پھولوں کے ساتھ گیت گاتے، گاتے، ہنساتے ہوئے..... رب کی ثنا بیان کرتے ہوئے۔ اب تو ذرا سا دن چڑھا؟ لب پیا ہے..... آنکھیں بھیگنے لگتی ہیں گرمی سے..... اُف توبہ یہ گرمیاں کتنی ہوتی ہیں۔ دن کتنے لمبے تلخ اور گرم.....'' (مگر ہماری تحریریں تو اس گرمی کی شدت کو کم تو کردیتی ہیں ناں.....)

✍ شیریں ظفر، ملتان سے۔ ''سب سے اچھا خط ڈاکٹر ممتاز ضیا نے لکھا تھا۔ ان کے خط سے ہی ان کا خوب صورت مزاج چھلک آیا..... تبصرہ یہ کہ میں سو فیصد ان سے متفق ہوں..... میں نے ہر ہر خط کو کھنگال کے پڑھ ڈالا..... ام ثمامہ کا سندھ سے خط..... شائستہ زریں کا خط خوب تھا۔ ان سب کی طرح میں بھی آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ مجھے اپنا حصہ سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا تو کیا ہی کہنا..... انہیں اللہ نے اپنی خاص توفیق سے اتنی عزت بخشی ہے کہ قرآن پاک لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ تمام بہنیں یہ طریقہ جاننے کی کوشش کررہی ہیں اور انجم آپی آپ نے صالحہ کوثر کو پنجاب سے قرآن پاک کی طباعت کا طریقہ تو سمجھا دیا کہ آپ اپنی پسند اور سائز کا قرآن پاک لے کر لائنیں لگوالیں اور کالے رنگ کا پوائنٹر یوز کریں..... مگر یہ پاک کام تمام لوگوں کے کرنے کا نہیں ہے۔ پہلی بات ہی صادق آتی ہے کہ پہلے اس کو خوب، خوب پڑھا جائے کہ دل و دماغ میں گھر کر جائے۔ آپی کیا لکھائی کا خوب صورت اور واضح ہونا ضروری ہے؟ (بالکل) انجم آنٹی آپ نے کھلے اور دو بے الفاظ میں ماؤں کو بیٹیوں کے بارے میں جو تلقین کی ہے، میں اس سے سو فیصد متفق ہوں کہ مائیں اپنی آنکھیں کھلی رکھیں..... دس سال اور اس سے بڑی بچیوں کی مائیں تو رات کو اٹھ کر اپنے بچوں کو لازمی چیک کریں اور اپنا اور بچوں کا بیڈ روم اکٹھا کریں..... اور اپنے میاں جی کا بیڈ روم الگ کرلیں۔ پاکیزہ میں بہنوں کی محفل کے بعد میرا پسندیدہ ناول شام شہر یاراں ہے۔ عنیزہ جی! میں جانتی ہوں کہ لکھنا آسان کام نہیں..... مگر معذرت کے ساتھ واقعی آپ اپنے ناولز کے ساتھ پروفیشنلی ٹریٹ کررہی ہیں۔ آپ کے کردار بہت ہی پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا عقل، فہم اور ادراک، ان کا عشق، ان کا جذبہ سب کا سب بہت کاملیت لیے ہوئے ہے مگر مجھے یہ اَن نیچرل لگتا ہے۔ امانت میں رفعت سراج نے اور بھی بور کیا..... مجھے تو انتہائی بورنگ ناول لگ رہا ہے مگر رفعت سراج کی سینیارٹی اور گزشتہ لکھا ہوا میٹریل ہمیں کوئی بھی قسط مس کرنے سے روک رہا ہے۔ سترہ اقساط بور بور کرتے بھی پڑھ ڈالی ہیں۔ اصیل خان کو ماضی میں بہت امیر اور کاروباری دکھایا جاتا ہے تو کیا وہ مہر جان اور گل جان کا اتنا گناہ گار ہے کہ پوری دنیا تیاگ کے ان کے در پر غلام بنا پڑا ہے۔ خیر کچھ گناہ اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ تمام عمر ماتھا رگڑتے رہو..... انجام سے پناہ مانگتے رہو پھر بھی نتائج سامنے آکر رہتے ہیں..... رابی اور روما، اصیل خان کی بیٹیاں ہیں۔ یہ تو کنفرم ہے مگر کیا گل جان ان کی ماں ہے۔ یہ خیال میرے دل کو کھڑا کردیتا ہے کہ ہاں پھر تو واقعی امانت میں خیانت ہوئی ہے ناں..... رضوانہ پرنس نے اک نئے موڑ پر لکھا..... کیا خوب لکھا..... یقین جانیں، فاران کی ذہنیت نے خودداری کو اک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا۔ بالکل سچ، زبردست۔ شمیم ناز صدیقی کی تحریر دست نے اداس کردیا۔ ماں، باپ کا اٹوٹ رشتہ واقعی ان کے بعد دل و جان اور زندگی میں بہت بڑا خلا آجاتا ہے۔ رفاقت جاوید نے رشتہ بھروسے کا لکھا بہت ہی اچھی..... جہیز، ڈگری، اعلیٰ نوکری، گورا رنگ، لمبا قد، نوعمر، خوب صورت ماڈرن، خوش لباس و خوش گفتار جب شادی کا بندھن ان الفاظ کے جالے سے آزاد ہوتا ہے تو اب اس کو حق مہر کے بھاری بکسے میں ڈالا جاتا ہے۔ یہ وبا آج کل بہت عام ہے۔ لوگ اپنی بیٹیوں کی worth لگوا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ترکِ وفا میں نایاب جیلانی ہمیں جرمن زبان نہ سکھائیں، ہم ویسے ہی پڑھ کر خوش ہوجاتے..... مگر اس قسط میں تو کوئی خاص موومنٹ نہ ہوئی ناولٹ میں۔ اک قدم بھی آگے نہیں بڑھا۔ ہم نے مان لیا کہ مالا اور عیسیٰ ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے اور مون حسیب ان کی دشمن تھی پھر کیا ہوا نایاب جیلانی جی.....! جلدی بتائیں ناں.....؟ اس صدی کی محبت شکر ہے کہ سکینہ فرخ نے جلدی سمیٹ لی۔ پرانی کہانی کو نئے، نئے ریپر لپیٹ کر لانے کی آپ کی کیا مجبوری تھی۔ سکینہ آپ تو بہت اچھی رائٹر ہیں۔ سا افسانوں میں کوئی افسانہ انعامی ہوتا تو میں عقیلہ حق کے حجاب کو انعام یافتہ افسانہ کہتی۔ سچ حجاب کی مجبوری نے میرے آنسو رواں کردیے۔ عقیلہ حق آپ نے حق لکھا..... جزاک اللہ انجم آنٹی آپ واقعی جلتر نگ لکھ کر کمال کرتی ہیں اور اس بار آپ نے اس ناچیز جیسی کئی فینز کا دل خوش کردیا اقبال بانو سے ملوا کر۔'' (تفصیلی تبصرے کا شکریہ..... مگر اس دفعہ آپ نے تبصرہ قلم کے بجائے تلوار سے لکھا ہے)

✍ تسیم تاج، لاہور سے۔ ''آپ کو پچھلے ماہ خط لکھا تھا۔ جس پر آپ کا فون آیا تو جہاں مجھے ڈھیروں خوشی اور حوصلہ ملا وہیں پر خود کو لاکھ بار نفرین بھی بھیجی کہ میں نے آپ کو آپ کے فون کی بات کے بارے میں کیوں لکھا اور آپ کا سوری کہنا مجھے شرم سے غرق کر گیا..... میں بہت، بہت معافی چاہتی ہوں اور آپ نے مجھے جو نوافل شکرانے اور توبہ اور حاجت کے پڑھنے کے لیے کہا ہے تو میں عرصہ دراز سے پڑھتی آرہی ہوں۔ اب دو نفل حاجت کے بھی شامل کیے لیتی ہوں اور جو چار حرف 500

بار روز پڑھنے کے لیے کہا ہے وہ بھی شروع کردیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس قدر محبت وفکر پر بہت زیادہ جزائے خیر دے گا۔ میری ہر دعا میں آپ شامل رہتی ہیں۔ بہنوں کی محفل اور قسط وار ناول جو ہیں وہی پڑھ پائی ہوں۔ آپ کا اداریہ رسالے کی جان ہوتا ہے۔ آپ اس قدر خوب صورتی سے معاشرتی، معاشی اور انفرادی واجتماعی وقومی وملی موضوعات پر بات کرتی ہیں کہ دل میں ہر بات اتر جاتی ہے۔ میں نے آپ کے تمام اداریے الگ سے سنبھال کر رکھے ہیں۔ یقین مانیں آنٹی اگر آپ صرف ان اداریوں کو ایک جگہ پر جمع کر کے ایک کتابی شکل دیں تو ایک اور جامع کتاب بن سکتی ہے اور کمال تو یہ ہے کہ ہر موضوع اس نوعیت کا ہے اور اس انداز سے لکھا گیا ہے کہ لگتا ہے کہ یہ سب ہی آج کے حالات پر ہے۔ خواہ وہ دس سال پرانا اداریہ ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کا اندازِ تحریر اور گفتگو نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں کو ایک نئی امید اور نئی زندگی کی سوچ پر ڈالتا ہے جو بہت بڑا صدقۂ جاریہ ہے۔" (تم میرے اداریے سنبھال کر رکھو...... میں کتاب شائع کروں گی...... دیگر باتوں کے لیے فون کرلینا)

✉ ہانیہ بتول، لالہ موسیٰ سے۔ "امانت کی کیا ہی بات ہے...... رفعت سراج کا قلم بہت عظیم قلم ہے...... شاہکار ناول لاتا ہے۔ عنیزہ جی بھی زبردست جا رہی ہیں...... صائمہ اکرم کا افسانہ بس سو، سو تھا۔ باقی افسانوں میں رفاقت جاوید بازی لے گئیں۔ ناولٹ، ستارہ ہو کہ دل بھی دل کو لگا...... سکینہ فرخ کا ناول اے ون رہا۔ ایسے ہی اینڈ کا انتظار تھا۔ سلمان کی خود غرضی پہ تاؤ چڑھا۔ ترکِ وفا کی کیا بات ہے، اپنے سحر میں جکڑ ہی لیا...... نایاب کا نام پاکیزہ میں نیا ہے؟ تاہم ان کی تحریر سے قطعاً قطعاً نہیں ہوا کہ وہ نئی لکھاری ہیں۔ (یہ کافی پرانی اور تجربہ کار لکھاری ہیں) مون حسیب ایک غیر معمولی کردار ہے۔ مالا کی معصومیت سے خوف آتا ہے کہ کہیں نقصان نہ اٹھا لے۔ کہانی میں نئے کردار کا اضافہ خوش آئند رہا...... عیسیٰ کی مالا کے لیے محبت سے محبت ہوگئی۔ مون کی پُراسراریت خوف زدہ کرتی ہے۔ وہ غیر معمولی لڑکی دکھائی دی۔ آگے جاننے کے لیے بے چینی ہے۔ تمام رائٹرز کو میری طرف سے تعریفی کلمات پہنچا دیں۔ بانو آپا کا انٹرویو یادگار انٹرویو تھا۔" (نوازش)

✉ شمسہ رضوان، گلستان جوہر سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے میں فیملی سسٹم کے بارے میں آپ نے بالکل صحیح کہا بلکہ میرا یہ سوچنا ہے کہ اعتدال ایسا لفظ ہے جو ہر کام، رشتہ، خواہش سب کو کنٹرول میں رکھتا ہے اگر پیار، نصیحت، غصہ، تنقید سب میں اعتدال سے کام لیا جائے تو بہت سے مسائل کم ہو سکتے ہیں۔ افسانے، ناولٹ تمام ہی اچھے تھے مگر جلترنگ میں سچ کو آنچ...... مینار محبت پڑھ کر بے اختیار ہنسی کے جلترنگ ایسے بجے کہ دیر تک دماغ میں جیسے گھوم گھوم کرلبوں پر ہنسی بکھیرتے گئے اللہ آپ کے لبوں پر بھی ہمیشہ ہنسی رکھے ہر پریشانی سے دور رکھے (آمین) گرمی کے ساتھ ساتھ جون، جولائی کی فیس، سالانہ فیس کورس کتابیں یونیفارم کی قطار شروع ہو جاتی ہے ایسے میں وہ تے داریاں یاد رہتی ہیں اور ہنسی کہاں غائب ہوتی ہے پتا نہیں مگر جلترنگ جیسی بے ساختہ تحریریں ہمارے موڈ کو شگفتگی کی جانب ڈال دیتی ہیں اور ہمارے کام آسان ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک ہوا انجم آنٹی۔ فریدہ فری کی غزل اچھی لگی مگر نجن غزل صدف نورین کی بہت مزیدار لگی۔" (تبصرے کا شکریہ، دیگر باتوں کے لیے تم مجھے کسی دن فون کرلو 021-36981952)

✉ فرزانہ عزیز جانی، پنجاب سے۔ "پاکیزہ سے میرا کوئی دس بارہ سالوں سے تعلق ہے۔ کبھی کبھی آپ کو خط لکھتی ہوں تو آپ شائع بھی کرتی ہیں۔ مستقل قاری ہوں۔ اب تو اخبار والے سے لگوا لیا ہے۔ ہر ماہ آرام سے گھر میں مل جاتا ہے۔ تین چار دنوں میں پڑھ لیتی ہوں پھر اگلے ماہ کا انتظار...... تو یہ کوئی مجھ سے پوچھے...... پاکیزہ میں لگتا ہے کہ موتی پروئے ہوئے ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر رائٹرز میرا دل کرتا ہے کہ میں مستقل تبصرہ نگار بن جاؤں مگر فرصت ہی نہیں ملتی۔ سوچتی ہوں کہ آپ کو کوئی غزل یا کوئی تحریر جو میری نہیں بلکہ پسند ہو تو بھیجوں مگر آپ ہنسیں گی تو پھر ارادہ ترک کر دیتی ہوں...... لیکن اب دو بھیج رہی ہوں اگر گنجائش ہو تو شائع کریں ورنہ میرا مقدر تو کری میں۔" (فرزانہ اس محفل میں خوش آمدید...... آپ نے دونوں غزلیں خط کی کمر پر لکھ دیں۔ آئندہ علیحدہ کاغذ پر لکھ کر بھیجیے گا تو ضرور شائع ہوں گی)

✉ طیبہ عنصر مغل، راولپنڈی سے۔ "سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے سے شروع کیا تو آپ نے ہمارے دل کی بات چھین لی کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔ وہ ین کی باتیں ہمیشہ کی طرح دل کو چھو گئیں۔ اب بات کرتے ہیں محترمہ رفعت سراج کے ناول امانت کی...... اس دفعہ تو بہت سی گرہیں کھلتی چلی گئی ہیں۔ صائمہ اکرم کا بے چاری مختصر لیکن مزیدار تھا خوب چٹخارے لے کر پڑھا۔ نایاب جیلانی کا ترکِ وفا اچھا ہے اس میں جو جرمنی کی معلومات ہیں وہ انتہائی حیرت انگیز اور دلچسپ ہیں۔ رشتہ بھروسے کا کے ساتھ رفاقت جاوید نے ہمیں حق مہر کی حقیقت سمجھائی کہ ہمیں اپنی بچیوں کو اس قابل بنانا چاہیے کہ وہ اپنے

پیروں پر کھڑی ہو سکیں نہ کہ بڑے حق مہر کو ضمانت سمجھنا چاہیے۔ رضوانہ پرنس جی نے بھی اپنے ناول کا اختتام بالآخر کر دیا۔ واقعی یہ ایک دل فریب روداد تھی اور جانے کیوں ایسا لگا جیسے کوئی سچی کہانی ہو...... حجاب تحریر کر کے عقیلہ حق نے تحریر کا حق ادا کر دیا...... زبردست اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ...... آمین۔ عنیزہ سید جی کی شام شہر یاراں زبردست تحریر ہے قاری کو اپنے ساتھ ساتھ لیے چلتی ہے محسوس ہوا کہ اپنے اختتامی مراحل کی طرف گامزن ہے۔ ارجمند مغل کی احتجاج ایک ایسی تحریر تھی جس میں دو سبق تھے ایک اسکول کے ڈسپلن کو قائم کرنے کا طریقہ دوسرا پرندوں کا خیال بھی رکھنا...... اچھی لگی۔ سیمار ضاردا کی ستارہ ہو کہ دل کچھ فلمی تھی اور طویل بھی مکروں کو پڑھتے ہوئے ناگوار نہیں لگی۔ تہی دست نے تو ہمارا دل نکال لیا کیونکہ ہم بھی ان بدنصیبوں میں سے ہیں جو چند سال قبل اپنی ماں کو کھو بیٹھے اور بھلا نہیں پا رہے۔ سکینہ فرخ کی کہانی کا اختتام ہماری توقعات کے عین مطابق تھا۔ عائلہ نے بالکل درست وقت پر درست فیصلہ کیا اور مایہ ناز مصنفہ اقبال بانو کے اتنے خوب صورت انٹرویو پر بہت بہت مبارک باد...... بہنوں کی محفل، سندیسے، جلترنگ سب خوب صورت...... کس کی تعریف نہ کی جائے ہر چیز اپنی جگہ مکمل...... عقلی آفاق میں انجم آپی کے تمام اوصاف نظر آرہے ہیں۔ پاکیزہ ڈائری کو کمال سے سجاتی ہیں۔" (نوازش)

✉ فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ "بر ہان نے ٹھیک کیا، اصل خان کی اصلیت رفتہ رفتہ واضح ہو رہی ہے۔ صائمہ اکرم کی بے چاری واقعی بے چاری کی سوچ درست رہی۔ ہلکی پھلکی تحریر پسند آگئی۔ ترکِ وفا بہت مزیدار لگ رہی ہے۔ سسپنس برقرار ہے آخر علی عیسیٰ اتنی محبت کے بعد نفرت کیسے کرے گا؟ مون کے کردار سے نفرت ہوتی ہے، کچھ بھی ہو جرمنی کی صفائی ستھرائی اور ماحول کی دلکشی پر دل خوش ہوتا ہے۔ رفاقت جاوید کا رشتہ بھروسے کا میری تو آنکھیں فائزہ کی بے بسی و بے کسی پر بار بار بھر آرہی تھیں، آخر پیمانۂ صبر چھلک ہی گیا ماں...... اک نئے موڑ پر اختتام اگر خوشگوار اور مثبت ہوتا تو نئے انداز سے زندگی گزارنے کا ڈھنگ ملتا اور گھر بھی سلامت رہتا، فاران بھی...... زنیرا کے حصے میں بھی خوشیاں واپس آجاتیں، چلیں جی رضوانہ جی کی مرضی...... عنیزہ سید اپنے منفرد و مخصوص انداز میں شہر یاراں کو دھیمی رفتار سے آگے بڑھا رہی ہیں، میرال کو اس کا صحیح مقام ملنا چاہیے ورنہ اعتبار اٹھ جائے گا۔ احتجاج، بھوک سے نبرد آزما ہونے والوں کے لیے منفرد رہا۔ ستارہ ہو کہ دل بس ٹھیک لگا۔ نسیم صدیقی کا تہی دست رُلا گیا۔ ماں کی کمی، ماں کے بنا وقت گزارنے والے ہی جان سکتے ہیں۔ اس صدی کی محبت اچھا لگا۔ دوسرا حصہ مگر بے حد طوالت اختیار کر گیا۔ دوسروں کو نیچا دکھانے والے مغرور لوگوں کا سر خدا جھکاتا ہے۔ بہت شکریہ باجی اقبال بانو آپ نے مجھ ناچیز کو یاد رکھا اور مجھے آج تک آپ کی ملاقات یاد ہے۔" (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

آئیے رخصت ہونے سے قبل دعا مانگتے ہیں، پہلے درود شریف پڑھ لیں جبکہ ہمیشہ دعا مانگنے سے پہلے اور بعد میں درود شریف پڑھنا اپنی عادت بنالیں۔ یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم میرے جسم کو شفا...... دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما دے اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ مجھے ملتا رہے۔ یا رب العالمین...... تو مجھ سے، میری اولاد سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا...... ہر گناہ، ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور دونوں جہان میں مجھے خیر عطا فرمانا اور میرے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا۔ زمین آسمان کے درمیان جتنے بھی شر ور ہیں ان سب سے بھی بچانا کہ بے شک تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیب یا مجیب یا مجیب

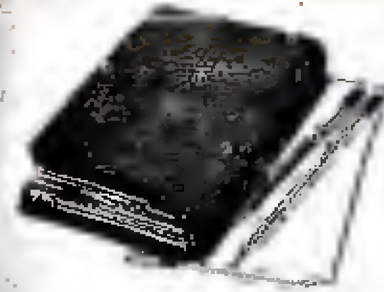
دعاگو...... آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ C.63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ، کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

پاکیزہ ڈائری

آفاق سعید



اللہ اللہ اللہ ھو

لا الہ الا ھو
تجھ سے ہے میری یہی دعا
معاف تو کردے میری ہر اک خطا
نام ہے غفار تیرا
اللہ اللہ اللہ ھو

لا الہ الا ھو
جب بھی پڑی مشکل کوئی
تو نے جگائی قسمت میری
مولا ہے بڑا رحمٰن میرا
اللہ اللہ اللہ ھو

لا الہ الا ھو
تو غفور بھی تو شکور بھی
تو صبور بھی تو ہی نور بھی
تو رحیم ہے، تو رحمٰن ہے
اور بڑا ہی مہربان ہے
اللہ اللہ اللہ ھو

لا الہ الا ھو

شاعرہ: ساریہ چوہدری، گجرات ڈوگا

نعت

جب یاد محمد ﷺ آتی ہے دل چپکے چپکے روتا ہے
صرف آپ ہی اپنے ہیں ورنہ یاں کون کسی کا ہوتا ہے
تنہا تنہا بوجھل بوجھل سب راتیں اور سارے دن
صبحِ بہاراں کب آئے گی سارا شہر تو سوتا ہے
وقت کا پنچھی اڑتا جائے ڈور کسی کے ہاتھ نہ آئے
جاگ اٹھو اے دنیا والو جانا پل کب آتا ہے
نورِ نبیؐ کو دل میں بسالو اپنی دنیا آپ سجالو
عشقِ نبیؐ میں اشک بہالو دل کا نگر یوں بستا ہے

عشقِ نبی ﷺ میں خود کو مٹا کر کیا کھویا کیا پایا ہے
دیکھنے والا دیکھ رہا ہے کچھ کھویا نہیں سب پایا ہے

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

مرسلہ: عذرا بی بی، راول پنڈی

دعا

میں ہوں، میرا رب ہو اور حرم ہو میرے آگے
آنکھوں میں بسالوں جو حرم ہو میرے آگے
سینہ میرا روشن ہو تیرے نور سے یارب
ہونٹوں پہ ہو ذکر تیرا جو حرم ہو میرے آگے
لفظوں میں تیری حمد و ثنا ہو میرے مولا
دل کعبہ بنالوں جو حرم ہو میرے آگے
ہاتھوں میں ہو لرزش نہ پاؤں میں تھکن ہو
کیسے جاؤں طواف ہر دم جو حرم ہو میرے آگے
سجدے میں رہوں ہر پل، سر کو نہ اٹھاؤں
مر جاؤں بھی تو کیا غم جو حرم ہو میرے آگے

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

روزے میں غصے سے پرہیز

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ ”یہ مواسات کا مہینہ ہے، ایک دوسرے سے غم خواری کا مہینہ ہے، لہٰذا غصہ اور غصے کی وجہ سے سرزد ہونے والے جرائم اور گناہ مثلاً جھگڑا، مار پٹائی اور تو تکار...... ان چیزوں سے پرہیز کا اہتمام کریں...... حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ

ترجمہ! اگر کوئی شخص تم سے جہالت اور لڑائی کی بات کرنے تو تم کہہ دو کہ میرا روزہ ہے، یعنی میں لڑنے کے لیے تیار نہیں، نہ زبان سے لڑنے کے لیے تیار ہوں اور نہ ہاتھ سے، اس سے پرہیز کریں، یہ سب بنیادی کام ہیں۔ مرسلہ: ڈولی مسرت، دبئی

رمضان میں نفلی عبادات زیادہ کریں

نبی کریم ﷺ رمضان کے مہینے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ پورے قرآن کریم کا دور فرمایا کرتے تھے...... اس لیے جتنا زیادہ سے زیادہ ہو سکے اس مہینے میں تلاوت کریں اور اس کے علاوہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے زبان پر ذکر اللہ جاری رکھیں...... اور تیسرا کلمہ، درود شریف اور استغفار کثرت سے پڑھیں...... اور نوافل کی جتنی کثرت ہو سکے کریں...... عام دنوں میں رات کو اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنے کی اگر توفیق نہیں ملتی لیکن ماہ رمضان میں چونکہ انسان سحری کے لیے اٹھتا ہے تو تھوڑا پہلے اٹھ جائے اور سحری سے پہلے تہجد پڑھنے کو معمول بنالے تو اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوگی...... اس کے ساتھ، ساتھ ہم سب کو گناہوں سے بچنے کی فکر کرنی چاہیے۔ ماہ رمضان میں روزانہ توبہ کے نفل لازمی پڑھنے چاہئیں۔

مرسلہ: سنبل ملک، شاہدرہ

خدا کی قدرت

خدا وہ ہے جو وہیل مچھلی کو روزانہ سمندر میں 33 ٹن گوشت کھلاتا ہے جبکہ 1 ٹن میں 28 من گوشت آتا ہے اور 33 ٹن میں ٹوٹل 924 من گوشت ہوتا ہے جو کہ 36960 کلو بنتا ہے۔

اس لیے مانگو خدا سے جو دیتا ہے خوشی سے اور کہتا نہیں کسی سے۔

”تو تم اپنے رب کی کون، کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔“

مرسلہ: زریں زبیر کوٹھاری، کراچی

اہل عمل کے نام

وہ سارے حرف روشن ہیں
جو کردار بناتے ہیں
بدیوں سے عبرت کے بیج
نیکی کے پھول اگاتے ہیں
اہلِ شہادت مر کر بھی
گل زمین کو بچاتے ہیں
اہلِ سخاوت، اہلِ جمال
زندگی گلزار بناتے ہیں
مخلص ساتھی، مخلص دوست
ہر ممکن ساتھ نبھاتے ہیں
کوثر ہم تو ہر پل بس
دعاؤں کے شجر سجاتے ہیں

شاعرہ: کوثر خالد، جڑانوالہ

رمضان المبارک کے اہم واقعات

☆ یکم رمضان حضرت عیسیٰ پر انجیل نازل ہوئی۔

☆ صحائفِ آسمانی حضرت ابراہیمؑ پر نازل ہوئے۔

☆ یکم رمضان 9 ہجری کو مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان جنگِ تبوک ہوئی۔

☆ ۲ رمضان کو فتح مکہ اور مروۃ الفتح کا واقع پیش آیا۔

☆ ۶ رمضان کو حضرت موسیٰؑ پر تورات نازل ہوئی

☆ ۶ رمضان کو حضورؐ کے چچا حضرت ابو طالبؓ نے وفات پائی۔

☆ ۷ رمضان کو حضور اکرمؐ اپنے اصحابؓ کے ساتھ جنگِ بدر کے لیے روانہ ہوئے۔

☆ ۹ رمضان کو حضرت یحییٰؑ پیدا ہوئے۔

☆ ۱۰ رمضان کو زوجہ رسول ﷺ خدا ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے رحلت فرمائی۔

☆۱۲ رمضان کو رسول اکرم ﷺ نے مدینے میں مہاجرین و انصار کے درمیان اخوت کا رشتہ باندھا جسے مواخاۃ کہتے ہیں اس روز آیہ انما المومنون اخوہ نازل ہوئی۔

☆۱۵ رمضان کو رسول اللہ کے سبطِ اکبر امام حسنؓ کی ولادت ہوئی۔

☆۱۷ رمضان زوجۂ رسول خدا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے رحلت فرمائی۔

☆۱۸ رمضان کو غزوۂ بدرِ کبریٰ کا واقعہ پیش آیا۔

☆۱۸ رمضان کو حضرت داؤدؑ پر زبور نازل ہوئی۔

☆۱۹ رمضان کو چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سر مبارک پر ابنِ ملجم مرادی نے مسجدِ کوفہ میں ضرب لگائی۔

☆۲۱ رمضان کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے شہادت پائی۔

☆۲۱ رمضان کو حضرت عیسیٰ آسمان پر اٹھائے گئے۔

☆۲۷ رمضان کو آخری آسمانی کتاب قرآن مجید، فرقانِ حمید رسول اکرم ﷺ پر نازل ہوئی۔

☆۲۷ رمضان کو ہم سب کا وطن، ہمارا پیارا ملک پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔

نوٹ: یہ تاریخی معلومات روایاتِ متفرق کی بنا پر ہیں اگر کسی کو اختلاف ہو تو وہ رائے دینے کا حق رکھتا ہے۔

بہت پیاری معلومات

اندلس کے مشہور سیاح محمد بن جبیر (متوفی 27 شعبان 614ھ) نے بدر کے حال میں لکھا ہے۔ اس موضع میں خرما کے بہت باغات ہیں اور آبِ رواں کا ایک چشمہ ہے۔ موضع کا قلعہ بلند ٹیلے پر ہے اور قلعے کا راستہ پہاڑوں کے بیچ میں ہے...... آج کل بھی اس زمین میں خرما کا باغ ہے اور اس کے بیچ میں گنجِ شہیداں ہے۔ اس آبادی میں داخل ہوتے وقت بائیں طرف جبلُ الرحمت ہے، لڑائی کے دن اس پہاڑ پر فرشتے اترے تھے۔ اس پہاڑ کے ساتھ جبل الطبول ہے۔ اس کی وضع قطع ریت کے ٹیلے کی سی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر جمعے کی شب کو اس پہاڑ سے نقارے کی صدا آتی ہے۔ اس لیے اس کا نام جبل الطبول رکھا گیا ہے۔ اس بستی کے ایک عرب باشندے نے بیان دیا میں نے اپنے کانوں سے نقارے کی آواز سنی ہے۔ جبل الطبول کی سطح کے قریب آنحضرت ﷺ کے تشریف رکھنے کی جگہ ہے۔ اس کے سامنے میدان جنگ ہے۔

اسی سال یومِ فطر سے دو دن پہلے یا شروع شوال میں، صدقہ، فطر واجب ہوا...... زکوٰۃ فرض ہوئی، عید کے دن نمازِ عید الفطر عید گاہ میں جماعت سے پڑھی گئی۔

رازِ سیرت رسول ﷺ

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

قابل پرستش

خوب صورتی اور بدصورتی سب فانی چیزیں ہیں۔ ان چیزوں کی طلب کی جاسکتی ہے۔ پرستش نہیں کی جاسکتی۔

قابلِ پرستش تو وہ لوگ ہیں جو حُسنِ اخلاق کی دولت سے مالا مال ہیں...... انسان کے اچھے اعمال ہی اسے حسن عطا کرتے ہیں۔

مرسلہ: انیلا ناہید، لیہ

غزل

ہر شخص کی اصلی و صحیح شکل دکھا دی
صد شکر کہ الفت نے مجھے عقل سکھا دی
دیکھے ہیں ہر ہاتھ میں جو اپنے ہی لیے سنگ
سر پہلے ہی زانو پہ تھا گردن بھی جھکا دی
کیوں ذکر نہ ہو تیرا ہر اک شعر میں میرے
تو نے رخِ رنگیں سے میرے فن کو جلا دی
سمجھوں تھی زمانے کو بھی جانوں تھی تجھے بھی
کیا جانیے کس آس پہ پھر خود کو سزا دی
جاتے ہوئے دیکھا تھا اسے تیری ہی جانب
پلٹی نہیں عاقی گو اسے لاکھ صدا دی

شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

فیس بک ناشتا

حمید صاحب...... صبح سویرے فیس بک کھول کر بیٹھ گئے، ان کی آفس کی سیکریٹری نے سینڈوچ کی تصویر اپ لوڈ کی اور لکھا "آئیں سر......! ہمارے ساتھ ناشتا کرلیں۔"

شوہر نے لائیک کیا...... بیوی نے کمنٹ پڑھ لیا اور حمید صاحب کو ناشتا نہیں دیا۔ پانچ گھنٹے بھوکا رہنے کے بعد بیوی بولی۔

"لنچ گھر پر کرو گے یا فیس بک پر......؟"

مرسلہ: نور افشاں، شکار پور

شادی کی سالگرہ

میاں، بیوی نے اپنی شادی کی سالگرہ پر ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ بیوی نے بڑے شوق ذوق سے کھانے تیار کیے۔ مہمان جمع تھے۔ خوش گپیوں اور مشروبات وغیرہ کا دور چل رہا تھا۔ ایک دوسرے کو لطیفے سنائے جارہے تھے۔ قہقہے گونج رہے تھے۔ ایسے میں شوہر نے اپنی بیوی سے کہا...... کیا خیال ہے کہ مہمانوں کو کچھ دیر اور لطف اندوز ہونے دیا جائے...... یا پھر تمہارے ہاتھ کے پکے کھانے لگوا دیے جائیں......؟

مرسلہ: نگینہ ضیا بخش، کراچی

اگر کبھی

اگر کبھی میری یاد آئے تو
چاند راتوں کی دل گیر روشنی میں
کسی ستارے کو دیکھ لینا
اگر وہ نخلِ فلک سے اڑ کر
تمہارے قدموں میں آگرے تو
یہ جان لینا
وہ استعارہ تھا میرے دل کا
اگر نہ آئے......؟
مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے
کہ تم کسی پہ نگاہ ڈالو
تو اس کی دیوارِ جاں نہ ٹوٹے
وہ اپنی ہستی نہ بھول جائے
گردش کرتی ہوا کی لہروں پہ ہاتھ رکھنا
میں خوشبوؤں میں تمہیں ملوں گا
مجھے گلابوں کی پتیوں میں تلاش کرنا
میں اوس قطروں کے آئینے میں تمہیں ملوں گا

شاعر: امجد اسلام امجد

پسند: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

ویسی ہی

شاید وہ آجائے
کچھ جی ٹھہر جائے
وہ آیا، آکر چلا بھی گیا
اداسی پھر بھی ویسی ہے
نہیں کرنی کسی سے بھی باتیں
بس شاعری ڈائری کرنی ہے
شاعری بھی کر کے دیکھ لی
اداسی پھر بھی ویسی ہے

کاوش: عنبرین کاظمی اشک، فیصل آباد

سکون

ڈاکٹر: آپ کے شوہر کو مکمل سکون کی ضرورت ہے۔ یہ نیند کی گولیاں ہیں۔

بیوی: یہ میں انہیں کس وقت دوں؟

ڈاکٹر: یہ آپ نے کھانی ہیں......

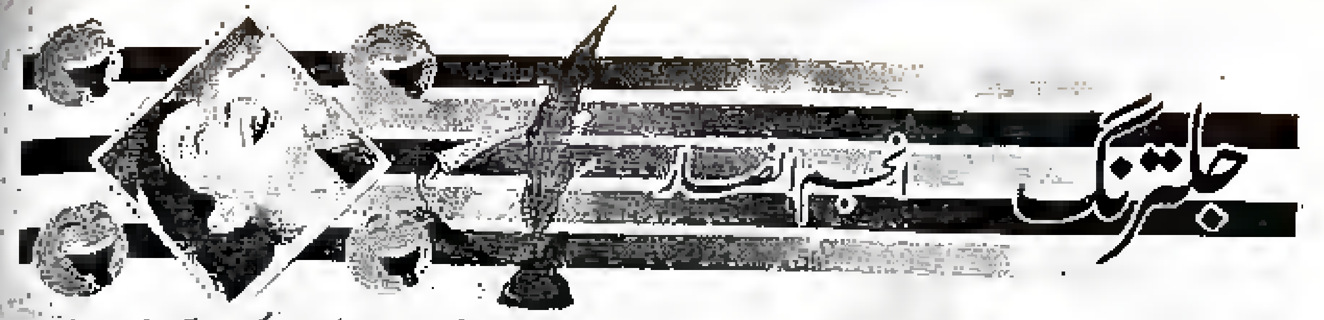
از: مہرین ضیا بخش، کراچی

رحم

ایک آدمی دعا مانگتے ہوئے۔

"یارب تو نے بچپن دیا، واپس لیا، جوانی دی، واپس لی، پیسہ دیا، واپس لیا، بیوی دی، دے کر بھول ہی گیا۔ رحم فرما، رحم فرما۔"

از: حفصہ دلدار خان، کوہاٹ



میرے وہ......!

بڑے دو بھائیوں کی جب سے کراچی میں جاب لگی تھی۔ ان کا یہی اصرار تھا، ہم اپنا گاؤں چھوڑ کر کراچی آبسیں، یہاں زندگی ہوا کی رفتار سے زیادہ تیز ہے۔ اماں نے تو جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ یہاں ان کا دل جو لگا ہوا تھا۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر وہ جو گھومنے نکلتی تھیں تو شام سے ذرا پہلے ہی گھر میں داخل ہوتی تھیں اور ہر روز جانے کے ان کے پاس بے شمار جواز ہوتے تھے۔

نانی کے دانت میں درد تھا...... آپا کی آنکھ صبح پھڑک اٹھی تھی...... ابا میاں کی بکری چارا نہیں کھا رہی تھی...... مرغیوں کو آٹے کی گولیوں میں لہسن کھلانا تھا...... ہمسائے کی بچی کو نظر لگ گئی تھی...... خالہ کی بیٹی کی منگنی ہونے والی تھی...... بڑی خالہ کو دوسرے گاؤں کے رشتے دار دیکھنے آرہے تھے...... ماموں کی ممانی سے لڑائی ہو گئی تھی...... ممانی کی طبیعت صاف کرنی تھی...... وغیرہ وغیرہ......

"اماں آپ کراچی آکر گاؤں کو بھول جائیں گی بلکہ یہ کہیں گی کہ میں گاؤں نہیں جاؤں گی۔ ڈولی رکھ دو کہارو......" بھیا نے ان کے زمانے کا گیت انتہائی بری آواز میں گا کر سنایا تو وہ غصے میں آکر بولیں۔

"خالد تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا...... کیا کوئی اپنی ماں کے بغیر بھی رہ سکتا ہے۔ یہ گاؤں تو میرا میکا ہے۔ یہاں میری ماں رہتی ہے...... میرا یہاں کے علاوہ کہیں دل ہی نہیں لگ سکتا۔"

اور پھر یوں ہوا کہ ہم سب کراچی آگئے اور اماں کا یہاں اتنا دل لگا کہ وہ واقعی گاؤں جانا بھول گئیں۔

"نانی کا خط آتا...... حاجراں تو آکے مل لے......" تو اماں تنک کر کہتیں۔

"جس کے پاس فالتو کا ٹائم ہو وہ آنے جانے میں وقت ضائع کرے...... یہاں وقت کس کے پاس ہے۔"

تب ابو جی، اماں کی باتیں سن کر مسکراتے رہتے۔

یہاں بھائی کو ان کی کمپنی کی طرف سے اچھا بڑا سا گھر ملا تھا جس میں وہ تمام آسائشات تھیں جن کا ہم ذکر تو ضرور سنتے تھے مگر کبھی استعمال نہیں کی تھیں...... اب اے سی میں سوتے تھے، گاڑی میں بیٹھ کر جاتے تھے...... ہمارے غسل خانوں میں گرم اور ٹھنڈا پانی آتا تھا۔ گاؤں کے اسکول میں تو بھی ہم پاس ہو جاتے تھے اور کبھی فیل اتنی فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ اسکول کی ہیڈ مسٹریس کو جس سال اماں نے گندم کی بوری دی تھی اس نے مجھے نہ صرف کلاس کا مانیٹر بنا دیا تھا بلکہ امتحان میں فرسٹ آنے کا اعزاز علیحدہ دلوایا تھا...... اماں کا یہ خیال تھا کہ شاید میں بہت ذہین ہوں اور مجھے بھی اپنے بارے میں یہی اندازہ ہو گیا تھا...... (نہ جانے کیوں) کہ میں دیگر لڑکیوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ذہین و فطین سی ہوں...... اس لیے جب شہر آکر اماں نے مجھے ایک کلاس اوپر داخلہ دلوایا تو پہلے تو میں بہت خوش ہوئی کہ یہاں مقیم اپنے رشتے داروں کے سامنے تو فخر کا احساس بھی ہوا تھا مگر جب بعد میں پڑھائی کا بوجھ سامنے آیا تو دن میں تارے نظر آنے لگے...... باقی مضامین میں تو مجھے کوئی ایسی پریشانی نہیں تھی، میری اردو اچھی تھی اور یاسمین میری گہری سہیلی تھی، وہ میرے برابر بیٹھتی تھی۔ اس لیے مجھے نقل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی...... لگ بھگ میرے اور اس کے نمبر ایک جیسے ہی آتے تھے۔

ایک مرتبہ عجیب اتفاق ہوا...... میں نے اس کی نقل میں سارے پرچے دیے اور نمبر اس سے کہیں

زیادہ آئے...... یہی بات یاسمین کو بری لگ گئی۔ حالانکہ برا ماننے کی تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ خود اپنے آگے بیٹھی ہوئی فارحہ کی نقل کرتی تھی۔ میں نسرین کو نقل کرواتی تھی۔ میں نے تو نسرین پر کبھی احسان تک نہیں جتایا تھا مگر یاسمین مجھ سے ناراض ہو گئی اور کہنے لگی۔

"مسرت...... اب تم سے مل کر مجھے بالکل بھی مسرت نہیں ہوتی...... تم اپنی جگہ بدل لو......"

"اے ہے...... میں کیوں جگہ بدلوں...... تم خود بدل لو......" مجھے اس کی بات پر تاؤ ہی تو آگیا تھا۔

"اگر تم پیچھے کی سیٹ پر نہیں جاؤ گی تو میں میڈم شازیہ سے کہہ دوں گی کہ تم میری کاپی سے نقل کرتی ہو۔" اب وہ اوچھے پن پر اتر آئی تھی۔

شہر کی لڑکیاں کتنی فتنی ہوا کرتی ہیں اس کا احساس مجھے فوراً ہوا اور عافیت یہی جانی کہ اپنی جگہ تبدیل کرلوں۔ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ کر بہت سی خوشیاں مجھے ملیں...... کلاس میں سب سے آخری نشستوں پر بیٹھنے والی لڑکیاں پڑھنے کے علاوہ دیگر دلچسپیوں کی بھی حامل ہوتی ہیں۔

نازیہ اپنے البم دکھاتی رہتی...... آگے پڑھانے والی ٹیچر کو قطعی علم ہی نہیں ہوتا کہ ان کی باتیں سنی جارہی ہیں یا پیچھے باتیں ہو رہی ہیں۔

"گرلز آپ کی سمجھ میں میری بات آئی......"

میڈم توقیر جب بھاری بھرکم آواز میں پوچھا کرتیں تو لیس مس کا نعرہ ہمارا گروپ لگاتا۔

یہاں نقل کرنے کی مجھے مزید آسانیاں فراہم ہوئیں...... کتاب کھول کر، کاپی کے نیچے رکھ کر لکھنا مزید آسان سا لگا اور اچھے نمبر نہ صرف ماہانہ ٹیسٹوں میں آنے لگے بلکہ سالانہ امتحان میں بھی سرخروئی حاصل ہوئی۔

انگریزی کے مضمون سے مجھے سخت نفرت تھی اگر یہ اردو میں ہوتا تو پڑھائی اتنی مشکل نہ تھی۔ میں دیگر لڑکیوں کی طرح بہت سے دلائل دینا بھی سیکھ گئی تھی۔ جس میں انگریزی سے بیزاری کا اظہار ہوتا۔

"آخر جاپانی بھی تو صرف اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور کتنے آگے ہیں، ہمیں کیا ضرورت ہے انگریزی پڑھنے کی۔"

مگر ایک گاؤں سے آئی ہوئی لڑکی کی آواز میں کتنا دم خم ہو سکتا ہے، میں اپنے اسکول سے انگریزی کا مضمون خارج نہ کروا سکی۔ (ہائے...... بے قدری میری......!)

پھر یوں ہوا کہ میں اب اکثر انگریزی کے مضمون میں فیل ہونے لگی...... میڈم توقیر نے جب گھر ایک بڑا سا لیٹر بھیجا کہ مسرت انتہائی کند ذہن لڑکی ہے تو اماں سے زیادہ بھائیوں نے ڈانٹ پھٹکار تک کا بیڑا اٹھا لیا۔

"فیشن سارے سیکھ لیے...... ٹی وی کے ڈرامے سارے رٹ لیے مگر ایک پڑھائی نہیں کی جاتی...... جبکہ ٹیوشن تک لگوا کر دے رکھی ہے۔"

اب اگر دماغ کسی سمت جانے سے انکار کردے تو بندہ کرے تو کیا کرے...... مگر کسی کو اس کا احساس تک نہیں تھا۔

"اب اگر مسرت کا رزلٹ اچھا نہیں آیا تو اس کو گھر بٹھا لو......" ایک شب بڑے بھیا نے کہا۔ یہ سزا تو مجھے انعام سی معلوم ہوئی...... میرا کون سا اسکول جانے کو دل چاہتا تھا۔

"کیا واقعی......؟" مارے خوشی کے میں نے بے سرشار سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں...... تم گھر بیٹھ کر گھر کا تمام کام کیا کرو گی...... گھر میں کام کرنے والی ماسی کو ہم نکال دیں گے تاکہ گھر کے کام کاج میں تو طاق ہو سکو۔"

"اُف...... برتن، کپڑے دھونا...... ٹاکی لگانا...... کھانا پکانا...... یہ سب کام کرنے سے کہیں بہتر تھا کہ اسکول ہی جایا جائے......" میں نے رو رو کر آنکھیں سجا لیں۔

"میں پھر انگریزی میں فیل ہو گئی ہوں حالانکہ

مضمون اس قدر رٹا تھا مگر میڈم توقیر نے پھر فیل کردیا.....''ایک دن میں نے اپنی نئی سہیلی رضیہ سے کہا۔

''تم شوق سے پڑھتی نہیں ہو ناں.....اس وجہ سے انگریزی کے ہر ٹیسٹ میں فیل ہوجاتی ہو انگریزی کی میڈم تو بہت اچھی ہیں۔'' رضیہ نے فخر سے کہا۔

''مجھے تو نفرت ہے اس انگریزی سے۔ اس کی وجہ سے ہمیشہ گھر میں میری بے عزتی ہوتی ہے۔ اب گھر میں بڑی آپا کی منگنی کی وجہ سے مہمان بھرے ہوئے ہیں۔ اب دیکھنا سب کے سامنے کس قدر کھچائی ہوگی۔'' میں روہانسی ہوگئی۔

''گھر میں نقارہ بجانے کی کیا ضرورت ہے..... گول کر جانا.....'' رضیہ نے رائے دی یا اسے میرے پریشان لہجے اور پیلے ہوتے چہرے پر رحم سا آگیا تھا۔

''رضیہ..... تم میرے بڑے بھیا کو جانتی نہیں ہو..... بہنوں کو ذلیل کرنے میں ماسٹر کیا ہوا ہے۔ ہمارے ہر ٹیسٹ کی تفصیل سے ہر وقت آگاہ رہتے ہیں اگر مجھے کبھی یہ خیال آجاتا کہ اس اسکول کی ہیڈ مسٹریس کی بیٹی سے بڑے بھیا کا رشتہ جڑے گا تو کبھی اس اسکول میں داخلہ نہ لیتی۔''

''میں کبھی اسکول سے دیر سے بھی آؤں تو انہیں خبر ہوجاتی ہے۔ ہر وقت کی رپورٹنگ نے تو میرا ناک میں دم کردیا ہے۔ پتا نہیں کیسی بھاوج ہے جو آنے سے پہلے ہی اپنی نند کے بھالے مار رہی ہے۔'' اب میں پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اسکول میں میرا دل نہیں لگتا تھا اور گھر جا کر بھی اسکول میرے سر پر ایک جلاد کی طرح چھایا رہتا تھا۔ آخر بچے فیل بھی ہوجاتے ہیں، میں کوئی انوکھی لڑکی تو نہیں تھی جو انگریزی میں فیل ہو رہی تھی مگر میرے لیے ہر طعنے کا منہ کسی توپ کی طرح کھلا ہوا تھا۔

''واقعی، تمہارے ساتھ تو یہ بڑی زیادتی ہے۔'' رضیہ نے ترحم بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایک بات کہوں..... اگر تم مانو تو.....'' میں نے ذرا جھجکتے ہوئے رضیہ سے کہا۔

''ہاں..... ہاں..... کہو.....'' اس نے اپنے کان لگا دیے جیسے میں نہ جانے کون سا راز افشا کرنے والی ہوں۔

''تم صرف ایک دن کے لیے اپنی ٹیسٹ کی کاپی مجھے دے دو۔ میں اوپر سے کور چڑھا کر اپنے گھر میں دکھا دوں گی کہ اس دفعہ میں انگریزی کے ٹیسٹ میں پاس ہوگئی ہوں..... اگلے دن تمہاری کاپی میں واپس کردوں گی۔''

''مگر میں تو آج یہ کاپی تمہیں ہرگز نہیں دے سکتی۔'' رضیہ نے وہ کاپی اپنے سینے سے لگا کر کہا۔ جیسے وہ کوئی سونے کا میڈل ہو۔

''کیسی سہیلی ہو تم..... اُف میں نے تو تمہیں دنیا سمجھا تھا، ایک میری گاؤں کی سہیلیاں تھیں، مجھ پر فدا سی رہتی تھیں۔ ہر آڑے وقت کام آتی تھیں اور ایک تم ہو کہ مجھے شرم آرہی ہے تمہیں اپنا دوست کہتے ہوئے.....'' رات ٹی وی کے ڈرامے کا ڈائیلاگ بول کر..... چھی..... چھی کی آوازیں نکال کر کاندھے علیحدہ اچکا کر اسے پھر دیکھا کہ شاید۔

''یہ بات نہیں مسرت.....'' رضیہ نے محبت سے میرا ہاتھ تھاما..... (ابھی بریک میں، میں نے اسے کینٹین سے برگر اور بوتل جو پلائی تھی)

''بات مت کرو مجھ سے..... تم بھی چاہتی ہو ناں کہ میرے گھر میں میری کرکری ہو تو تم خوش ہو جاؤ، آج شام تمہارے گھر میں جب ہنسی اور قہقہوں کی فلک شگاف آوازیں جائیں تو سمجھ جانا کہ گھر کے تمام لوگ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ میرا مذاق اڑا رہے ہیں.....'' میری آنکھوں سے پھر پرنالہ بہنے لگا۔

''یہ بات نہیں مسرت، میں خود انگریزی میں فیل ہوگئی ہوں جبکہ میرے نمبر تو تم سے بھی خراب آئے ہیں۔ میں نے تو صرف آج کے لیے مانیٹر کی کاپی مانگی ہے۔ جس کے اس نے مجھ سے بیس روپے لیے ہیں۔ کل پرسوں بلکہ پورے پندرہ دنوں کے لیے

دیگر لڑکیوں نے مانیٹر سے بکنگ کرلی ہے، اس کی کاپی اپنے گھر لے جانے کے لیے.....'' رضیہ نے شرمندگی سے مجھے بتاتے ہوئے کہا۔

''اچھا یہ بات ہے تو کوئی بات نہیں.....'' رضیہ کے فیل ہونے کا سن کر طبیعت کی پژمردگی قدرے کم ہوگئی تھی۔

''ایمان سے میں آج کے لیے تمہیں یہ کاپی دے بھی دیتی مگر آج میرے منگیتر آرہے ہیں ناں اور وہ اتنے بے وقوف سے ہیں کہ کوئی اچھی سی بات کرنے کے بجائے ہمیشہ میری تعلیمی حالت کے بارے میں باتیں کرکے وقت ضائع کرتے ہیں۔''

''ایمان سے اتنے بے وقوف ہیں وہ۔۔'' میں نے تاسف سے اسے دیکھا۔

''اللہ کی قسم..... اس سے بھی زیادہ.....'' اب رضیہ کے آنسو بہہ رہے تھے۔

اور میں..... ہاں میں..... وہ تمام آنسو اپنے رومال میں چن چن کر رکھ رہی تھی کہ میری سہیلی کا غم تو میرے غم سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔

میرے ''وہ'' ایسے تو نہیں تھے!

ہیرے موتی

مقابلے بازی کا بھی میں دل سے قائل نہیں تھا اور نہ ہی مجھے کسی کو گرانے میں مزہ آتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ مجھے نشاط اور طلعت دونوں بھابیاں بہت اچھی لگتی تھیں۔ نشاط بھابی ڈاکٹر تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ گھر پر کم وقت دے پاتی تھیں.....مگر اس کے باوجود مجھے ان سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی...... ایک تو میں اپنے کام خود کرنے والا شخص تھا۔ دوسرے وہ اخلاق کی بہت اچھی تھیں..... وہ ہمیشہ مجھ سے کہتیں۔ ''عابد..... تم بھی کیا سوچتے ہوگے کہ بھائی بھاوج کے پاس آیا تو کسی نے تمہاری کوئی خاطر داری تک نہیں کی۔''

''نہیں بھابی..... میں کبھی ایسی باتیں نہیں سوچا کرتا......''

''تمہاری دلہن جب آئے گی تو وہ تم سے... بہت خوش رہے گی۔'' وہ ہنس کر کہتیں۔

''جب آئے گی تو رہے گی ناں.....'' میں دل میں سوچا کرتا۔

گھر میں کسی کو بھی میری شادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تعلیم ختم کرکے جاب کرتے ہوئے بھی مجھے پانچ سال ہوگئے تھے مگر نہ نشاط بھابی کو یہ خیال آتا تھا اور نہ طلعت بھابی کو...... بڑے دونوں بھائی تو شادی کو ایک مصیبت سمجھتے تھے اور اکثر مجھ سے کہا کرتے۔

''عابد...... یہ گولڈن پیریڈ ہے جو تم گزار رہے ہو ورنہ شادی کرکے بندہ خوار ہوجاتا ہے۔ اپنی زندگی اپنی نہیں لگتی۔''

طلعت بھابی کے ہاں کبھی جانا ہوتا تو وہ یوں تو خوب خاطر داریاں کرتیں مگر شادی بیاہ کے نام سے کوسوں دور بھاگتیں۔

''میں نے اپنے بھائیوں کی شادیاں کرائیں اور میکے میں بری بنی...... میری ساری بہنیں مجھ سے ناراض ہیں کہ میں نے ایک سے ایک فیشنی بھابی کا انتخاب کیا..... اب تو میں اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوں کہ جو کبھی کسی کی شادی کے معاملے میں شامل بھی ہوں۔''

جس شخص کی کوئی بہن نہ ہو اور بھابیاں ایسی اکل کھری ہوں...... اور وہ شخص خود سے پسند کرنے کا حوصلہ بھی نہ رکھتا ہو۔ اس کی شادی ہونی ناممکن نہ بھی ہو تو مشکل ضرور ہوتی ہے۔

پھر یوں ہوا...... کہ چھوٹے بھائی نے اپنی چوری چھپے شادی کا اعلان کردیا اور سائرہ بھابی کو ساہیوال سے لے کر کراچی آگیا۔ اماں پہلے تو ناراض ہوئیں اور پھر بہو کے پاس آگئیں۔ سائرہ نے اماں کا اتنا خیال رکھا کہ وہ اماں کی چہیتی بہو بن گئیں۔

میں لاہور میں اکیلا رہ رہا تھا کہ سائرہ بھابی نے مجھے فون کرکے کہا۔

"عابد بھائی کچھ دنوں کے لیے کراچی آ جائیں، آپ کی شادی کروا دیں گے۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ......" میں آفس سے چھٹیاں لے کر کراچی آ گیا۔ مجھے آئے ہوئے پورے دو مہینے ہو گئے تھے اور سائرہ بھابی جس قسم کا میرے ساتھ کھیل کھیل رہی تھیں۔ میں واقعی طیش میں آ چکا تھا۔

پھر ایک دن گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ میں لان میں کرسیاں گھسیٹ کر لایا اور ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔

"ہے کوئی گھر میں جی دار ایسا جو میرے ساتھ بیٹھ کر سائرہ بھابی کی برائیاں کرے۔"

صرف ایک ہی آواز کی دیر تھی۔ زاہد بھائی کے سوا سب ہی حاضر تھے۔ اماں، طلعت بھابی، ان کے بچے حد تو یہ تھی کہ سائرہ بھابی کی چھوٹی بہن ناصرہ بھی آ گئی۔ بقول اماں کے کن سوئے لینے آئی ہوگی مگر میرا یہ خیال تھا کہ وہ اپنی ڈھکی چھپی محبت کا الارم بجانے آئی تھی جسے میں نے فوراً سن بھی لیا تھا۔ ان دنوں کراچی آنے کی وجہ ہی صرف یہی تھی کہ سائرہ بھابی میرے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں مگر عجیب بات تھی کہ جہاں کوئی لڑکی اچھی نظر آتی بھابی اس میں کوئی نہ کوئی نُق (عیب) نکال لیتیں۔

اب عاتکہ اماں کو اچھی خاصی پسند آ گئی تھی۔ گھرانہ بھی اچھا تھا۔ جہیز بھی خاصا ملتا نظر آ رہا تھا کہ سائرہ بھابی نے گھر آ کر خواہ مخواہ کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ "لڑکی کی ناک کس قدر لمبی تھی بالکل طوطے کی طرح...... چہرے پر نظر ڈالو تو نظریں ناک سے آگے بڑھتیں ہی نہیں جیسے کہ بس اسٹاپ ہو۔"

"ہاں دلہن! میں نے بھی صرف اس کی ناک ہی دیکھی، آنکھوں اور چہرے پر غور ہی نہیں کیا"...... اماں بھی ان کی باتوں میں آ گئیں اور یوں لڑکی صرف اپنی ناک کی وجہ سے بہ آسانی ریجیکٹ ہو گئی۔ خدا خدا کر کے رضیہ سب کو پسند آ گئی اور جب حتمی فیصلہ کرنے کی غرض سے سب لوگ گئے تو نہ جانے کیسے دو مرغیاں ٹہلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ چائے آئی تو کپوں پر مور کی شکل بنی ہوئی تھی۔ لڑکی کی بہن کی قمیص پر تتلی کڑھی ہوئی تھی۔ بچوں کی شرٹ پر بن مانس کی تصاویر تھیں...... لیجیے سائرہ بھابی گھر آ کر پھیل گئیں کہ انسان ہیں یا درندے، جانوروں کی تصاویر کیسے رغبت سے کپڑوں پر بناتے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں مرغیاں تک ٹہلتی ہیں۔ ہمارے جیٹھ کی شادی ہو جائے گی تو گھر والوں سے پہلے ان کے جانور خیریت پوچھنے آئیں گے۔ ہمارے بھائی تو ان کے ہاں سکون سے چائے تک نہیں پی سکیں گے۔ اس سے قبل کہ میں کچھ بولتا یا انہیں کچھ سمجھاتا...... سائرہ بھابی کی بلند آواز دیگر آوازوں کے ابھرنے سے پہلے چھا گئی۔

"ارے دفع کرو کم بختوں کو، ہمارے چاند سے بھیا کے لیے کوئی لڑکیوں کی کمی ہے کیا؟"

فاخرہ بڑی خالہ کی پڑوسن کی لڑکی تھی۔ خاصی خوش شکل اور بے حد سلیقہ مند...... اماں تو اس کو دیکھتے ہی ریجھ گئیں۔ میرے سمجھانے کا ان پر خاصا اثر ہوا تھا۔ سائرہ بھابی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اماں، فاخرہ کی اس قدر تعریفیں کرتیں کہ بھابی کا چہرہ حیران بلکہ پریشان ہو جاتا۔ ان کی چھوٹی بہن کے چہرے پر بھی ویرانی برسنے لگی۔

"آپ لوگوں کو اس قدر پسند ہے تو رشتہ دے دیتے ہیں مگر کیا خیال ہے کہ اسے ایک دفعہ بہانے سے اپنے ہاں بلا لیتے ہیں۔ اس سے سب بات چیت کرتے ہیں یوں اس کی تمیز و اخلاق کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔"

"چھوڑیں بھابی! اس طرح کے امتحان تو ہمارے بھائی نے بھی آپ کے نہیں لیے ہوں گے بلکہ آپ کو ہم سب نے شادی ہونے کے بعد ہی دیکھا۔" میں نے پہلی مرتبہ جملہ کسا۔

مگر مجال ہے کہ وہ برا مانی ہوں۔ لگیں کھی کھی کر کے ہنسنے۔

"بھابی! خواہ مخواہ کسی لڑکی کو نروس کرنے کا فائدہ۔" میں نے صاف منع کیا کہ دل میں گمان ہو رہا تھا کہ یہ بھابی خواہ مخواہ کی کھپ ڈالیں گی۔ لڑکیاں ریجیکٹ کرنے میں تو وہ پہلے ہی ماسٹر تھیں۔

"میں اکیلے میں اس سے کوئی بات نہیں کروں گی۔ ساری باتیں چائے کی میز پر ہی ہوں گی اور تمہارے سامنے ہی۔ دشمن نہیں ہوں تمہاری......" وہ میرے لہجے کی روانی سے بہت کچھ سمجھ گئی تھیں۔

"مگر فائدہ......؟" میں اب بھی اپنے مؤقف پر قائم تھا۔ "تم ہمیں عزیز ہو۔ اسی لیے کہہ رہے ہیں ورنہ ہماری بلا سے۔" انہوں نے آنکھوں کو پٹ پٹا کر دو موٹے موٹے آنسو لڑھکائے۔

"اے دلہن تم کیوں جی چھوٹا کرتی ہو۔ کیا میں جانتی نہیں ہوں کہ تم عابد سے کتنی محبت کرتی ہو۔ تم اس کے لیے بھابی کے ساتھ ساتھ بہن بھی ہو۔ جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔ خواہ مخواہ اپنی آنکھوں میں آنسو لانے کی ضرورت نہیں۔" اماں سارے سبق بھول گئیں۔ جو میں نے بہ مشکل یاد کروائے تھے۔

اور پھر اگلی شام چائے کی میز پر ہماری بڑی خالہ فاخرہ کے ساتھ موجود تھیں۔ لڑکی سمجھدار تھی یا بڑی خالہ کے مشورے کے تحت وہ خوب سج بن کے آئی تھی اور کافی اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے سامنے سائرہ بھابی کی سمپل سی ناصرہ واجبی سی لگ رہی تھی۔

"عابد...... ان لوگوں کو کسی بہانے سے فارغ کر دیتے ہیں۔ مجھے یہ لڑکی پسند نہیں آئی۔"

بھابی نے مجھ سے رازداری سے کہا۔

"مگر مجھے تو فاخرہ بہت اچھی لگی ہے۔ میں تو اسی لڑکی سے شادی کروں گا۔" میں نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

"ارے کیا تم کسی توتلی لڑکی سے شادی کرو گے؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"آپ کو وہم ہوا ہوگا۔ لڑکی ٹھیک ہے۔" میں نے ایک نظر مسکراتی فاخرہ پر ڈال کر پُرسکون لہجے میں کہا۔

"اچھا میں تمہارے سامنے بات کروں گی۔ تم غور سے سننا۔" وہ میرے پاس سے ہٹ کر پھر فاخرہ کے برابر جا بیٹھیں۔

"بھئی فاخرہ...... تم یہ پاپڑ بھی کھاؤ ناں۔ میں نے ٹی وی کے چینل سے سیکھ کر خود بنائے ہیں۔" بھابی نے بلند آواز میں کہا۔

"میں پاپل کھاتی ہی نہیں۔" فاخرہ نے کہا۔

"اچھا یہ کھیر تو لے لو...... میری بہن ناصرہ نے بطور خاص تمہارے لیے بنائی ہے۔"

"اتا...... میں تھیر (کھیر) ضرور تھاؤں گی۔ (کھاؤں گی)" میں نے ایک نظر فاخرہ کے خوبصورت چہرے کو دیکھا اور دوسری نظر ناصرہ پر ڈالی جو اپنی ہنسی ضبط کیے بڑی حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"چلو ناصرہ میرے ساتھ چلو......" میں فوراً ہی اٹھ گیا۔

اماں...... ہیں...... ہیں کرتی رہ گئیں مگر میں ناصرہ کو لے کر جیولر کی دکان پر گیا اور اس کے ناپ کی انگوٹھی خرید کر گھر آیا۔

"بھابی اب آپ میری منگنی جھٹ ناصرہ سے کر دیں تاکہ پٹ سے شادی ہو سکے۔"

"عابد بھائی، آپ نے خواہ مخواہ انگوٹھی خریدی میں تو پہلے ہی آپ کی دلہن کی انگوٹھی ناصرہ کے ناپ کی بنوا چکی تھی۔"

اور میں سائرہ بھابی کے چلتر پن پر پہلی مرتبہ دل کھول کر ہنسا۔ ناصرہ بھی مسکرا رہی تھی اور اب مجھے یہ پورا یقین تھا کہ اس رشتے میں سائرہ بھابی، کوئی انگل نہیں مار سکیں گی۔ اس لیے آج مجھے یہی کہنا ہے کہ اگر بھابی کو ہمنوا بنانا ہے تو ان کے خاندان ہی سے اگر کوئی ہیرا نہیں تو موتی چن لینے میں ایسا کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

ہے ناں......!



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆سیدہ جیا عباس......تلہ گنگ

تسکین نہ ہو جس میں وہ راز بدل ڈالو
جو راز نہ رکھ پائے ہمراز بدل ڈالو
تم نے بھی سنی ہوگی بڑی عام کہاوت ہے
انجام کا ہو خطرہ آغاز بدل ڈالو

☆پروین افضل شاہین......بہاول نگر

یوں نہ جھانکو غریب کے دل میں
حسرتیں بے لباس رہتی ہیں

☆انیقہ انا......چکوال

اداسیاں ہوں مسلسل تو دل نہیں روتا
کبھی کبھی ہو تو یہ کیفیت بھی پیاری لگے
بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

☆عرشیہ جنید......کراچی

زخم گہرا ہے بہت دیر میں اچھا ہوگا
ٹیس ایسی ہے کہ دل خون ہوا جاتا ہے

☆نرگس نسیم......صابہ موہڑہ

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

☆عنبر وسیم......گوجرانوالہ

افسوس ہم چلے نہ سلامت روی کی چال
یا بے خودی کی چال چلے یا خودی کی چال

☆مسرت نسیم......جہلم

جل کے مٹ جانا دوسروں کے لیے
زندگی ہے یہ شمع محفل کی

☆نگہت آصف......اسلام آباد

کیا جم سکے گا گردشِ لیل و نہار میں
وہ تخمِ نظر جو آنکھ نہ کھولے غبار میں

☆کوثر خورشید......یو۔کے

پہنچ گیا وہی منزل پہ ایک دن اکبر
کہ جس نے راہِ محبت کو اختیار کیا

☆نفیسہ آرا......راس الخیمہ

اپنی صداقتوں کا جنازہ لیے ہوئے
جھوٹوں کے اس ہجوم میں تنہا کھڑا ہوں میں

☆ممتاز خانم......کراچی

اِک اچٹتی سی نظر چاند پہ ڈالی تھی سلیم
آج تک آنکھ کی دہلیز سے تارے نہ گئے

☆عظمیٰ عنبرین......ڈی جی خان

راہ سے اپنی اور منزل سے ایسے ہوئے ہیں غافل لوگ
بیچ بھنور میں ناؤ کو لاکر ڈھونڈ رہے ہیں ساحل لوگ

☆شبانہ کوثر......قصور

یوں ہوسکی نہ آج تک تکمیل پیار کی
کچھ بے خبر سے وہ رہے کچھ بے خبر سے ہم

☆جبین نیاز......ملتان

مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں
گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں

☆ثنا اجالا......بھلوال

آج اس نے درد بھی اپنے علیحدہ کر لیے
آج میں رویا تو میرے ساتھ وہ رویا نہ تھا



مزیدار ذائقوں اور لذیذ کھانوں کے شوقین ہمارے پیارے قارئین کے لیے آج موسم گرما کی مناسبت سے مختلف تراکیب حاضرِ خدمت ہیں اگرچہ ماہِ رمضان کی آمد بھی ہے تو آپ رمضان کا اہتمام جس طرح بھی کرتی ہوں ان ذائقوں کو بھی اپنے دسترخوان کی زینت ضرور بنایئے گا۔ سب سے پہلے مختلف سبزیوں کے رائتے جو تقریباً ایک ہی ترکیب سے بن جائیں گے۔

بیگن، شلجم، لوکی یا ٹنڈے کا رائتہ

اشیا: کوئی بھی سبزی تین عدد لے لیں۔ دہی ڈیڑھ پیالی۔ گول مرچ، دو سے تین عدد۔ لہسن، چھ سے آٹھ جوے۔ ٹماٹر، دو چھوٹے۔ ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچ سجاوٹ کے لیے۔ نمک، کالی مرچ۔ حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: سبزی کو دھو کر ثابت ابال لیں...... شلجم اور لوکی کے چاہے چھلکے اتار دیں ورنہ صرف اوپر سے تراش دیں۔ دہی میں پیاز، ٹماٹر، چوپ کر کے مکس کرلیں اور نمک، مرچ اور پسا زیرہ بھی ملا دیں۔ اب ہرا مسالا بھی ملا دیں۔ دو کھانے کے چمچ تیل میں لہسن کا بھگار کر کے دہی اور سبزی کے آمیزے میں لگا دیں۔ مزیدار رائتہ تیار ہے۔

کھیرے کے رائتے میں بگھار کی ضرورت نہیں، صرف دیگر اشیا ملالیں اور کھیرا، کچا ہی استعمال ہوگا۔

کیری کی چٹنی

کیریوں کی بہار ہے کیوں نہ اس سے لطف اٹھایا جائے۔

اشیا: کیری، ایک پاؤ۔ گندم کا سرکہ، ایک پیالی۔ ثابت لال مرچ، چار سے پانچ عدد۔ چینی، آدھ پاؤ۔ نمک، حسبِ ضرورت۔ کلونجی، ایک ٹیبل اسپون۔

ترکیب: کیریوں کو چھیل کر باریک کاٹ لیں۔ اب اس میں نمک اور پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ گلنے کے قریب ہوں تو چینی، لال مرچ، سرکہ اور کلونجی ڈال کر کچھ دیر اور پکائیں کہ چٹنی مکس ہوجائے...... یہ چٹنی گاڑھی، گاڑھی ہوگی اور بہت جلدی و آسانی سے بن جاتی ہے۔

کیری کی چٹنی

اشیا: کیری، دو عدد۔ سفید زیرہ، ایک ٹیبل اسپون۔ ہری مرچ، حسبِ ذائقہ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ پودینہ، آدھی گٹھی۔

ترکیب: کیری کو باریک، باریک کاٹ کر گرائنڈر میں دیگر تمام چیزیں ڈال کر پیس لیں یا پھر سل پر پیس لیں جس کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ گرائنڈر میں پیستے وقت دو تین قطرے کوکنگ آئل کے ڈال لیں۔ مزیدار چٹنی تیار ہے۔

صبا سجاد، دبئی

املی اور آلو بخارے کا شربت

اشیا: املی ایک پاؤ، آلو بخارا، آدھا کلو۔ چینی، تین

سے چار کپ۔ زردے کا رنگ، آدھا چائے کا چمچ۔ نمک، دو چٹکی۔

ترکیب: املی، ایک پاؤ اور آلو بخارے دھو کر ایک لیٹر پانی میں ابال لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر گٹھلیاں الگ کرلیں اور آمیزے کو چھان لیں۔ اب اس آمیزے میں چینی ڈال کر پکائیں۔ زردے کا رنگ بھی ملالیں، گاڑھا ہوجائے تو ٹھنڈا کر کے فریج مں رکھ لیں۔ سرو کرتے ہوئے آدھا گلاس خوب ٹھنڈا پانی اور آدھا گلاس شربت ڈالیں ساتھ ہی برف بھی چُور کرکے ڈالیں اور افطار کا مزہ لیں۔

فالسے کا آسان شربت

فالسے، آدھا کلو۔ فالسے دھو کر گرائنڈر جگ میں پانی کے ساتھ پیس لیں اور چھان لیں۔ آدھا کلو چینی کا شیرہ بنا کر الگ رکھ لیں اور ٹھنڈا کرلیں۔ ایک جگ میں فالسے کا یہ شربت اور چینی کا شیرہ مکس کرلیں اور چورا کی ہوئی برف کے ساتھ پیش کرلیں۔

فریج میں یا ویسے ہی چوبیس گھنٹے چل جائے گا۔ زیادہ بنانا ہو تو صرف فالسے کے شربت کو فریزر میں رکھیں اور شیرہ فریج میں، سرو کرنے سے آدھے گھنٹے پہلے نکال کر شیرے کے ساتھ مکس کر کے بنائیں۔

ویسے فریزر میں آج کل لوڈشیڈنگ اور شدید گری کے باعث 36 گھنٹے میں بھی چیزیں نہیں جم رہیں۔

شہلا محمود، واہ کینٹ

آم کا اچار

آم کا اچار وہ بھی بہت آسان

اشیا: کچے آم، ڈھائی کلو۔ نمک، حسب ذائقہ۔ سرخ مرچ، آدھا پاؤ۔ سونف، چھٹانک۔ میتھی دانہ و کلونجی، سو گرام۔ رائی، سو گرام۔ پسی ہوئی ہلدی، پچاس گرام۔

ترکیب: میتھی دانے کے سوا تمام مسالے کوٹ لیں اور تھوڑا سرسوں کا تیل ڈال کر مکس کرلیں۔ میتھی ثابت ہی ڈالیں۔ آم کو دھو کر اور اچھی طرح خشک کر کے چار، چار پھانکیں بنالیں ایسے کہ سرے سے ملی ہوئی ہوں الگ، الگ پھانک نہ کریں۔ اب یہ مسالا آم کے اندر بھردیں اور اسے کسی مٹی یا چینی کے مرتبان میں ڈال دیں...... باقی مسالا اوپر سے ڈال دیں اور تین چار دن تک اچھی دھوپ میں مرتبان رکھیں مگر رات کو اوس میں پڑا نہیں رہنے دیں۔ جیسے ہی دھوپ جائے، ہٹالیں۔ چوتھے دن سرسوں کا تیل کڑکڑا کر ٹھنڈا کر کے ڈالیں اتنا کہ آم ڈوب جائیں اور اسی طرح مزید پانچ دن دھوپ میں رکھیں۔ ایک ہفتے بعد اچار مکمل تیار ہوگا۔

انیلا عباس، کراچی

گرمیوں کے لیے خصوصی اہتمام

ایک مٹی، چینی کے مرتبان میں ایک کلو کے قریب کالا (دیسی) سرکہ ڈالیں۔ اس میں ایک بڑا ٹکڑا لاہوری نمک اور ایک بڑا ڈلا گڑ کا ڈال دیں اب اس میں دیسی لیموں دھو کر اور خشک کر کے آدھے، آدھے کر کے ڈالیں۔ اس کے علاوہ نچوڑے ہوئے لیموں یعنی رس نکلے ہوئے چھلکے بھی ڈال سکتے ہیں۔ یہ مرتبان آٹھ دن دھوپ میں رکھیں پھر استعمال کریں۔ اس طرح لیموں کا چھلکا تک بھی ضائع نہیں ہوگا...... یہ سرکہ اچار نہایت ہاضم ہوتا ہے۔

شیشے کی بوتل میں دیسی سرکے کے ساتھ چھوٹی چھوٹی گول، پیاز اور لہسن چھیل کر ثابت ہی ڈالیں، ہری مرچوں کا بھی اضافہ کرسکتے ہیں۔ اس میں بھی لاہوری نمک کا ایک چھوٹا ڈلا ڈال دیں مگر گڑ نہیں۔ آپ کا ذائقہ بن جائے گا تو اس میں سبزیوں

کے ٹکڑے مثلاً کریلا، گوبھی، گاجر، مٹر اور کھیرا بھی ڈال سکتی ہیں۔ اسے دھوپ میں رکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ دال، چاول، سبزی، روٹی سب کے ساتھ یہ اچھا لگے گا۔

قیمے کی ٹکیاں

اشیا: روکھا قیمہ، گائے، بکرا یا مرغ۔ کچا پپیتا، ایک ٹی اسپون۔ ٹماٹر اور پیاز دو، دو عدد، چوپ کرلیں۔ ادرک بھی چوپ کرلیں۔ ایک انچ کا ٹکڑا۔ ہری مرچ، ہرا دھنیا، لال مرچ اور نمک، حسب ضرورت لے لیں۔ بھُنا ہوا بیسن یا بھُنے چنے پیس لیں، دو ٹیبل اسپون۔ خشخاش، ایک ٹی اسپون۔ پسا گرم مسالا، ہاف ٹی اسپون۔ تیل، تلنے کے لیے۔

ترکیب: قیمے میں نمک، مرچ گرم مسالا، خشخاش، ادرک، ٹماٹر، پیاز اور پپیتا مکس کر کے چار گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ مرغی کے قیمے کے لیے گھنٹا بھر کافی ہے۔ اب اس قیمے میں بھنا ہوا بیسن ملا کر گول، گول ٹکیاں بنالیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے یہ ٹکیاں آہستہ، آہستہ ڈالیں۔ آنچ ہلکی رکھیں۔ کچھ دیر میں دوسری طرف سے بھی پک جائیں تو اتار لیں اور کیری کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

اس کے سینڈوچ بھی اچھے لگیں گے۔ فرنچ فرائز کی سجاوٹ بھی کرسکتی ہیں۔ آپ کے افطار کو یہ ٹکیاں مزیدار بنادیں گی۔

ثنا مرتضیٰ، کراچی

انڈا سبزی گریوی

اشیا: پالک، ایک پاؤ۔ ہرا دھنیا، ایک گٹھی۔ تازہ میتھی، ایک پاؤ (اچھی طرح صاف کرلیں) انڈے، چار عدد۔ (فرائنگ پین میں خوب ابلتے پانی میں ایک انڈا ایسے ڈالیں کہ زردی نہ ٹوٹے اور ہاف فرائی کی طرح کفگیر میں آرام سے نکل آئیں۔ یہ پورچڈ انگیز ہوں گے۔) نمک، حسب ذائقہ۔ ادرک، لہسن، حسب ذائقہ۔ ہری مرچیں، چار عدد۔ املی کا رس، دو کھانے کے چمچ۔ آئل، دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب: پالک کو میتھی اور دھنیے کے ساتھ بلینڈ کرلیں۔ آئل گرم کر کے پیاز کو فرائی کریں پھر ادرک، لہسن کا پیسٹ ڈال دیں۔ جب تیل علیٰحدہ ہونے لگے تو پالک، میتھی اور دھنیا ڈال کر بھونیں۔ شیشے کی بیکنگ ٹرے میں پالک پھیلالیں (مطلب یہ بھُنا ہوا مسالا) پھر اوپر پورچڈ کیے ہوئے انڈے رکھ دیں، اوون کو اٹھارہ سینٹی گریڈ پر پندرہ منٹ کے لیے گرم کریں پھر پالک انڈوں والی یہ ڈش پانچ سے سات منٹ تک رکھ کر بیک کریں۔

اس ڈش کو سحری میں یا پھر افطار میں بھی لے سکتی ہیں۔ اور رمضان سے پہلے سنڈے برنچ میں بھی لطف اٹھائیں۔

سنبل ملک، شاہدرہ

لوکی اور ساگو دانے کی کھیر

اشیا: دودھ، ڈیڑھ کلو۔ ساگو دانا، آٹھ کھانے کے چمچ۔ چینی، آدھا کلو۔ سبز رنگ، چند قطرے۔ عرق گلاب، ایک کھانے کا چمچ۔ بادام، پستہ، (چھلکے اتار کر) آدھا کپ۔ لوکی، ایک پاؤ۔

ترکیب: ساگو دانے کو دس منٹ کے لیے بھگو دیں...... دودھ اچھی طرح پکائیں پھر اس میں ساگو دانہ ڈال کر پکائیں۔ جب ساگو دانہ گل جائے تو لوکی کو پانچ منٹ پانی میں ڈال کر بوائل کریں اور پھر میش کر کے ساگو دانے اور دودھ میں ڈالیں۔ دس منٹ بعد چینی ڈالیں اور خوب گھوٹیں۔ پانچ منٹ بعد عرق گلاب اور سبز رنگ بھی ڈالیں، گاڑھی ہونے پر ڈش میں نکال لیں اور بادام، پستہ ڈال کر سجا دیں اور ٹھنڈی کر کے کھائیں۔

ثمین عباس، کراچی

سندیسے



یا رحیم

تیرا یہ کہنا
کہ اے بندے
تو اک قدم بڑھا
میں دس قدم بڑھا کر
تجھے اپنی رحمتوں میں سمیٹ لوں گا
اس بات کو کسی پاک وحی کی صورت
تو نے دل میں اتارا
تب انسانوں کے وسیلے چھوڑ
تیری رسی کو تھام کر میں نے
وہ سب پالیا
جو میرے جیسے کا تھا بھی، نہیں بھی
جو مانگا تھا اور نہیں بھی

از۔اُم ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ

چندا سی بہنا کا بھائی کو میسج

گال پہ غازہ نہ ہو پلکوں پہ مسکارا نہ ہو
درحقیقت چاند ہو مصنوعی سیارہ نہ ہو
دھیمے سُر میں بولتی ہو چال ہو بادِ نسیم
دیکھنا چندا کہیں وہ جیٹ طیارہ نہ ہو
باحیا ہو، باوفا ہو، سانولی ہو خیر ہے
چھت سے ٹکر مارتی ہو ایسی فنکارہ نہ ہو
اس قدر شیریں نہ ہو کہ "اوہ بہنی" کہنا پڑے
بس ذرا نمکین ہو لیکن نمک پارہ نہ ہو

از۔ارم کمال۔فیصل آباد

اگر تم

اگر تم اس وقت مسکرا سکتے ہو
جب تم پوری طرح ٹوٹ چکے ہو
تو یقین جانو کوئی تمہیں
اس دنیا میں
کبھی توڑ نہیں سکتا

از۔لاریب، ماہ زیب۔چونیاں

چلو اِک کام کرتے ھیں

چلو اک کام کرتے ہیں
اپنے بے سکوں دل کو
اندھیری رات میں اٹھ کر
خدا کے ذکر سے آباد کرتے ہیں
چلو اک کام کرتے ہیں

شاعرہ: از کئی اخلاق بٹ، شیخوپورہ

شرط

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

از: رضوانہ شکیل راؤ، لودھراں

دل

نگاہوں کا تصادم بھی
بڑا عجیب ہوتا ہے
بظاہر کچھ نہیں ہوتا مگر
جو بھی نقصان ہوتا ہے
محض وہ "دل" کا ہوتا ہے!

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

روحانی مشورے

رمضان المبارک کے چار اھم کام

1۔ لا الہ الا اللہ کی کثرت۔
2۔ استغفار میں لگے رہنا۔
3۔ جنت نصیب ہونے کا سوال۔
4۔ دوزخ سے پناہ میں رہنے کی دعا کرنا۔

افطاری کے وقت فضائلِ اعمال اور فضائل صدقات وغیرہ کتابوں میں سے سب گھر والے بیٹھ کر سنیں سنائیں۔ اس طرح تعلیم کرنے سے ان شاء اللہ تعالیٰ گھر میں دینی ماحول بنے گا۔

فضائلِ رمضان

1۔ نبی الرحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان کے ہر عمل کا ثواب دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: روزہ اس قانون سے مستثنیٰ ہے کیونکہ روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود اس کی جزا دوں گا۔ بندہ اپنی خواہش اور اپنے کھانے کو میرے لیے چھوڑتا ہے پھر فرمایا کہ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں ایک افطار کے وقت اور دوسری اس وقت ہوگی جب خدا سے ملاقات کرے گا اور روزے دار کے منہ کی بُو خدا کے نزدیک مُشک کی خوشبو سے عمدہ ہے اور روزہ ڈھال ہے (جو گناہوں سے اور دوزخ سے بچاتا ہے) جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو گندی باتیں نہ کرے اور شور نہ مچائے پس اگر کوئی شخص اس سے گالی گلوچ کرنے لگے یا لڑنے لگے تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں (لڑنا جھگڑنا، گالی کا جواب دینا میرا کام نہیں)۔

2۔ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:



ادارہ

جنت میں ایک دروازہ ہے جس کا نام ریان (یعنی سیرابی کرنے والا) ہے اس سے صرف روزے دار ہی داخل ہوں گے۔

3۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ایک دن خدا کی راہ میں روزہ رکھ لیا، اللہ تعالیٰ اسے دوزخ سے اس قدر دور کردیں گے کہ ستر سال میں جتنی دور پہنچا جائے۔

4۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے بلا کسی شرعی رخصت اور بلا کسی مرض کے (جس میں روزہ چھوڑنا جائز ہو) رمضان کا روزہ چھوڑ دیا تو اگرچہ (بعد میں) اس کو رکھ لیا تب بھی ساری عمر کے روزوں سے اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ مطلب یہ ہے کہ رمضان کے روزوں کی فضیلت اور برتری اس قدر ہے کہ اگر رمضان کا ایک روزہ چھوڑ دیا تو عمر بھر کے روزے رکھنے سے بھی وہ فضیلت اور اجر و ثواب نہ پائے گا جو رمضان میں روزہ رکھنے سے ملتا ہے گو قضا کا ایک روزہ رکھنے سے حکم کی تعمیل ہوجائے گی۔

5۔ فخرِ بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ جن کے لیے (حرام کھانے یا حرام کرنے کا یا غیبت وغیرہ کرنے کی وجہ سے) پیاس کے علاوہ کچھ بھی نہیں اور بہت سے تہجد گزار ایسے ہیں جن کے لیے (ریا کاری کی وجہ سے) جاگنے کے سوا کچھ نہیں۔

6۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ (شیطان کی شرارت سے بچنے کے لیے) ڈھال ہے جب تک کہ روزہ دار (جھوٹ بول کر غیبت وغیرہ کرکے) اس کو پھاڑ نہ ڈالے۔

7۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے روزہ رکھ کر بری بات اور برے عمل کو نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کچھ حاجت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

8۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ایمان کے ساتھ (اور) ثواب سمجھتے ہوئے رمضان کے روزے رکھے اس کے گزشتہ گناہ معاف کردیے جائیں گے اور جس نے ایمان کے ساتھ (اور) ثواب سمجھتے ہوئے رمضان میں قیام کیا (تراویح وغیرہ پڑھی) تو اس کے پچھلے گناہ معاف کردیے جائیں گے اور جس نے شبِ قدر میں قیام کیا ایمان کے ساتھ (اور) ثواب سمجھ کر اس کے اب تک کے گناہ معاف کردیے جائیں گے۔

9۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور رمضان میں آپ کی سخاوت بہت ہی زیادہ بڑھ جاتی تھی، رمضان کی ہر رات میں جبرئیل (علیہ السلام) آپ سے ملاقات کرتے تھے اور آپ ان کو قرآن مجید سناتے تھے۔ جب جبرئیل (علیہ السلام) آپ سے ملاقات کرتے تھے تو آپ اس ہوا سے بھی زیادہ سخی ہو جاتے تھے جو بارش لے کر بھیجی جاتی ہے۔

10۔ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے روزے دار کا روزہ کھلوایا تو اس کو روزہ دار جیسا اجر ملے گا اور ان کے اجر میں کچھ کم نہیں ہوگا۔

11۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص روزے میں بھول کر کھا پی لے تو روزہ پورا کرلے کیونکہ (اس کا کچھ قصور نہیں) اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا اور پلایا۔

12۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے۔

13۔ نبی الرحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ ہمیشہ خیر پر ہی رہیں گے جب تک افطار میں جلدی کرتے رہیں گے۔ یعنی غروبِ آفتاب ہوتے ہی فوراً روزہ کھول لیا کریں گے۔

14۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم روزہ کھولنے لگو تو کھجوروں سے افطار کرو، کیونکہ کھجور سراپا برکت ہے اگر کھجور نہ ملے تو پانی سے روزہ کھول لو کیونکہ وہ (ظاہر و باطن) کو پاک کرنے والا ہے۔

15۔ سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موسمِ سرما میں روزہ رکھنا مفت کا ثواب ہے۔

مفت کا ثواب اس لیے فرمایا کہ اس میں پیاس نہیں لگتی اور دن جلدی سے گزر جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ بہت سے لوگ اس پر بھی روزے سے گریز کرتے ہیں۔

16۔ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحالتِ روزہ اتنی بار مسواک کرتے دیکھا ہے کہ جس کا میں شمار نہیں کرسکتا۔

مسواک تر ہو یا خشک، روزے میں ہر وقت کرسکتے ہیں البتہ منجن، ٹوتھ پاؤڈر، ٹوتھ پیسٹ یا کوئلہ وغیرہ سے روزے میں دانت صاف کرنا مکروہ ہے۔

17۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میری آنکھ میں تکلیف ہے کیا میں روزے میں سرمہ لگالوں؟ فرمایا: لگالو۔

18۔ فخرِ بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تک روزے دار کے پاس کھایا جاتا رہے اس کی ہڈیاں تسبیح پڑھتی ہیں اور اس کے لیے فرشتے استغفار کرتے ہیں۔

رمضان المبارک

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ماہِ رمضان المبارک بہت ہی بابرکت اور

فضیلت والا مہینہ ہے اور یہ صبر و شکر اور عبادت کا مہینہ ہے اور اس ماہِ مبارک کی عبادت کا ثواب ستر درجہ عطا ہوتا ہے، جو کوئی اپنے پروردگار کی عبادت کرکے اس کی خوشنودی حاصل کرے گا اس کی بہت بڑی جزا خداوند تعالیٰ عطا فرمائے گا۔ ماہِ رمضان المبارک کی پہلی شب اور پھر ہر شب بعد نمازِ تہجد آسمان کی طرف منہ کرکے بارہ مرتبہ یہ دعا پڑھنا بہت افضل ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ الْقَائِمُ عَلٰی کُلِّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ۝

(اس کے پڑھنے والے کو بے شمار نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جائیں گی)

آخری رات میں بخشش

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رمضان کی آخری رات میں امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مغفرت کردی جاتی ہے۔ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! کیا اس سے شبِ قدر مراد ہے؟ فرمایا: نہیں! (یہ فضیلت آخری رات کی ہے شبِ قدر کی فضیلتیں اس کے علاوہ ہیں) بات یہ ہے کہ عمل کرنے والے کا اجر اس وقت پورا دے دیا جاتا ہے جب کام پورا کردیتا ہے اور آخری شب میں عمل پورا ہوجاتا ہے لہٰذا بخشش ہوجاتی ہے۔

1۔ صدقۂ فطر

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر روزوں کو لغو اور گندی باتوں سے پاک کرنے کے لیے اور مساکین کی روزی کے لیے مقرر فرمایا۔

صدقۂ فطر کی مقدار

صدقۂ فطر کی مقدار پونے دو سیر گندم ہے، اگر گندم دینا مشکل ہو تو پونے دو سیر گندم کی قیمت دینا جائز ہے۔

2. شوال کے چھ روزے

فخرِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد چھ (نفل) روزے شوال (یعنی عید) کے مہینے میں رکھے تو (پورے سال کے روزے رکھنے کا ثواب ملے گا اگر ہمیشہ ایسا ہی کیا کرے تو) گویا اس نے ساری عمر کے روزے رکھے۔

پہلی کا چاند دیکھنے کی دعا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب چاند دیکھتے تو اس دعا کو پڑھتے:

اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْیُمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ رَبِّیْ وَرَبُّکَ اللّٰہُ۔

ترجمہ: ”اے اللہ! ہم کو تو امن و ایمان سلامتی اور اسلام کا چاند دکھا اور اے چاند! میرا اور تیرا رب اللہ ہی ہے۔“

چند مسنون دعائیں

دوسری عباوات کی طرح روزے میں نیت کرنا ضروری ہے اور نیت دل کے ارادے کا نام ہے لہٰذا دل میں روزے کا عزم کرنا ہی نیت ہے زبان سے کچھ الفاظ کہنا ضروری نہیں، البتہ زبان سے کہہ دینا بہتر ہے اردو میں یوں کہے: ”آنے والے دن کے روزے کی نیت کرتا ہوں۔“

معاذ بن زہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم افطار کے وقت یہ دعا پڑھتے تھے:

اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ۔

ترجمہ: ”اے اللہ! میں نے تیرے ہی لیے روزہ رکھا اور تیرے ہی دیے ہوئے رزق پر کھولا۔“

☆☆☆



شوابے ہومیو کلینک





اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

رمضان کے دو فائدے

کیا آپ جانتے ہیں؟

مستفید ہوں گے؟

ہر سال رمضان کا مہینا آتا ہے۔ مزے مزے کے کھانے اور عید کی تیاریوں کے لیے۔ ہوتا بھی یہی ہے کہ پوری قوم رمضان کے نام پر ہر چیز جو کیسی بھی ہو اس کو دوگنے چوگنے داموں میں فروخت کرتی ہے۔ یہ اشیا کھانے کی ہوں، گھریلو استعمال کی ہوں یا کپڑے، میک اپ، جوتی، پرس وغیرہ۔ سب اسی کوشش میں ہوتے ہیں کہ کھانے کی اشیا کا ذخیرہ کرلیا جائے جس میں سب کچھ ہو۔ گھر کا فرنیچر، کراکری وغیرہ سب تبدیل کردیے جائیں۔ رمضان کے شروع ہوتے ہی سحری پارٹیاں، افطار پارٹیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ خوب کھاؤ، پیو۔ ایک ہفتہ ابھی گزرتا ہی ہے کہ تراویح کے ختم شروع ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی عبادت کا اینڈ ہوجاتا ہے اور عید کی تیاریوں کی شروعات ہوجاتی ہیں۔ رات بھر جاگ کر عید کی چیزوں کی شاپنگ ہوتی ہے حتیٰ کے آخری عشرے میں جس میں زور عبادات پر ہونا چاہیے تھا، شاپنگ سینٹرز، بیوٹی پارلرز و ہیر کٹنگ سیلونز پر ہو جاتا ہے یا ٹی وی چینلز کے رمضان پروگرام پر۔ کیا رمضان اس لیے آتا ہے؟ عید کس کی ہوتی اور کیوں منائی جاتی ہے؟ اِلاّ ماشاء اللہ ہی کچھ لوگوں کے سوا بالعموم نہیں جانتے۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

اگست 2014

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________________

پتا: ____________________

____

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر بتا دیا (بشرطیکہ ہم ترجمے کے ساتھ پڑھیں) اور امتوں کی طرح رمضان کے روزے تم پر اس لیے فرض کیے جارہے ہیں تاکہ تم متقی، پرہیزگار ایمان والے بن جاؤ۔ اب غور کریں فائدہ روزہ رکھنے کا... صبح سویرے اٹھ کر سحری کی، رسول ﷺ کی سنت کی پیروی ہوئی۔ روزہ کس لیے رکھا اللہ کی خوشنودی کے لیے سارا دن کھانے، پینے سے پرہیز کیا، جھوٹ، دھوکا، فریب، چغل خوری اور برائیوں سے بچے۔ قرآن کی تلاوت کی، نمازیں باجماعت ادا کیں، اپنا کام ایمانداری سے کیا، شام کو روزہ اپنی حلال روزی سے افطار کیا۔ ایسے روزے کو اللہ تعالیٰ قبول کرتے ہیں اور فرشتوں کو کہہ دیتے ہیں کہ بندے نے میرے لیے روزہ رکھا میں ہی اس کا اجر و ثواب دوں گا۔ خالی پیٹ رہنے سے جو بُو بندے کے منہ میں پیدا ہوجاتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو مشک (ایک قسم کی بہترین و مہنگی خوشبو) سے زیادہ پسندیدہ کہا ہے۔ روزہ داروں کے لیے جنت میں داخلے کا ایک دروازہ مخصوص کردیا گیا ہے۔ یہ بات آپ کے تجربے اور مشاہدے میں لازماً کئی بار آئی ہوگی کہ جب انسان مالی طور پر آسودہ ہوتا ہے اور پیٹ بھر کر انواع و اقسام کے کھانے کھا رہا ہوتا ہے تو اس میں غرور تکبر اور نفسانی خواہشات کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ بھوکے پیٹ کبھی کوئی انسان نفسانی خواہش کا خیال بھی نہیں کرتا۔ اس طرح روزہ رکھ کر ہمیں غریبوں کی بھوک کا احساس تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہمارے نفس کی صفائی بھی ہوتی ہے۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے ایک صحابیؓ کو مشورہ دیا تھا کہ نفسانی خواہش پر قابو پانے کے لیے روزہ کثرت سے رکھو۔ لہٰذا پہلا فائدہ صحیح طور پر روزہ رکھنے کا یہ ہے کہ نفس کمزور پڑتا ہے اور روح پاکیزہ ہوتی ہے۔ بندے کا تعلق مسلسل اللہ تعالیٰ سے جُڑا رہتا ہے اس طرح دنیا و آخرت کی سرخروئی ہوتی ہے۔



سحر و افطار میں ایسی غذا کا استعمال جو جسم کو توانائی فراہم کرے۔ اپنی زندگی کے فرائض کی انجام دہی کے لیے ... عام روٹی سالن، دودھ دہی گوشت، انڈے وغیرہ نہ کہ مرغن تلی ہوئی چیزیں، کولڈ ڈرنکس، برگر پزا سموسے، پکوڑیاں بریانی قورمہ نہاری پائے وغیرہ تو اس طرح شوگر، کولسٹرول یورک ایسڈ کی زیادتی سے بچیں رہیں گے اور یوں آپ رمضان کے مہینے میں جسمانی صحت کو نہ صرف بحال کرسکتے ہیں بلکہ مزید بہتر بھی بنا سکتے ہیں۔ شوگر، کولسٹرول، وزن کی زیادتی، بلڈ پریشر اور دل کی بیماریوں سے بڑی حد تک محفوظ رہ سکتے ہیں اور یوں یہ دوسرا فائدہ آپ کو حاصل ہوجاتا ہے۔ اللہ اور پیارے رسولؐ کی یہ بات جو میں نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی اگر سمجھ آگئی تو اس رمضان کو اسی طرح گزار کر دیکھیں۔ رمضان کے روزے اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کے مطابق رکھیں۔ اللہ قبول کرتے ہوئے خوش ہوتا ہے اور اسی لیے پیارے نبی کریمؐ کا حکم ہے کہ عیدگاہ میں نماز پڑھنے کے لیے اپنے بچوں اور عورتوں کو ساتھ لاؤ اگر ایک عورت کے پاس کپڑا نہیں ہے تو وہ دوسری عورت کے ساتھ چادر میں لپٹ کر آئے نماز نہیں بھی پڑھنی پھر بھی آئے اور دعا میں شریک ہو اور اللہ کی عنایت و اکرام سے مستفید ہو۔ اس طرح اللہ مسلمانوں سے خوش ہوتا ہے۔ اس نے ہمیں کلمہ سکھایا کہ ہم بھی اس خوشی کا اظہار کریں اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد۔

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہم اب کس کو خوش کریں گے؟ یقیناً ہمارا عمل بتاوے گا۔



نظر کی پیدائشی کمزوری

مسز اعجاز۔ گلشن اقبال کراچی

ڈاکٹر صاحب میرے بیٹے کی عمر ساڑھے پانچ سال ہے۔ پیدائشی طور پر میرے بیٹے کی سیدھی آنکھ بھینگی ہے۔ دو سال پہلے میں نے اس کی آنکھوں کا چیک اپ کروایا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کی سیدھی آنکھ (Lazy eye) ہے۔ اس کا (Vision) پیدائشی طور پر استعمال نہیں ہو رہا۔ اس کے لیے ڈاکٹر نے ایک گھنٹے تک جو آنکھ ٹھیک ہے یعنی الٹی آنکھ اسے بند رکھنے کا کہا ہے تاکہ وہ اپنی (Lazy eye) کو استعمال کرے۔ میں اس کی سیدھی آنکھ کو استعمال کروانے کے لیے الٹی آنکھ کو پٹی سے باندھ دیتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب مسئلہ یہ ہے کہ ان کی (Lazy eye) کا نمبر 10 ہے اور الٹی آنکھ کا نمبر بھی بہت تیزی سے گر رہا ہے۔ ہر مہینے نمبر مزید خراب ہو جاتا ہے۔ میرا بیٹا کمزور بھی بہت ہے اور ہر وقت موٹے چشمے لگا کر رکھتا ہے۔ عینک کے بغیر اسے کچھ نہیں دکھتا۔ اسے بہت دشواری ہوتی ہے۔ برائے مہربانی اس خط کا جواب جلدی دیجیے گا اور ضرور دیجیے گا۔ اللہ آپ کو اس کی جزا دے گا۔ آمین!

جواب: بہتر ہوتا کہ آپ کلینک پر آ کر ملتیں بہرحال بچے کو Calc.Phos-30، Calc. fluor-30، Physostigma-30 کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ دیں۔ دو ماہ تک تمام ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں۔

پیشاب کی بار بار حاجت

صائمہ انجم۔ گلستان جوہر کراچی

میری شادی کو آٹھ سال ہو چکے ہیں۔ تقریباً سات سال پہلے جب میں ایک ڈیڑھ ماہ کے حمل سے تھی تو میں نے شوہر کے کہنے پر اپنا ابارشن کرایا تھا۔ مگر اس کے بعد شاید میرا مثانہ کمزور ہو گیا ہے کہ مجھے بار بار پیشاب آتا ہے، کوئی جلن وغیرہ تو نہیں ہے نہ مجھے کوئی معدے کا مسئلہ ہے مگر میں تھوڑا سا بھی پانی پی لوں تو بار بار پیشاب آتا رہتا ہے۔ قبض وغیرہ نہیں ہے۔ رات کو بھی میں تقریباً 12 سے 15 دفعہ پیشاب کرنے کے لیے جاتی ہوں۔ میں اس مسئلے کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ مجھے کہیں دور سفر پر جانا ہو تو نہیں جا سکتی کیونکہ بار بار واش روم جانا پڑتا ہے۔

جواب: قدرت کے کاموں میں دخل نہیں دینا چاہیے ورنہ سزا ملتی ہے۔ ابارشن کرانے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ وجوہات کا تعین کرنا آسان نہیں ہوتا اس کے لیے مریض کو دیکھنا اس کی رپورٹس کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ڈائجسٹ والوں سے نمبر لے کر فون پر رابطہ کریں۔ اس دوران ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Liliumtig -30 کے 10 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

نسوانی نشوونما

سیدہ۔ کراچی

میری شادی کو 10 سال ہو چکے ہیں۔ الحمدللہ میرے دو بیٹے ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں دبلی پتلی ہوں اور میرا وزن 40kg ہے اور میرے بریسٹ پچھلے دو سال سے تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس سے پہلے بہتر تھے۔ میں بہت عرصے سے آپ سے اپنا علاج کروانا چاہتی ہوں مگر side effect اور کچھ وجوہات کی بنا پر نہ کروا سکی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے کوئی متوازن غذا کا چارٹ بتا دیں۔ آپ کا ہر دفعہ کالم پڑھتی ہوں اس لیے اس دفعہ کوشش کی کیونکہ اس میں ہمیشہ لوگوں کو آپ نے بہترین مشورے اور ادویات علاج کے لیے دیں اور ان سب کو اللہ کے حکم سے اور آپ کے علاج سے شفا ہوئی۔

جواب: بی بی گھبرائیں اور پریشان نہ ہوں لوگ کسی حال میں خوش نہیں رہنے دیتے۔ آپ اللہ کا شکر ادا کریں۔ ہارمونز کی خرابی سے ایسا ہو جاتا ہے۔ چہل قدمی کی عادت ڈالیں روزانہ ایک گھنٹا۔ کھانے میں ٹھنڈے مشروب و مرچ مسالوں سے پرہیز کریں۔ نمک آیوڈین والا استعمال کریں، متوازن غذا لیں Thyroidprofile اور CBC کا ٹیسٹ کرائیں۔ دو ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں Alfalfa-Ø کے 15 قطرے کھانے کے ایک گھنٹے بعد آدھے گلاس پانی میں ڈال کر Calc. Phos-30 اور Thyroidinum-6 کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔

بالوں کا گرنا اور سفید ہونا

فردوس شیخ، یوکے

میں اپنے بیٹے کے بالوں کے بارے میں بہت پریشان۔ اس کے بال پیدائشی طور پر بہت گھنے تھے لیکن کافی عرصے سے مسلسل گر رہے ہیں۔ اب تو آدھے بھی نہیں رہے اور اس کے علاوہ تیزی سے سفید بھی ہو رہے ہیں۔ قد تقریباً چھ فٹ ہے اور عموی صحت ٹھیک ہے۔ غذا کا بھی خاص خیال رکھتی ہوں۔ بادام وغیرہ بھی خوراک میں شامل کرتی ہوں لیکن بال گرنے اور سفید ہونے کی وہی رفتار ہے۔

جواب: خط آپ کا نامکمل ہے۔ بال کب سے گر رہے ہیں؟ اور کتنے بال گرتے ہیں۔ سوتے میں، نہاتے ہوئے، برش کرتے ہوئے۔ خشکی تو نہیں یا کوئی اور جلدی بیماری یا کوئی جسمانی بیماری یرقان، ٹائی فائڈ کے بعد بھی بال گرتے ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔ Lycopodium-30 اور Acid Phos-30 کے 10-10 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کرائیں۔ مزید معلومات کے لیے hdrzubairahmad@yahoo.com پر رابطہ کریں۔

SCHWABE

رسولی

کرن ملک۔ لاہور

مجھے پچھلے ایک سال سے رسولی کا مسئلہ ہے۔ رسولی بچہ دانی میں ہے۔ منگنی ہو چکی ہے۔ اب اپریل میں شادی کی ڈیٹ رکھی ہے۔ مجھے menses بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں اور ٹانگوں میں شدید درد ہوتا ہے۔ اُن دنوں میں چل پھر بھی نہیں سکتی۔

جواب: صحت کے معاملے میں ہم سستی کیوں دکھاتے ہیں؟ آپ کا یہ معاملہ زندگی کا ہے جس پر آپ اور آپ کے گھر والوں نے سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Pulsatilla-1M کی ایک خوراک ایک دن لیں۔ اس کے ایک دن بعد Thuja-30 کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں دو ہفتے تک۔ پھر ایک دن کے وقفے سے Pulsatilla-1M کی ایک خوراک لیں اور پھر ایک دن کے وقفے کے بعد Thuja-30 لیں دن میں 3 مرتبہ۔ تین مہینے بعد الٹراساؤنڈ کرا کر اور پچھلی رپورٹ سے موازنہ کرا کر اس کی فوٹو کاپی اور اپنا احوال لکھیں۔ مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔ وزن نہ اٹھائیں۔

ذہنی دباؤ

مسز علی۔ فیصل آباد

بہت بیمار اور تھکن محسوس کرتی ہوں۔ سر کے

ٹاپ میں شدید درد ہوتا ہے جو جبڑوں چہرے اور گردن کی رگوں میں پھیلتا جاتا ہے۔ اکڑن ہو جاتی ہے پٹھوں میں شدید، بازوؤں، ٹانگوں اور کمر میں درد بہت تیز ہوتا ہے۔ نیند بالکل نہیں آتی۔ چہرہ بہت کمزور اور پتلا ہو گیا ہے بلکہ بعض اوقات تو رات جاگ کر ایک اضطراری کیفیت میں گزرتی ہے جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہو۔ سانس مدھم اور دل کی دھڑکن رکتی سی لگتی ہے۔ دل میں لہریں سی نکلتی ہیں جیسے ابھی رک جائے گا خوف سا بڑھ جاتا ہے۔ تمام رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے۔ بے چینی، اضطراری سی کیفیت ہوتی ہے۔ سینے میں جلن، معدے میں درد کا مسئلہ تو بہت ہی پرانا ہے۔ کچھ بھی کھالوں جلنے لگتا ہے۔ درد شروع ہو جاتا ہے۔

بیٹی کی صحت اور بیٹے کا مسئلہ

ہماری چھت کی دیوار نہیں تھی۔ میری بیٹی گرمیوں میں... چھت سے گلی میں گری سیدھے۔ پاؤں کی ہڈی 5 جگہ سے فریکچر ہو گئی پلاسٹر لگا دیا لیکن اب کمر درد کی شکایت لیکوریا کی شکایت ہے۔ بیمار رہتی ہے۔ رنگت زرد، نیلی نیلی لگنے لگتی ہے۔ آنکھوں کے گرد گہرے حلقے ہیں۔ پیٹ درد کی شکایت رہتی ہے۔ کبھی قبض کبھی موشن لگے رہتے ہیں۔ کبھی خوش اور کبھی بہت غمگین بس ابھی تک بچوں میں ٹھیک رہتی ہے کارٹون دیکھ کر ہنستی ہے۔ کبھی کبھی بہت گہری باتیں بھی کرتی ہے لیکن ابھی تک بچوں والا ذہن ہے۔ کبھی کبھی بہت غصے میں اور چڑچڑی ہو جاتی ہے۔ مجھے کہتی ہے کہ میں آپ کے کام آنا چاہتی ہوں لیکن مجھ سے کچھ نہیں ہوتا بھول جاتی ہوں، پھر رونے لگتی ہے۔ میرا بیٹا ورکشاپ پر کام کرتا ہے۔ کبھی کبھی سر درد اور معدے میں درد کی شکایت کرتا ہے۔ بازو میں بھی درد بتاتا ہے۔

جواب: مسز علی آپ کے تمام مسائل کی وجہ ذہنی دباؤ ہے۔ یہ ذہنی دباؤ کچھ آپ کی وجہ سے، کچھ لوگوں کی وجہ سے اور کچھ حالات کی وجہ سے ہے۔ شوہر اور بیوی کا ایک تعلق ہوتا ہے۔ اس کو کسی طور پر بھی متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ اس تعلق کے متاثر ہونے سے ذہنی تناؤ خود میں اور رشتوں میں پیدا ہوتا ہے جس کے اثرات گھر، کاروبار اور بچوں پر پڑتے ہیں۔ اس لیے میاں بیوی آپس میں مل کر اپنی ضروریات اور مسائل سے ایک دوسرے کو آگاہی فراہم کریں۔ دوستانہ ماحول میں اور اپنے حالات کے مطابق چادر کی حد کا تعین کریں تاکہ ٹانگیں چادر سے باہر نہ نکلیں۔ خواہشات اور ضروریات کبھی ختم نہیں ہوتیں اور نہ مکمل ہوتی ہیں۔ لہٰذا ضروریات کو نمبروار پورا کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح کرنے سے ذہنی دباؤ نہیں ہوگا جو پریشانی کا باعث بنتا ہے اور پھر مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ یہ مایوسی کفر کے ساتھ ساتھ مختلف جسمانی بیماریوں کا باعث بنتی ہے۔

آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Laikan اور Velaxan ایک ایک گولی دن میں ۳ مرتبہ تھوڑے پانی کے ساتھ کھائیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

بیٹی کو Natrum sulph-200 کی ایک خوراک ہر ہفتے دیں اور اس کے دینے کے ایک دن بعد Alfalfa-Ø کے 11 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ کھانے کے بعد پلائیں۔ ایک ماہ بعد حالت بتائیں۔

بیٹے کی آنکھیں چیک کرائیں۔ نظر تو کمزور نہیں ہے؟ بیٹے کو Natr. mur-30 اور Calc. Phos-30 کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر 3 مرتبہ پلائیں۔ ایک ماہ بعد اس کی کیفیت بھی بتائیں۔